رجسٹرڈ نمبر A—466

نگار

قیمت ۱ روپیہ فی جلد

ہمیشہ یاد رکھئے

کہ پرچہ نہ پہونچنے کی اطلاع اگر اُسی مہینہ کے اندر نہ دی گئی تو آیندہ مہینہ کے اخیر تک پانچ پیسہ کے ٹکٹ آنے پر دوبارہ روانہ ہوگا (کیونکہ ڈاک خانہ اب پچھلے پرچوں کا محصول پنچ گنا وصول کرتا ہے) اور اُس کے بعد قیمتاً یعنی ۸ر کے ٹکٹ موصول ہونے پر۔

منیجر "نگار"

[illegible]

تصانیف نیاز فتحپوری

نگار بک ایجنسی

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ۔ نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کیا اُس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔

قیمت دو روپیہ (للعہ)

علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں ۲۲۔ افسانے سنہ ۳۳ء تک کے درج ہیں۔ زبان قدرت بیان علو تخیل و پاکیزگی خیال کے بہترین شاہکار کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشری مسایل کا حل بھی آپ کو اس مجموعہ میں نظر آئے گا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔ قیمت چار روپیہ (للعہ)

علاوہ محصول

خریداران نگار سے ایک روپیہ کم

مکتوبات نیاز

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو نگار میں شایع ہوئے ہیں نیز وہ جو شایع نہیں ہوئے۔ جذبات نگاری اور سلاست بیان رنگینی اور ادبیت کے لحاظ سے فن انشا میں یہ بالکل پہلی چیز ہے جس کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں مع تصویر حضرت نیاز ۲۸ پونڈ کے کاغذ پر مجلد شایع ہوئی ہے۔

قیمت دو روپیہ آٹھ آنے (عہ)

علاوہ محصول

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اُردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اُصول پر لکھا گیا ہے۔ اس کی زبان اس کی تخیل اس کی نزاکت بیان اسکی بلندی مضمون اور اسکی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔

قیمت ایک روپیہ (عہ)

علاوہ محصول

اُردو شاعری

یعنی جنوری سنہ ۳۵ء کا نگار جس میں اردو شاعری کی تاریخ، اس کی عہد بہ عہد ترقی اور ہر زمانہ کے شعراء پر بسیط نقد و تبصرہ کیا گیا ہے مع انتخاب کلام۔ اس کی موجودگی میں آپ کو کسی اور تذکرہ دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی اور جس میں سات مضامین اڈیٹر نگار کے لکھے ہوئے ہیں۔

حجم ۲۰۰ صفحات۔ قیمت عہ علاوہ محصول

ہندی شاعری

یعنی جنوری سنہ ۳۶ء کا نگار جس میں ہندی شاعری کی تاریخ اور اس کے تمام ادوار کا بسیط تذکرہ موجود ہے اس میں تمام مشہور ہندو شعراء کے کلام کا انتخاب مع ترجمہ کے درج ہے۔ ہندی شاعری کی اصل قدر و قیمت کا اندازہ مقصود ہو تو اُردو میں آپ کے لئے صرف یہی ایک مجموعہ کافی ہے۔ قیمت علاوہ محصول عہ

ہندوستان کے اندر سالانہ چندہ پانچ روپیہ ششماہی تین روپیہ
ہندوستان کے باہر سالانہ چندہ آٹھ روپیہ یا بارہ شلنگ

ششماہی چندہ میں "نگار" کا جنوری نمبر
بوجہ اضافۂ ضخامت وقیمت شامل نہ ہوگا۔

نگار

ہمیشہ یاد رکھئے کہ پرچہ نہ پہونچنے کی اطلاع اگر اُسی مہینہ کے اندر نہ دی گئی تو آئندہ مہینہ کے اخیر تک پانچ پیسے کے ٹکٹ آنے پر دوبارہ روانہ ہوگا (کیونکہ ڈاک خانہ اب پچھلے پرچوں کا محصول پنج گنا وصول کرتا ہے) اور اُس کے بعد قیمتاً یعنی ۸ر کے ٹکٹ وصول ہونے پر۔

منیجر "نگار"

جلد (۳۷)	فہرست مضامین جنوری سنہ ۱۹۴۰ء	شمار (۱)

نظیر میری نظر میں ---------- اڈیٹر ---- ۲
نظیر اور اردو شاعری میں واقعیت و جمہوریت ---- مجنوں گورکھپوری --- ۱۰
نظیر میر کے رنگ میں (غیر مطبوعہ غزل) ---------- ۴۲
نظیر کا مسلک ---------- ل۔ احمد ---- ۴۶
نظیر کی فارسی تراکیب (غیر مطبوعہ مسلسل غزل) ---------- [illegible]
نظیر پر ایک نظر ---- مخمور اکبرآبادی ---- ۴۱
نظیر کی سوگواریاں (غیر مطبوعہ غزل) ---------- ۵۸
نظیر کی فارسی تصانیف ---- اڈیٹر ---------- ۵۹
بدعت تضمین (غیر مطبوعہ نظم) ---------- ۶۳
نظیر کا عارفانہ رنگ (غیر مطبوعہ مسدس) ---------- ۶۴
نظیر اکبرآبادی کی شاعری پر ایک عمومی تبصرہ --- اختر اریبوی --- [illegible]
نظیر کی قدرت بیان و زبان (غیر مطبوعہ مخمس) ---------- ۷۶
نظیر اکبرآبادی اور عوام --- سید احتشام حسین رضوی --- ۷۹
نظیر کی ایک ناکام رات (غیر مطبوعہ ترجیع بند) ---------- ۸۸
نظیر کبیر کے رنگ میں (غیر مطبوعہ مسدس) ---------- ۸۹
نظیر کے مختصر سوانح ---------- انتظام اللہ شہابی --- ۹۱
نظیر کی معیاری تغزل (غیر مطبوعہ تضمین) ---------- ۱۰۰
ادبیات اردو میں نظیر اکبرآبادی کا فنی و لسانی درجہ --- سیماب اکبرآبادی ۱۰۲
نظیر کی جزئیات نگاری و زباں دانی --- عبدالباری آسی --- ۱۰۷
نظیر کا تبصرہ کارگاہ عالم پر (غیر مطبوعہ مخمس) ---------- ۱۱۴
پورے ہیں وہی مرد جو ہر حال میں خوش ہیں (نظیر کا ایک غیر مطبوعہ مسدس) ۱۱۸
ایک قاصہ کا عروج و زوال (نظیر کی ایک غیر مطبوعہ مسلسل غزل) --- ۱۲۰
بھونچال (نظیر کا ایک غیر مطبوعہ مسدس) ---------- ۱۲۱
اعتراف نظیر ---- احسان دانش --- ۱۲۳
تاریخ انتقال نظیر اکبرآبادی --- احسن مارہروی --- ۱۲۴
ملاحظات ---------- اڈیٹر ---- ۱۲۶

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

شمار - ۱	جنوری سنہ ۱۹۴۰ء	جلد - ۳۷

نظیر میری نظر میں

نظیر کے غیر مطبوعہ کلیات کی ورق گردانی کر رہا تھا اور سوچتا جاتا تھا کہ اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ نظیر کس قسم کا شاعر تھا، تو میں کیا جواب دے سکتا ہوں۔ اس کی غزلیں پڑھیے تو فوراً میر و سوز کی طرف خیال منتقل ہوتا ہے، پھر بھی وہ میر و سوز سے بالکل علیحدہ ہے، اسی طرح اس کی بعض نظموں میں جرأت و انشاء کی جھلک پائی جاتی ہے، لیکن سچ پوچھیے تو ایک کو دوسرے سے کوئی نسبت نہیں۔ الغرض میں اسی خیال کو لئے ہوئے جستہ جستہ اس کے اشعار دیکھتا جاتا تھا کہ دفعتاً اس کے اس مطلع پر نگاہ پڑی:-

لا کر ہر اک ادا میں وہ عیار چٹکلا چٹکی بجا کے چھوڑے ہے ہر بار چٹکلا

اسوقت تک مجموعی حیثیت سے جو اثر نظیر کی شاعری کا میرے دماغ پر پڑا تھا، اس نے مجھے اس شعر کی طرف زیادہ متوجہ کر دیا اور میں کچھ ایسا محسوس کرنے لگا کہ کہیں نظیر اسی قسم کا شاعر تو نہیں کہ

چٹکی بجا کے چھوڑے ہے ہر بار چٹکلا

اور جب مقطع میری نگاہ سے گزرا، تو میرا خیال اور زیادہ مستحکم ہو گیا۔ وہ مقطع آپ بھی سن لیجئے:-

سب جانتے ہیں چٹکلے بازی نظیر کی،
اس کے تو ہر سخن میں ہے اے یار چٹکلا

اگر آپ نے نظیر کے تمام اصناف سخن کا مطالعہ کیا ہے، تو میری طرح غالباً آپ کو بھی یہ بات محسوس ہوئی ہوگی کہ اس کا کوئی کلام ایسا نہیں، جس میں کچھ "چہل پل" نہ ہو، کوئی "انوٹ" نہ پائی جاتی ہو اور ایک قسم کی "اینڈ" موجود نہ ہو، لیکن ان سب کے ملنے کے بعد جو چیز بنتی ہے اسے کس لفظ سے تعبیر کر سکتے ہیں، یہ بات سمجھ میں نہ آتی تھی جسے نظیر کے مقطع نے سمجھا دیا کہ اسے "چٹکلے بازی" کہتے ہیں اور نظیر ایک "چٹکلے باز" شاعر تھا۔ لیکن "چٹکلے باز" کسے کہتے ہیں، یہ بات بجائے خود ذرا تشریح طلب ہے۔

"چٹکلے باز" ہماری سوسائٹی کا وہ انسان ہے (سوسائٹی سے علحدہ اس کا کوئی مفہوم متعین نہیں کیا جا سکتا) جو بچوں سے لیکر بوڑھوں تک غریبوں سے لیکر امیروں تک ہر عمر و طبقہ کی محفل میں اپنی جگہ پیدا کر لیتا ہے جو کبھی "بار خاطر" نہیں بلکہ ہمیشہ "یارِ شاطر" ثابت ہوتا ہے اور جس کی ہستی تکلف و تصنع سے بالکل پاک ہوتی ہے — اس کی زندگی کا رجائی (Sense of humour) پہلو ہمیشہ نمایاں رہتا ہے، اور خود وہ ہنسے یا نہ ہنسے لیکن دوسروں کو ہنسانے کی کوشش ضرور کرتا ہے۔ وہ ایک ایسا مرنجانِ مرنج، البیلا، کھلنڈرا اور چونچال لیکن بے ضرر انسان ہوتا ہے کہ وہ ہر شخص سے محبت کرنا چاہتا ہے اور ہر شخص اس سے محبت کرنے لگتا ہے۔ وہ مردِ مرتاض بننے کا دعویٰ کبھی نہیں کرتا، وہ مذہب کی تنگ نظری سے ہمیشہ علحدہ رہتا ہے، وہ ایک نہایت دلچسپ قسم کا "رند" ہے جو دنیا کو دوسروں کی نگاہوں سے دیکھنے کا زیادہ شائق ہوتا ہے اور اپنے آپ کو سوسائٹی کے اندر جذب کر کے اپنی انفرادیت کو بھی اجتماعی چیز بنا دیتا ہے۔ دوسروں کے ساتھ گھل مل کر زندگی بسر کرنا اس کا نصب العین ہوتا ہے اور دل پر چوٹیں کھانے کے بعد بھی ہر وقت مسکراتے رہنا اس کا شعار۔

اس کی رنگینی طبع اکتسابی نہیں بلکہ کیسر وہبی ہوتی ہے، اور اسی لئے وہ کبھی موقعہ پر چوکتا نہیں اور ہونٹوں پر آئی ہوئی بات کو روکتا نہیں۔ بولی ٹھولی، ضلع جگت، پھبتی، فقرہ بازی، بذلہ سنجی میں مشاق ہوتا ہے اور محفل کا جو رنگ ہوتا ہے اسی میں ڈوب جاتا ہے۔ اگر اس کے ہاتھ میں کبھی تسبیح ہوتی ہے تو کسی وقت اس کی کمر میں زنار بھی نظر آتی ہے اگر ایک وقت وہ لمبی داڑھی کے ساتھ محرابِ مسجد میں دکھائی دیتا ہے، تو دوسرے وقت ریش و بروت صاف، ارتھی کے ساتھ ساتھ بھی نظر آتا ہے، وہ بچوں کے ساتھ ملکر کھیلتا ہے۔ جوانوں کی محفل میں شریک ہو کر حسن و عشق کی باتیں کرتا ہے اور بوڑھوں کی صحبت میں وعظ و نصیحت۔

وہ دُنیا کو "شیطان سے خدا کا انتقام" نہیں سمجھتا بلکہ "انسان پر احسان" سمجھ کر اس سے لطف حاصل کرنا چاہتا ہے اور "انسان" کا مطالعہ وہ "انسانِ کل" ہونے کی حیثیت سے کرتا ہے۔ وہ اختلافِ مسلک و مشرب کو زندگی کا تنوع سمجھ کر اس سے دلچسپی لیتا ہے اور اسی لئے وہ اذان کی آواز اور صدائے ناقوس دونوں سے محبت کرتا ہے۔ اس کی زندگی یکسر نغمہ و رقص ہے جس میں سوائے قہقہۂ نشاط اور ہمہمۂ زندہ دلی کے کچھ نہیں ہے، یہاں تک کہ اس کی داستانِ عبرت و بصیرت بھی ایک ایسا گوارا اور پُر سکون اثر چھوڑ جاتی ہے کہ سننے والے کو موت بجائے زندگی کا نیا تجربہ

محسوس ہونے لگتی ہے۔

یہ ہے میرے نزدیک "چٹکلے باز" کا مفہوم اور اگر آپ نے نظیر کے کلام کا وسیع مطالعہ کیا ہے تو غالباً آپ بھی مجھ سے متفق ہوں گے کہ وہ واقعی "چٹکلے باز" شاعر تھا اور اس کا یہ کہنا کہ

"اس کے تو ہر سخن میں ہے اے یار چٹکلا"

بالکل صحیح و درست ہے۔

خیر یہاں تک تو "چٹکلے باز" انسان کی تشریح ہوئی (گو وہ ایک حد تک یقیناً تشنہ ہے) لیکن اگر ایک شاعر "چٹکلے باز" ہو تو اس میں اور کیا خصوصیات ہونی چاہئے، اس کا جان لینا بھی ضروری ہے۔

ہو سکتا ہے کہ ایک شخص چٹکلے باز ہو اور شاعر نہ ہو، لیکن شاعر بھی ہو اور چٹکلے باز بھی اس کے لئے چند باتوں کا پایا جانا لازم ہے۔ جزئیات کا مطالعہ تو بہر حال دونوں کے لئے ضروری ہے، لیکن ایک شاعر کے لئے "آہنگِ شعر" کا اسکے دماغ میں پہلے سے پایا جانا ناگزیر ہے۔ اس کے پاس الفاظ کا بھی بڑا ذخیرہ ہونا چاہئے اور مترادف و نیم مترادف الفاظ کے معانی میں جو ہلکے ہلکے فرق ہوتے ہیں اُن سے بھی اسے آگاہ ہونا چاہئے۔ اس میں موقع و محل کے لحاظ سے وضعِ الفاظ کا بھی مادہ ہونا چاہئے اور جذبات و اثر اندازی کے مقابلہ میں صنعتِ شعری سے مغلوب نہ ہونا۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ نظیر میں یہ تمام خصوصیات بدرجۂ کمال پائی جاتی ہیں۔

نظیر کی ہمہ گیری

جزئیات کا مطالعہ اس کا اتنا وسیع ہے کہ کوہ سے لیکر پرِ کاہ تک کوئی چیز اس کی نگاہ سے نہیں چھوٹتی اور "آہنگِ شعر" اتنا زبردست رکھتا ہے کہ ایک غیر متوازن چیز میں بھی وہ بلا کا توازن پیدا کر دیتا ہے۔ رہا الفاظ کا ذخیرہ سو اس باب میں تو اردو کا کوئی شاعر اس کا مقابلہ کر ہی نہیں سکتا، اور الفاظ کے گھڑنے میں جو یدِ طولیٰ اسے حاصل ہے اس میں نظیر آپ اپنی نظیر ہے۔ اسی لئے اس کے یہاں وہ سب کچھ ہے جو دوسروں کے یہاں الگ الگ پایا جاتا ہے اور اس کی شاعری داخلی و خارجی دونوں حیثیتوں سے بڑی مکمل چیز ہے۔

شاعری کے سلسلہ میں نظیر کے یہاں کیا نہیں ہے۔ غزل، قصیدہ، رباعی، مثنوی، مسدس، ترجیع بند، مستزاد بھی کچھ ہے اور ہر چیز اپنی جگہ لفظی و معنوی حیثیت سے ایک جڑا ہوا نگینہ نظر آتی ہے۔

مباحث کے تنوع کے لحاظ سے اس کا کلیات ایک ایسا نایاب ذخیرہ ہے کہ زندگی کا کوئی پہلو، معیشت و معاشرت کا کوئی انداز اور احساسات و تاثرات کا کوئی منظر ایسا نہیں ہے جو اس میں موجود نہ ہو۔ امیر و غریب، شاہ و گدا، زاہد و رند، سنجیدہ و غیر سنجیدہ، ہندو مسلمان، گبر و ترسا علحدہ علحدہ سب کی دلچسپی کا سامان اس میں موجود ہے اور عالمِ محسوسات کی شاید ہی کوئی چیز ایسی ہو جس کا ذکر کسی نہ کسی نہج سے نظیر نے نہ کیا ہو۔ مشاغلِ زندگی، ضروریاتِ انسانی مظاہرِ تمدن میں "مقطع" اور "ہنسوڑ" قسم کی کوئی چیز ایسی نہیں ہے جسے نظیر نے چھوڑ دیا ہو اور جس پر پورے

اہتمام شاعرانہ کے ساتھ تمام ممکن صنایع و بدایع لئے ہوئے قلم نہ اُٹھایا ہو۔ پھر لطف یہ ہے کہ نظیر کا کوئی رنگ سخن ایسا نہیں ہے جس میں واقعیت نہ پائی جاتی ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ اس کی زبان سے نکلتا ہے وہ اس کا تجربہ و مشاہدہ ہے اور اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ نظیر نے اپنی زندگی میں سبھی پاپڑ بیلے اور ہر رنگ کی صحبت میں شریک ہو کر اس سے لطف اُٹھایا۔

نظیر کی سیرت کے تفصیلی واقعات بہت کم بلکہ بالکل نہیں ملتے، لیکن اُس کی زندگی کا اجمالی خاکہ ہم اس کے کلام سے بہ آسانی معلوم کر سکتے ہیں۔ اس کا ایک غیر مطبوعہ مسدس ہے جس میں وہ اپنے محبوب کو مخاطب کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ وہ زندگی میں کیا کیا کھیل کھیل چکا ہے مثلاً

آگے بھی بھیس ہم نے بدلے ہیں کتنے باری   زنار باندھا قشقا کھینچا ہے، ہو پجاری
جوگی بھی بن چکے ہیں، مندیل بھی سنواری   آزاد بن کے اس دم ہیں دید کے بھکاری
اک دم کو آ گئے ہیں منہ مت چھپالے ہم سے
ٹک ہنس کے او پریرو آنکھیں لڑالے ہم سے

بانکے بھی ہو گئے ہم نے اس دید کو اُڑایا   شمشیر اور سپر کو اک عمر کھڑکھڑایا
بانک و پٹا و بلم گتکا و لٹھ پھرایا   جھمکا تمھارا اس دم ہم کو جو یاد آیا
اک دم کو آ گئے ہیں منہ مت چھپالے ہم سے
ٹک ہنس کے او پریرو آنکھیں لڑالے ہم سے

پھر کتنے روز ہم نے بچہ بٹے کا پالا   اس جال میں بھی کتنے خوباں کو دیکھ ڈالا
پنجرا، گلہری، توتا، شکرہ شکاروالا   اب دیکھنے کو تیرے یہ سوانگ کر کے لالا
اک دم کو آ گئے ہیں منہ مت چھپالے ہم سے
ٹک ہنس کے او پریرو آنکھیں لڑالے ہم سے

شیشہ میں مدتوں تک ہم نے پلنگ اُتارا   کتنے پری رخوں کو جا پیرنے میں مارا
تصویریں بیچنا بھی کتنے دنوں بچارا   اب دیکھنے کو تیرے ہو کر فقیر، یارا!
اک دم کو آ گئے ہیں منہ مت چھپالے ہم سے
ٹک ہنس کے او پریرو آنکھیں لڑالے ہم سے

کشتی میں ہم نے کتنی مدت بدن کو توڑا   سو گلبدن کے تن کو من مانتا مروڑا
جو ڈھب تھا اس ہنر کا کوئی نہ ہم نے چھوڑا   اب خوبرو کا پیارے دنیا میں دیکھ توڑا
اک دم کو آ گئے ہیں منہ مت چھپالے ہم سے
ٹک ہنس کے او پریرو آنکھیں لڑالے ہم سے

جوڑے کبوتروں کے پھر کتنے دن اڑائے / کنکوے، چنگ، گڈّی، تکل، پتنگ بنائے
کھٹ والے بن، ہزاروں چھاتی تلک لگائے / ہیں دید کے جو دل میں لاکھوں مزے سمائے
اک دم کو آگئے ہیں منہ مت چھپا لے ہم سے
ٹک ہنس کے اوپر یرو آنکھیں لڑا لے ہم سے

پھر لال بھی لڑائے اور گلدمیں بھی پالیں / جنگل میں دل لگائے اور بدڑیاں پھنسالیں
ڈبوں میں ڈالی بھی بل مکڑیاں بنالیں / کیا کیا نہ ہم نے پیارے بہروپیاں مچالیں
اک دم کو آگئے ہیں منہ مت چھپا لے ہم سے
ٹک ہنس کے اوپر یرو آنکھیں لڑا لے ہم سے

خرادی ہوئے ہم نے لٹو چکئے بنائے / اس میں بھی کتنے لڑکے خراد پر چڑھائے
پھر ہوئے سرمے والے سرمے بہت لگائے / ریچھوں تلک لڑائے بندر تلک نچائے
اک دم کو آگئے ہیں منہ مت چھپا لے ہم سے
ٹک ہنس کے اوپر یرو آنکھیں لڑا لے ہم سے

اسی طرح کا ایک مسدس اس کے مطبوعہ کلام میں بھی نظر آتا ہے جس کی سرخی دید بازی ہے اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے شعراء کی طرح مہرخوں کے لئے اس نے صرف مصوری ہی نہیں سیکھی بلکہ اور بہت سے جتن کئے، یہاں تک کہ ریچھ اور بندر بھی نچایا، آم جامن کے ٹوکرے بھی سر پر اٹھائے دال موٹھ اور پاپڑ کی بھی دوکان لگائی، الغرض بقول انھیں کے

"سو مکر و فن بنانا سو رنگ روپ بھرنا"

ان کا شعار زندگی رہا۔ اگر ہم ان تمام بیانات کو شاعرانہ مبالغہ سے تعبیر کریں، تو بھی اس سے یہ بات تو ثابت ہی ہوتی ہے کہ نظیر نے زندگی کے ہر رنگ کا نہایت گہرا مطالعہ کیا تھا اور ہر صحبت و مجلس میں شریک ہو کر اس نے خود ان تمام باتوں کا تجربہ حاصل کیا تھا جسے شعراء عام طور پر صرف سنی سنائی حیثیت سے ظاہر کرتے ہیں اور یہ وہ خصوصیت ہے جو نظیر کے علاوہ ہندوستان کے کسی شاعر کو نصیب نہیں ہوئی۔

نظیر طبقۂ خواص کا بھی شاعر تھا

نظیر کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ طبقہ عوام کا شاعر تھا، اور اسی لئے اس نے شاعرانہ اسقام و اغلاط کی پرواہ نہیں کی، مگر میری رائے میں یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ وہ عامۃ الناس کا شاعر تھا اور اس میں کسی طبقہ کی تخصیص نہیں ہے، کیونکہ اس کے کلیات میں ہر طبقہ و جماعت کی دلچسپی کا سامان پایا جاتا ہے۔

حضرات جنھوں نے صرف اس کی سادگی بیان اور سیدھی سیدھی باتوں کو دیکھ کر اس کے "عوامی" شاعر ہونے پر

حکم لگایا ہے وہ غالباً یہ سنکر حیرت کریں گے کہ نظیر جب فارسی تراکیب اور لفظی شان و شوکت کا اہتمام کرتا ہے تو وہ بالکل غالب و مومن بلکہ موجودہ زمانہ کا شاعر نظر آتا ہے۔ ایک غزل ملاحظہ ہو:-

جاں بھی بجاں ہے ہجر میں اور دل فگار بھی　　تر ہے مژہ بھی اشک سے جیب کا تار تار بھی
طرفہ فسوں سرشت ہے چشم کرشمہ سنج یار　　لیتی ہے اک نگاہ میں صبر بھی اور قرار بھی
دیکھئے کیا ہو، بطرح دل کی لگے ہیں گھات میں　　عشوۂ پرفریب بھی غمزۂ سحرکار بھی
زلف کو بھی ہے دمبدم عزم کمند افگنی　　دام لئے ہے مستعد طرۂ تابدار بھی

چند اشعار اور مختلف غزلوں کے ملاحظہ ہوں:-

جس طرف تجھے دیکھتے عیش و طرب کا جوش تھا　　مستی و رندی ہوسبازی و بے اندیشگی
قد میں خم، آنکھوں میں نم، چہرہ پہ جھری، رنگ زرد　　سر سے پا تک سخت ناخوش منظری، بد ہیئتی
جس کے لب سے سخن پند گہر جوش ہوئے　　عمر بھر پھر وہ ہمارے گہر گوش ہوئے
چاہت کے اب افشاگن اسرار تو ہم ہیں　　کیوں دل سے جھگڑتے ہو، گنہگار تو ہم ہیں،
کیا کبک کو دکھلاتے ہو انداز خرام، آہ　　حسرت زدۂ شوخی رفتار تو ہم ہیں،

کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ اشعار اسی کے ہیں جو

کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں

پکارتا پھرتا ہے۔

ایک غزل اور ملاحظہ ہو:- (یہ بھی غیر مطبوعہ ہے)

اے صف مژگاں تکلف برطرف　　دیکھتی کیا ہے الٹ دے صف کی صف
دیکھ وہ گورا سا مکھڑا رشک سے　　پڑ گئے ہیں ماہ کے منہ پر کلف
آگیا جب بزم میں وہ شعلہ رو　　شمع تو بس ہو گئی جل کر تلف
ساقی بھی یوں جام لیکر رہ گیا　　جس طرح تصویر ہو ساغر بکف

ان اشعار سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ نظیر طبقۂ عوام ہی کا شاعر نہ تھا بلکہ طبقۂ خواص کا بھی تھا۔

چشم کرشمہ سنج - عشوۂ پرفریب - غمزۂ سحرکار - طرۂ تابدار - بے اندیشگی - ناخوش منظری - گہر جوش - حسرت زدۂ شوخی رفتار - فارسی کی وہ ترکیبیں ہیں جو فارسی کا نہایت بلند ذوق رکھنے والے شاعروں ہی کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔

نظیر تقریباً سو سال زندہ رہے اور ۱۲۴۶ھ میں ان کا انتقال ہوا یعنی جب ولی دکنی دربار دہلی پہونچے ہیں اس وقت نظیر کی عمر سات آٹھ سال کی تھی اور جب غالب جوان تھے تو نظیر کی زندگی کے کم از کم پندرہ سال ضرور باقی تھے اس لئے

اگر نظیر کی شاعری کی ابتدا ۲۰ سال سے مانی جائے تو اس کے معنے یہ ہیں کہ اس نے میرزا مظہر، شاہ حاتم، سودا، میر، سوز، قایم، حسرت (استادِ جرأت)، رنگین، شاہ نصیر، ممنون، مومن، غالب، ذوق، جرأت، انشاء، مصحفی اور ناسخ سب کا زمانہ دیکھا، جن میں سے کچھ اس سے قبل مر گئے اور کچھ اس کے بعد بھی زندہ رہے اور اس لئے اگر اس کے کلام میں ہم وہ سب کچھ پائیں جو اس کے ہمعصر شعراء کے کلام میں پایا جاتا ہے تو تعجب نہ کرنا چاہئے، گو نظیر کا وہ انفرادی رنگ جس کا ذکر ہم آئندہ کریں گے ایسا تھا جس کی ہوا بھی انکے ہمعصر شعراء میں سے کسی کو نہ لگی تھی۔

ذیل کے اشعار (جو اُس کے غیر مطبوعہ کلیات سے لئے گئے ہیں) اس بات کا ثبوت ہیں کہ نظیر کا عہد ان سب شاعروں کا عہد تھا اور وہ بیک وقت متقدمین و متوسطین و متاخرین تمام شعراء کی صف میں جگہ پا سکتا ہے۔

شرمندۂ رفو نہیں عاشق کا چاکِ جیب
کس باغباں نے گل کا گریباں سلا دیا؟

تمھاری زلف کا اے یار ہم سے بل نہ گیا
ہمارے دل سے تیری اک بال بھر خلل نہ گیا،

ہمیں ہیں دیکھ جو قدموں پہ گر رہے ہیں ترے
دگر نہ یاں سے میاں ہاتھ کون مل نہ گیا

جلا کے پر، جو لگن میں پڑا اسلگتا ہے
پتنگ پہلے ہی خانہ خراب جل نہ گیا

بہار آئی کیا ہر شاخ پر گل نے مکاں اپنا
بنا اب تو بھی اے بلبل چمن میں آشیاں اپنا

ابھی کہیں تو کسی کو نہ اعتبار آوے
کہ ہم کو راہ میں اک آشنا نے لوٹ لیا

ٹھہرنا عشق کے آفات کے صدموں میں نظیر
کام مشکل تھا پر اللہ نے آسان کیا

جس کام کو جہاں میں تو آیا تھا اے نظیر
خانہ خراب تجھ سے وہی کام رہ گیا

اس کے چہرہ پہ نہیں کاکل مشکیں کی نمود
یہ پٹاری کے تئیں توڑ کے کالا نکلا،

مٹ گئے شور و فغاں جی کے نکلتے ہی نظیر
پھر نہ سینہ سے اُٹھی آہ، نہ نالا نکلا،

میرا اور اُس کا اختلاط ہو گیا مثلِ ابر و برق
اس نے مجھے رُلا دیا، میں نے اُسے ہنسا دیا

تیشہ کی کیا مجال تھی جو یہ تراشے بیستوں
تھا وہ تمام دل کا زور جس نے پہاڑ ڈھا دیا

سن کے ہمارا عرضِ حال یار نے یک بیک نظیر
ہنس کے کہا کہ بس جی بس تم نے تو سر پھرا دیا

خط کے آنے پر بھی کافر مجھ کو ترساتا رہا
جیسا شرماتا تھا جب، ویسا ہی شرماتا رہا

آہ کے، نالہ کے، ٹھنڈی سانس کے، یا اشک کے
اب خدا جانے کے کس کے ساتھ جی جاتا رہا

آج دیکھ اُس نے مری چاہ کی چتون یارو
منھ سے گو کچھ نہ کہا دل میں تو جاتا ہو گا،

دیکھ لے اس چمنِ دہر کو دل بھر کے نظیر
پھر ترا کاہیکو اس باغ میں آنا ہو گا،

تمھارے ہی واسطے تو کل ہم بھی رو دئے صاحب
جگر کے داغ جو دھوئے تھے دھو لئے صاحب

کل اس صنم نے کہا دیکھکر ہمیں خاموش (قطعہ)
کہ اب تو آپ بھی ٹک لب کو کھولئے صاحب
یہ سن کے ہنسنے نظیر اُس سے یوں کہا ہنسکر
جو کوئی بولے، تو البتہ بولئے صاحب

کچھ اُسے شرم، کچھ ہے ہم کو حجاب
ہے نئی چاہ میں یہ طرفہ عذاب
کیوں نہ عشرت دوچند ہو جو ملے
یار مہ چہرہ اور شبِ مہتاب

کہیں بیٹھنے دے دل اب مجھے جو حواس ٹک میں بجا کروں
نہیں تاب مجھ میں کہ جب تلک تو بھرے تو میں بھی بھرا کروں
جو نگہ سے چاہ کے دیکھوں ٹک تو چڑھا کے تیوری یہ کہتا ہے
تری اس نگہ کی سزا ہے یہ کہ بس اب میں تجھ سے چھپا کروں
مجھے مدتوں سے ہے دردِ دل جو کہا کچھ اس کا علاج کر
تو کہا کہ اسکی دوا یہ ہے تو کہا کرے میں سنا کروں
کوئی بولا تمنے نظیر کو نہ جھڑک دیا، تو کہا میاں
دل و جاں سے مجھ پہ وہ ہے فدا، اسے کس طرح میں خفا کروں

نہ دن کو چین نہ راتوں کو خواب آنکھوں میں
بھر آرہی ہے ترے غم سے آب آنکھوں میں
جدھر وہ دیکھے اُدھر صف کی صف اُلٹ دے ہے
بھری ہے شوخ کے ایسی شراب آنکھوں میں
تھما نہ اشک، نہ نیند آئی، نہ پلک جھپکی،
بسا ہے جب سے وہ خانہ خراب آنکھوں میں
شتابی آن کے محبوبو پگڑیاں رنگ لو،
نظیر لایا ہے بھر کر شہاب آنکھوں میں

جام نہ رکھ ساقیا، شب ہے پڑی اور بھی
پہر جہاں کٹ گئے چار گھڑی اور بھی
پہلے ہی ساغر میں تھے ہم تو پڑے لوٹتے
اتنے میں ساقی نے دی اس سے کڑی اور بھی

سرشکِ چشم سے موتی بہت پروئے گئے
ولے یہ داغ جگر سے کبھی نہ دھوئے گئے
غرور نے تو ہمارے بہت ہی کھینچا سر
پر اس کو ہم بھی سدا خاک میں ملوئے گئے
نظیر کیا ہی مزا تھا کہ کل خوشی سے ہم
گئے تھے یار کو لینے سو آپ ہی کھوئے گئے

یوں کارواں شباب کا گزرا کہ گوشزد
آوازِ پا ہوئی نہ صدائے درا ہوئی
پوچھی نظیر ایک نے کل شکلِ وصلِ یار (قطعہ)
ہم نے کہا یہ اُس سے کہ کیا کہئے کیسا ہوئی
جو شکلِ دورباش تھی روزِ نخست کی
اب بھی جو ہم گئے تو وہی برملا ہوئی

دل ٹھہرا ایک تبسم پہ کچھ اور بہا لے جان نہیں
گر ہنس دیجے اور لیجیے تو فائدہ ہے نقصان نہیں
جب سنتا ہے احوال مرا یوں کہتا ہے عیاری سے
ہے کون وہ، اس سے ہمکو تو کچھ جان نہیں پہچان نہیں
کچھ بن نہیں آتا کیا کیجے کس طور سے ملئے اے ہمدم
وہ دیکھ ہمیں رک جاتا ہے اور ہم کو چین اک آن نہیں

گر ہم نے دل صنم کو دیا پھر کسی کو کیا
اسلام چھوڑ کفر لیا، پھر کسی کو کیا
کیا جانے کس کے غم میں ہیں آنکھیں ہماری لال
اے ہمنے گو نشہ بھی پیا، پھر کسی کو کیا

کبھی کیا ہے اپنے گریباں کو ہم نے چاک — آپ ہی سیا سیا نہ سیا، پھر کسی کو کیا،

نظیر کی انفرادیت غزل میں

اگر آپ اس اقتباس کا بغور مطالعہ کریں گے تو آپ کو اس میں ان تمام شعراء کا رنگ نظر آئے گا، جو نظیر کے معاصر تھے اور جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ خالص تغزل کی بھی اس کے یہاں کمی نہ تھی لیکن جس خصوصیت نے نظیر کو تمام شعراء سے ممتاز بنا دیا ہے اور جس میں اسکا کوئی ہمسر نظر نہیں آتا، وہ وہی ہے جو اس کی منظومات میں نظر آتی ہے اور کہیں کہیں بے اختیارانہ غزلوں میں بھی اس کی جھلک نمایاں ہے۔

نظیر کے غیر مطبوعہ دیوان میں (جو میرے پیش نظر ہے) دو سو سے زیادہ غزلیں پائی جاتی ہیں جن میں سے بعض مسلسل ہیں، بعض مستزاد، بعض صرف تضمین کی حیثیت رکھتی ہیں اور بعض یکسر محاکات ہیں۔

نظیر کی خصوصیت اس کا مطالعۂ جزئیات ہے جو اس کی بعض غزلوں سے بھی ظاہر ہوتا ہے اور جس وقت وہ کسی منظر کی تصویر کھینچنے پر آتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک ایک ذرہ کا حساب دے رہا ہے، ایک غزل میں ہولی کا سماں پیش کرتے ہیں:

ہولی کی رنگ فشانی سے ہر رنگ یہ کچھ پیراہن کا — جوں رنگا رنگ بہاروں میں ہو صحن چمن اور گلشن کا
جس خوبی اور رنگینی سے گلزار کھلے ہیں عالم میں — ہر آن چھڑکواں جوڑوں سے ہے حسن کچھ ایسا ہی تن کا
لے جام لبالب بھر دینا، پھر ساقی کو کچھ دھیان نہیں — یہ ساغر ہو پہنچے دوست تلک یا ہاتھ لپک لے دشمن کا
ہر محفل میں رقاصوں کا کیا سحر دلوں پر کرتا ہے — وہ حسن جتانا گانے کا اور ہوش دکھانا جوبن کا
ہر روپ بھیروں کا مہوش اور رنگ گلالوں کا گلگوں — ہیں بھرتے جس میں رنگ، بنا ہو رنگ عجب اس برتن کا
اس گلرو نے یوں ہم سے کہا کیا مستی اور مدہوشی ہو — نا دھیان نہیں کچھ چولی کا نا ہوش تمہیں کچھ دامن کا
جب ہم نے نظیر اُس گلرو سے یہ بات کہی، ہنس کر اُس دم — کیا پوچھے ہو اے رنگ بھری ہو مست جھینا پھاگن کا

نظیر کے زور بیان اور ذخیرۂ الفاظ کے لئے ذیل کی غزل ملاحظہ فرمایئے:-

دکھا کر اک جھمک دل کو نہایت کر گیا بیکل — پری رو، تند خو، سرکش، ہٹیلا، چلبلا، چنچل
وہ عارض اور جبیں تاباں کہ ہوں دیکھ اسکو شرمندہ — قمر، خورشید، زہرہ، شمع، شعلہ، مشتری، مشعل
کفوں میں انگلیوں میں، لعل لب میں، چشم سیگوں میں — حنا، آفت، ستم، فندق، مسی، جادو، فسوں، کاجل
بدن پر جامۂ زرکش سراپا جس پہ زیب آور — کڑے، بندے، چھڑے، چھلے، انگوٹھی، نورتن، ہیکل
نزاکت اور لطافت وہ کف پا تک کہ حیراں ہوں — سمن، گل، لالہ، نسریں، نسترن، دُر، پنکھڑیاں، مخمل
سراسر جب یہ ایسا کہ ظاہر جسکی نظروں سے — شرارت، شوخی، عیاری، طرح، پھرتی، دغا، چھلبل

نظیر اک عمر عشرت ہو، ملے ایسا پری پیکر
اگر اک آن، اگر اک دم، اگر اک چھن، اگر اک پل

نظیر نے اک جگہ سمدھن کا سراپا دکھانے میں جس نقاشی سے کام لیا ہے، اس کی مثال اُردو شاعری میں مشکل سے ملسکتی ہے، ملاحظہ ہو:-

سراپا حسنِ سمدھن گویا گلشن کی کیاری ہے
پری بھی اب تو بازی حسن میں سمدھن سے ہاری ہے
کھنچی کنگھی، گندھی چوٹی، جمی پٹی، لگا کاجل
کماں ابرو، نظر جادو، نگہ ہر اک دُلاری ہے
جبیں مہتاب، آنکھیں شوخ، شیریں لب، گہر دنداں
بدن موتی، دہن غنچہ، ادا ہنسنے کی پیاری ہے
نیا کمخواب کا لہنگا، جھمکتے تاش کی انگیا
کچیں تصویر سی، جن پر لگا گوٹا کناری ہے
ملایم پیٹ مخمل سا، کلی سی ناف کی صورت
اُٹھا سینہ صفا پیڑو، عجب جوبن کی ناری ہے
سُرین نازک، کمر پتلی، خطِ گلزار رو، ما دل
کہوں کیا آگے اب اس کے مقام پردہ داری ہے
لٹکتی چال، مدھ ماتی، چلے بچھووں کو جھنکاتی
ادائیں دل لیے جاتی، عجب سمدھن ہماری ہے
بھرے جوبن پہ اتراتی، جھمک انگیا کی دکھلاتی
کمر لہنگے سے بل کھاتی، لٹک گھونگھٹ کی بھاری ہے

ایک محبوب کا ذکر غزل میں اس طرح کرتے ہیں:-

اس گورے بدن کا کوئی کیا وصف کرے آہ
ختم اس کے اوپر گلرخی و سیمتنی ہے
منہ چاند کا ٹکڑا ہے، بدن چاندی کی تختی،
دنداں ہیں گہر، ہونٹ عقیقِ یمنی ہے
بلور کی پتلی کہوں یا موتی کا دانہ
یا چین میں اک چینی کی مورت یہ بنی ہے
نرمی میں، صفائی میں، نزاکت میں تن اُسکا
ریشم ہے نہ گلبرگ، نہ برگ سمنی ہے
گر پھول کی پتی کی بنا، پہنے وہ پوشاک
چھل جاوے بدن اُس کا یہ نازک بدنی ہے
کل میں نے کسی شخص سے نام اس کا جو پوچھا
یعنی یہ پری یا کہ غزالِ ختنی ہے
وہ بولا کہ اس شوخ کو کہتے ہیں، ہیرا
کام اس کا سدا دلبری و دلشکنی ہے
تب میں نے وہیں ہنس کے کہا اُس سے نظیر، آہ
ہیرا اگر کہو اس کو یہ ہیرے کی کنی ہے،

نظیر کی اس خصوصیت کا مزید مطالعہ کرنے کے لئے وہ نظم دیکھئے جو رقاصہ کے عنوان سے اسی رسالہ میں، آپ کو کسی جگہ ملے گی۔

نظیر کے محاسنِ شعری

وہ شاعر جس کا مطالعۂ جزئیات بہت وسیع ہوتا ہے، قدرتاً اس کا میلان صنایع و بدایع کی طرف بھی زیادہ ہوتا ہے، کیونکہ بغیر ان کے وہ اپنے خیالات و جذبات کو بخوبی ذہن نشین نہیں کرسکتا۔ ایک اچھا نقاش بھی اسوقت تک کسی حسین نقش کو کامیابی کے ساتھ پیش نہیں کرسکتا

جب تک اس کے پیش منظر اور ماحول میں نقش کی معنویت کے لحاظ سے خاص حسن نہ پیدا کیا جائے۔

نظیر کا کلام صنایع و بدایع سے مالامال ہے جن کو تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کا موقعہ نہیں، لیکن مختصراً چند مثالیں یہاں پیش کی جاتی ہیں۔ یوں تو تشبیہات و استعارات سے اس کا سارا کلام بھرا پڑا ہے اور کوئی نظم اس صنعت سے خالی نہیں، چنانچہ صفحات سابقہ میں جو اقتباس دیا گیا ہے اس سے بھی آپ کو اس کا ثبوت ملے گا، لیکن جہاں اس نے مرکب تشبیہات استعمال کی ہیں، وہاں نزاکت خیال کی انتہا ہو گئی ہے۔

عاجزی و افتادگی ظاہر کرنے کے لئے شعراء نے متعدد اسالیب اختیار کئے ہیں، لیکن نظیر کی انفرادیت ملاحظہ ہو، کہتا ہے:

وہ نیاز عجز تھا اُس کی نگہ سے آشکار — جس طرح سے تھک رہے طایر کہیں پرواز سے

یہ بات اسی کے قلم سے نکل سکتی تھی جس نے تھکے ہوئے طایر کو زمین پر گرتے دیکھا ہے اور ساتھ ہی ساتھ نزاکت تعبیر کا بھی غیر معمولی سلیقہ رکھتا ہے۔

گورے بدن پر سُرخ لباس کی کیفیت کو اس طرح ظاہر کرتا ہے:

گویا شفق میں آن کے بجلی چمک پڑی

رخسار کو نارنگی کہنا معمولی بات ہے، لیکن نظیر اس معمولی بات کو کس قدر اہم بنا دیتا ہے، ملاحظہ ہو:-

سُرخ گالوں پہ جو ہم کرتے ہیں اس گل کے نگاہ — پڑی نارنگیاں ٹپکے ہیں ہزاروں دلخواہ

شاعری میں صبح ہونے کو خدا جانے کتنے مختلف انداز سے بیان کیا گیا ہے، خاصکر میر انیس کے یہاں بہت تنوع پایا جاتا ہے، لیکن نظیر کی انفرادیت کی بھی داد دیجئے، کہتا ہے:

جب آنکھ سے سورج کی، ڈھلا رات کا گجرا

ہونٹوں پر مسکراہٹ آنے کو اس طرح بیان کرتا ہے:

گر کچھ کچھ تبسم کی شکر لب سے لگا ملنے

ایک جگہ نظیر نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ساقی جام ہاتھ میں لئے ہوئے متحیر کھڑا ہے اور اس کی تشبیہ یوں دیتے ہیں:-

جس طرح تصویر ہو ساغر بکف

نظیر کی ایک اور خصوصیت جو بہت کم آپ کو کسی اور شاعر کے یہاں نظر آئے گی، یہ ہے، کہ وہ موقعہ محل کے لحاظ سے الفاظ ایسے استعمال کرتا ہے کہ سامعہ پر بھی اس کا خاص اثر پڑتا ہے اور سننے والا خوف و ہراس، یا لطف و انبساط کی تمام کیفیات الفاظ میں محسوس کرنے لگتا ہے۔ برسات کی رنگ رلیوں کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتا ہے:

روز مزوں سے رات کو برسے تھا مینہ جھمک جھمک — بوندیں پڑیں ٹپک ٹپک، پانی پڑا چھپک چھپک

جام رہے چھلک چھلک، شیشے رہے بھبک بھبک　　ہم بھی نشوں میں خوب چھک لوٹتے تھے بہک بہک

نظیر کو اختراع الفاظ کا خاص سلیقہ حاصل تھا اور موضوع کے لحاظ سے اُن کا اتنا صحیح صرف کرتا تھا کہ الفاظ خود معنی ہوکر رہ جاتے تھے، اس مثال میں آپ نے دیکھا کہ مستی و سرخوشی ظاہر کرنے کے لئے جو الفاظ اس نے استعمال کئے ہیں انمیں کتنی موسیقی پائی جاتی ہے۔

ہندوؤں کے صنمیات میں بھیروں کی تصویر بہت ہیبتناک اور ڈراؤنی دکھائی جاتی ہے، نظیر کی ایک نظم اس موضوع پر بھی لکھی ہے (جو غیر مطبوعہ ہے) اس کے بعض بند ملاحظہ کیجئے کہ ہندوؤں کی روایات کے لحاظ سے کیسے مناسب الفاظ اس نے استعمال کئے ہیں:

آنکھوں میں چھا رہا ہے تیرا سروپ کالا　　تن میں بھبھوت گہرا، گلے بیچ منڈ مالا
آنکھیں دیا سی روشن، ہاتھوں میں اک پیالا　　ہوں دل سے داس تیرا، سن اے مرے دیالا

ماتھے پہ تیرے ٹیکا سیندور کا براجے　　مدھ پیوے، ماس کھاوے جو تو کرے سو چھاجے
ترسول کاندھے اور ڈوڑو کی گت بھی باجے　　سب تج کے میں نے اب تو تیرے کرم کے کاجے

غصہ میں جب تو آکر اپنی جٹا ہلا دے　　دھرتی، اکاس، پربت، پاتال دہل جاوے
سر کاٹ راچھسوں کا چوٹی پکڑ جھلاوے　　جھانکے کلال خانے، کتے کو خوں چٹاوے

نظیر کی مناظر پرستی اس حد تک بڑھی ہوئی تھی کہ نقوش قدرت میں وہ اپنے آپ کو بالکل گم کر دیتا تھا اور اس لئے اسکے بیان میں قیامت کی والہانہ تکمیل پائی جاتی ہے۔ چاندنی رات اور وصلِ محبوب، عاشقوں اور شاعروں کی بڑی تمنا رہی ہے اور سبھی نے اس آرزو پر دھنا ہے۔

میرزا مظہر کہتے ہیں:

مہتاب و شراب و انتظارت　　ایں روز قیامت ست شب نیست

نسبتی اس سے زیادہ پُرلطف و بلیغ انداز میں فرماتے ہیں:

مے باقی و ماہتاب باقی ست　　ما را بتو صد حساب باقی ست

اب ایک غیر مطبوعہ مسدس کے چند بند نظیر کے بھی سنئے:-

جس دم چمن میں چاندنی کی ہوں خوش جمالیاں　　اور جھومتی ہوں باغ میں پھولوں کی ڈالیاں
بہتی ہوں مے کے جوش سے عشرت کی نالیاں　　کانوں میں نازنیں کے جھمکتی ہوں بالیاں
عیش و طرب کی دھوم نشوں کی بجالیاں
جب چاندنی کی دیکھئے راتیں اُجالیاں

بیٹھی ہو چاندنی سی جو وہ شوخ گلعذار، — اور بادلے کا تن میں جھمکتا ہو تار تار،
ہاتھوں میں گجرا، بالی میں کلیاں، گلے میں ہار — ہر دم نشے میں پیار سے ہنس ہنس کے بار بار
ہم چھیڑتے ہوں اس کو وہ دیتی ہو گالیاں
جب چاندنی کی دیکھیے راتیں اُجالیاں

ایسی ہی چاندنی سی بنائے وہ سب پھبن — چمپا کلی جڑاؤ، وہ ہیرے کا نورتن
گہنے سے چاندنی میں جھمکتا ہو گلبدن — اور چاندنی کی جھلک سے وہ گورا سا اس کا تن
دکھلا رہا ہو کرتی و انگیا کی جالیاں
جب چاندنی کی دیکھیے راتیں اُجالیاں

وہ گلبدن کہ حُسن کا جس کے مچا ہو شور — کرتی ہو بیٹھے ناز سے سو چاندنی پہ زور
چھلّے بھی اُنگلیوں میں جھمکتے ہوں پور پور — ہم بھی ہوں پاس شوخ کے جوں چاند اور چکور
دونوں گلے میں پیار سے باہیں ہوں ڈالیاں
جب چاندنی کی دیکھیے راتیں اُجالیاں

ایدھر ہو حُسنِ باغ، اودھر چاند کی جھلک — وہ نازنیں بھی زور نشے میں رہی ہو چھک
دیتی ہو بوسہ پیار سے ہر دم جھجک جھجک — ہر آن بیٹھتی ہو بغل میں سرک سرک
منہ پر نشوں کی سرخیاں، آنکھوں میں لالیاں
جب چاندنی کی دیکھیے راتیں اُجالیاں

نکھرا ہو چاند نور میں، ڈھلتی چلی ہو رات — پھولوں کی باس آتی ہو ہر دم ہوا کے سات
وہ نازنیں کہ چاند بھی ہوتا ہو جس سے مات — بیٹھی ہو سو بناؤ سے ڈالے گلے میں ہاتھ
گاتی ہو اور نشے میں بجاتی ہو تالیاں
جب چاندنی کی دیکھیے راتیں اُجالیاں

نظیر ہر چند دورِ مغلیہ کے عہدِ زوال کا شاعر تھا، لیکن چونکہ وہ قدرتاً رجائی (Optimistic) انسان تھا، اس لئے اس کی طبیعت رنگ رلیوں کی طرف زیادہ مائل تھی اور یہی سبب ہے کہ اس کی نظموں میں مناظر کی تصویر کشی کے ساتھ میلان جنسی (Saxual Appeal) ہر جگہ پایا جاتا ہے، جیسا کہ مندرجۂ بالا مسدس سے بھی ظاہر ہے۔

یہ ہم پہلے ظاہر کر چکے ہیں کہ نظیر کا مطالعۂ جزئیات نہایت وسیع تھا اور اس نے شاید کوئی بات ایسی نہیں

کبھی جو اس پر نہ گزری ہو اور اس کا ثبوت اس کے کلام سے بکثرت مل سکتا ہے۔ اسی نظم کو دیکھئے اور غور کیجئے کہ کیا وہ شخص جس نے خود اس منظر کو نہیں دیکھا، کبھی یہ کہہ سکتا ہے کہ

اور چاندنی کی جھلک سے وہ گورا سا اس کا تن
دکھلا رہا ہو کرتی و انگیا کی جالیاں

صحبتِ بادہ میں بھی اتنا ہوش کہ گورے بدن کی چھوٹ سے کُرتی اور انگیا کی جالیوں کو دیکھ لے اور اس کو نظم میں بھی لے آئے، بیک وقت رندی و شاعری کا اتنا عجیب و غریب امتزاج ہے کہ اس کی مثالیں دنیائے شعر میں خال خال کہیں نظر آتی ہیں۔

نظیر میں جدت و اختراع کا مادہ بھی بہت تھا، جس کی مثالیں اس کے کلام میں بہت ملسکتی ہیں۔ اس زمانہ میں مسلسل غزلیں کہنے کا رواج تھا، خاصکر ظفر اس کا بہت شایق تھا، لیکن صرف ایک محاورہ یا ضرب المثل کے لئے پوری غزل کہہ ڈالنا نظیر ہی کی جدت تھی۔ مثلاً دو غزلیں ملاحظہ ہوں:

گلہ لکھوں میں اگر تیرے غم کے جھیلوں کا — تو ہو نباہ نہ پچھلوں کا اور نہ پہلوں کا
سنے سے نام محبت کا تھر تھراتے ہیں — یہ کچھ تو حال ہے تیرے ستم کے دہلوں کا
کہا جو یار سے اک دن کہ دل یہ چاہے ہے — طریق جیسے ہے عشرت کے اہلے گہلوں کا
مکاں ہو ایک سنہرا، دھرے ہوں شیشہ و جام — بچھا ہو فرش بھی واں بادلہ رو پہلوں کا
کھلی ہو چاندنی، بکھرے ہوں ڈھیر پھولوں کے — پلنگ بھی ہو بہت نرم روئی کے پہلوں کا

یہ سن کے اس نے کہا یہ تو وہ مثل ہے نظیر
کہ سوویں جھونپڑے میں خواب دیکھیں محلوں کا

جہاں میں جو نہ ہوا اس پری کا دیوانہ — تو اس نے آہ مزہ عاشقی کا کیا جانا
کہا یہ شوخ نے تو ہم کو چاہتا ہے، نظیر — یہ پوچھا ہم نے بھلا تم نے کس طرح جانا
تو ہنس کے کہنے لگا اس طرح میں سمجھا ہوں — کہ تجھ کو پاس ہمارے ہے دمبدم آنا
جو ہم نہ ہوویں تو آ کر ہمارے کوچے میں — یہ غم سے بیٹھنا پہروں تلک نہ گھبرانا
جو ہم خفا ہوں تو آ کر ہزار منت سے — خوشی ہو چھیڑنا ہنس ہنس کے گالیاں کھانا
پس ایسی باتوں سے کیونکر نہ چاہ ثابت ہو — خدا کو دیکھا نہیں، عقل سے تو پہچانا

نظیر نے مستزاد بھی کہے ہیں، لیکن تھوڑی سی جدت کے ساتھ، بعض شعر ملاحظہ ہوں:۔

یہ مہر فزا رخ ـــ کرتا ہے نگاہوں کو ترا مطلعِ انوار
اب تیرے سوا رُخ ـــ کس کا ہے بتا نام خدا ایسا جھمکدار

فرقت کے الم سے ـــ دل تڑپے ہو اور آنکھیں کھلی رہتی ہیں دن رات
دیکھیں گے ترا رخ ـــ وہ کونسا دن ہوگا مبارک جو ہم اے یار

تضمینوں میں ان کی اپج دیکھئے:۔

رہوں کا ہیکو دلخستہ، پھروں کا ہیکو آوارہ   اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دلِ مارا
خدا اگر مجھ گدا کو سلطنت بخشے تو میں یارو   بخالِ ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

پوری غزل اسی ترکیب سے تضمین کی ہے۔

بعض غزلیں انھوں نے اُردو فارسی دونوں میں لکھی ہیں یعنی بعض شعر اُردو کے ہیں، بعض فارسی کے، اسی قسم کی ایک غزل کے آخری اشعار سنئے:۔

نظیر ایک دن اُس تند خو سے میں نے کہا   یہ فارسی میں کہ "اے مہ غدار، زہرہ جبیں"
چہ کردہ ام کہ نگاہے بہ حالِ من نہ کنی،   چہ گفتہ ام کہ نگوئی "دمے بیا بنشیں"
بجز جفا و تعدی نمیکنی برمن   نظرِ عتاب قریں داری و جبیں پُر چیں
دلم برائے ہمیں بردہ کہ ظلم کنی   شنید و گفت "بلے بردہ ام برائے ہمیں"

ایکبار انھوں نے اپنے پنجابی محبوب سے پنجابی بھی گفتگو کی تھی، ملاحظہ ہو:۔

کل نظیر اس نے یہ پوچھا بزبانِ پنجاب   "نیہہ وچ میڈی ہے کے حال تسا دا ہے، میاں"
(ہماری محبت میں تمہارے دل کا کیا حال ہے)
جوڑ ہتھ ہم نے کہا حال "اساڈے دل دا   تسی سب جاندی ہو جی اسے کے عرض کراں"
(ہمارے دل کا   تم سب جانتی ہو جی اسے کیا عرض کریں)

اس میں شک نہیں کہ نظیر، اپنی خصوصیات کے لحاظ سے، ہندوستان کا عجیب و غریب شاعر تھا، جس میں کبیر کے اخلاق اور خسرو کی ذہانت کا نہایت دلکش امتزاج پایا جاتا تھا اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اُردو شاعری میں تغزل سے ہٹکر سب سے پہلے اسی نے نظمیں لکھنے کی ابتدا کی اور سچ پوچھئے تو انتہا بھی کردی، لیکن افسوس ہے کہ وہ بہت قبل از وقت پیدا ہوا۔ وہ اس زمانہ کا شاعر تھا اور اسی زمانہ میں اسے ہونا چاہئے تھا۔

نیاز

نظیر اکبر آبادی

اور

اُردو شاعری میں واقعیت و جمہوریت کا آغاز

آج میں بچپن کی زندگی اور اس کے اُصول و عقاید پر غور کرتا ہوں تو صرف ایک نتیجہ پر پہونچتا ہوں اور وہ یہ کہ بچپن میں ہم جو کچھ ہوتے ہیں وہ ہماری اصلی فطرت ہوتی ہے جس پر زمانہ کی رفتار اور تہذیب و مدنیت کے بڑھتے ہوئے احساس کے ساتھ سیکڑوں ہزاروں پردے پڑتے جاتے ہیں یہاں تک کہ ہماری فطرت کچھ کی کچھ نظر آنے لگتی ہے۔ تہذیب و تربیت جہاں انسان میں طرح طرح کی لطافتیں اور نفاستیں پیدا کرتی ہے وہاں اس کو ریاکار اور حقیقت فراموش بھی بنادیتی ہے یہی وجہ ہے کہ بچپن جوانی اور بڑھاپا دونوں کے مقابلہ میں زندگی سے زیادہ قریب ہوتا ہے

ہم جب مڑکر اپنے اس دور پر نظر ڈالتے ہیں جس کو معصومیت اور بے شعوری کا دور کہتے ہیں اور اس وقت کے فیصلوں کا بعد کی عمر کے فیصلوں سے مقابلہ کرتے ہیں تو اکثر اسوقت کے فیصلے زیادہ سچے اور زیادہ ناقابل تردید معلوم ہوتے ہیں اسکا سبب یہ ہے کہ بچپن کے فیصلے اضطراری ہوتے ہیں

مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہے جبکہ نظیر اکبر آبادی کے نام سے میں پہلے پہل واقف ہوا۔ عمر وہ تھی جس کو صحیح معنوں میں بچپن کہنا چاہئے جبکہ آزادی اور خرمی انسان کا مذہب ہوتا ہے۔ مجھے ابتک اُردو نہیں پڑھائی گئی تھی۔ عربی اور فارسی پڑھ رہا تھا۔ فارسی زبان اور فارسی شاعری سے کافی واقفیت حاصل ہو چکی تھی اور اب فارسی زبان سے کوئی اجنبیت باقی نہیں تھی۔ عربی کے مدارج طے کرائے جارہے تھے۔ اب خیال ہوا کہ اُردو کے لئے زمین تیار ہو چکی ہے اور اب اُردو کتابوں کا بھی مطالعہ کراتے رہنا چاہئے۔ دو کتابیں منتخب کی گئیں۔ ”آرائش محفل“ یعنی قصۂ حاتم طائی اور کلیات نظیر اکبر آبادی

بچپن کے تصورات مادی دنیا سے ماخوذ ہوتے ہیں، وہ اپنے خیالات میں اپنے گرد و پیش کی دنیا سے زیادہ قریب ہوتے ہیں اور جو چیزیں انکے محسوسات و تجربات کی دنیا سے زیادہ قریب ہوتے ہیں۔ انھیں کی وہ زیادہ قدر کرتے ہیں۔ میں پڑھنے کو سعدی، عرفی، صائب سبھی کو تھوڑا تھوڑا درسی طور پر اور بہت کچھ اپنے شوق سے پڑھ چکا تھا، مگر سب کو حقیقتاً اپنے سے بیگانہ پا رہا تھا۔ سب ایسا معلوم ہوتا تھا زمین سے اوپر کہیں آسمان کے پاس سے باتیں کر رہے ہیں۔ ان میں جو شخص سب سے

زیادہ اپنے قریب سے بولتا ہوا معلوم ہوتا تھا وہ سعدی تھے وہ بھی "گلستاں" اور "بوستاں" والے سعدی۔ ان عالم بالا والوں کے بعد نظیر اکبرآبادی کی آواز سنی تو ایسا محسوس ہوا کہ کوئی بالکل اپنی بغل میں برابر کھڑا ہوا ہو اور اپنی زبان میں گفتگو کر رہا ہو۔

آپ سمجھئے "بنجارہ نامہ" اور "ہنس نامہ" دونوں تمثیلیں ہیں اس وقت بھی مجھے یہی بتایا اور ذہن نشین کرایا گیا تھا۔ اور بظاہر میں سمجھ بھی گیا تھا اگر سمجھنے کے صرف یہ معنی ہیں کہ بتائی ہوئی بات حافظہ میں محفوظ ہو گئی۔ لیکن درحقیقت میری سمجھ میں صرف ایک بات آئی تھی۔ وہ یہ کہ شاعر ایسی باتوں کا ذکر کر رہا ہے جو برابر میرے تجربے میں آتی رہتی ہیں اور جن سے میں اچھی طرح مانوس ہوں۔ میں دیہات میں پیدا ہوا اور دیہات ہی میں بچپن گزرا اور دیہات ہی میں ابتدائی تعلیم و تربیت پائی۔ مجھے نہ جانے کتنے فارسی اشعار زبانی یاد تھے لیکن میرے خیال میں ان کا مصرف صرف یہ تھا کہ ان کے معنی بتلائے جائیں یعنی ان کو اپنی زندگی کے اجزائے ترکیبی نہیں پاتا تھا

برخلاف اس کے جب میں یہ پڑھتا:۔

چنڈول اگن ابلقے جھپان بنے ڈھیر　　مینا و بئے کلکلے بگلے بھی سمنبر
طوطے بھی کئی طور کے ٹوٹیاں کوئی لہبر　　رہتے تھے بہت جانور اس پیڑ کے اوپر
اس نے بھی کسی شاخ پر گھر اپنا سنوارا

یا یہ پڑھتا:۔

گر تو ہے لکھی بنجارہ اور کھیپ بھی تیری بھاری ہے　　اے غافل تجھ سے بھی چترا اک اور بڑا بیوپاری ہے
کیا شکر مصری قند گری کیا سانبھر میٹھا کھاری ہے　　کیا داکھ منقا سونٹھ مرچ کیا کیسر لونگ سپاری ہے
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

تو ان سب چیزوں سے اپنے کو مانوس پاتا تھا۔ سب ایسی چیزیں تھیں جو روزانہ زندگی کی ترکیب میں داخل تھیں۔ جن پرندوں کے نام گنائے گئے تھے ان میں سے شاید ہی کوئی ایسا ہو جن کے انڈوں بچوں کی تلاش میں دیہات کے لڑکے صبح سے شام تک مارے مارے نہ پھرتے ہوں۔ بنجارے اور اسی قماش کے دوسرے خانہ بدوش لوگ آئے دن اپنے گاؤں سے گزرتے تھے اور اکثر گرد و پیش کے آم کے باغوں میں ڈیرے ڈال دیتے تھے۔ مزدوروں کو کھیپ لادتے ہر وقت دیکھتا تھا اور ہلکی اور بھاری کھیپ کا پورا اندازہ تھا۔ بیوپاری روز آیا کرتے تھے اور دیہی چیزیں گاؤں میں بیچ جاتے تھے۔ جن کی فہرست نظیر نے دی ہے۔ میں انکے اس "بڑے بیوپاری" کو بھی اسی قسم کا ایک بیوپاری سمجھتا تھا۔

غرض کہ نظیر پہلے شاعر تھے جن کو میں نے زمین پر کھڑے ہوئے زمین کی چیزوں کے متعلق باتیں کرتے ہوئے پایا اور پہلی مرتبہ میں نے یہ محسوس کیا کہ شاعری کا تعلق روئے زمین سے بھی ہے۔ یہ احساس کبھی میرے دل سے گیا نہیں۔ البتہ میر اور غالب، نظیری اور عرفی، ملٹن اور ورڈسورتھ کے پیدا کئے ہوئے اثرات میں ایک مدت تک کھویا ضرور رہا۔

آج جبکہ میں نظیر کی شاعری اور اس کی نوعیت پر دوبارہ غور کرنے بیٹھا ہوں تو لڑکپن کے وہ نقوش اور وہ احساسات عود کر آتے ہیں اور مجھے ان کے اندر ایسی صحت اور صداقت نظر آرہی ہے کہ اتنی مدت بعد بھی نہ تو میں انسے انکار کر سکتا ہوں اور نہ ان میں کوئی قابلِ لحاظ ترمیم یا اضافہ۔ نظیر اکبر آبادی کے متعلق میری اب بھی وہی رائے ہے جو اسوقت تھی۔ آج میں اپنے انھیں قدیم ارتسامات کو شرح و تفصیل کے ساتھ پیش کرنا چاہتا ہوں۔

اُردو شاعری میں نظیر اکبر آبادی کی حیثیت متعین کرنا آسان کام نہیں ہے۔ اس لئے کہ اب تک اہل نقد و نظر نے ان کی کوئی قابل لحاظ حیثیت تسلیم نہیں کی۔ نظیر کو پڑھتے سب تھے "الہی نامہ"۔ "برسات کی بہاریں" "بنجارہ نامہ"۔ "ہنس نامہ"۔ "تندرستی نامہ"۔ "ریچھ کا بچہ"۔ کے اشعار اکثروں کی زبانوں پر چڑھے رہے ہیں۔ لیکن جب ان کو کوئی مرتبہ دینے کا موقع آتا ہے تو سب اس طرح خاموش ہو جاتے ہیں یا زیر لب کچھ کہہ کے رہجاتے ہیں جیسے نظیر کا نام لینا آداب مجلس کے خلاف ہو۔ یعنی یہ تو سب محسوس کر رہے تھے کہ اُردو شاعری میں نظیر ایک نئی قوت اور ایک نیا امکان ہیں مگر کوئی اس کا اعتراف کرنا نہیں چاہتا۔ تذکرہ نگاروں نے ان کو اچھوت سمجھ کر ان سے پہلو بچایا ہے۔ وہ تذکرے گنتی کے ہیں جس میں نظیر کا بھی کوئی ذکر ہو اور ان میں بھی ان کے خلاف فیصلے ملیں گے۔ شیفتہ جو نظیر کے "حلم و خلق و انکسار" کا اعتراف کرتے ہیں۔ جب ان کی شاعری کا ذکر آتا ہے تو کہتے ہیں کہ "اس کے بہت سے اشعار ہیں جو سوقیوں کی زبان پر جاری ہیں اور ان اشعار پر نظر رکھتے ہوئے ان کو شعراء کی تعداد میں شمار نہ کرنا چاہیے"۔ (ترجمہ از "گلشن بیخار)

پُرانے تذکرہ نگاروں میں شیفتہ بڑے مبصر اور منصف مزاج واقع ہوئے تھے لیکن نظیر کے متعلق انھوں نے بھی وہی حکم لگایا جو ان کے پیشرؤوں نے لگایا تھا اور جو ان کے معاصرین لگا رہے تھے۔ شیفتہ کا اس میں کوئی قصور نہیں ہو اس کے کہ وہ مروجہ معیار شاعری اور مروجہ اُصول تنقید سے تھوڑی دیر کے لئے انحراف نہ کر سکے اور شیفتہ کو کیا کہیے!۔

آزاد سے لیکر اسوقت تک اُردو شاعری اور اُردو ادب کی جتنی معتبر اور قابل قدر تاریخیں لکھی گئی ہیں ان میں رام بابو سکسینہ کی "مختصر تاریخ ادب اُردو" کو چھوڑ کر کسی میں نظیر کا تذکرہ نہیں ملے گا۔ مخمور صاحب (مؤلف "روح نظیر") اپنی کتاب کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:۔ "مولانا محمد حسین آزاد صاحب تذکرہ آبحیات کی وسیع جستجو سے نظیر کے پوشیدہ رہنے کے دو معنے ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ آزاد نظیر کو شاعر نہ سمجھتے تھے۔ دوسرا یہ کہ ان سے سہو ہوا۔ آزاد کی جوہر شناس نگاہ کے متعلق یہ شبہ کرنا کہ وہ نظیر کے قائل نہ تھے ہم بہتان سمجھتے ہیں۔ پس یہ خیال تو ایک منٹ کے لئے بھی قایم نہیں رکھا جا سکتا۔ البتہ دوسری وجہ زیادہ قرین قیاس ہے"۔

ہم اس کو آزاد کے ساتھ مخمور صاحب کا بڑھا ہوا حسن ظن سمجھتے ہیں۔ اگر ہم مان بھی لیں کہ آزاد کی نظر اتنی ہی جوہر شناس تھی جتنی کہ مخمور صاحب سمجھتے ہیں تو آزاد کو نظیر میں کوئی جوہر نظر نہیں آسکتا تھا۔ وہ اسی کو شاعری کا جوہر سمجھتے تھے جس کو

نسلاً بعد نسل لوگ شاعری کا جوہر مانتے آئے تھے۔ مخمور صاحب کا یہ خیال بہت صحیح ہے کہ "گزشتہ زمانہ میں مذاق سخن اس درجہ مصنوعی اور غیر فطری ہوگیا تھا کہ فطرت شناسوں کے لئے کوئی جگہ باقی نہ رہی تھی"۔ یہ مصنوعی معیار اور غیر فطری اسلوب اردو شاعری کے راستہ میں آج تک زحمتیں پیدا کر رہا ہے اور اس کو فطرت شناس نہیں ہونے دیتا۔

نظیر کی طرف اب لوگوں کی توجہ جا رہی ہے اور اب یہ آواز سننے میں آنے لگی ہے کہ نظیر تنہا اپنی ذات سے ایک دبستان اور بجائے خود ایک جماعت تھے لیکن اس قسم کی گول گول باتوں سے کام نہیں چلتا۔ یہ تو پہلی اور سطحی نظر میں ہر شخص کو معلوم ہو جاتا ہے کہ نظیر اردو شاعروں کے عام جھنڈ سے الگ ہیں۔ انھوں نے اردو شاعری میں اجتہاد کیا اور ایسا اجتہاد جس کو روایات سے دور کا بھی کوئی تعلق نہیں۔ یہ سب جانتے ہیں کہ نظیر اپنے رنگ کے تنہا شاعر تھے۔ لیکن اس کے در پردہ یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ بدراہ تھے اور اکثر نقادوں کا دبا ہوا اشارہ بھی یہی ہے۔ ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ نظیر کے اجتہاد کا راز اور اس کی اہمیت کیا ہے۔

نظیر سے جن لوگوں نے بحث بھی کی ہے انھوں نے ان کی زندگی اور ان کی شاعری کے اخلاقی اور تمثیلی پہلو پر ضرورت سے زیادہ زور دیا ہے اور اس سے آگے یا تو کچھ کہہ سکے ہی نہیں ہیں یا کہنے کی ہمت نہیں پڑی ہے۔ مگر اردو کا ہر شاعر کم و بیش یہی رہا ہے۔ تمثیل و کنایہ اردو شاعری کی گویا گھٹی میں پڑے ہیں اور مضامین کے اعتبار سے عشق، تصوف اور اخلاق انھیں تین چیزوں کا ہماری شاعری میں غلبہ رہا ہے۔ لہٰذا اس کو نظیر کا طرۂ امتیاز نہیں کہا جا سکتا۔ اگر محض یہی ہوتا تو آج اردو شاعروں کی محفل میں نظیر اس قدر بیگانہ نظر نہ آتے اور اردو شعرا انکے ساتھ ایسی سرد مہری کا برتاؤ نہ کرتے۔

حقیقت یہ ہے کہ نظیر نے اردو شاعری میں اس بغاوت اور انقلاب کی بنیاد ڈالی جس سے ہمارے شاعر و ادیب آج تک موانست اور مساوات نہیں پیدا کر سکے ہیں۔ اردو شاعری نے اپنے تمام اکتسابات اور کمالات کے باوجود زندگی کی وہ نمایندگی نہیں کی جو اس کو کرنا چاہئے تھا۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ اس نے اپنے تصورات و مفروضات اپنے روایات و صور اپنے اصول و اسالیب۔ غرضکہ تمام معیار اور تمام تخئیل ایران سے لئے اور فارسی شاعری سے اپنا دستور مرتب کیا۔ اس لئے کہ اہل حکومت کی مادری زبان فارسی تھی اور درباروں میں فارسی کی آؤ بھگت تھی۔ نتیجہ جو ہونا چاہئے ظاہر ہے۔ اردو شاعری میں ہم کو اپنے ملک کا سارا جغرافیہ۔ ساری تواریخ سارے روایات و اساطیر بدلے ہوئے نظر آنے لگے۔ ہمالیہ اور بندھیاچل کی جگہ الوند و بیستون کھڑے ہو گئے۔ گنگا جمنا کی جگہ جیحون و سیحون موجیں مارنے لگے۔ نل اور دمینتی کو فرہاد اور شیریں نے معزول کر دیا۔ ہیر اور رانجھا کو قیس و لیلیٰ نے گدی سے اُتار دیا۔

ہماری شاعری نے اپنے ملک و معاشرت سے نہ مواد لئے نہ اسالیب اور ایک دور از خیال اور موہوم زندگی کو اپنا ماخذ رکھا۔ اور اسی کو اپنا موضوع بنایا۔ دوسرا سبب اردو شاعری کی زندگی سے بے تعلق اور بیگانہ رہ جانے کا یہ ہوا

کہ اس کی جو صنف بادشاہوں اور درویشوں کی سرپرستی اور اثر میں سب سے زیادہ رائج اور مقبول ہوئی وہ غزل ہے جس میں ہر شعر میں ایک مضمون کو مکمل کرنا پڑتا ہے ایسی شاعری زندگی کے تمام حالات، واقعات اور تمام معاملات و مسائل سے عہدہ برا نہیں ہو سکتی۔ غزل بھی انسانی زندگی کی ایک ضرورت ہے لیکن وہ ہر ضرورت پر حاوی نہیں ہو سکتی۔ غزل کی ہیئت پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اس کا کام ان کیفیات و مشاہدات کو اشاروں میں بیان کرنا ہے جو کسی طرح شرح و تفصیل کی متحمل نہ ہو سکیں۔ لیکن انسان کی زندگی میں روز بروز وسعت اور پیچیدگی بڑھتی گئی ہے اور ہم کو نظم اور نثر دونوں میں ایسے اصناف کی ضرورت رہی ہے جو ہماری خارجی اور باطنی زندگی کا پورا پورا حق ادا کر سکیں۔

نظیر کو اردو شاعری کی کوتاہیوں کا احساس اسوقت ہوا جبکہ ان کے آگے پیچھے کی دنیا میں کسی کو بھی انکا احساس نہیں ہو سکتا تھا۔ نظیر پڑھے لکھے آدمی تھے۔ ان کی فارسی کی قابلیت اچھی خاصی تھی۔ عربی سے بھی ناواقف نہیں تھے انھوں نے عمر بھر معلمی میں بسر کی۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ ضرور مروجہ نصاب کے مطابق پڑھے لکھے ہوں گے۔ کم سے کم اتنی عربی، فارسی تو جانتے ہی ہوں گے کہ اگر چاہتے تو میر یا سودا۔ انشا یا مصحفی، آتش یا ناسخ کے رنگ شاعری کو اختیار کر سکتے تھے۔ پھر ان کے کلام سے بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ فارسی زبان اور فارسی شاعری سے کافی واقف اور مانوس تھے۔ لیکن انھوں نے بالقصد دلی اور لکھنؤ دونوں دبستانوں سے بالکل الگ اپنا ایک رنگ نکالا۔ اس لئے کہ وہ دیکھ رہے تھے کہ مروجہ اردو شاعری کو نہ ملکی رسوم و روایات سے کوئی تعلق ہے اور نہ عوام کی زندگی سے اور وہ مقدس الہامی کتابوں کی آیات کی طرح ہمیشہ ایک چیدہ اور برگزیدہ لوگوں کے حلقہ کی چیز بنی رہے گی۔

عوام زیادہ سے زیادہ اس کو صحف سماوی کے قسم کی چیز سمجھ کر اس سے مرعوب رہیں گے لیکن اس سے کوئی اثر قبول نہیں کر سکتے۔ اس احساس کے ماتحت انھوں نے ایسی شاعری کی بنیاد ڈالی جو اپنے ملک کی پیداوار معلوم ہو جس سے کثیر سے کثیر تعداد میل اور یگانگت محسوس کرے جو عوام کی روزمرہ زندگی کی نمایندگی کرے اور جس میں یہ صلاحیت ہو کہ عوام کی زندگی کی ترکیب میں داخل ہو کر اس کی تہذیب و ترقی میں مددگار ثابت ہو سکے۔

نظیر کے کلام کے مطالعہ سے پڑھنے والے پر جو مجموعی اثر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ شخص اردو شاعری میں واقعیت اور جمہوریت کی بنیاد ڈالنے کی پہلی کوشش کر رہا ہے۔

یہ بڑی بات تھی کہ نظیر کسی کے شاگرد نہ تھے۔ کم سے کم اس کا پتہ نہیں چلتا۔ شاعری کا ملکہ ان کے اندر فطرتاً موجود تھا اور انھوں نے صرف فطرت اور حقیقت کو اپنا استاد بنایا۔

اگر یہ کہا جائے کہ نظیر اکبرآبادی اپنے رنگ کے موجد تھے جو انھیں پر ختم ہو گیا تو یہ کوئی تنقیدی بات نہ ہوگی۔ اسلئے کہ اکثر بڑے شاعر اپنے رنگ کے موجد ہی ہوتے ہیں۔ غالب اپنے رنگ کے موجد تھے اور خود ہی اس کے خاتم بھی ہوئے۔ جرأت بھی اپنے رنگ کے موجد تھے۔ اس لئے نظیر کے متعلق صرف یہ کہنا کہ وہ اپنے رنگ کے موجد تھے کافی

نہیں ۔ وہ صرف اپنے رنگ کے موجد ہی نہیں تھے بلکہ اور رنگوں کے منکر بھی تھے ۔ انھوں نے سارے مروجہ اسالیب و صور ہی سے انحراف کیا ۔

سب سے پہلی بات جو پہلی ہی نظر میں معلوم ہو جاتی ہے وہ یہ ہے کہ اگر قصاید اور مثنویات کو نظم میں شمار نہ کیو اور نظم کی اصطلاح کو جدید معنوں میں استعمال کیا جائے تو نظیر اُردو کے پہلے نظم نگار ہیں ۔ لکھنے کے لئے انھوں نے غز بھی لکھی ہیں اس لئے کہ غزل کا ہر طرف زور تھا اور کوئی شاعر اسوقت تک شاعر تسلیم نہیں کیا جا سکتا تھا جب تک کہ وہ کو غزل کا مرد میدان نہ ثابت کرے ۔ لیکن اول تو غزل نظیر کا کارنامہ نہیں ہے ۔ وہ اپنی نظموں کے بل پر زندہ رہے ا زندہ رہیں گے ۔ دوسرے باوجود اس کے کہ غزل میں اجتہاد اور مروجہ رسوم و روایات سے انحراف کی سب سے کم گنجایش ہے نظیر نے حتی الامکان اپنے لب و لہجہ اور انداز بیان سے اس کی کوشش کی ہے کہ وہ زمین کے قریب ہی رہیں اور ان کی باتیں آسمانی باتیں نہ ہونے پائیں ۔ مثال کے طور پر چند شعر سنئے :-

پیش جاتی نہیں ہرگز کوئی تدبیر نظیر
کام جب آن کے پڑتا ہے زبردستوں سے

پہنا وہ خوش لباس بسنتی دکھا نظیر
چمکایا حسن یار نے کیا کیا بسنت کا

جو دل تھا وصل میں آباد تیرے ہجر میں آہ
بنی ہے شکل اب اسکی اجاڑ بن کی سی

ہزار تن کے چلیں بانکے خوبرو لیکن
کسی میں آن نہیں تیرے بانکپن کی سی

وہ دیکھ شیخ کو لاحول پڑھ کے کہتا ہے
یہ آئے دیکھئے داڑھی لگاکے سن کی سی

کہاں تو اور کہاں اس پری کا وصل نظیر
میاں تو چھوڑ یہ باتیں دیوانہ پن کی سی

دیکھ کر کرتی گلے میں سبز دھانی آپ کی
دھان کے بھی کھیت نے اب آن مانی آپکی

یا وہ غزل جس میں نظیر نے اپنے "یار" کو بسنت کی خوش خبری سنائی ہے اور جس کا مطلع یہ ہے :-

ملکر صنم سے اپنے ہنگام دلکشائی
ہنس کر کہا یہ ہم نے اے جاں بسنت آئی

نظیر اکبرآبادی خیالات کے شاعر نہیں ہیں بلکہ واقعات کے شاعر ہیں ۔ وہ جانتے تھے کہ خیالات انسان کو بہکا کر دنیائے آب و گل سے دور لیجاتے ہیں اور اس کے اندر انسانی ہمدردی باقی رہنے نہیں دیتے ۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر اُن کے اندر یہ احساس کام کر رہا تھا کہ انسان کا سب سے بڑا انسانی جرم وہ ہے جو وہ بلند خیالی اور بلند معیاری کے پردے میں کرتا ہے ۔ خود اپنے خیالات کو اتنا بلند کر لینا اور اپنے مذاق کو اس طرح رچ لینا کہ آپ ساری خلقت انسانی سے الگ ایک مخلوق ہو جائیں اور عوام الناس آپ کو ادنےٰ اور حقیر نظر آنے لگیں کوئی بہت بڑا اکتساب نہیں ہے ۔

نظیر کے کلام کو پڑھنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک خوش دل اور شگفتہ مزاج رفیق ملگیا ہے جس کو

انسان اور انسانی دنیا سے محبت ہے۔ جو انسان کی بے قدری نہیں کرتا۔ جو انسانی زندگی کی کم مائگی کا احساس پیدا کرکے دلوں کو افسردہ نہیں کرتا۔ جو اپنی رفاقت سے ہمارے اندر ایک تقویت پیدا کرتا ہے اور ہم کو یہ اطمینان دلاتا ہے کہ زندگی صرف دکھ درد کا نام نہیں ہے۔ ہنسی، خوشی بھی زندگی ہی کی باتیں ہیں۔ یہاں کانٹے بھی ہیں پھول بھی ہیں۔ کانٹوں کو نظر میں رکھو۔ پھولوں سے دل خوش کرو۔

نظیر ہندوستان کے شاعر تھے اور ہندوستان کی جمہوری زندگی کو انھوں نے اپنی شاعری کا موضوع بنایا اور اسالیب اور لب و لہجہ کو عوام سے ہم سطح رکھا یہاں تک کہ ان کی شاعری کو عامیانہ اور بازاری سمجھا جانے لگا لیکن ان کا نفس جمہور کا نفس اور ان کا ضمیر سماجی ضمیر تھا جس کو ایسے اعتراضات کی پروا نہیں تھی۔ انھوں نے کہیں کھلے الفاظ میں کہا نہیں ہے مگر ان کا انداز بتاتا ہے کہ وہ شاعری کو جمہوری زندگی کا آئینہ سمجھتے تھے۔ شاعر کو کوئی حق نہیں کہ وہ خلق اللہ کی زندگی سے بیگانگی برتے اور اپنے کو ان سے علحدہ اور برگزیدہ سمجھے اور حقیقت یہ ہے کہ جو شاعر اپنے کو ایک مخصوص اور برگزیدہ حلقہ یا طبقہ کی چیز سمجھتا ہے اور عوام کی زندگی کو قابل اعتنا نہیں سمجھتا وہ معاشرت اور سماج کا مجرم ہے۔

نظیر خالص ہندوستانی شاعر تھے۔ ہندوستان کی زندگی اور ہندوستان کے رسوم و روایات ان کی شاعری کے لازمی عناصر ہیں۔ وہ اپنے گرد و پیش کی زندگی کے عام سے عام واقعات کے ساتھ سچی مؤانست رکھتے ہیں اور انھیں سے اپنی شاعری کے لئے مواد حاصل کرتے ہیں۔ نظیر اُردو کے پہلے شاعر ہیں جن کا کلام پڑھ کر ہندوستان کے حالات کی عام معاشرت اور یہاں کے رسم و رواج کے متعلق معلومات حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر "برسات کی بہاریں" دیکھئے :-

مارے ہیں موج ڈابر دریا ڈونڈ رہے ہیں | مور و پپیہے کوئل کیا کیا ڈمنڈ رہے ہیں
جھڑ کر رہی ہیں ندیاں نالے اُمنڈ رہے ہیں | برسے ہے مینہ جھڑا جھڑ بادل گھمنڈ رہے ہیں

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

بادل لگا ٹکوریں نوبت کی گت لگادیں | جھینگر جھنگار اپنی سرنائیاں بجادیں
کر شور مور بگلے جھڑیوں کا مینہ بلادیں | پی پی کریں پپیہے مینڈک ملار گادیں

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کتنوں کو محلوں اندر ہے عیش کا نظارا | یا سائبان ستھرا یا بانس کا اُسارا
کرتا ہے سیر کوئی کوٹھے کا لے سہارا | مفلس بھی کر رہا ہے پولے تلے گزارا

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

سبزوں پہ بہر بہتی ٹیلوں اوپر دھتورے ۔۔۔ پسو سے مچھروں سے روئے کوئی بسورے
بچھو کسو کو کاٹے کیڑا کسی کو گھورے ۔۔۔ آنگن میں کنسلائی کونوں میں کنکھجورے
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

آپ نے دیکھا! اردو شاعری ابتک اس زبان اور اس انداز سے ناآشنا تھی۔ اگر شعراء برسات کا نقشہ کبھی کھینچتے بھی تھے تو وہ نہ جانے کس خطہ کی برسات ہوتی تھی۔

نظیر کوشش کے ساتھ یہ زبان اور یہ اسلوب استعمال کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ وہ نہ صرف یہ چاہتے تھے کہ ان کی شاعری موضوع اور زبان دونوں کے اعتبار سے عوام کی زندگی اور ان کے جذبات و خیالات سے قریب سے قریب ہو بلکہ جہاں تک ہو سکے خواص کی دنیا سے دور اور ان کے لئے غیر مانوس ہو۔ اس لحاظ سے نظیر اور ہندی کے مشہور کوی کبیر داس میں خاصی مناسبت نظر آتی ہے۔

کبیر داس کی بھی یہی کوشش ہوتی ہے کہ ان کی زبان وہ ہو جس کو عوام کی زبان کہہ سکیں اور جس کو خواص کی مہذب اور مصنوعی زبان سے کوئی واسطہ نہ ہو۔ کبیر اور نظیر دونوں کی زندگی اور دونوں کی شاعری اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ وہ خواص سے بری طرح چڑھے ہوئے تھے۔ اس لئے کہ خواص اپنے کو خدا کی خاص مخلوق سمجھتے ہیں اور عوام کو ادنیٰ اور ذلیل مخلوق سمجھ کر نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور پھر یہ بھی نہیں کہ ان کو قابل نفرت قرار دیکر ان سے بے تعلق ہو جائیں۔ نہیں بلکہ ان کے حقوق کو غصب کرنے کے لئے اور ان سے خدمتیں لینے کے لئے ان کی گردنوں پر تسمہ پا کی طرح سوار بھی رہتے ہیں۔ کبیر اور نظیر دونوں صحیح معنوں میں جمہوری شاعر تھے۔ فرق یہ ہے کہ کبیر کے خلوص اور ان کی بڑھی ہوئی انسانیت پر ان کی وہ جھلاہٹ غالب آگئی تھی جو ان کو اپنے ماحول اور اپنے زمانہ کے سماجی نظام سے تھی اور ان کے اندر کلبیت (Cynic movement) کا بھی ایک میلان پیدا ہو گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود اس کے کہ ان کی زبان عوام کی زبان ہوتی ہے ان کے خیالات ایسے انوکھا پیرایہ لئے ہوتے ہیں کہ عوام اور خواص دونوں ان کو سمجھنے سے قاصر رہ جاتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر انتہائی ضد میں نہیں چاہتا کہ کوئی اس کی بات کو سمجھے۔

نظیر فطرتاً خوش مزاج تھے۔ یہی خوش مزاجی ان کی زندگی اور ان کی شاعری کا سب سے بڑا جوہر ہے۔ افسردگی اور اضمحلال یا خفگی اور جھلاہٹ کو ان کی طبیعت سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ وہ انسان کو فطرتاً ایک اچھی مخلوق اور اس کی زندگی کو اصلیت کے اعتبار سے ایک اچھی زندگی سمجھتے تھے اور اس میں جتنی خرابیاں ہیں ان کو خارجی اور عارضی خیال کرتے تھے جو اس قابل نہیں کہ ان پر اپنی توجہ ضایع کی جائے۔ دنیا کے شاعروں نے بالعموم اور اردو اور فارسی شاعروں نے بالخصوص انسانی زندگی کی بنیادی خرابیوں پر اس قدر زور دیا ہے کہ اب وہ اوج ثریا تک ہم کو خراب نظر آنے لگی ہے۔

نظیر کا سارا کلام پڑھ جایئے آپ کو کبھی یہ احساس نہیں ہوگا کہ ہماری زندگی کوئی خراب چیز ہے۔ ان کے کلام میں جا بجا سوز و گداز اور دردمندی بھی موجود ہے بالکل اسی طرح جس طرح واقعی زندگی میں بھی یہ عناصر جا بجا موجود ہوتے ہیں مثلاً "جوگی نامہ" اور "جوگن نامہ" یا وہ مسلسل غزل پڑھئے جس کے دو شعر مطلع اور مقطع یہ ہیں:-

یہ جواہر خانۂ دنیا جو ہے با آب و تاب ۔۔۔ اہل صورت کا ہے دریا اہل معنے کا سراب
خواب کہئے اس تماشے کو نظیر اب یا خیال ۔۔۔ کچھ کہا جاتا نہیں واللہ اعلم بالصواب

تو ان سے ہمارے دلوں میں سوز و گداز اور دردمندی کی ایک اٹھی اور لطیف کیفیت تو ضرور پیدا ہوتی ہے لیکن ہم افسردہ اور زندگی سے دل برداشتہ نہیں ہوتے۔ جو نظمیں خالص اخلاقی مقصد سے لکھی گئی ہیں ان کو پڑھ کر بھی ہمارا دل دنیا سے سرد نہیں ہوتا اور ہم تیاگ ویراگ کی طرف نہیں مائل ہوتے۔ "بنجارہ نامہ"، "ہنس نامہ"، "فنا نامہ" پڑھ کر ہم اپنے اندر بس ایک آگاہی پانے لگتے ہیں، جیسے کسی نے سوتے سوتے چونکا دیا ہو اور ہم ہوشیار ہو گئے ہوں۔ "کلجگ" جیسے عنوان پر بھی نظیر جب لکھتے ہیں تو اس سے ہمارے اندر ہوشیاری کے ساتھ ساتھ زندگی کی ایک نئی لہر پیدا ہوتی ہے۔ جس کو دنیا کلجگ کہتی ہے نظیر اس کو "کرجگ" بتاتے ہیں اور ہم کو سمجھاتے ہیں:-

جو چاہے لے چل اس گھڑی سب جنس یاں تیار ہے ۔۔۔ آرام میں آرام ہے آزار میں آزار ہے
دنیا نہ جان اس کو میاں دریا کی یہ منجدھار ہے ۔۔۔ اوروں کا بیڑا پار کر تیرا بھی بیڑا پار ہے

کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے

اپنے نفع کے واسطے مت اور کا نقصان کر ۔۔۔ تیرا بھی نقصاں ہوئے گا اس بات پر تو دھیان کر
کھانا جو کھا تو دیکھ کر پانی پیئے تو چھان کر ۔۔۔ یاں پاؤں کو رکھ پھونک کر اور خوف سے گزران کر

کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے

دیکھا آپ نے! اچھا خاصہ معاشرتی عہد نامہ ہے۔ روسو نے اپنے "معاشرتی معاہدہ" میں اس سے زیادہ کیا کہا ہے؟ اور اصطلاحی جزئیات سے قطع نظر کر لیجئے تو آج اشتراکیت اور جمہوریت اس سے زیادہ کیا چاہتی ہے؟ پرنس کروپاٹکن نے اپنی مشہور کتاب "امداد باہمی" (Mutual aid) میں اور کیا بتایا ہے؟ "زندہ رہو اور زندہ رہنے دو" کا جو نعرہ اس وقت بلند ہو رہا ہے وہی نظیر کے کلجگ کا بھی پیغام ہے کہ زندہ رہو اور زندہ رہنے دو۔ اور سب کو زندہ دیکھ کر خوش ہو۔ اردو میں نظیر پہلے شاعر ہیں جن کی شاعری انسانیت کی آواز معلوم ہوتی ہے اور جو انسانیت کی فطری اور اصلی قدر سے ہم کو آگاہ کرتی ہے

نظیر کی شاعری میں شروع سے آخر تک وہ عنصر چھپا ہوا ہے جس کو "روح عصر" کو (Zeik geist) کہتے ہیں اور جدید اُصول تنقید کی رو سے جس کے بغیر ادب صحیح معنوں میں ادب نہیں ہوتا ہے۔ اُردو شاعری میں یہ عنصر کم نہیں بلکہ سرے سے مفقود تھا۔ کسی شاعر کو اپنے ماحول اور زمانہ سے کوئی سروکار نہیں رہا۔ اُردو کا کوئی شاعر ایسا نہیں جس کا کلام پڑھکر ہم اس کے زمانے کی معاشرت اور سماجی حالات کا کوئی اندازہ کر سکیں۔ ہاں اگر شاعر قصیدہ گو ہوا تو زیادہ سے زیادہ ہم یہ بتا سکتے ہیں کہ وہ کس بادشاہ کے زمانہ میں تھا یا کس امیر کے دربار سے توسل رکھتا تھا۔ برخلاف اس کے نظیر کا کلام اپنے وقت اور اپنے ماحول کا آئینہ ہے واقعات و حالات اور رسوم و روایات کی جیسی زندگی سے معمور تصویریں نظیر نے ہم کو دی ہیں وہ اُردو شاعری کے حصہ کی چیزیں نہیں تھیں۔ ایسی مرقع نگاری میر حسن اور میر انیس کے بھی بس کی بات نہیں تھی۔ ایسے مرقعے تو کچھ انگریزی شاعری کے مورث اعلیٰ چاسر ہی کے وہاں نظر آتے ہیں۔ یہ محاکاتی قدرت کچھ چاسر ہی کو نصیب ہوئی تھی۔ فرق یہ ہے کہ چاسر نے ہر طبقہ اور ہر جماعت کی زندگی کی تصویریں اُتاری ہیں۔ نظیر نے اس کا کوئی اہتمام نہیں رکھا اور جمہور کی روزمرہ زندگی سے واسطہ رکھا۔ وہ اسی کو زندگی سمجھتے تھے جو کثیر سے کثیر تعداد اور وسیع سے وسیع دائرہ پر احاطہ کرے۔ اگر اولیت کے اعتبار سے ولی کو اُردو شاعری کا چاسر کہنا چاہئے تو فنی مماثلت کے اعتبار سے نظیر اُردو شاعری کے چاسر ہیں۔ نظیر جس چیز یا جس واقعہ کو بیان کرتے ہیں اس کی ہو بہو تصویر اُتار کر رکھ دیتے ہیں جیسے اصل کا ایک مثناہ تیار کر دیا ہو۔ " آگرہ کی تیراکی " کا جو نقشہ نظیر نے کھینچا ہے اسکا لطف اسوقت بھی خونچے والوں سے لیکر شہر کے رئیسوں تک ہر وہ شخص اُٹھا سکتا ہے جو ایک گزرے ہوئے زمانہ اور ایک اُٹھی ہوئی رسم کو ابھی الکدم نہ بھول گیا ہو۔ چند بند ملاحظہ ہوں :-

چھتری سے برج خونی دارا کا چونترا کیا — جھرنے سے لیکے یارو سجا کا تا پیالہ
غل شور کی بہاریں انبوہ سیر چرچا — مہتاب باغ، سید تیلی قلعہ و روضہ

ہر اک مکاں میں ہو کر ہشیار پیرتے ہیں
اس آگرہ میں کیا کیا اے یار پیرتے ہیں

ان میں جگہ جگہ پر مجلس ہے انجمن ہے — باغ حکیم اور جو شیو داس کا چمن ہے
کچھ پیرنے کی دھو میں کچھ عیش کا چلن ہے — میوہ، مٹھائی کھاتے اور ناچ دل لگن ہے

ہر اک مکاں میں ہو کر ہشیار پیرتے ہیں
اس آگرہ میں کیا کیا اے یار پیرتے ہیں

ہر جا کھڑی و چادر بند اور ناند چکوا — برسات میں جو آکر چڑھتا ہے خوب دریا
منڈا گھمیر تختہ کتے پچھاڑ کترا — مینڈا، بھنورا چھالن چکر سمیٹ مالا

واں بھی ہنر سے اپنے ہشیار پیرتے ہیں
اس آگرہ میں کیا کیا اے یار پیرتے ہیں

تربینی میں اہاہا ہوتی ہیں کیا بہاریں خلقت کے ٹھٹھ ہزاروں پیراک کی قطاریں
پیریں نہاویں، اُچھلیں، کودیں لڑیں پکاریں لیتے وہ چھینٹ غوطے کھا کھا کے ہاتھ ماریں
کیا کیا تماشے کر کر اظہار پیرتے ہیں
اس آگرہ میں کیا کیا اے یار پیرتے ہیں

جاتے ہیں ان میں کتنے پانی پہ صاف سوتے کتنوں کے ہاتھ پنجرے کتنوں کے سر پہ طوطے
کتنے پتنگ اُڑاتے کتنے سوئی پروتے حقوں کا دم لگاتے ہنس ہنس کے شاد ہوتے
سو سو طرح کا کر کر بستار پیرتے ہیں
اس آگرہ میں کیا کیا اے یار پیرتے ہیں

کچھ ناچ کی بہاریں پانی کے کچھ لتاڑے دریا میں مچ رہے ہیں اندر کے سو اکھاڑے
لبریز گلرخوں سے دونوں طرف کرارے بجرے، ناؤ، چپو، ڈونگی بنے نواڑے
ان جمگھٹوں سے ہو کر سرشار پیرتے ہیں
اس آگرہ میں کیا کیا اے یار پیرتے ہیں

سچ تو یہ ہے کہ یہ واقعہ نگاری چاسر کے بوتہ کی بھی بات نہیں تھی چاسر اتنی وسیع واقفیت اور اس قدر متنوع معلومات کہاں سے لاتا؟ نظیر کی زندگی ہی ایسی گزری کہ ان کے تجربات اور معلومات کا اس قدر وسیع اور ہمہ گیر ہونا لازمی تھا۔

نظیر نے اپنا دائرہ موضوع کسی خاص طبقہ یا کسی خاص فرقہ کی زندگی تک محدود نہیں رکھا۔ انھوں نے اپنی زندگی میں مذہب اور مشرب کو کوئی اہمیت دی نہ شاعری میں۔ سب جانتے ہیں کہ ان کی زندگی کے بیشتر اوقات ہندوؤں میں گزرے۔ اس کے اور اسباب جو کچھ بھی ہوں مگر ایک اہم سبب یہ ضرور تھا کہ نظیر جمہوریت پرست تھے اور ان کو احساس ہو رہا تھا کہ یہ مذہبی امتیازات بھی سماجی مدارج کی طرح خواص کے پھیلائے ہوئے فساد ہیں۔ نظیر نے ہندوؤں کے رسوم و روایات کی طرف زیادہ توجہ رکھی اس لئے کہ وہ دیکھ رہے تھے ہندوستان کی معاشرت کے غالب عناصر یہی ہیں۔ نظیر نے یوں تو حمد، نعت، معجزہ حضرت علی اور معجزہ حضرت عباس سبھی پر نظمیں لکھی ہیں لیکن ہم جانتے ہیں کہ یہ سب محض برائے بیت ہیں اور ان میں وہ جان نہیں ہے جو «کنھیا جی کے جنم»، «بانسری»، «ہر کی تعریف»، «مہادیو جی» کے ایک ایک لفظ میں موجود ہے۔ نظیر کا قلم انھیں چیزوں میں جان پیدا کر سکتا تھا جن سے ان کے ملک کی عام زندگی میں

جان تھی۔ آپ ساری کلیات نظیر پڑھ جایئے۔ صرف ایک نظم "عیدالفطر کے بیان میں" ملے گی اور اس میں بھی وہ زور، وہ کیفیت اور وہ بیساختگی نہیں ہے جو "دیوالی"، "ہولی"، "بلدیوجی کا میلہ" میں ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔ ایک جگہ ہولی کے بیان میں یہ لکھتے ہیں:۔

ہو ناچ رنگیلی پریوں کا بیٹھے ہوں گلرو رنگ بھرے
کچھ بھیگی تانیں ہولی کی کچھ ناز و ادا کے ڈھنگ بھرے
دل بھولے دیکھ بہاروں کو اور کانوں میں آہنگ بھرے
کچھ طبلے کھڑکیں رنگ بھرے کچھ عیش کے دم منھ چنگ بھرے
کچھ گھنگھرو تال جھنکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی

اس رنگ رنگیلی مجلس میں وہ رنڈی ناچنے والی ہو
منھ جس کا چاند کا ٹکڑا ہو اور آنکھ بھی مے کی پیالی ہو
بدمست بڑی متوالی ہو ہر آن بجاتی تالی ہو
مے نوشی ہو بیہوشی ہو بھڑوے کے منھ میں گالی ہو
بھڑوے بھی بھڑوا بکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی

اسی ہولی کا ایک دوسری جگہ یوں نقشہ کھینچتے ہیں:۔

یا سوانگ کہوں یا رنگ کہوں یا حسن بتاؤں ہولی کا
سب ابرن تن پر جھمک رہا اور کیسر کا ماتھے ٹیکا
ہنس دینا ہر دم ناز بھرا دکھلانا سج دھج شوخی کا
ہر گالی مصری قند بھری ہر ایک قدم اٹھکھیلی کا
دل شاد کیا اور موہ لیا یہ جوبن پایا ہولی نے

ہر جاگہ تھال گلالوں سے خوش رنگت کی گلکاری ہے
اور ڈھیر عبیروں کے لاگے سو عشرت کی تیاری ہے
ہیں راگ بہاریں دکھلاتے اور رنگ بھری پچکاری ہو
منھ سرخی سے گلنار ہوئے تن کیسر کی سی کیاری ہے
یہ روپ جھمکتا دکھلایا یہ رنگ دکھایا ہولی نے

دیوالی کا جشن دیکھئے:۔

ہر اک مکاں میں جلا پھر دیا دوالی کا
ہر اک طرف کو اُجالا ہوا دوالی کا
سبھی کے دل میں سماں بھا گیا دوالی کا
کسی کے دل کو مزا خوش لگا دوالی کا
عجب بہار کا ہے دن بنا دوالی کا

جہاں میں یارو عجب طرح کا ہے یہ تیوہار
کسی نے نقد لیا اور کوئی کرے ہے اودھار
کھلونے، کھیلوں، بتاسوں کا گرم ہے بازار
ہر اک دکاں میں چراغوں کی ہو رہی ہے بہار
سبھوں کو فکر ہے اب جا بجا دوالی کا

مکان لیپ کے ٹھلیا جو کوری رکھوائی جلا چراغ کو کوڑی وہ جلد جھنکائی
اصل جواری تھے ان میں تو جان سی آئی خوشی سے کود اُچھل کر پکارے او بھائی
شگون پہلے کرو تم ذرا دوالی کا

شگن کی بازی لگی پہلے بار گنڈے کی پھر اس سے بڑھ کے لگی تین چار گنڈے کی
پھری جو ایسی طرح بار بار گنڈے کی تو آگے لگنے لگی پھر ہزار گنڈے کی
کمال نرخ لگا پھر تو آ دوالی کا

کسی کو داؤ پہ لا نقی موٹھ نے مارا کسی کے گھر پہ دھرا سوختہ نے انگارا
کسی کو نرد نے چوپڑ کے کر دیا زارا لنگوٹی باندھ کے بیٹھا ازار تک ہارا
یہ شور آکے مچا جابجا دوالی کا

"راکھی" سے چند بند ملاحظہ ہوں:-

چلی آتی ہے اب تو ہر کہیں بازار کی راکھی سنہری سبز ریشم زرد اور گلنار کی راکھی
بنی ہے گو کہ نادر خوب ہر سردار کی راکھی سلونوں میں عجب رنگیں ہے اس دلدار کی راکھی
نہ پہونچے ایک گل کو یار جس گلزار کی راکھی

مچی ہے ہر طرف کیا کیا سلونوں کی بہار اب تو ہر اک گلرو پھرے ہے راکھی باندھے ہاتھ میں خوش ہو
ہوس جو دل میں گزرے ہے کہوں کیا آہ میں تم کو یہی آتا ہے جی میں بن کے باہمن آج تو یارو
میں اپنے ہاتھ سے پیارے کے باندھوں پیار کی راکھی

پھریں ہیں راکھیاں باندھے جو ہر دم حسن کے تارے تو ان کی راکھیوں کو دیکھ اے جاں چاؤ کے مارے
پہن زنار اور قشقہ لگا ماتھے اُپر بارے نظیر آیا ہے باہمن بن کے راکھی باندھنے پیارے
بندھا لو اس سے تم ہنس کر اب اس تیوہار کی راکھی

ان نظموں کی سب سے زبردست خصوصیت وہ انسانی انداز اور وہ واقعیت ہے جس کی مثالیں اردو تو خیر ایک طرف، دوسری زبانوں میں بھی شاذ و نادر ہی ملتی ہیں۔ ہمارے مدعیانِ فضیلت نے نظیرؔ کی اس انسان پرستی کو سوقیت اور ابتذال کہکر بدنام کرنا چاہا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک مدت تک نظیرؔ کی طرف توجہ کرنے کی لوگوں کی ہمت نہیں ہوئی۔ مگر حقیقت کے ابر اگر پردہ ڈالا جائے تو زیادہ عرصہ تک ٹھیر نہیں سکتا۔ اسوقت بھی لوگوں کو احساس تھا

کہ نظیر اُردو شاعری میں ایک نئے امکان اور ایک نئی قوت کو بروئے کار لا رہے ہیں۔ البتہ اسوقت مذاق و معیار کے اجارہ داروں کا رعب کچھ ایسا طاری تھا کہ کوئی زبان سے وضع و عادت کے خلاف کسی رائے کا اظہار نہیں کر سکتا تھا مگر اب ہماری زندگی میں نئی قدریں اور نئے معیار پیدا ہو گئے ہیں اور ہمارے مذاق اور میلانات بندشوں سے آزاد ہورہے ہیں۔ اب ہم کو صحیح احساس ہو رہا ہے کہ نظیر نے اُردو شاعری کو کیا دیا اور اب ہم اس کا اعتراف بھی کر رہے ہیں۔ نظیر نے اُردو میں خارجی اور واقعی شاعری کا امکان پیدا کیا اور اس کو ایک جمہوری چیز بنا کر پیش کیا۔

نظیر کا حق مارنے کی ہمارے شاعروں اور نقادوں نے بڑی کوشش کی مگر حق کسی نہ کسی طرح حقدار کو پہونچ ہی جاتا ہے بظاہر نظیر ہم کو اپنے رنگ کے تنہا شاعر نظر آتے ہیں جس کی نہ کسی نے تعریف کی نہ تقلید لیکن غائر نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ نظیر کا اثر آیندہ نسلوں پر کتنی دور تک ہوا ہے۔ بالخصوص غدر کے بعد اُردو شاعری نے جو نیا جنم لیا ہے اور نظم نگاری کی جو تحریک پھیلی ہے اس میں کہیں شعوری اور کہیں غیر شعوری طور پر نظیر کا اثر برابر کام کرتا رہا ہے۔ حالی اور آزاد جو جدید نظم اُردو کے دو زبردست معمار ہیں نظیر سے اثر قبول کئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ اسمٰعیل میرٹھی کے وہاں تو یہ اثر اور بھی واضح اور نمایاں ہے۔ میرا دعویٰ ہے کہ ہماری زبان میں اگر "ریچھ کا بچہ"، "کورا برتن"، "تندرستی نامہ"، "ادس"، "موسم زمستاں"، "برسات کی بہاریں"، "بنجارہ نامہ"، "ہنس نامہ"، "مفلسی" وغیرہ نظمیں موجود نہ ہوتیں تو "برکھا رت"، "رحم و انصاف کا جھگڑا"، "اسلم کی بلی"، "دال" اور حالی اور اسمٰعیل کی اور اسی قسم کی نظمیں ابھی نہ جانے کتنی دیر بعد ہم کو ملتیں اور ان کے راستے میں نہ جانے کیا کیا دقتیں ہوتیں۔ اس کو مانتے ہوئے ہماری طبیعت ہچکچاتی ہے اس لئے کہ حالی سے لیکر اسوقت تک اُردو کے نظم نگاروں کا اسلوب عموماً نظیر کی یاد نہیں دلاتا۔ نظم میں بھی اسی فضیلت شاہی (Pendantocracy) کا سکہ چلا جو غزل اور قصیدہ میں اپنا سکہ چلا رہی تھی اور غیر ملکی عناصر ہماری شاعری میں کم و بیش اسی طرح غالب رہے لیکن حالی کی "برکھا رت"، "مناجات بیوہ"، "شکوۂ ہند" اور اسمٰعیل میرٹھی کی اکثر نظموں میں نظیر کا کافی رنگ ہے۔ جو ان شاعروں کے اپنے اپنے انفرادی رنگ کے ساتھ سمویا ہوا ہے۔ ان لوگوں کے بعد اُردو نظم کے امام اقبال ہوئے جو فطرتاً ایک مفکر شاعر تھے انھوں نے محسوس کیا کہ وہ جب تک فارسیت میں پناہ نہ لیں اپنے خیالات کو جو ایک خاص سطح سے تھے ادا نہیں کر سکتے تھے۔ اگرچہ وہ اپنے "نغمہ" کو "ہندی" بتاتے ہیں مگر ان کی زبان میں ہندی نژاد الفاظ کی جتنی کمی ہے شاید ہی کسی دوسرے اُردو شاعر میں ہو۔ ایک عرصہ تک وہ اُردو نظم کے قائد اعظم بنے رہے اور نظم نگاروں کی نئی نسل ان کی تقلید کو اپنے لئے فخر سمجھتی رہی۔ لیکن گزشتہ بیس برس کے اندر اُردو شاعری میں کافی انقلابی آثار پیدا ہو گئے ہیں اور اب ہم اپنی شاعری کے رواجی معیار کو اپنی نئی زندگی اور اس کے نئے میلانات اور نئے مطالبات کے لئے ناقص پا رہے ہیں۔ اب ہم کو احساس ہو رہا ہے کہ ہم کیسی دنیا کے کس

حصہ میں ہیں اور کیسی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اس احساس کا اثر ہماری شاعری پر بھی نمایاں طور پر پڑ رہا ہے۔ ہماری شاعری کے معیار اور اسلوب دونوں بدل رہے ہیں۔ اس وقت اگر کوئی شاعر ہم پر صحت بخش اثر ڈال سکتا ہے تو وہ میر یا غالب نہیں ہیں نظیر اکبر آبادی ہیں۔ ہماری شاعری میں اب بھی واقعیت کے مقابلے میں تخئیلیت اور جمہوریت کے مقابلہ میں انفرادیت کا عنصر ناگوار حد تک غالب ہے۔ اپنے حال میں مبتلا رہنا اور اپنے نفس کے اندر کھویا رہنا اُردو شاعر کا مزاج ہو کر رہ گیا ہے اور اب اس کو اس طلسمی حصار سے باہر لانے کے لئے نظیر ہی جیسے رہبر کی ضرورت ہے جو ہم کو خارجیت کی طرف لیجاتا ہے اور آنکھیں کھول کر خدا کی وسیع دنیا سے کیف اندوز ہونے کی دعوت دیتا ہے ساری اُردو شاعری میں ہم کو نظیر ہی ایک ایسی ہستی ملتی ہے جو اپنے نفس کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی نہیں۔

یہ محض میرا دعویٰ نہیں ہے۔ میں خلا میں باتیں نہیں کر رہا ہوں بالکل نئی نسل کے ان شاعروں کو پڑھئے جو جمہوریت اور انقلابیت کی طرف مایل ہیں تو ان کو آپ نظیر سے قریب تر پائیں گے۔ اگرچہ ایسے شاعروں کی تعداد ابھی تک بہت کم ہے۔ اس سلسلے میں مجھے ایک شاعر کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کرنا ہے۔ مجھے حیرت تھی کہ احسان دانش کے ہاں ایسی بے لاگ خارجیت کہاں سے آئی جس کا اُردو شاعری میں ان سے پہلے منزلوں پتہ نہیں چلتا میری حیرت کو خود احسان دانش نے دور کر دیا۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ انھوں نے اگر کسی شاعر کا غور اور شوق سے مطالعہ کیا ہے تو وہ نظیر ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ تفصیلی واقعیت اور یہ اضطراری عمومیت نظیر ہی کی دین ہو سکتی تھی۔ احسان دانش اُردو شاعری میں بالکل نئے امکانات کا پتہ دے رہے ہیں۔ جن کا جایزہ ابھی نہیں لیا گیا ہے اور انھوں نے ہم کو ان امکانات کو کام میں لانے کا ڈھنگ بھی بتا دیا ہے۔ ان کی شاعری اس بات کی طرف کافی اشارہ کر رہی ہے کہ اُردو شاعری کیا ہو سکتی ہے اور آیندہ وہ کیا ہوگی۔ جو شاعری کہ "باغی کا خواب" بیان کرنے کی قدرت رکھتی ہو وہ کیا نہیں ہو سکتی اور کیا نہیں کر سکتی۔ اگر اس کو ایک تنگ و تاریک قفس سے نکل کر کھلے میدان میں آجانیکی اجازت دیدی جائے۔

آخر میں مجھے ان لوگوں سے کچھ کہنا ہے جو اساتذہ کی رائے کی کورانہ تقلید میں نظیر کی شاعری کو مبتذل سمجھتے آئے ہیں۔ جس چیز کو ہم ابتذال بتاتے ہیں وہی نظیر کا فن ہے۔ یہ اصل میں دو عقیدوں اور دو معیاروں کا سوال ہے۔ عام طور سے ہم شاعری کو خواص کی دنیا کی چیز سمجھتے رہے ہیں۔ اس لئے اس کے جتنے اصول اور اسالیب مرتب ہوئے وہ خواص کی معاشرت سے ماخوذ کئے گئے۔ نظیر کا عقیدہ اس کے بالکل برعکس تھا۔ وہ شاعری کو عوام کی زندگی کی چیز سمجھتے تھے اس لئے انھوں نے جو اسلوب اختیار کیا وہ عوام کی زندگی سے ماخوذ تھا۔ ان کی زندگی اور اور ان کی شاعری دونوں میں بہت سی ایسی باتیں ملتی ہیں جو مصنوعی مروجہ مذاق اور معیار پر پوری نہیں اُترتیں اور جو ایک خاص زاویہ نگاہ سے مبتذل اور فحش معلوم ہوتی ہیں۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ نظیر کثیر سے کثیر تعداد کی زندگی کو

زندگی سمجھتے تھے اور جس چیز کو ہم ابتذال یا سوقیت کہتے ہیں وہ اس کو اس کثیر سے کثیر تعداد کی زندگی کی عام اور لازمی خصوصیت پا رہے تھے اس لئے اس سے احتراز کرنا ان کے خیال میں ایک قسم کی فرعونیت تھی۔ دوسرے نظیر فطرتاً بے جھجک قسم کے انسان تھے۔ ان کے کلام کے مطالعہ سے ایک یہ بھی اثر ہوتا ہے کہ یہ ایک ایسے شخص کا کلام ہے جس کے نفس میں وہ گرہیں یا رکاوٹیں (Inhibitions [Annihilations]) بہت کم ہیں جو تہذیب و معاشرت کے خراب نتائج میں سے ہیں۔ ایسا شخص ایسی ہی شاعری کر سکتا تھا اور ایسی شاعری ایسے ہی شخص کے بس کی بات تھی جس شخص کے اندر نفسیاتی حائلات اور مرکبات (Complexes) نہ ہوں اس کو آپ اور جو جی چاہے کہہ لیجئے لیکن وہ بڑا سچا اور بے نفس انسان ہوتا ہے۔ ریا اور تصنع سے اس کو دور کی بھی کوئی نسبت نہیں ہوتی۔

نظیر کی زندگی اور شاعری دونوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دل کے اچھے اور سچے آدمی تھے۔ جو جمہوریت اور واقعیت ان کی شاعری کی ممتاز ترین خصوصیت ہے اور جس کو ابتک ابتذال اور سوقیت سے تعبیر کیا جاتا رہا ہے وہ دراصل سچائی اور بے نفسی ہے۔ یہ سچائی اور بے نفسی بڑی پر اثر اور کارگر قوت ہوتی ہے۔ خاصکر اسوقت جبکہ انسان اپنے نفس کی بھول بھلیاں میں اس طرح کھو کر رہ گیا ہو کہ اس کا دم گھٹ رہا ہو اور اس کو کوئی دوسری قوت باہر نہ لا سکتی ہو۔

مجنوں گورکھپوری

نظیر میر کے رنگ میں

(غیر مطبوعہ دیوان سے)

دل ٹھہرا ایک تبسم پر کچھ اور رہا رے جان نہیں / گر ہنس دیجے اور لے لیجے تو فایدہ ہے نقصان نہیں

یہ ناز ہے یا استغنا ہے یا طرزِ تغافل ہے یارو / جو لاکھ کوئی تڑپے اسکے فریاد کرے کچھ دھیان نہیں

جب سنتا ہے احوال مرا یوں کہتا ہے عیاری سے / ہے کون وہ اس سے ہمکو تو کچھ جان نہیں پہچان نہیں

کچھ بن نہیں آتا کیا کیجے کس طور سے ملئے اے ہمدم / وہ دیکھ ہمیں رک جاتا ہے اور ہمکو چین اک آن نہیں

تر دیکھ کے میری آنکھوں کو یہ بات سناتا ہے ہنس کر / ہیں کہتے جسکو چاہ، میاں وہ مشکل ہے آسان نہیں

دل پھنس کر اسکی زلفوں میں تدبیر رہائی کی مت کر / کب چھوٹتا اسکے دام سے تو، وہ دانا ہو نادان نہیں

نظیر کا مسلک

مختلف مذاہب میں حق و صداقت اور علوئے اخلاق کی ایک سی تعلیم اس بات کی دلیل ہے کہ مذہب کا مقصود ایک ہے۔ اس عالمگیر تعلیم و مقصود کو "آفاقی مذہب" یعنے "مذہب محبت" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ آفاقی مذہب حقانیت کے سوا کسی قید و بند اور رسوم و مناسک کو قبول نہیں کر سکتا، کیونکہ "محبت" کے لئے تو "مذہب انسانیت" کا دائرہ بھی تنگ ہے۔

کسی مذہب کی تاریخ اُٹھا لیجئے، آپ کو نظر آئے گا کہ اُس مذہب میں جب ضابطہ و آئین ہی کو اصل مذہب بنا لیا گیا ہے جب تقلید و قدامت پرستی نے روح مذہب کو پامال کیا ہے، اِس آفاقی یا محبت کے مذہب کے ماننے والے اُسی مذہب میں سے پیدا ہو گئے ہیں۔ تاریخ مذاہب کا مطالعہ اس بات کو بھی واضح کر دیتا ہے کہ شروع میں ہر مذہب بعض سادہ و فطری حقیقتوں کو لیکر آتا ہے، مگر وقت کے ساتھ ساتھ ضابطہ بندی اور اگلوں کی لکیر ہی کو اصل مذہب سمجھ لیا جاتا ہے۔ لیکن اگر ایک طرف اس مذہب میں یہ تقلید و قدامت پرستی بڑھتی رہتی ہے تو دوسری جانب اُس مذہب کے پیروؤں میں روحانی ثقافت (کلچر) بھی پیدا ہوتی رہتی ہے، اور یہ روحانی ثقافت جب ایک خاص سطح پر پہونچ جاتی ہے تو اُس مذہب کے ماننے والوں ہی میں سے بعض ہستیاں رونما ہو جاتی ہیں، یہ لوگ اُس آفاقی مذہب کے معلّم و مبلغ ہوتے ہیں اور اُس مذہب والے اس "بغاوت" کو بھی اپنے مذہب کا جزو بنا لیتے ہیں۔

دنیا کے چند بڑے مذہبوں میں برہمنیت، بودھ مت اور عیسویت مثالی (Idealist) مذہب کہے جاتے ہیں۔ اس لئے اُن کے ماننے والوں کا اس آفاقی مذہب تک پہونچ جانا دشوار نہ تھا، چنانچہ ان مذاہب کے اندر ترک و تیاگ ہی فلسفۂ مذہب ہو گیا۔ بلکہ بودھ مت تو شروع ہی تیاگ سے ہوا۔ لیکن اسلام بُز مثالی نہیں بلکہ سراسر ایک عملی مذہب تھا اور جس نے اپنے پیروؤں کو رہبانیت سے روکا ہے، اسکے اندر بھی تھوڑی ہی مدت میں تصوف داخل ہو گیا، اور جزو مذہب بنا لیا گیا، شریعت و حقیقت، مذہب کے دو شعبے قرار پائے اور جس طرح اس آفاقی مذہب میں بھی دو فرقے ہوتے رہے ہیں اسی طرح اسلامی تصوف نے بھی سالک و مجذوب کی تقسیم مان لی۔

جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا ہے، یہ آفاقی مذہب صرف محبت کو مانتا اور اسمار و علامات کو تسلیم نہیں کر سکتا ہے۔ اس کر

مذہب کی تعلیم دینے والوں نے بیشتر شعر کو اپنی تعلیم پھیلانے کا ذریعہ بنایا اور ایشیا میں خصوصیت کے ساتھ متصوفانہ شاعری کا بہت بڑا ذخیرہ وجود میں آگیا۔ متصوفانہ شاعری کی تعریف میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ انسانی طبع و مزاج پر حقیقت کے تصور کا ردعمل ہے۔ تصوف کی تعلیم نے نوع انسان کو کچھ فائدہ پہونچایا یا نہیں؟ اس کے جواب میں دونوں پہلوؤں پر بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ لیکن انسانی طبیعت کی ساخت کو دیکھتے ہوئے "مذہب محبت" کا پیغام، آفاقی مذہب، کی تعلیم اپنی جگہ اٹل رہی اور رہے گی۔ اس زمانے میں مادہ پرستی کے زور نے کائناتی محبت کی تعلیم کو بہت کچھ مٹایا ہے، لیکن اس لئے کہ "محبت" کا پیغام ایک فطری اپیل ہے، آج کل کا انسان بھی جب اپنی حیوانیت اور درندگی سے تھک جائے گا تو امن و سکون کی تلاش میں وہ اس آفاقی مذہب کے اندر ہی پناہ پا سکے گا۔

نظیر ایک صوفی شاعر تھے۔ لیکن یہ معلوم کرنے کے لئے کہ وہ اپنے فقیرانہ مشرب میں کس ہادی و مرشد کے پیرو تھے یا ان کا صوفی منش ہونا کس اثر کا نتیجہ تھا، اس وجہ سے دشوار ہے کہ نظیر کی زندگی کے حالات ہمارے سامنے نہیں۔ انکے حالات زندگی اس قدر بھی محفوظ نہ کئے گئے جتنے دیگر معمولی معمولی شاعروں کے ہوگئے اور اس کی وجہ معلوم ہے کہ چونکہ وہ اپنے عہد کے معیار شاعری سے ہٹے ہوئے تھے، تقلید کو مٹانے والے تھے، عام انسانوں کی بول چال میں عام باتیں کہتے تھے، اس لئے اشراف کا طبقہ ان کو اپنا نہ سکتا تھا۔ ایسی صورت میں بجز اس کے کوئی چارہ نہیں کہ اس زمانہ کے عام حالات پر قیاس کر کے نظیر کے کلام ہی سے استنباط کیا جائے۔

میاں نظیر نے جب ہوش سنبھالا تو ایک طرف تو رومی و عطار، سعدی، و حافظ، تلسی و کبیر اور نانک و سور داس کے نغموں سے فضا معمور تھی اور دوسری طرف تیموری خانوادے کی باجبروت سلطنت اکبر اعظم کی عظیم الشان حکومت دم توڑ رہی تھی۔ یہ ماحول اگر ایک ذی حس اور صاحب بصیرت انسان کو عالم کی بے ثباتی کا سبق دے اور کائناتِ تخلیق سے محبت کرنا سکھا دے تو اچنبھے کی بات نہیں۔ اسلام میں قدامت پرستی اور تقلید عروج کو پہونچی ہوئی تھی اور یکے بعد دیگرے مذہب محبت کی منادی کرنے والے رونما ہوتے چلے آرہے تھے، نظیر کے ماحول نے ان کو بھی اسی آفاقی مذہب کے راستے پر ڈال دیا۔

نظیر متصوفانہ مزاج اور حکیمانہ نظر کے انسان تھے لیکن وہ نہ تو ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جانے والے صوفی تھے اور نہ سرِ ساحل کھڑے ہو کر موجوں کو گننے والے فلسفی وہ تصوف کی زندگی جیتے اور فلسفے کے تریاق سے "قید حیات" کو گوارا بنا لیتے ہیں۔ وہ نہ تو ترک و تیاگ کرتے ہیں اور نہ زندگی کا رونا رو کر اپنے انسانی و سماجی فرض سے غافل ہو جاتے ہیں۔ نظیر نے عالم کی بے ثباتی پر اتنا زیادہ زور دیا ہے، جتنا کسی دوسرے اردو شاعر کے یہاں نہ ملے گا۔ وہ معرفت نفس کو جس دلنشین پیرایے اور عام فہم انداز میں سمجھاتے ہیں، دوسروں کے یہاں نہیں ملتا۔ اس بسیط و عظیم کائنات میں نظیر نے انسان کے ہیچ در ہیچ حقیقت ہونے کو جس طرح سنایا ہے، نظیر ہی سنا سکتے تھے۔ وہ انسانی تفوق سے بیزار ہیں اور

"فرزندانِ الٰہی" بلکہ کائناتِ خلقت کی کامل آزادی کے ماننے والے اور مبلغ ہیں۔

تصوف کے دو اُصول اہم اور بنیادی ہیں، وحدتِ وجودی اور معرفتِ نفس۔ معرفتِ نفس کی تلقین کی پرداز دیکھئے:-

جو تو کہتا ہے اے غافل "یہ تیرا ہے یہ میرا ہے"   یہ جس کا ہے اُسی کا ہے، نہ تیرا ہے نہ میرا ہے
تو اول سوچ تو دل میں کہ تو ہے کون اور کیا ہے   نمازی ہے، شرابی ہے، اُچکا ہے، لٹیرا ہے
فرشتہ ہے، پری ہے، دیو ہے یا آدمی، جن ہے   بلا ہے، بھوت ہے، یا مُن مزدور یا گھیرا ہے
تری کیا ذات ہے، کیا نام ہے، کیا کام کرتا ہے،   مسافر بے وطن ہے، یا ترا اس جا پہ ڈیرا ہے،
جب ان چیزوں سے تو اپنے تئیں کچھ چیز ٹھیرا لے   تو اُسکے بعد پھر کہیو کہ "یہ تیرا یہ میرا ہے"
یہ چیزیں تو غرض کیا ہیں، تو اپنا ہی نہیں مالک   تجھے او بے خبر ناداں، یہ کس غفلت نے گھیرا ہے
تو کچے سوت کا دھاگا، عبث بل پیچ کھاتا ہے،   یہ سب وہم غلط ہے اور قصور فہم تیرا ہے،
تو کیا جانے کہ تجھکو کس نے کس چرخے میں کاتا ہو؟   تو کیا جانے کہ تجھکو کس اٹیرن میں اٹیرا ہے؟
تماشا ہے، مزا ہے، سیر ہے، "اہاہا ہاہا"!   مصور نے عجب کچھ رنگ قدرت کا بکھیرا ہے
ترقی میں تنزل ہے، تنزل میں ترقی ہے   اندھیرے میں اُجالا ہے اُجالے میں اندھیرا ہے
طلسماتِ حقیقی ہے یہ کچھ سمجھا نہیں جاتا   یہی چاند اور یہی سورج، یہی شام اور سویرا ہے
نظیر اللہ اللہ، اس جہاں میں دم غنیمت ہے   کہاں ہم اور کہاں پھر تم، کوئی دم کا بسیرا ہے

بالکل سامنے کی اور بالکل بے حقیقت چیزوں کی مثال سے انسان کی بے حقیقتی ثابت کر کے نظیر کہتے ہیں کہ اب تم اس تماشے سے لطف لو۔ دنیا کو "طلسماتِ حقیقی" کا نام وضع کر کے نظیر نے دفتر کے دفتر بیان کر دئے ہیں اور یہ کہکر کہ ہر شے اپنی ضد کے اندر ہی مستور رہتی اور اسی میں سے ظاہر ہوتی ہے، سب کچھ سمجھا دیا ہے۔

اپنی ذات پر نظر کرنے کی تعلیم کے بعد نظیر بتاتے ہیں کہ عالم پر بھی نظر ڈالو:-

تنہا نہ اُسے اپنے دلِ تنگ میں پہچان،   ہر باغ میں، ہر دشت میں، ہر سنگ میں پہچان،
بیرنگ میں، بارنگ میں، نیرنگ میں پہچان   منزل میں، مقامات میں، فرسنگ میں پہچان،
نت روم میں اور ہند میں، ہر زنگ میں پہچان   ہر رات میں، ہر ساتھ میں، ہر سنگ میں پہچان
ہر عزم و ارادے میں، ہر آہنگ میں پہچان،   ہر دھوم میں، ہر صلح میں، ہر جنگ میں پہچان
ہر آن میں، ہر بات میں، ہر ڈھنگ میں پہچان   عاشق ہے تو دلبر کو ہر ایک رنگ میں پہچان

ایک دوسری جگہ زرا شاعرانہ رنگ میں ذرا گہری حقیقت بیان کرتے ہیں:-

لے آئینے کو ہاتھ میں اور بار بار دیکھ،   صورت میں اپنی قدرت پروردگار دیکھ

خالِ سیاہ اور خطِ مشکبار دیکھ　　زلفِ دراز و طرۂ عنبر نثار دیکھ
ہر لحظہ اپنی چشم کے نقش و نگار دیکھ
اے گل تو اپنے حسن کی آپ ہی بہار دیکھ

آئینہ کیا ہے، جان ترا پاک و صاف دل　　اور خال کیا ہیں، تیرے سویدائے رخ کے تل
زلفِ دراز فہم رسا سے رہی ہے مل　　لاکھوں طرح کے رنج میں بھی ہم رہے ہیں کھل
ہر لحظہ اپنی چشم کے نقش و نگار دیکھ
اے گل تو اپنے حسن کی آپ ہی بہار دیکھ

یہ آٹھ بند کا مسدس ہے۔ آخری بند یہ ہے:-

باغ و چمن کے غنچہ و گل میں نہ ہو اسیر　　قمری کی سن نفیر نہ بلبل کی سن صفیر
اپنے تئیں تو دیکھ کر کیا ہے ارے نظیر　　ہیں حرف من عرف کے یہی معنی اے نظیر
ہر لحظہ اپنی چشم کے نقش و نگار دیکھ
اے گل تو اپنے حسن کی آپ ہی بہار دیکھ

مذہب و ملت کے اختلاف کو نظیر ایک واقعیت نگار کی نظر سے دیکھتے ہیں، اور اس حقیقت پر یقین رکھتے ہیں کہ مذہب پرستی "پیدائش کا اتفاق" ہے۔ جو خالق حقیقی کے طلبگار ہیں وہ نہ ہندو ہو سکتے ہیں نہ مسلمان، اور نہ کوئی اور۔ راستوں کا فرق اور منزل کا ایک ہونا تصوف کا وہ نکتہ ہے جسے اکثر شعرا نہایت دلنشین اسلوب میں بیان کر گئے ہیں۔ مگر اس نکتے کو تو نظیر فلسفے کی نظر سے دیکھتے اور بتاتے ہیں کہ مرنے کے بعد اختلاف مذہب نہیں رہتا یعنے وہاں ہندو مسلمان اور عیسائی کا نام جانی بوجھی باتیں نہیں، وہاں اگر پوچھا جائے گا تو انسان یا خدا کا بندہ، بس انھیں ناموں سے پوچھا جائے گا۔ نظیر کا ایک بند نقل کیا جاتا ہے اسے پڑھئے اور نظیر کی نظر کی گہرائی تک پہونچئے:-

جھگڑا نہ کرے مذہب و ملت کا کوئی یاں،　　جس راہ میں جو آن پڑے خوش رہے ہر آں
زنار گلے یا کہ بغل بیچ ہو قرآن　　عاشق تو قلندر رہے نہ ہندو نہ مسلماں
کافر نہ کوئی صاحب اسلام رہے گا
آخر وہی اللہ کا ایک نام رہے گا

ہندوستان میں ذاتوں کی تقسیم نے سماج کو جتنا پست کر دیا اور انسانیت کو جس قدر ذلیل کر دیا، میرا خیال ہے، کہ اسی احساس نے نظیر سے وہ نظم لکھوائی جس کا عنوان "آدمی نامہ" رکھ لیا گیا ہے۔ میرے خیال میں اس نظم میں نظیر نے کسی شاعرانہ کمال کو نمایاں نہیں کیا ہے بلکہ امر واقعہ کو اس انداز سے پیش کر دیا ہے کہ پڑھنے والے کا ذہن

اس کے اندر چھپے ہوئے طنز کو اور آفاقی مذہب کی تعلیم کو سمجھے بغیر رہ نہیں سکتا۔ نظیر نے پوری نظم میں کہیں یہ نہیں کہا کہ شریف اور کمین، اُتم اور نیچ برابر ہیں، اُس نے صرف یہ بتایا ہے کہ برا ہونے والے اپنے اپنے کام میں لگا ہوا سماجی فرض ادا کر رہا ہے اور اس حقیقت الامر پر توجہ دلا کر نظیر نے فی المعنی بتایا ہے کہ سوچو تو کہ اُتم اور نیچ کا کیا مفہوم ہے، بے کہے سمجھایا ہے کہ کیا زمانے کے نشیب و فراز سے کوئی شخص اپنے آپ کو کسی ذات سے بری یا محفوظ سمجھ سکتا ہے۔ اس نظم کا پرداز کچھ ایسا ہے کہ خیال اس طرف جائے بغیر نہیں رہتا کہ نظیر ذہنی انقلاب ہی کو اصل انقلاب سمجھتے تھے اور اس انقلاب کے لئے وہ ان واقعیتوں کو پیش کرنا ضروری اور کافی سمجھتے تھے جو ہماری خرابیاں بن گئی ہیں۔ نظیر کا اسلوب مسلمہ طور پر دل میں گھر کر لینے والا اسلوب ہے جس کے تخاطب کے دائرے میں عامی بھی داخل ہیں یہ نظم سولہ بند کا طویل مخمس ہے۔ میں یہاں اس کے تین پہلے مصرعوں کو چھوڑ کر باقی اشعار نقل کرتا ہوں:۔

نعمت جو کھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی — ٹکڑے چبا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی،
حتے کہ اپنی زور ریاضت کے زور سے — حق سے جو جا ملا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
شیطاں بھی آدمی ہے جو کرتا ہے مکر و زور — اور ہادی رہنما ہے سو ہے وہ بھی آدمی
اور آدمی ہی ان کی چراتے ہیں جوتیاں — جو ان کو تاڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
سچا بھی آدمی ہی نکلتا ہے میرے لال — اور جھوٹ کا بھرا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
دوڑے ہے آدمی ہی تو مشعل جلا کے راہ — اور بیاہنے چڑھا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
کاندھے پہ رکھ کے پالکی ہیں دوڑتے کہار — اور اس میں جو پڑا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
کس کس طرح کی بیچیں ہیں چیزیں بنا بنا — اور مول لے رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
یاں تک کہ آدمی ہی اُٹھاتے ہیں جا ضرور — اور جس نے وہ پھرا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
گورا بھی آدمی ہے کہ ٹکڑا ہے چاند کا — بدشکل و بدنما ہے سو ہے وہ بھی آدمی
وہ آدمی ہی ناچیں ہیں اور دیکھو پھر مزا، — جو ناچ دیکھتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
کمخواب و تاش شال دوشالوں میں غرق ہے — اور چیتھڑے لگا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
سو سو طرح سے عیش کے کرتے ہیں رنگ ڈھنگ — اور خاک میں پڑا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
سب آدمی ہی کرتے ہیں مردے کے کاروبار — اور وہ جو مر گیا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی
اچھا بھی آدمی ہی کہاتا ہے اے نظیر — اور سب میں جو برا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

پوری نظم عدم مساوات کے شدید احساس کا اثر پیدا کرتی ہے، اور انسان انسان کے ساتھ جو بے انصافی کر رہا ہے اس کی طرف سے دل میں ایک بیزاری پیدا ہو جاتی ہے۔

''مذہب محبت'' کی تلقین ہر صوفی شاعر نے کی اور کفر و ایمان، دیر و حرم، سبحہ و زنار، کی تفریق کو سب ہی نے حماقت کہا ہے، لیکن نظیر ان احساسات کو جس طرح پیش کرتے ہیں وہ دوسروں کی طرح سطحی بات نہیں کہتے بلکہ خود ڈوب جاتے ہیں۔ انھوں نے ہر مذہب کے مذہبی استعارے اور تلمیحات اس طرح لئے ہیں کہ اگر کرشن مہاراج کی تعریف کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے ان سے بڑا کرشن بھگت دوسرا نہیں ہو سکتا ''کنہیا جی کے جنم'' کا پہلا بند ہے

ہے ریت جنم کی یوں ہوتی جس گھر میں بالا ہوتا ہے — اُس منڈل میں ہر من بھیتر سکھ چین دو بالا ہوتا ہے
سب بات بتھا کی بھولی ہے جب بھولا بالا ہوتا ہے — آنند منڈلی باجت ہے انت بھون اُجالا ہوتا ہے
یوں نیک نچھتر لیتے ہیں اس دنیا میں سنسار جنم
پر اُن کے اور ہی لچھن ہیں جب لیتے ہیں اوتار جنم

بالپن کی بانسری کے دو بند ملاحظہ ہوں:۔

ظاہر میں سب وہ نند جسودا کے آپ تھے — ورنہ وہ آپ مائی تھے اور آپ ہی باپ تھے
پردے میں بالپن کے یہ اُن کے ملاپ تھے — جوتی سروپ کہئے جنھیں سو وہ آپ تھے
ایسا تھا بانسری کے بجیا کا بالپن،
کیا کیا کہوں میں کرشن کنہیا کا بالپن

سب مل کے یارو کرشن مراری کی بولو جے — گوبند چھیل کنج بہاری کی بولو جے
دوہ چور گہاری ناتھ بہاری کی بولو جے — تم بھی نظیر کرشن بہاری کی بولو جے
ایسا تھا بانسری کے بجیا کا بالپن
کیا کیا کہوں میں کرشن کنہیا کا بالپن

بھیروں جی کی تعریف کا ایک بند دیکھئے:۔

دیکھا ہے جب سے میں نے تیرا جمال بھیروں — رکھتا ہوں دل میں تب سے تیرا خیال بھیروں
دن رات ہے یہ میرا تجھ سے سوال بھیروں — تیری ہرن گہی ہے کر تو نہال بھیروں
اے پرتپال دیوت مہ مست کال بھیروں

مدح گرو نانک شاہ میں دیکھئے:۔

ہیں کہتے نانک شاہ جنھیں وہ پورے ہیں آگاہ گرو — وہ کامل رہبر جگ میں ہیں یوں روشن جیسے ماہ گرو
مقصود مراد امید سبھی برلاتے ہیں دلخواہ گرو، — نت لطف و کرم سے کرتے ہیں ہم لوگوں کا نرباہ گرو
اس بخشش کے اس عظمت کے ہیں بابا نانک شاہ گرو
سب سیس نوا ارداس کرو اور ہر دم بولو واہ گرو

مدح حضرت سلیم چشتی سنئے :-

عالم ہے سب معطر تیرے کرم کی بو سے　　حرمت ہے دوستوں کو حضرت تمہاری رو سے
یہ چاہتا ہوں اب میں سو دل کی آرزو سے　　رکھو نظیر کو تم دو جگ میں آبرو سے
اے موجدِ ہر احساں حضرت سلیم چشتی

منقبت امیر المومنین کا بھی ایک بند ملاحظہ ہو :-

نور ظہور خالق اکبر کو کیا لکھوں　　روحِ روانِ جسم پیمبر کو کیا لکھوں
دریائے معرفت کے شناور کو کیا لکھوں　　دونوں جہاں کے گوہر انور کو کیا لکھوں
حیرت میں ہوں کہ حیدرِ صفدر کو کیا لکھوں

یہ مختصر اقتباس یہ اندازہ کرنے کے لئے کافی ہیں کہ نظیر ان لوگوں میں سے تھے جو ایک ہی وقت میں سکھ بھی ہیں اور ہندو بھی، سنی بھی ہیں اور شیعہ بھی، اور یہی محبت کا مذہب ہے۔

متصوفانہ موضوعات پر اظہار خیال میں نظیر کے یہاں کوئی خاص ندرت نہیں جو فارسی، اُردو اور ہندی کلام میں نہ ملے، لیکن نظیر کا خلوص مقصد اور خلوص شعری مخصوص چیز ہے جو کہیں اور مشکل سے ملتی ہے۔ چند شعر پیش ہیں :-

فقط جو ذات کے ہیں دل سے چاہنے والے　　اُنھیں کرشمہ و ناز و ادا سے کیا مطلب
یہ کچھ بہروپ پن دیکھو کہ بنکر شکل دانے کی　　بکھرنا، سبز ہونا، لہلہانا، پھر سمٹ جانا
یہ یکتائی، یہ یکرنگی، تس اوپر یہ قیامت ہے　　نہ کم ہونا نہ بڑھنا اور ہزاروں گھٹ میں بٹ جانا
جدھر کو دیکھو اُدھر آپ ہی جھمکتا ہے　　مزا پڑے نہ اُسے کیونکہ شیش محلوں کا
پھر کے نگاہ چار سو، ٹھیری اسی کے روبرو　　اُس نے تو میری چشم کو قبلہ نما بنا دیا

ہمہ اوست یا وحدت وجود سے متعلق یہ چند شعر آپ نے پڑھے۔ اب اور اک باری تعالیٰ کے متعلق نظیر کیا کہتے ہیں، اسے بھی سُن لیجئے :-

وصف اس کے حسن کا کس سے ہوا کلی مگر،　　جتنا جس کے فہم میں آیا، کہا، اچھا کہا

اور تخلیق کائنات کو نظیر نے کس طرح سمجھا ہے، وہ بھی سنئے :-

خواب عدم میں ہم تو فراغت سے اے نظیر　　سوتے تھے عشق نے مگر آکر جگا دیا،
اور :- عشق میں اُس گوہر نایاب کے،　　آج تک خشک ہیں دریا کے لب

مسئلۂ قدرت اور "اختیار" انسانی کی حقیقت نظیر کی نظر میں یہ ہے :-

میں ہوں پتنگ کاغذی ڈور ہے اسکے ہات میں،　　چاہا اِدھر گھٹا لیا، چاہا اُدھر بڑھا دیا

محوِ تدبیر ہیں ہم لیک خدا ہی جانے　　کونسا گل ہے پس پردۂ تقدیر کھلا

فرض انسانیت کی شناخت نظیر نے کس طرح کی ہے :۔

جس کام کو جہاں میں آیا تھا تو نظیر　　خانہ خراب تجھ سے وہی کام رہ گیا

انسانی فطرت، فطرت بسیط سے واصل ہو جانے کی ہر دم آرزومند رہتی ہے، اس کو نظیر کس شوق کے ساتھ بیان کرتے ہیں :۔

چمک جا پھر خدا کے واسطے اے طور کے شعلے　　کہ مثل آتش افسردہ ہے دل پھر کچھ چلا کمہلا،

دُنیا کی دلکشیوں اور اس کی حقیقت کو نظیر نے اس طرح سمجھا ہے :۔

ہے جواہر خانۂ دنیا جو یہ باآب و تاب،　　اہل صورت کا ہے دریا اہل معنی کا سراب

نظیر اپنی بشریت کا علاج کس طرح کرتے ہیں :۔

نظیر آگے ہم کو ہوس تھی کفن کی،　　جو سوچا تو آخر کو دیوانہ پن تھا،

ل۔ احمد

نظیر کی فارسی تراکیب

(غیر مطبوعہ دیوان سے)

بحرِ ہستی میں صحبت احباب　　یوں ہے جیسے بروئے آب حباب

بادۂ ناب کیا ہے، خونِ جگر　　زردیِ رنگ ہے شبِ مہتاب

جس کو رقص و سرود کہتے ہیں　　وہ بھی ہے اک ہوائے خانہ خراب

حسن اور عشق جس کو کہتے ہیں　　خطفۂ برق و قطرۂ سیماب (چمک)

گردشِ آسماں میں ہم کیا ہیں　　پر کاہ ہے میانۂ گرداب

عمر کہتے ہیں جس کو وہ کیا ہے　　مثلِ تحریرِ موج، نقش بر آب

جسم کیا روح کی ہے جولانگاہ　　روح کیا اک سوار پا بر کاب

فرصتِ عمر قطرۂ شبنم　　وصلِ محبوب گوہرِ نایاب

سب کتابوں کے کھل گئے معنی
جب سے دیکھی نظیر دل کی کتاب

نظیر پر ایک نظر

اہل نظر نے ارباب فطنت کو پیغمبر، اور ان کے اقوال کو پیغام فطرت کا زریں لقب دے کر، ان کے نو بہ نو ذہنی و عملی کارناموں کا مطالعہ بنی نوع انسانوں کی ہدایت کا ذریعہ سمجھا ہے۔ ان سماجی پیشواؤں کے افادات کا شمار آسان نہیں۔ سوسائٹی ان میں سے کسی کی اہمیت نظرانداز نہیں کر سکتی۔ لیکن نقطۂ نظر کے فرق سے قطعہ نظر کرنے پر بھی، ان میں بعض، اپنی قدر و قیمت میں بعض سے اہم تر نظر آتے ہیں۔ اہمیت کا معیار یہ ہے کہ وہ ذہنی ثمر جو انسانی حیات پر بلاواسطہ مؤثر اور نفس کی تربیت میں براہ راست مفید ثابت ہوتے ہیں نسبتاً زیادہ نمایاں اور اہم سمجھے جاتے ہیں۔ قدیم فلسفے نے جب انسان کی تعریف وضع کی تو اُسے حیوان ناطق کہہ کر دوسرے جانوروں سے ممیز کیا۔ لیکن اگر مسلسل رویے کی بنا پر جس کی شہادت ابتدائے آفرینش سے آج تک برابر مل رہی ہے، اس کا نام بدل کر، اب علم کا دیوانہ رکھ دیا جائے تو بیجا نہ ہوگا یہ تلخ حقیقت بھی تاریخی واقعے کے طور پر ہمارے سامنے ہے کہ حصولِ علم کی سعی میں خود انسان نے اپنے ہمجنسوں کی راہ میں بے تعداد دشواریاں پیدا کیں، لیکن ہر دشواری نے مشعل ہدایت کا کام کیا۔ ارتقائے ذہنیت کی تاریخ میں یہ حادثہ بھی ثبت ہے کہ دنیا کے ایک قدیم مذہب نے حصول علم کی کاوش کو جو ابوالبشر کی فطرت کا اقتضائے اولین تھا۔ ان کا اولین گناہ قرار دیا اور باداش یہ تجویز کی کہ جنت جیسے محبوب وطن سے نکال کر دنیا جیسے دارالمحن میں ابد تک قید کر دیا۔ آدم پر اس کا جو اثر ہوا ہم اس سے زیادہ متعلق نہیں۔ لیکن اولاد نے باپ کے گناہ کو بڑے استقلال سے سراہا اور اسی معصیت کو اپنی نجات کا وسیلہ گردانا۔ دنیا کی زندہ قومیں آج اس دھن میں ہیں کہ ہر بات کا پتہ پتال تک لگائیں اور بس چلے تو عرش کے تارے بھی توڑ لائیں۔ حد یہ ہے کہ تحقیق و تجسس کی راہ میں جان جیسی عزیز نعمت دریغ نہیں کی جاتی۔ فلسفے کی نظر میں حصولِ علم کا اصل مقصد یہ ہے کہ خلقت کی غایت اور حیات کے منتہیٰ کا وقوف ہو، لیکن خود حیات کا تقاضا ہے کہ زندگی کو آسان اور خوشگوار بنانے یا اس کے مصائب کم کرنے کی تدبیریں دریافت کی جائیں۔ اب اگر افادی نظر سے دیکھئے تو حیات کا تقاضا فلسفے کے مطالبے سے سخت تر ہے۔ اس بنا پر ارباب فطنت کی ذہنی کاوشوں کے وہ نتیجے جو افادی مقصد کے حصول میں ذہن کی اعانت کرتے ہیں زندگی سے قریب اور اس نوع کی دوسری مساعی کے مقابلے میں اہم تر سمجھے جاتے ہیں۔ یہ اپنی فطرت کے اعتبار سے لطیف اور اثر کے لحاظ سے مقبول و دلپسند ہوتے ہیں۔ ان کا علمی نام فنون لطیفہ ہے۔ یہ معماری

سنگتراشی، نقاشی، موسیقی اور شاعری پر مشتمل ہیں۔ دنیا کی زندہ اور ترقی پسند قومیں علوم متداولہ کے پہلو بہ پہلو ان کی تعلیم پر بھی زور دیتی ہیں۔ ان فنون کے مطالعہ سے انسان کی جمالیاتی حس میں نشو و نما ہوتا ہے جو تربیت اخلاقی کے لئے از بس ضروری ہے۔ لیکن قبول عام کی بنا پر شاعری ان سب میں سربلند ہے۔ تجربہ شاہد ہے کہ دوسرے فنون لطیفہ کے مقابلے میں شعر سے متاثر ہونے کی صلاحیت انسان میں زیادہ ہے۔ ممکن ہے کہ غنائی دلنوازی کی بنا پر موسیقی کو شعر سے افضل بنایا جائے لیکن شعر میں موسیقی کا یہ عنصر موجود ہوتا ہے۔ ہر عہد اور ہر قوم میں اس کا مشاہدہ ہو چکا ہے کہ نقش کے مقابلے میں شعر کی نزاکتیں انسان کے فہم کو جلد تر گرویدہ کر لیتی ہیں۔ نظیر کی نظم، چغتائی کے مرقع سے پہلے سمجھی جاتی ہے۔ غالباً اسی سہولت کی بنا پر نظام تعلیم نے شعر کے درس کو سارے فنون لطیفہ پر ترجیح دی ہے۔ لیکن شعر کے ساتھ اتنا جزوی واسطہ جتنا دنیا کے تعلیمی اداروں نے روا رکھا ہے، زندگی کے زہراب کی سمیت دور کرنے کے لئے کافی نہیں۔ شعر کا مطالعہ ذہن میں بصیرت، دل میں ولولہ اور اخلاق میں بلندی پیدا کرتا ہے۔ زندگی کے پاکیزہ اجزاء کی بقا اور نشو و نما کے لئے شعر کا وسیع پیمانے پر مطالعہ اتنا ہی ضروری ہے جتنا چراغ کے لئے تیل یا درختوں کے لئے آبیاری۔

چنانچہ زندگی میں شعر کے مطالعہ اور گہرے مطالعہ کی ضرورت مسلم ہے۔ لیکن شعر ہمہ گیر ہونا چاہئے۔ بلکہ یوں کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ وہی شعر صحیح معنی میں شعر کہے جانے کا مستحق ہے جس میں ہمہ گیری کے سارے خواص مشترک ہوں۔ ہمہ گیری سے مراد یہ ہے کہ شعر کی بنیاد ایسے خیال پر قایم ہو جو زمانہ، ملک، قوم اور رنگ کے اختلافات سے گزر کر نوع انسان پر یکساں موثر ہو جس میں ساری دنیا کو اپنے مفاد، اپنے تفنن، اپنے تفرج اور اپنی فطرت کا آئینہ نظر آئے۔ لیکن اس قسم کے شعرا کی ہر زبان میں کمی ہے جن کے تخیل کی وسعت زمان و مکان سے بے نیاز ہو کر عالم و ماورائے عالم کو محیط ہو جائے۔ شعری ادب کے باب میں اردو کسی زبان سے پیچھے نہیں اور اس زبان کے شعرا میں چند ایسے گزرے ہیں جن کے تخیل میں ہمہ گیری کے سارے اجزا موجود ہیں۔ لیکن نظیر پہلا شاعر ہے جس نے اردو زبان میں اس رنگ کی شاعری کی داغ بیل ڈالی۔ یہی شاعری مغربی اصطلاح میں یونیورسل کہلاتی ہے۔

نظیر کی شاعری بیشک ہمہ گیر اجزا سے مرکب ہے۔ لیکن ہمہ گیری کا جایزہ لینے کے لئے کلام پر تبصرہ کرنے سے قبل اس بزرگوار کے سوانح حیات کا مسئلہ سامنے آتا ہے۔ جب تک اس نوع کے شاعر کی جسے فطرت کا پیغمبر اور زندگی کا مبصر کہا جائے پوری زندگی سامنے نہ ہو اس کے کلام کے لطف کی حدود کا تعین اور اہمیت کا اندازہ محال ہے۔ نظیر کے معرفوں کا پہلا کام یہ تھا کہ ایک جامع تذکرہ مرتب کرتے مگر اس طرف اب تک پوری توجہ نہیں کی گئی۔ کلام پر مختصر اور سرسری تبصرے اکثر کئے گئے ہیں جو رسایل میں شایع بھی ہو چکے ہیں لیکن یہ کوششیں قطرے سے پیاس بجھانے کی ناکام کوششیں ہیں۔ ان کا وجود اگر کچھ ثابت کرتا ہے تو صرف یہ کہ اس عظیم الشان موضوع کو کسی نے بقدر عظمت سمجھنے کی پرواہ نہیں کی۔ تذکرے کا موضوع اس سے بھی کم تر توجہ کا ممنون ہے۔ کہیں کہیں جہاں تذکرہ مرتب کرنے کی دوراز کار سعی کی گئی ہے

وہاں تذکرے کو تبصرے سے اس طرح مخلوط کر دیا گیا ہے کہ دونوں بے مصرف ہو کر رہ گئے ہیں۔ اس باب میں قطب الدین خاں باطن اور خلیفہ گلزار علی اسیر کی کوتاہی ناقابل معافی ہے۔ مشرقی معاشرت کو مدنظر رکھتے ہوئے شاگرد اور بیٹے سے زیادہ کسی کو شاعر کی زندگی کے واقعات سے واقفیت نہیں ہو سکتی۔ ان حضرات کی غفلت یا سہل انگاری نے دنیا کو اس قیمتی عینی شہادت سے محروم کر دیا جسے تحقیق کی قوت ہزار کاوش کے بعد بھی آج ہمارے لئے فراہم نہیں کر سکتی۔ شہباز نے نظیر کی موت کے کم و بیش ۷۵ برس بعد، بیسویں صدی کی ابتدا میں زندگانی بےنظیر کے نام سے ایک تذکرہ مرتب کیا جو اولیت کے لحاظ سے اور اس لحاظ سے بھی کہ اس میں واقعات جمع کرنے کی سعی بلیغ کی گئی ہے بلاشبہ دلچسپ اور مستحسن ہے مگر نفسیاتی نظر سے زیادہ مفید نہیں۔ فاضل مؤلف کے انداز بیان سے نہیں بلکہ طریقۂ کار سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔ اُس کے پاس واقعات و اسناد کی کمی نہ تھی مگر اس مواد کے استعمال کا طریقہ نہایت محدود اور نامکمل ہے۔ واقعات کو جب تک نقد کی کسوٹی پر کس کر پرکھا نہ جائے اُن میں کوئی تاریخی اہمیت اور قبول کی صلاحیت پیدا نہیں ہوتی۔ یہ تالیف اُصول تذکرہ نویسی کی رو سے تذکرہ اس لئے نہیں کہی جا سکتی کہ اس میں استنباط اور استقراء کے منطقی اُصولوں سے کہیں کام نہیں لیا گیا۔ نظموں کے عنوانوں کو شاعر کی ذہنی کیفیت کا مترادف قرار دیکر جابجا سطحی تبصرہ کیا گیا اور مفروضہ نتائج اخذ کئے گئے ہیں اور بس۔ کردار کی صورت گری کی بجائے جس کا مجموعی اثر ایک جیتی جاگتی زندہ تصویر کی طرح اپنی ساری امتیازی خصوصیات کے ساتھ ہمارے سامنے آتا، طبع زاد بہروپوں کی ایک غیر مربوط فہرست سامنے رکھدی گئی ہے جسے قبول کرنے سے ناقدانہ حس انکار کرتی ہے۔ اس کے علاوہ کسی فرد کی خوبیاں یا برائیاں، امتیازات یا کوتاہیاں گنوا دینے سے اس کے کردار کا مرقع پیش نظر نہیں ہو جاتا جب تک ان تمام اجزاء کے باہمی رابطوں، تعاون و تصادم، عمل و ردعمل سے ایک لازمی و صریحی نتیجہ نکال کر نہ بتایا جائے۔ ضرورت اس کی تھی کہ شاعر کے ذہن کا ارتقا اور مختلف ارتقائی منازل کا شعری زندگی پر اثر دکھایا جاتا اور ساتھ ہی ساتھ یہ بتایا جاتا کہ ماحول کے واقعات و حوادث نے شاعر کے کردار میں کس طرح نشو و نما کیا اور کیا کیا تغیرات رونما کئے۔ کن باتوں سے وہ سب سے زیادہ اثر پذیر ہوا اور کن کا اس نے کوئی اثر قبول نہ کیا اور پھر یہ سب حالتیں شعر میں کس طرح منعکس ہوئیں۔ تذکرے کے نام سے نظیر کی زندگی کا ایک خیالی اور بے بنیاد ڈھانچہ مرتب کیا گیا ہے جسے اس کی سیرت سے کوئی تعلق نہیں اور جو اس کی فطنت کے تجزئے اور عظمت کے ادراک میں ذرا ہماری مدد نہیں کرتا۔

ایک نامور انگلستانی ادیب نے تذکرے کے باب میں لکھا ہے کہ "اگر کوئی شخص واقعی اتنا ممتاز ہے کہ اسکی زندگی اور سیرت کے حالات یادگار کے طور پر دنیا کے مفاد کے لئے قلمبند کئے جائیں تو دنیا کو اس کی سیرت کے اندرونی روابط اور سرچشموں سے بھی آگاہ کرنا چاہئے۔ دنیا کو یہ بتایا جانا چاہئے کہ دنیا اور حیات انسان، خود اس شخص کے معاشری مقام اور نقطۂ نظر سے، اس کے ذہن پر کس طرح ظاہر ہوئیں۔ گرد و پیش کے موقت حالات نے باہر سے خود اُسے اور

اندر سے خود اس نے موقت حالات کو کس طرح متاثر کیا۔ کن کن کوششوں اور کتنی قدرت سے اس نے واقعات پر غلبہ کیا اور کتنے مقابلے اور مصائب کے بعد اُن سے مغلوب ہوا۔ مختصر یہ کہ اس نے سماج پر کیا اور کس طرح اور سماج نے اس پر کیا اور کس طرح اثر کیا۔ تذکرے کا جو مصنف اپنے موضوع کے متعلق ان سوالوں کا جواب دے سکیگا وہ تذکرے کا اعلیٰ نمونہ پیش کر سکے گا۔ بہت کم افراد اس نوع کے مطالعہ کے مستحق ہوتے ہیں۔ بہت سے تذکرے لکھے جائیں گے اور حیرتیں دور کرنے کے لئے لکھے جانے چاہئیں لیکن جو اس معنی میں تذکرے نہیں وہ پڑھے اور فراموش کر دئے جائینگے" شہباز کا تذکرہ اسی قبیل کی کتاب ہے جو ایک مرتبہ پڑھ کر فراموش کر دی جاتی ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اس تالیف کا کوئی مرتبہ نہیں یا اب اس موضوع پر مزید کام نہیں کیا جا سکتا۔ نظیر کی سیرت نگاری وہ موضوع ہے جس کا سرچشمہ کبھی خشک نہیں ہو سکتا۔ امتداد زمانہ کے ساتھ اس میں نئے نئے سوت پیدا ہوتے چلے جائیں گے اور دنیا پر نئی نئی حقیقتیں منکشف ہوتی رہیں گی۔

کوئی عیب کتنا ہی مذموم ہو اگر عادت بن جائے تو استواری کی بنا پر اس کی داد دینی پڑے گی۔ انسان کی مردہ پرستی داد دینے بلکہ قسم کھانے کے قابل ہے۔ ایک صاحب نے دوسرے سے پوچھا کہ فلاں صاحب کب مر گئے۔ دوسرے نے کہا وہ تو زندہ ہیں تم نے مردہ کیسے سمجھ لیا۔ انھوں نے کہا لوگ ان کی تعریف کر رہے تھے۔ یہ مزاحیہ لطیفہ نفسیات کا آئینہ ہے۔ ایک استعارہ ہے جس میں انسانی سیرت بالخصوص ہندوستانی معاشرت کا ایک راز مخفی ہے۔ مردہ پرستی انسان کا عام رویہ ہے۔ زندگی میں سرد مہری برتنے کی تلافی قبر پر پھول یا آنسو چڑھا کر کر دی جاتی ہے لیکن نظیر کو ابتک اس حق سے بھی محروم رکھا گیا۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ سوسائٹی کے موجودہ نظام میں یہ غیر معمولی بات نہیں کہ کوئی صاحبِ فطنت روٹی مانگے اور اس کے پتھر مارا جائے۔ ہماری سوسائٹی میں اس سے زیادہ ہوا ہے ہنرمندوں کو صرف روٹی مانگنے کے قصور پر پتھر مارے گئے ہیں اور بے ہنروں کو مالامال کر دیا گیا ہے۔ لیکن نظیر کے ساتھ اس سے بہت زیادہ ہوا۔ اس نے خود روٹی کا مطالبہ نہ کیا اور سوسائٹی کے بھوکوں کو قناعت اور غیرت مندی کا سبق بھی پڑھایا پھر بھی اس کو پتھر مارا گیا۔ انیسویں صدی کی ہندوستانی حق ناشناسی نے اپنے صاحبانِ کمال کو سبک سمجھا اور خود موقت سماج ان کے خفیف کرنے پر آمادہ رہا۔ اس رویے کا تجزیہ کیا جائے تو غفلت، حسد اور خود بینی تہ میں نظر آئیں گی۔ غفلت، قومی مفلسی اور بے حال دپری کا دوسرا نام ہے، لیکن حسد اور خود بینی دو رکیک جذبے ہیں جو پست اور بے مغز ذہنوں میں عدم تربیت سے پیدا ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ان امراض میں مبتلا رہنے والی ادبی ذہنیت نے جس کے نمایندوں کی اس دور میں کمی نہ تھی کمال سے نہ صرف اذیت محسوس کی بلکہ کمال کے اعتراف کو اپنی پستی کے اعتراف کا مترادف جانا۔ ہر اہلِ کمال سے اس کی زندگی میں طرح طرح کی بے اعتنائی برتی اور مرجانے کے بعد جب ان خود ساختہ حریفوں کے دلوں میں کھٹکنے والا کانٹا نکل گیا اور چھپائے نہ چھپنے والا کمال بہ زعم خود سدِّ راہ نہ رہا

تو اطمینان کے جذبے نے رستگاری کی سانس لے کر دنیا ساز تحسین ناشناس کی شکل اختیار کی جو اصل میں مذمت سے بدتر ثابت ہوئی۔ ہندوستان میں اس نوع کی نوازش و پذیرائی کی مثالیں کثرت سے موجود ہیں۔ چنانچہ نظیر سے بھی بقدر کمال یہی سلوک کیا گیا۔ اہلِ کمال کی تحسین کا غلغلہ پہلے اُن کے گرد و پیش بلند ہوتا ہے لیکن نظیر کے گرد و پیش وہ سوسائٹی تھی جس کے قویٰ قدامت پسندی، تنگ نظری اور بدمذاقی کی فولادی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ ان زنجیروں کو صرف انقلاب کی سخت آگ پگھلا سکتی تھی اس لئے نظیر کے کمال کو انقلاب کا انتظار کرنا پڑا۔

مشاہدے نے ثبات کو عنقا کا مترادف ٹھیرایا ہے لیکن جب اس کلیے کے دوسرے رخ پر نظر ڈالی جاتی ہے تو یہ حکمت بے نقاب ہوتی ہے کہ ؎

ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

تغیر ایک ایسی مرئی حقیقت ہے جو ہر قدم پر بہ جبر اپنا احساس کراتی ہے۔ خیالات، محسوسات، مراسم، معاشرت، ذوق، وجدان، حکومت، سیاست، مختصر یہ کہ زندگی کا کوئی پہلو اور شعبہ تغیر کے اثر سے محفوظ نہیں۔ قدروں کا تغیر، زندگی کے تنوع کا باعث اور ترقی کی معجز نمائی کا ذمہ دار ہے۔ سیاست کا وسیع میدان تغیر کی محبوب آماجگاہ ہے۔ لیکن سیاست کے میدان میں اس کی سحر کاریاں اتنا متحیر نہیں کرتیں جتنا ادبیات کے دائرے میں کرتی ہیں۔ تغیر سیاست کی فطرت کا جزو ہے لیکن جب اس کا جادو فنونِ لطیفہ خصوصاً شعر و ادب کی دنیا میں چلتا دیکھتے ہیں تو حیرت کی انتہا نہیں رہتی۔ ادب کے معیار اٹل اور قدریں مستقل ہونی چاہئیں لیکن نشو و نما کے اُصول بتاتے ہیں کہ ادبی قدریں بھی گھٹتی بڑھتی اور بدلتی رہتی ہیں اس خصوص میں سیاست اور ادب ایک ہی سطح پر نظر آتے ہیں لیکن ایک نازک مگر بین فرق موجود ہے جس سے ادبیات کی فطری عظمت پر روشنی پڑتی ہے۔

وہ فرق یہ ہے کہ جب سیاسی قدریں بدلتی ہیں تو اترا شحنہ مردک کہلاتا اور رہا تما شیطان بن کر رہ جاتا ہے۔ لیکن ادب کے مندر کا پجاری کبھی مردود نہیں ٹھہرتا۔ ایک نوع کے ادب کا دور ختم ہونے پر دوسرے کے علمبردار، پہلے کے مبلغوں کو متہم نہیں کرتے، کم سے کم ان کی نیت پر شبہ نہیں کیا جاتا۔ مذاق کا تغیر انھیں صرف کہنگی کے غلاف میں لپیٹ کر طاقِ نسیاں پر رکھ دیتا ہے اور بس۔ ان دونوں صورتوں کی مثال حسنِ اتفاق سے ایک ہی ذات میں جمع ہے۔ مسلم سوشلسٹ جماعت سرسید کو ایک سیاسی رہنما کی حیثیت میں آج غدار بتاتی ہے لیکن طرزِ تحریر میں عظیم الشان انقلاب ہو جانے اور سرسید کا اندازِ نگارش مسلماً نامطبوع ہو جانے کے بعد بھی کوئی نقاد سرسید کی انشا کو بدنیتی یا گمرہی کی پیداوار نہیں بتاتا۔

چنانچہ قدروں کا تغیر جب ادبیات کے سمندر میں شدید تلاطم برپا کرتا ہے تو مقبول گمنام اور گمنام مقبول ہو جاتے ہیں۔ صرف یہی ہو کر نہیں رہ جاتا۔ اس سے اہم تر نتائج رونما ہوتے ہیں۔ بعض ایسی ہستیاں منظر عام پر آ جاتی ہیں جن کی

صحیح اہمیت کا اندازہ کبھی کیا ہی نہیں گیا بلکہ جس کے احساس کی اہلیت ہی سرے سے مفقود ہوتی ہے۔ یہ وہ جواہر ہوتے ہیں جو تعصبات کی کثافت جل چکنے کے بعد اپنی تابانی سے نگاہوں کو روشن اور قلبوں کو منور کر دیتے ہیں۔ ✓

ہمارا عہد، انقلاب کا عہد ہے۔ تغیر کا آوازہ بلند ہے۔ وقت نظر ہمہ ادارے کا جائزہ لے رہی ہے۔ اعتقاد و عقیدتمندی کی فرسودہ راہوں سے ہٹ کر نقد و بصیرت کی جدید شاہراہیں بنائی جا رہی ہیں۔ قدریں بدل رہی ہیں۔ چھان بین قطع و برید شست و شو کا بازار گرم ہے۔ پرانے معیاروں کے بوسیدہ ایوان ڈھا کر تحقیق و تجسس کی پختہ بنیادوں پر نئے خیالات کے حیات پرور محل تعمیر کئے جا رہے ہیں۔ معاشرت و معتقدات کے پہلو بہ پہلو جب اُردو ادب کا احتساب کیا جاتا ہے تو نشاطِ حیات کا جلوہ مفقود اور توہمات کے دوش بدوش، تصنع روایت پرستی اور پاس نوازی کا بھیانک منظر بے نقاب ہوتا ہے۔ غائر نظر ڈالی جاتی ہے تو پتہ چلتا ہے کہ خود وہ کسوٹی جس پر ہم کھوٹا کھرا پرکھنے کے عادی رہے ہیں معطل ہو چکی ہے۔ جمود کی سمیت نے ذوق کی رگ و پے میں سرایت کر کے امتیاز اور فیصلے کی قوتوں کو مضمحل کر دیا ہے۔ پیمانے آبِ حیات کی جگہ زہر آب سے لبریز ہیں۔ زندگی کے نغمے کے نام سے موت کا نوحہ پڑھا جا رہا ہے۔ بقائے حیات کی یہی ایک تدبیر رہ گئی تھی کہ کسوٹی ریزہ ریزہ اور پیمانے چور کر دئے جائیں۔ چنانچہ اہل نظر اس پر مجبور ہوئے اور فوری تغیر رونما ہوا۔ جب نئے معیار پر پرکھا گیا تو رائج الوقت سکوں کی کثیر تعداد جس پر صحت و سند کے طغرے کندہ تھے جنس کاسد نکلی۔ اہم شخصیتیں جن کی اہلیت مسلم اور شہرت لازوال سمجھی جاتی تھی پست و لایعنی نظر آئیں اور ٹکسال باہر ہو گئیں۔ نقد کے امتحان میں سوائے معدودے چند کے کوئی پورا نہ اترا۔ لیکن اس الٹ پلٹ نے یہ کار فرمائی کی کہ اُن شخصیتوں پر جنھیں زمانے نے فراموش کر رکھا تھا نگاہیں پڑنے لگیں۔ ڈھونڈھنے والوں کی بلند پروازیوں سے وہ حسین ترین پھول نہ چھپ سکے جو سب سے اونچی چوٹی پر کھلے ہوئے تھے۔ آخر افق بعید پر گمنامی و کس مپرسی کے کالے بادلوں کے اندر، ایک سورج کی دھندلی شعاعیں جھلکنے لگیں۔ زمانہ کی جوہر شناسی کا غبار ایک صدی سے زیادہ کی مسلسل کوشش میں نظیر کا شاعرانہ جمال چھپائے نہ چھپا سکا۔

٥ کہا جاتا ہے کہ نظیر (۱۷۳۰ ــــــ ۱۸۳۰ء) محمد شاہ کے عہد سے اس عہد کی ابتدا تک جسے تاریخ، دور مستقبل میں عہد انقلاب کہیگی گمنام رہا۔ اس کی گمنامی، اس کی شخصیت اور شیکسپیر کی زندگی کے حالات کی طرح ایک عظیم الشان راز ہے جس کا مفہوم سمجھنا ضروری ہے۔ یہ گمنامی اس شخصیت کی گمنامی ہے جسے ایک صدی سے زیادہ کی طویل بے اعتنائی صفحۂ ہستی سے مٹانے اور ذہنوں سے محو کرنے میں کامیاب نہ ہوئی۔ زبان کے مورخوں کی عدم توجہی اور نقادوں کے استہزا کے باوجود جس شاعر کا کلام مسلمہ ناموروں کے دوش بدوش درس میں داخل، بے نواؤں اور گداگروں کو حفظ اور مثالوں اور کہاوتوں کے طور پر ورد زبان ہو جس کی پوری پوری نظمیں عطف و اضافت کی صحت کے ساتھ، ستر اور اسی
٦ برس کے ناخواندہ بوڑھوں کو یاد ہوں اور جو انھیں تبرکاً بتبرک کر عام جلسے میں گاتا آج بھی اپنا فخر سمجھتے ہوں جس کے صرف نام سے بسنت کے جشن میں دو ہزار ہندو مسلم، سکھ اور عیسائی فرقہ وارانہ کشمکش کے اس ملعون دور میں جمع

ہو جائیں، جس کی قبر پر عقیدت مند جُھلا چراغی چڑھا کر منت مانگیں اور اہلِ نظر پرستار پھولوں کے ہار گجرے چڑھائیں اس کی گمنامی ضرور ایک اہم راز ہونی چاہئے۔ اگر آپ اُردو زبان کے شاعروں کے کلیات، دیوان اور منتخبات کے مختلف قلمی اور مطبوعہ نسخے جمع کرکے یہ فیصلہ کرنا چاہیں کہ سب سے زیادہ متنوع اشاعتوں میں کس کا کلام مفید ہے تو آپ کو سرِ دفتر اسی گمنام شاعر کا نام ملیگا جسے مغرب کے مبصروں نے اُردو کا واحد شاعر تسلیم کیا ہے۔ ان شہادتوں کے بعد آپ حیرت میں پڑکر نظیر کی گمنامی کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ نظیر کے باب میں گمنامی کا لفظ اصل میں ایک اضافی لفظ ہے جو صرف نظیر کی ذات کی نسبت سے اپنے اندر معنی رکھتا اور اپنے مفہوم کا حامل کہا جا سکتا ہے۔ شہرت کی جو مقدار نام نہاد گمنامی میں نظیر کا حصہ رہی وہ کسی بڑے شاعر کے لئے مباہات کا موجب بن سکتی ہے لیکن خود نظیر کی ذات کے لئے گمنامی کی مترادف ہے۔ شہرت کے عام معنی میں نظیر پر اس لفظ کا اطلاق نہیں ہوتا۔ اس کی شخصیت عام امتیازات کی دسترس سے بالاتر ہے۔ دوسرے شاعروں کی ناموری کی حدیں جہاں ختم ہوتی ہیں وہاں سے نظیر کی ابتدا ہوتی ہے۔ نظیر کو جب گمنام کہا جائے تو مطلب یہ سمجھنا چاہئے کہ بقدرِ کمال اس کی فطنت کی داد نہیں دی گئی۔

کمال خواہ نظیر کا ہو یا کسی دوسرے کا سراہنے کا محتاج نہیں۔ مقبولیت اور گمنامی دونوں حالتوں میں کمال کی ذاتی قدر برقرار رہتی ہے۔ موتی جوہری کے گلاس کیس اور سمندر کی تہ دونوں جگہ موتی رہتا ہے۔ ہاں فرق یہ پڑتا ہے کہ گمنامی کی حالت میں نوعِ انسان کمال سے کسبِ منفعت نہیں کر سکتی اور اس کی اخلاقی و روحانی تربیت سے محروم رہتی ہے۔ لیکن کمال جب بروئے کار آجاتا ہے تو اس کی نمایش کسی ذاتی یا فطری تغیر کی وجہ سے نہیں بلکہ نظروں کے تغیر کے باعث ہوتی ہے۔ اُنیسویں صدی کے آخری دو اور بیسویں کے پہلے ربع کی عام ہندوستانی آنکھیں نظیر کے کمال کے جوہر پرکھنے سے قاصر تھیں۔ آبِ حیات کے مصنف نے اگر نظیر کو نظرانداز کیا تو اس سے نظیر کی بے کمالی یا آزاد کی جوہر ناشناسی ثابت نہیں ہوتی۔ جو ثابت ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ خود نفسِ ذوق میں اتنا بلوغ پیدا نہ ہوا تھا کہ آسمانِ شعر کے انتہائی منازل میں اڑان بھر سکتا۔

نظیر کو سمجھنے کے لئے اس کے ماحول کا جایزہ لینا ضروری ہے ہر فطین اپنے تاریخی و سیاسی، معاشری و اخلاقی ماحول کی مخلوق ہوتا ہے۔ ماحول کا اثر موافق اور مخالف دونوں صورتوں میں رونما ہو سکتا ہے۔ اب یہ متعین کرنا پڑے گا کہ نظیر کو ماحول نے کس طرح متاثر کیا۔ اس بزرگوار کا طریقہ کار یہ ہے کہ اس نے شعر کے عصری ادارے کے خلاف بغاوت کرکے، اپنا ادارہ خود قایم کیا۔

اس جدت طرازی کا ثبوت اور اس کی اہمیت کا اندازہ جب ہو سکتا ہے جب نظیر کے کلام کا اُس کے متقدموں اور حریفوں کے کلام سے تقابل کیا جائے۔ اس نوع کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ نظیر کے عہد کی شاعرانہ فضا،

اُس جیسی فطنت کی خلقت کے لئے بہ ظاہر سخت ناموزوں تھی۔ لیکن فطرت کو کلیہ توڑنا یا استثنا سے اس کا ثبوت مقصود تھا اس لئے نظیر کو تصنع کا مخالف اور واقعیت کا علمبردار بنا کر بھیجا۔ زمانے کے لحاظ سے وہ سودا (۱۷۱۳ — ۱۷۸۱)، میر (۱۷۲۲–۱۸۱۰)، جرات (۵ — ۱۸۱۰)، انشا (۵ — ۱۸۱۷) اور مصحفی (۱۷۵۰ — ۱۸۲۴) کا معاصر تھا۔ اُردو شعر کی دنیا میں ان ناموں کی عظمت مسلم ہے، لیکن ذرا سی ادبی بصیرت بتا دیتی ہے کہ ان کے کلام کی قسم ایک ہے رنگ و اسلوب کے ہلکے ہلکے تنوع سے قطع نظر کر کے، ان اُستادوں کے کلام میں کوئی بنیادی فرق نظر نہیں آتا۔ اس کی وجہ مشترک یہ ہے کہ ان کے افکار حقیقت سے اتنے ہی دور ہیں جتنے تصنع سے قریب ہیں۔ زندگی کی آئینہ داری ان کے یہاں قریب قریب نہ ہونے کے برابر ہے۔ قدامت کے شیدائی اس بیان پر کان کھڑے کریں گے مگر میں اپنی دانست میں نہ کوئی بری بات لکھ رہا ہوں، نہ ان ذاتوں کے باب میں سوئے ادب مقصود ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان سب حضرات کا نقطۂ نظر ایک ہی تھا۔ ان سب نے دنیا اور زندگی پر بالکل نظر نہ ڈالی۔ ہاں زندگی کے ناپیدا کنار سمندر کے ریتیلے ساحل پر کھڑے ہو کر چند سنگریزے اُٹھا لئے اور ان ہی کو اُلٹتے پلٹتے رہے۔ جذبات کی غیر محدود فضا میں سے صرف محبت اور ایک نوع خاص کی محبت کو چُنا اور اس کے صرف ایک رُخ کو ایک زاویۂ نگاہ سے دیکھا۔ چنانچہ عام طور پر محبت کا ایسا خود ساختہ، پُر تصنع اور دوراز کار منظر پیش کیا جسے آپ بال کی کھال کھینچنا کہہ کر، اُردو کے فن کے اعتبار سے کتنا ہی قابل داد سمجھیں، لیکن خود زندگی اُسے اپنا تسلیم نہیں کرتی۔ موضوع اس قدر تنگ و مختصر تھا کہ محنت و جانفشانی، ذہانت اور کمال کے ساتھ متحد ہو کر اُسے زیادہ شگفتہ نہ کر سکیں۔ سعیٔ بلیغ کے بعد جو شگفتگی پیدا ہوئی وہ اتنی سطحی اور عارضی تھی کہ موقت سوسائٹی کا کھلونا بن کر رہ گئی مشاعروں میں گرمیٔ محفل پیدا کرنے کے سوا اس کا کوئی مصرف نہ سمجھا گیا۔ کم و بیش سارے اساتذہ کا انداز بیان، اسلوب نگارش، بندشیں، ترکیبیں، تشبیہیں، استعارے یکساں ہیں۔ سب کے ہجر و فراق، راز و نیاز، شکوے اور گلے کا ایک ہی انداز ہے۔ سب کے جذبات، محسوسات اور ذہنی روشیں مماثل ہیں۔ سب کی محبت، وجدان، تخئیل ہم رنگ ہے۔ سب نے تغزل کو سراہا اور تغزل کو تکلف بنا کر اپنی روح کی گہرائیوں کی نمائش کا وسیلہ قرار دیا۔ غرض ان سب کی ترکیب شعری کے جملہ اجزاء، ایک سانچے کے ڈھلے ہوئے پرزے ہیں۔ سب کا ماخذ، سب کی صورت، سب کا مدعا ایک ہی ہے ان سب شعراء اور ان کے رنگ کا اتباع کرنے والوں کا ذوق علیل، فکر محدود اور تخیل مقید معلوم ہوتا ہے۔ ان کو ایک ہی جنس کے مختلف نمونے کہنا صرف حقیقت کا اظہار ہے۔ پس اس فضا میں جو شاعر پیدا ہوا سے ایسا ہی ہونا چاہیے لیکن نہ ہو تو اسکی جنس کا اختلاف تسلیم کرنا پڑے گا۔ جنس کا فرق اساسی فرق ہے اور بے شبہ قدرت، شخصیت اور فطنت کی موجودگی کی اٹل شہادت ہے۔ نظیر کی "بے راہ روی" نے اُس کے لئے "سر راہے" پیدا کر دیا جس پر قدم زن ہو کر اس نے آپ اپنی شاہراہ بنالی۔ میر و سودا کے ماحول میں نظیر، ذوق، مومن کے ماحول میں غالب، آتش و ناسخ کے ماحول میں انیس اور داغ و امیر کے ماحول میں اکبر جیسی شخصیتوں کا پیدا ہونا صریحی خرق عادت ہے۔ لیکن ایسا منظم مظاہرہ جیسا نظیر نے کیا

بہت کم ہوا کرتا ہے۔ معجزہ فطرت کے انتہا پسند مظاہر میں سے ایک شدید آڑ کار ہے۔ اس کی حدیں عرفان و انکار کی آخری حدوں سے ملی ہوئی ہیں۔ فطرت جب خود دخل دینا چاہتی ہے تو قیامت سے کم برپا نہیں کرتی۔ فطنت کا آوازہ تائیدی نوا نہیں ہوتا۔ نظیر اور اُردو شعر کی دنیا کا پہلا باغی ہے جس نے تحریک انقلاب کا سنگ بنیاد رکھا۔ یہ نظیرؔ، غالبؔ، انیسؔ اور اکبرؔ کا متحدہ اثر ہے جس نے نادر کاکوروی، سرور جہاں آبادی، اقبالؔ، صفیؔ، مانیؔ جائسی، فانیؔ اور جوشؔ جیسے صاحبان فکر و بصیرت شعرا اُردو میں پیدا کئے جنھوں نے پرانی روش کو ترک کر کے فطرت، انسان اور زندگی کا غائر مطالعہ کیا۔

اُردو شاعری کو حزن و یاس کا ثمر بتایا جاتا ہے۔ یہ الزام صداقت سے زیادہ دور نہیں ہے۔ اس کا سبب تلاش کرنے کے لئے بھی زیادہ کاوش درکار نہیں۔ جس زمانہ میں اُردو نے عہد طفولت سے نکل کر شباب کے میدان میں قدم رکھا، اسی زمانہ میں بدیشی حکومت اور تمدن کا ملک میں عمل دخل ہو گیا۔ غیر قومی حکومت کے اثر سے، محکوم قوم کے قویٰ میں جو اضمحلال پیدا ہو جاتا ہے اس کے نتائج و اقتضا پر بحث کرنے کی یہاں ضرورت نہیں۔ یہ بتانا کافی ہے کہ اُردو کا نشو و نما اس عہد میں ہوا جو سیاسی، ذہنی، اخلاقی اور تمدنی اعتبار سے ملک کے تنزل کا عہد تھا۔ ان حالات میں جو شعر کہا جائے گا وہ جا بجا طور پر امید سے خالی اور یاس سے لبریز ہونا چاہئے۔ محکوم قوم کا ولولہ سرد، جوش مفقود، ہمت پست اور خیالات سطحی ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اولوالعزمی کی بجائے خوشامد اور چاپلوسی سے کام نکلتا نظر آتا ہے۔ شاہراہیں پُرخطر اور پگ ڈنڈیاں محفوظ معلوم ہوتی ہیں۔ دلوں کی کمزوری کا یہ عالم ہو جاتا ہے کہ سچی بات زبان پر لاتے کلیجہ منھ کو آتا ہے۔ یہ سب حالتیں اُردو بولنے والوں پر بدرجۂ اولیٰ طاری ہوئیں۔ اس لئے شعر نغمۂ شادی نہ بنا نوحۂ غم ہو کر رہ گیا۔

صرف ایک نظیرؔ کے کلام میں امید، مسرت اور زندگی کی رَو دوڑتی محسوس ہوتی ہے۔ ماضی و مستقبل سے زیادہ حال اس کے پیش نظر ہے۔ چنانچہ ایک غلام قوم میں نظیرؔ جیسی آزاد روح حریت پسند طبع کا پیدا ہونا تعجب سے خالی نہیں۔ لیکن اسکے اسباب دو وجوہ ہیں۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ نظیرؔ کی زندگی اس عہد میں بسر ہوئی جس میں محکومیت کی بنیادیں راسخ نہ ہوئی تھیں۔ دوسری یہ ہے کہ فطرت کو نظیرؔ کی ذات سے خرقِ عادت کا کام لینا مقصود تھا۔ اس لئے غم نوائی کے مقابل اُسے خوشگو بنا کر بھیجا۔ اُس کے کلام میں اُردو شعرا کے عام رویے کے خلاف قنوطیت کی جگہ رجائیت، یکسانی کی جگہ بوقلمونی۔ فرسودگی کی جگہ غرابت، تصنع کی جگہ سلاست اور پیوست کی جگہ گھلاوٹ قدم قدم پر نمایاں ہے۔ طرفہ نگاری کا یہ زور ہے کہ بیان کے ہزارہا اسالیب خود وضع کر ڈالے۔ موضوع کے تنوع کا یہ جوش ہے ساری دنیا اس کے احاطۂ خیال و نظر میں مقید ہے۔ نصیحت میں سعدیؔ کی سی شیرینی اور رموز کی عقدہ کشائی میں حافظؔ کی سی حقیقت بیانی کے انداز پائے جاتے ہیں۔ جہاں زندگی پر نظر ڈالی ہے وہاں شیکسپیر کی یاد تازہ کر دی ہے۔ جہاں قدرت اور مناظر قدرت سے ہم آہنگی کی ہے وہاں ورڈسورتھ کے سے مرقعے بنا کر زندۂ جاوید کر دئے ہیں۔ تفلسف میں غالبؔ و بیدلؔ اور تغزل میں انوریؔ و عرفیؔ کی ہم طرحی دکھائی ہے۔ مگر ان سب سے نرالی ایک اور بات ہے اور وہ یہ کہ ان سب اور ان سے بہت زیادہ اجزاء کے مجموعے پر ایک خاص اور بالکل نیا رنگ

چڑھا ہوا ہے جس کا نام نظیر اکبر آبادی کا رنگ ہے۔ لارڈ مورلے نے ادیب کی تعریف میں بتایا ہے کہ ادیب وہ ہے جس میں مشاہیر کی ساری نمایاں خصوصیتیں موجود ہوں اور جن کی آمیزش سے مگر ان سب سے الگ تھلگ ایک نئی خصوصیت پیدا کرلے جسے خود اس کی ذات سے منسوب کیا جاسکے۔ نظیر میں یہ امتیازی شان سورج کی طرح چمکتی اور کلام پر چھائی ہوئی نظر آتی ہے۔ اسے آپ نظیر کا اسلوب، رنگ یا انداز کچھ کہہ لیجئے مگر یہ وہ حسن ہے جو بیشتر متقدمین یا متاخرین کے کلام میں ڈھونڈے نہیں ملتا۔ اسی کی موجودگی نظیر کو مجدد کہے جانے کا مستحق بناتی ہے۔

نظیر نے شعر کو زندگی سے اتنا قریب کردیا ہے کہ زندگی کے تمام پہلوؤں کا عکس شعر میں نظر آتا ہے۔ لیکن یہ حیرت انگیز ہے کہ اپنے دائرۂ نظر کو اتنا وسیع کرنے پر بھی اس نے زندگی پر تمسخر کرنے سے ہمیشہ گریز کیا۔ زندگی کی تلخیاں سہل انگاری و خوش باشی کی نقاب میں چھپائے رکھیں۔ طعن و تشنیع کے تیر و پیکان اس محب انسان نے قلب انسان کے لئے غیر ضروری حربے سمجھے۔ سرزنش کا کام جہاں تک بس چلا فہمایش سے لیا۔ فہمایش جتنی خوش آیند ہوتی ہے اتنی مؤثر بھی ہوتی ہے۔ موسیقی کا روح سے فطری علاقہ ہے۔ بہت سے مذہبوں نے راگ کو خدا رسی کا وسیلہ قرار دیا ہے۔ نظیر نے اپنا کلام موسیقی کے تراق میں سمویا۔ نغمے کے پروں پر سوار ہوکر کلام کی دلنوازی اثر کے آسمان کی انتہائی بلندیوں تک پہونچ گئی۔ نہ صرف عوام و خواص کے دلوں پر نقش ہوا بلکہ ہزاروں فقیروں، آزادوں، قلندروں اور مداریوں کو حفظ ہوگیا۔ آج بھی آگرہ اور مضافات میں کم سے کم سو میل کے دائرے کے اندر سوسائٹی کا کوئی طبقہ نہیں جہاں نظیر کے کلام کو کسی نہ کسی عنوان سے درخورِ نہ ہو مقنن قانون اور مصور تصویر بناتا ہے۔ نظیر اردو کا پہلا شاعر ہے جس نے زندگی کے گیت بنائے اور ایسے گیت جو سوسائٹی کے اخلاق کے تحفظ کے لئے قانون اور تصویر سے زیادہ ضروری تھے اور جو زندگی کے زخموں کا مرہم بن کر رہ گئے۔ اس کے شعر میں ہر دل کا درد اور اس کی لے میں ہر قلب کی زبان موجود ہے۔

دنیا میں چراغ سے چراغ جلا کرتا ہے۔ دوسرا، پہلے سے سیکھ کر تیسرے کو سکھاتا ہے۔ خیالات کے نشوونما اور سوسائٹی کی درجہ بدرجہ ترقی کا عام اصول یہی ہے۔ لیکن بعض شخصیتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو کسی سے اپنا چراغ نہیں جلاتیں خود اپنی ذات کی فطری درخشانی کے باعث سب سے الگ تھلگ چمکتی ہیں۔ نظیر نے اپنا چراغ کسی سے نہیں جلایا۔ اس کی فطرت اور بصیرت اس کی رہنما بنیں۔ وہ صحیح معنی میں تلمیذ الرحمان تھا۔ نہ اس کا کوئی اُستاد تھا نہ اس نے اپنا مخصوص انداز بیان اور طرزِ شعر کسی سے سیکھا۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہنا پڑتا ہے کہ اس نے کسی کو کچھ سکھایا بھی نہیں۔ ازل سے ہر فطن کا یہی رویہ رہا ہے اور ابد تک یہی رہیگا۔ نظیر اپنے رنگ کا خود ہی موجد تھا اور اپنی ہی ذات پر خاتمہ کرگیا۔ اس لئے اس کا کلام اگر تمام و کمال کسی کے حمائل نہیں تو تعجب کا مقام نہیں۔ لیکن جب سماج کا بھونڈا یا ناتراش فن نقادی اپنے محدود معیار کے مطابق اسکے کلام پر نقد کرنے بیٹھا تو ہر کس و ناکس کو طرح طرح کی خامیاں نظر آنے لگیں۔ خود ان نقادوں کے فہم کی رسائی چند خود ساختہ اصولوں کی دیوار تک تھی۔ انگلستانی نقادی کے فن کا غائر مطالعہ نہیں کیا گیا تھا۔ اس لئے جس نے خود دیوار کی بلندی

سے بلند ہو کر شعر کہا اس کے جانچنے کے لئے معیار میسر نہ آیا۔ مجبوراً قدما سے تقابل کیا گیا تو جنسی اختلاف سامنے آیا۔ آخر مذموم قرار دیکر رد کر دیا۔ یہ پہلی اُصولی غلطی تھی جو نظیر کے سمجھنے یا سراہنے میں کی گئی۔ ضرورت اس کی تھی کہ پہلے نظیر کے نظریہ کا جائزہ لیا جاتا اور خود اس کے وضع کردہ نقطۂ نظر کے حدود کے اندر اس کے کلام کے محاسن و معائب کو سمجھا اور جانچا جاتا۔

نیا آرٹ پرکھنے کے لئے نیا معیار سامنے ہونے کی حاجت تھی۔ اس لئے نظیر کا تقابل کسی سے ممکن اور جائز نہ تھا۔ اس سے انکار نہیں کیا جاتا کہ اس کے بہت سے صوری و معنوی اجزا متقدمین و متاخرین سے مشابہ ہیں، لیکن چونکہ مشابہت جزوی اور فرق زیادہ ہے اس لئے مشابہت کو اہمیت نہیں دیجا سکتی۔ ہاں بعض انگریزی شعراء سے تقابل ممکن ہے۔

جہاں تک اُردو زبان متعلق ہے، نظیر خود ایک ٹائپ یا نمونہ ہے جس کا مثل موجود نہیں۔ وہ مقلد یا پیرو نہ تھا بلکہ اُسے خلاقانہ فطرت ودیعت کی گئی تھی۔ موضوع کی خلاقی، معنی کی خلاقی، اسالیب کی خلاقی اس کا حصہ ہے۔ آج یورپ میں نیا خیال، نئے انداز میں پیش کرنے والوں کا بڑا درجہ ہے۔ وہ قوم کے چشم و چراغ اور انسان کے محسن سمجھے جاتے ہیں۔ نظیر نے صناعت شعر کا نیا انداز اور خیال کی پرواز کے لئے جدید فضا پیدا کی مگر ہندوستان کے ارباب علم و فن نے اس کے اختراع پر التفات بھی نہ کیا اور جنھوں نے کیا انھوں نے غلط زاویۂ نگاہ سے دیکھا۔ نظیر نے زندگی کی دشواریوں کو سہولتوں سے بدلنے کی تدبیریں بتائیں، سوسائٹی کے کان پر احسان مندی کی جوں بھی نہ رینگی۔ احسان مندی درکنار ابتذال کا الزام عاید کیا گیا۔ نظیر نے اپنی اخلاقی خدمت کا کوئی صلہ نہ مانگا مگر سوسائٹی نے از خود یہ صلہ دیا کہ قعر ذلت میں دھکیلنے کی کوشش کی۔ ان سب موانع کے باوجود، نظیر کی بے نظیر ندرت جو ایک الہامی نعمت تھی چھپنے والی چیز نہ تھی۔ وہ جس حال میں رکھی گئی ضوفشاں اور جاذب نظر رہی۔ آج وہی نام نہاد ابتذال اُردو زبان، اُردو شعر اور قومی نقطۂ نظر کی نشاۃ ثانیہ کا سنگ بنیاد بن رہا ہے

کہا جاتا ہے کہ اہل کمال کے مصنوعات میں ان کی شخصیت کا مکمل عکس ہوتا ہے۔ ان کی صناعت ان کے نفس کا آئینہ ہوتی ہے۔ اُردو کے بیشتر شعرا میں یہ خصوصیت نظر نہیں آتی۔ نظیر اس خصوص میں بھی فرد ہے۔ اس کے کلام سے اس کی شخصیت پھٹی پڑتی ہے اس کی فقیرانہ زندگی اور معلمی پیشہ اس کی روح کے استغنا، ذہن کی وسعت اور قلب کی طمانیت کے اٹل ثبوت ہیں۔ یہ سب کیفیتیں بغیر بتائے کلام سے صاف ظاہر ہیں۔ جس شاعر کا نفس ایسے پاکیزہ اجزا سے مرکب ہو۔ وہی دولت و ثروت، راحت و آرام، حکومت و اقتدار، عظمت و شکوہ، جاہ و جلال کو ٹھکرا کر گوشۂ عافیت اختیار کر سکتا ہے لیکن دنیا اور علایق دنیا سے منہ موڑ لینے پر بھی اس کا دل زندہ اور آنکھیں کھلی رہتی ہیں۔ وہ دنیا سے بے خبر ہو کر نہیں بیٹھتا اس کی بصیرت ہمہ وقت بیدار رہتی ہے۔ دنیا کو ہیچ سمجھتا ہے مگر اس کے سارے رموز و نشیب و فراز سے واقف ہے اور ایک ایک پر کھل کر نقد کرتا ہے۔ نیم کے تلے بیٹھنے والا مفلس چتر شاہنشہی کا درجہ درخت کے سائے سے بلند نہیں سمجھتا۔ وہ دنیا کے گردن کشوں اور دولت کے نشے میں چور رہنے والے قارون جاہوں پر رحم کھاتا ہے۔ رحم کھانے کی

دلیل یہ ہے کہ انھیں خواب غفلت سے جگانے کے لئے جھنجھوڑتا ہے۔ اس کی ہمدردیاں شاہ و گدا کے ساتھ یکساں ہیں۔ ایک طرف دولتمند کی 'مسوں پر اس کی نظر پڑتی ہے تو دوسری طرف مفلس کی کوتاہیاں اس کی نظر کے سامنے ہیں۔ نظیر کا نفس زاہد کا سا خود غرض و خود پسند نفس نہیں جسے صرف اپنی نجات کی فکر دامنگیر ہو۔ اس کی محبت ہمہ گیر اور اس کی ہمدردی لامحدود ہے۔ اس کی روح کی بلندی، ہر پستی کی دردمند ہے۔ اس کے نفس کی طمانیت، انسان کے نفس کی براءت کی آرزومند ہے۔ اس کی انسان نوازی، نوع انسان کو آلام حیات سے مامون دیکھنا چاہتی ہے۔ اپنی روح کو آزاد دیکھ کر اُسے انسان کی روح کی حریت کی آرزو پیدا ہوئی اور اسی مقصد کے حصول کے مجاہدے میں اس نے اپنی طویل زندگی بسر کر دی۔

قناعت عوام میں عیب لیکن خواص میں ہنر ہے۔ نظیر مفلس تھا مگر بڑا قانع تھا۔ اس کی قناعت اس کی زندگی کا ایک مستقل اور نہایت دلچسپ باب ہے۔ اس کی قناعت کا درجہ اس لئے بہت بلند ہے کہ اس کی قناعت مجبوری کا دوسرا نام نہیں بلکہ ان تمام پاکیزہ اجزا سے مرکب ہے جو اس صفت کا لازمہ ہیں۔ حصول ثروت کے ذرائع، زمانہ نے نظیر کے لئے بہم کئے اور بار بار بہم کئے مگر اس کی غیرت و ایثار نے ان سے استفادہ نہیں کیا۔ دنیا کے بہت سے ارباب کمال زندگی بھر مفلس رہے ہیں مگر خود اختیاری مفلسی کا شرف بہت کم کو حاصل ہے۔ جو نفس، نظیر کی طرح جہاد کرے گا وہی قناعت کے اتنے بلند مرتبے پر فائز ہو سکتا ہے۔ برنس اسکاٹ لینڈ کا مشہور عالم شاعر اپنی مفلسی سے ہمیشہ ملول رہا۔ غالب، نظیر کی طرح مفلس نہ تھا مگر برابر اپنی مفلسی کا رونا روتا اور دنیا کی قدرناشناسی کی شکایت کرتا رہا۔ انسان کی حیثیت سے نظیر کے کردار کی ایک بے مثل خصوصیت یہ ہے کہ اس نے اپنی مفلسی کا نہ برا مانا نہ کبھی اس کی شکایت کی اور نہ قناعت جیسے ایثار کی دنیا سے کوئی قیمت مانگی۔ قیمت مانگنا درکنار، احسان بھی نہ جتایا۔ برنس جسے نظیر کا مماثل بتایا جاتا ہے بہت بڑا شاعر تھا، اُسے نظیر کے برخلاف اور غالب کی طرح اپنی عظمت کا احساس بھی تھا اور غالب کی طرح دنیا سے اپنی نغز گوئی و خوش گفتاری کی قیمت بھی مانگتا تھا۔ اُسے کبھی اپنی مفلسی پر صبر نہ آیا۔ نظیر نے اپنی مفلسی ہنس ہنس کر کاٹی تاکہ دنیا کے مفلسوں کی زندگی ہنسی خوشی کٹوا دے۔ دل کے رونے پر لبوں پر تبسم نمایاں کرنے کے لئے بڑا کلیجہ چاہئے۔ جو یہ قدرت رکھتا ہے وہ بڑی بلند شخصیت کا مالک ہے۔ لیکن رونے کے مقام کو رونے کا محل نہ سمجھنے اور شادی و غم کو عارضی مہمان جاننے والے کا درجہ اس سے بلند تر ہے۔ ایسے نفس کا حامل مجاز و حقیقت کا درمیانی واسطہ ہے جس کا ایک رخ عالم اور دوسرا ماورائے عالم سے ملحق ہوتا ہے۔ نظیر دنیا کو اسی مقام سے دیکھتا تھا جہاں ثروت و عسرت ایک ہی حقیقت کے دو پہلو نظر آتے ہیں۔

نظیر سے پیشتر اردو شاعری میں تصوف، محبت، حسن و عشق کے مجازی چوچلوں اور معاملہ بندی کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ اس وقت میں شعر کے صوری محاسن کو نظرانداز کر رہا ہوں، صرف معنوی مغز کا جائزہ لینا مقصود ہے۔ بہرحال

متذکرۂ موضوعات پر جو کچھ بھی کہا گیا ہے وہ اس قدر محدود دیکرنگ اور ہم جنس ہے کہ صرف ایک ماحول کے پرورش یافتہ مذاق کو متاثر کر سکتا ہے۔ اس کی ادبی قدر بھی محدود ہے شعر کے ذریعے انسانی ذہن کی جو تربیت ہو سکتی ہے وہ اس سے بہت کم ہوتی ہے۔ نظیر اُردو کا پہلا شاعر ہے جس نے ورڈسورتھ کی طرح عامۃ الورود موضوعات پر عام زبان میں شعر کہا اور اس کا فایدہ یا لذت عوام تک پہونچایا۔ دقیق خیالات اور مشکل الفاظ کے جو تودے اساتذہ نے فہم کی راہوں میں جمع کر دئے تھے وہ نظیر نے ہٹائے اور خیال کی آمد و شد کے لئے راستہ صاف کیا۔ کیا یہ طریقۂ کار، انسانیت پر احسان نہیں کہ نظیر نے شعر کی دولت سوسائٹی کے اس طبقے تک پہونچا دی جو اب تک ہر اعتبار سے نااہل سمجھا جاتا تھا اور اس میں سمجھنے اور غور کرنے کی صلاحیت پیدا کر دی۔ فیض سخن ایک بڑی مشہور بات ہے لیکن جس سخن سے صحیح معنی میں فیض پہونچا وہ نظیر ہی کا سخن ہے۔ تربیت نفس میں نظیر کا کلام سعدی کے کلام کے برابر اثر کرتا ہے۔ ابھی بتایا گیا ہے کہ نظیر نے عام زبان میں شعر کہا۔ عام کا لفظ یہاں جان کر استعمال کیا گیا ہے۔ اس سے ہمارے نام نہاد ثقات یا اُن حضرات کو جو زبان کو انتشار کی نظر سے دیکھنا چاہتے ہیں بڑی چڑ ہے مگر میں تو یہ کہنے پر طیار ہوں کہ عوام تک کوئی سیاسی، اخلاقی یا وجدانی پیغام پہونچانے کے لئے اگر عام زبان جسے سوقیانہ یا بازاری کہا جاتا ہے بولنی پڑے تب بھی کوئی مضایقہ نہیں۔ انسان کا مفاد زبان کو ستھرے رکھنے کی ضرورت سے مقدم ہے۔ ستھرا پن ایک اضافی بات ہے جس کی حدیں ضرورت اور حالات کے تحت میں بدلتی رہتی ہیں لیکن اگر ایسا نہ بھی ہو تو خود ستھرے پن کا معیار فائدے کے مدارج کی نسبت سے قایم کرنا چاہئے۔ چنانچہ نظیر سوقیانہ زبان عام طور پر استعمال کر کے اگر اپنا شعری مشن پورا کر لیتا تو کچھ بے جا نہ ہوتا۔ یہ محض ایک علمی عصبیت ہے کہ عام کو سوقیانہ کا مترادف قرار دے دیا گیا ہے۔ عام کے معنی سوقیانہ یا بازاری نہیں، عام فہم ہیں۔ ایسے موقعوں کے علاوہ جہاں سوقیانہ محاوروں کا استعمال آرٹ کے نقطۂ نظر سے ضروری تھا نظیر نے بازاری روزمرہ استعمال نہیں کیا۔ عام طور پر عام فہم زبان یا موقت روزمرہ استعمال کیا ہے جسے مابعد کی سوسائٹی کی نافہمی یا تصنع پسندی نے سوقیانہ کا لقب مرحمت فرما دیا ہے۔ عام فہم کو سوقیانہ کے نام سے متہم کر کے نظروں سے گرانا اصل میں زبان کو محدود بنانے یا وسیع ہونے سے روکنے کی ایک جاہلانہ کوشش ہے جو ایک نافہم طبقے کی طرف سے مدت سے کی جا رہی ہے۔ عام فہم زبان لکھنے یا بولنے پر قادر ہونا، ساری دنیا کے زباں دانوں کی نظر میں لسانی معراج سمجھا جاتا ہے۔ یہ سادہ کا دوسرا نام ہے اور ایسی زبان سادگی کے اس مقام پر ہوتی ہے جہاں تک صرف فطرت کی رسائی ممکن ہے۔

نظیر نے اپنے شعر کی وساطت سے خیالات، الفاظ اور اسالیب کا جو عظیم الشان ورثہ ہمارے لئے چھوڑا ہے وہ اُردو کی مستقل دولت اور ملک کا غیر فانی سرمایہ ہے مستقل اور غیر فانی اس لئے کہنا پڑتا ہے کہ اسوقت تک اُردو کا نشو و نما نظیر ہی کے لسانی نظرئے کے مطابق ہوا اور آیندہ بھی اسی تحت میں ہوگا۔ نظیر نے برج بھاشا کے سینکڑوں لفظوں کو اُردو میں شامل کر کے اُردو کا جزو بنا دیا اور آج بھی وسعت کی تمام کوششوں کا رجحان اسی طرف ہے ہندوستان

کے طول و عرض میں بہت سی زبانیں بولی جاتی ہیں لیکن ان میں قریب قریب سب ماہران لسانیات کے نزدیک بولی کی حیثیت رکھتی ہیں۔ لیکن اُردو اپنے بنیادی سرمائے کی وجہ سے، جس پر اُسے بجا طور پر ناز ہے، یہاں کی ساری زبانوں میں ممتاز اور غیر قوموں کے مبصروں کی نظر میں زبان کا درجہ رکھتی ہے۔

بنگلہ اور گجراتی ملک کی دو ترقی یافتہ اور سیر زبانیں سمجھی جاتی ہیں مگر اُردو اپنے ادبی سرمائے اور تربیتی اثر دونوں کے لحاظ سے ان دونوں پر فضیلت رکھتی ہے۔ بنگلہ اور گجراتی اپنے صوبوں کے باہر نہیں سمجھی جاتیں مگر روز روشن کی چمک کی طرح اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کشمیر سے راس کماری اور بمبئی سے سنگاپور تک کی وسعتوں میں مقامی بولی کے علاوہ اگر کوئی زبان عام طور پر سمجھی جاتی ہے تو وہ اُردو ہی ہے۔ اسکی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ اس کے بہت سے الفاظ جن میں جنگل، چٹنی، چھینٹ، پاجامہ، سائیس اور پکا شامل ہیں، اپنے اصل تلفظ کے ساتھ انگریزی زبان میں شامل کر لئے گئے ہیں اور آج آکسفورڈ ڈکشنری کی زینت بنے ہوئے ہیں۔ ایسٹ انڈین ریلوے کمپنی کی ایک تیز رفتار گاڑی کو اُردو بولنے والوں نے طوفان میل کہہ کر پکارا تو نتیجہ یہ ہوا کہ قلی سے لے کر ایجنٹ تک یہی نام لینے لگا۔ آج یہ نام اس گاڑی کا سرکاری نام ہے اور ریلوے کے مصدقہ ٹائم ٹیبلوں میں درج ہے۔ اس ریلوے کی گاڑیاں سرحدی صوبہ پنجاب، یوپی، بہار اور بنگال پانچ بڑے بڑے صوبوں میں ہو کر گزرتی ہیں لیکن گورمکھی یا بنگلہ کا رکھا ہوا کوئی نام اب تک ہمارے کانوں تک نہیں پہونچا۔ ان باتوں سے ظاہر ہے کہ اُردو میں پھیلنے اور جذب ہونے کی قوت بدرجۂ کمال موجود ہے۔

اس کے دوش بدوش جلب و قبول کی صلاحیت بھی اس زبان میں دوسری زبانوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے اس کی وجہ تسمیہ، اس کے وجود میں آنے کے اسباب و حالات، اس کے نشو و نما کی تاریخ اس دعوی کا کھلا ہوا ثبوت ہیں۔ اس کے جلب و قبول کی صلاحیت کی ایک قوی دلیل یہ ہے کہ اپنی عمر کی اتنی قلیل مدت میں اس نے بولی کا درجہ طے کر کے زبان کا مرتبہ حاصل کر لیا۔ سندھی، مرہٹی، تامل، تلیگو اُردو سے پرانی ہیں لیکن انھیں ابھی زبان کا درجہ حاصل نہیں ہوا۔ دُنیا کی زبانوں میں غالباً کوئی زبان نہیں جس نے اتنی قلیل مدت میں اُردو کی سی قدرت نمائی کی ہو۔ اس کے لغات، محاورات، اسالیب و تراکیب کا جائزہ لیا جائے تو بے شمار مثالیں غیر زبانوں کے اجزا کی ملیں گی جنھیں صورت بدل کر توڑ مروڑ کر، تلفظ کے فرق یا لہجے کے تغیر سے اُردو نے اپنا بنا لیا ہے اور اس طرح اپنا بنا لیا ہے کہ وہ زبان کا جزو بن کر نہ صرف تمیز نہیں کئے جا سکتے بلکہ اپنی اصل سے اتنے مختلف ہو گئے ہیں کہ اپنے گھر میں بیگانے سمجھے جاتے ہیں۔ آم یا گلاب کے پودے میں قلم لگا کر خاطر خواہ شیرینی و لطافت یا رنگ و بو پیدا کر لینے پر قادر ہو جانا اس فن کے کمال کا معراج سمجھا جاتا ہے لیکن اُردو کے پودے میں قلمیں لگا کر طرح طرح کے اثرات کے پھول کھلا کر اس فن نے معجزہ دکھایا ہے۔

نظیر کی بصیرت، انسانی بصیرت کا معجزہ ہے۔ اس نے اُردو کی فطری صلاحیت کا رمز سب سے پہلے سمجھا اور اسی فرست میں جلب و قبول کی بنیاد ڈال کر اس بیج کو پانی دینا شروع کر دیا جسے مدت ہوئی خسرو نے بویا تھا۔ یہ کام میر و سودا اور دوسرے اساتذہ نے بھی کیا مگر ان بزرگواروں اور نظیر کے طرز عمل میں فرق رہا۔ پہلا اہم فرق مقدار کا فرق ہے۔ دوسرا

نے یہ کام مختصر اور نظیر نے وسیع پیمانے پر کیا۔ دوسرا اہم تر فرق نوعیت کا فرق ہے۔ نظیر کے یہاں اس ضرورت کا شدید احساس پایا جاتا ہے اور دوسروں کے یہاں اس کا فقدان ہے جگہ جگہ اس کی شہادت ملتی ہے کہ نظیر نے زبان کو وسیع کرنے کی اہمیت محسوس کرکے، حالات و اقتضا کے مطابق، خاص ارادے کے ماتحت اپنی لسانی فتوحات شروع کیں اور بڑی محنت و جانفشانی سے اپنا کام انجام کو پہونچایا۔ دوسرے اُستادوں کے یہاں اگر ارادے کا فقدان نہ بھی تسلیم کیا جائے تب بھی احساس کی یہ شدت اور کاربرآری کا یہ انتظام نظر نہیں آتا۔ زبان اپنے ارتقا کی جس منزل میں انھیں ملی انھوں نے وہی صورت قبول کرلی۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ "دوسرے شعرا زبان سے مغلوب ہوئے مگر نظیر نے خود زبان پر غلبہ حاصل کیا۔ نظیر سے پہلے کا کوئی اُستاد آپ نہ بتا سکیں گے جسکے نام کی مہر زبان کے ہزاروں لفظوں پر لگی ہو۔"

نظیر کا آرٹ اس کی سادگی کی عظمت میں مرکوز ہے۔ اس میں لفظوں کی سادگی، بیان کی سادگی، مفاہیم کی سادگی ساری سادگیاں شامل ہیں۔ آرٹ کا کام چکاچوند پیدا کرنا، نگاہوں کو خیرہ کرنا یا دلوں کو دہلا دینا نہیں ہے۔ وہ آرٹ جو شعر میں صرف کیا جاتا ہے ان کیفیتوں کی خصوصیت سے منافی ہے۔ آرٹ اپنا مقصد رافت و لطافت کی اعانت سے پورا کرتا ہے۔ آرٹ کا کام یہ ہے کہ قلب میں سرور و بالیدگی، روح میں امن و طمانیت اور اخلاق میں وسعت و علو پیدا کرے۔ اونچے درجے کے مصور کے یہاں تصنع کم اور سادگی زیادہ ہوتی ہے۔ وہ اپنی نمائش آورد کے ذریعے سے نہیں بلکہ حقیقت نگاری کے ذریعے سے کرتا ہے۔ وہ حواس پر چھا جانے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ ایسے ماحول میں لیجاتا ہے جو جوود نفس میں پاکیزہ کیفیتیں ابھارتا ہے۔ بھڑک، چٹک مٹک، دھوم دھڑکا مبتدیوں کے آلات کے نام ہیں۔ فطین اپنا مقصد بناوٹ، آرائش یا رنگ آمیزی سے نہیں بلکہ براہ راست حقیقت سے پورا کرتا ہے، اور یہی شعور اس کے تخیل کی بلندی اور اثر کے عمق کا ضامن ہوتا ہے۔ سارے بڑے کاموں کی طرح ساری زندۂ جاوید تصویریں، سارے مشہور اقوال، سارے الہامی شعر سادہ ہوتے ہیں۔ تصویریں قرمز پر آب و رنگ سے بنائی جائیں یا صفحۂ قرطاس پر منتخب لفظوں سے دلوں کو جب ہی مسخر کرتی ہیں جب ان کی روح سادگی کے جادو سے بنی ہوتی ہے۔ نظیر کے لفظی مرقعوں کا امتیازی جمال یہ ہے کہ وہ عریانی کی طرح سادہ، حقیقت کی طرح بیرنگ اور زندگی کی طرح پُراثر ہیں۔ نہ صرف زندگی سے بہت قریب بلکہ عین زندگی ہیں۔ مائیکل اینجلو نے مسیح کے مرقع میں موضوع کی رفعت کو فن کے کمال میں سمو کر ذی حیاتی و پُراثری کا جو شاہکار خلق کیا ہے وہ اسی لئے مو قلم کا کارنامہ سمجھا جاتا ہے کہ اس کے اندر سادگی کی برقی رو دوڑ رہی ہے۔

گوتم بدھ نے جسوقت اپنے اسوۂ حسنہ کا اعلان کیا تو دنیا سے یہ مطالبہ کیا کہ "دہرم کرو، دہرم کرو، دہرم کی ڈنڈ مچاؤ"۔ ان لفظوں میں نہ کوئی صوری شان و شکوہ ہے نہ ظاہری عظمت و جلالت مگر ان کی سادگی میں بلاغت کا ایک طوفان بند ہے۔ لفظوں نے بجلی کا کام کیا۔ ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے تک آگ سی لگ گئی بادشاہوں کے دل تخت و تاج سے پھر گئے، شہزادے اور شہزادیاں، محلوں کا عیش و عشرت ترک کرکے فقیرانہ زندگی کے دیوانے

بن گئے۔ ملک میں چار جانب بدھ مذہب کی بڑائی کا ڈنکا بجنے لگا۔ یہ کیا تھا۔ یہ ان چند سادہ لفظوں کی قوت تھی جو ایک پرخلوص دل سے نکل کر دلوں کا ایمان، دلوں کا جزو بن گئے۔

مسیح کی ساری زندگی سادگی کا ایک اعلیٰ نمونہ ہو لیکن ایک واقعہ دل ہلا دیتا ہے۔ یہودی بطریقون کے عہد حکومت میں زنا کی سزا سنگساری تھی۔ چنانچہ ایک غریب عورت جو اس جرم میں ماخوذ تھی۔ رسم کے مطابق کشاں کشاں لائی گئی ہیکل کا بیرونی میدان زائروں کے جم غفیر سے پٹا پڑا تھا۔ عقیدت مندوں کی کثرت سے تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ اپنی اپنی ماں کا ہر سپوت ہاتھ میں پتھر لئے گنہگار کا پہلا وار کر کے ازلی سعادت حاصل کرنے کا آرزو مند تھا۔ مصیبت کی ماری، بے یار و مددگار، بے کس و بے بس عورت کا یہ عالم تھا کہ ہوش و حواس ساتھ چھوڑ چکے تھے۔ بے کسی کی یہ کیفیت تھی کہ خود باپ اور بھائی قتل میں سبقت پر آمادہ تھے۔ خدا سے التجا کرنے کا منہ نہ تھا، وہ خدا کا گناہ کر چکی تھی اور خود خدا ہی کے حکم سے اس پر عقوبت کی جا رہی تھی۔ یاس کی شدتیں انتہا کے آخری نقطے پر پہونچ چکی تھیں، قریب تھا کہ پتھروں کی بارش ہونے لگے کہ یکایک ایک غیر معروف شخص مجمع کو چیرتا پھاڑتا آگے بڑھا اور کہنے لگا "ٹھہرو"۔ مجمع متحیر ہو کر ٹھہر گیا۔ اس نے کہا "تم میں سے وہ شخص اس عورت پر پتھر پھینکے جس نے گناہ نہ کیا ہو" ان سادہ لفظوں کی معنویت بجلی کا ایک کوندا تھا جس نے یکایک جہالت کے تاریک پردے کو جلا کر خاکستر کر دیا، دماغوں نے حقیقت کی روشنی کی جھلک دیکھ لی۔ پتھر ہاتھوں سے چھوٹ پڑے۔ کائی سی پھٹنے لگی ایک ایک کر کے سارا مجمع منتشر ہو گیا لفظوں کی سادگی نے محل استعمال سے مطابقت کی اور نتیجہ وہ نکلا جو آج اخلاق کی تاریخ میں زریں حرفوں سے درج ہے۔ مسیح کے لفظوں میں کوئی شکوہ، کوئی تصنع، کوئی رنگ آمیزی نہ تھی، ہاں سچائی کی سادگی کی بلاغت تھی جس نے بلیغ ترین خطبے سے بڑھ کر اثر دکھایا۔

پیغمبر اسلام (ہماری جانیں ان کے نام پر فدا ہوں) کا انداز تبلیغ، ان کا پیغام، ان کی زندگی سراپا سادگی ہے۔ عرب جیسے قدامت پرست، ضدی اور سنگدل ملک میں اس کے سوا کسی دوسرے حربے کا کارگر ہونا محال تھا۔ سادگی انسان کا آخری ملکوتی حربہ ہے اور ہمیشہ ان موقعوں پر استعمال ہوتا ہے جب ساری طاقتیں طاق ہو چکی تھیں، صرف یہی نہیں بلکہ یہ وہ حربہ ہے جو صرف فطن کے ہاتھ میں کام کرتا ہے، چنانچہ ایک روز آپ تمام اہل مکہ کو ہمراہ لے کر دشت کی طرف تشریف لے گئے اور کوہ صفا پر چڑھ کر پوچھا کہ "اے آل غالب، تم مجھے صادق سمجھتے ہو یا کاذب"۔ لوگوں نے جواب دیا کہ "ہم نے تیرا کوئی قول آج تک نہ جھوٹا سنا، نہ جھوٹا دیکھا" جب آپ نے اپنی فطرت شناسی سے دلوں پر پہلی فتح پا کر سوسائٹی سے اپنی سچائی کا اعتراف کرا لیا تو آگے بڑھے اس کے بعد جو کچھ ہوا اسلام کی تاریخ شاہد ہے۔ آپ کے سوال میں کوئی ادق فلسفیت، رجز خوانی یا انتباہ نہ تھا۔ عذاب و ثواب کے مسئلے کی گتھی سلجھانے سے پہلے آپ نے ایک ایسی سادہ حقیقت کا اعتراف کرا لیا

جس سے انکار محال تھا۔ دلوں کو مسخر کرنے کی یہ الہامی تدبیر تھی جس کے ذریعے اپنی ذات میں قوم کا اعتماد تازہ کیا گیا تھا۔ آئندہ اسی اعتماد کی بنیاد پر پیغمبرانہ قیادت کی عظیم الشان عمارت تعمیر ہوئی۔

سادگی کی مدد سے دنیا میں بڑے بڑے کام لئے گئے ہیں۔ سادگی کی آخری منزل تک پہونچ جانے کا نام آرٹ کا کمال ہے۔ جولیس سیزر کے قتل کے سانحہ پر مارک انطونی کی تقریر جو شیکسپیر کی ہمہ گیر ذکاوت کا ایک زندۂ جاوید کرشمہ ہے سادگی کی پُرکاری کا معجزہ ہے ٹرافلگار کی بحری لڑائی شروع ہونے سے پہلے، جسے جیت کر انگلستان دنیا کے سمندروں کا مالک بن گیا، قدیم روایتیں دہرانے، شجاعانہ جذبات کو براہ راست ابھارنے یا پیمان وفا بندھوانے کے بجائے امیر البحر نیلسن کا اپنے بیڑے میں صرف یہ سادہ اعلان کرنا کہ انگلستان ہر ملاح سے اپنا فرض ادا کرنے کی توقع رکھتا ہے فتح کا ضامن بن گیا۔ مطالبہ کی سادگی نے دلوں میں جوش کا طوفان برپا کر دیا۔ انقلاب فرانس کے دوران میں، جزیرۂ ایلبا سے واپسی پر یکہ و تنہا نپولین کا باغی پلٹن کے سامنے سینہ کھول کر گولی مارنے کی دعوت دینا اور ہتھیار ڈلوا دینا اور پھر اسی فوج کو لے کر یورپ میں دوبارہ تہلکہ ڈال دینا سادگی کی سحر فرمائی کا واحد کارنامہ ہے۔

سادگی جہاں ہو دلوں پر اپنی عظمت کا سکہ بٹھائے بغیر نہیں رہتی۔ چنانچہ اہرام مصر انجیل مقدس کی زبان اور مہاتما گاندھی کی زندگی کی طرح، نظیر کے بیان کی سادگی بھی یگانۂ روزگار ہے۔ عہد جدید کے سرخیل افسانہ نگار روسی ٹالسٹائے فرانسیسی موپاساں اور امریکی او ہنری کا کمال ان کی سادہ حقیقت نگاری ہے۔ یہ اپنے کرداروں کی تصویروں میں رنگ نہیں بھرتے، صرف ان کے فطری رنگ کی حفاظت کرتے ہیں۔ نظیر نے بھی یہ کام بالکل اسی طرح کیا ہے۔ نظیر کا آرٹ ہمارے لئے بیش از بیش دلکش اس لئے ہے، کہ ہندوستانی فطرت کو ہم روسی، فرانسیسی اور امریکی فطرت کے مقابلہ میں آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ نقادی کا جدید نظریہ، سادگی کے مدارج کے لحاظ سے کمال کا درجہ متعین کرتا ہے۔ غالب کے سادہ کلام کو سہل ممتنع کا لقب اسی لئے دیا گیا کہ اس کے اغلاق و تفلسف کے مقابلہ میں، اس کے کمال کے اس پہلو تک رسائی دشوار ہے۔ انیس کی مداحی، مناظر کی مصوری اور رزم نگاری اس کے کلام کے نمایاں کمالات ہیں مگر جس قدرت نے اسے اقلیم سخن کا شہنشاہ بنایا ہے وہ اس کی شیوا بیانی اور سادگی ہے۔

سادگی کی پُراثر جیسا چلتا جادو ہے، اتنا ہی اس جادو کا جگانا دشوار ہے۔ حضرت عروج لکھنوی (دولہ صاحب) نے فرمایا ہے کہ ؎

تلوار کاٹتی ہے مگر ہاتھ چاہئے

سادگی بڑی سچی تلوار ہے لیکن اس کے چلانے کے لئے فطن کا ہاتھ درکار ہے۔ ادب میں سادگی پیدا کرنا، دوسرے فنون لطیفہ کے مقابلہ میں دشوار ہے۔ نظیر کا کام، نظیر سے کم درجے کے شاعر کے بس کی بات نہ تھی لیکن فطرت کی ستم ظریفی نے اُسے، اپنے زمانے سے ایک صدی پہلے پیدا کر دیا۔ اس کی ذکاوت نے وقت سے پہلے وہ سکے ڈھال لئے جنکی

موقت بازار میں مانگ نہ تھی۔ مگر اس کی خلقت کا مقصد یہ تھا کہ اس کے نام کے سکے چلنے کے لئے خود بازار اپنی تعمیر نئے سرے سے کرے۔ ہر فطرت کو تین منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے اور چوتھی منزل مقصود ہوتی ہے۔ پہلی کا نام بے اعتنائی، دوسری کا تمسخر، تیسری کا مخالفت اور چوتھی کا مقبولیت ہے۔ نظیر تین مرحلے طے کر کے چوتھے میں قدم رکھ چکا ہے۔ عامیانہ ذہنیت جس کا کام تخریبی ہوتا ہے نظیر کے کلام کے عمق و علو کا اندازہ نہیں کر سکتی۔ اس کے رموز و حکم تک پہونچنے کے لئے تعمیری نقادی کی بصیرت درکار ہے، جو جذبات عالیہ کو سراہنے اور سادگی سے متاثر ہونے کی اہلیت رکھتی ہے۔ ذوق کی بین الاقوامی تربیت نے عامیانہ نقطۂ نظر کی پھیلائی ہوئی سمیت کا اثر بہت کچھ زائل کر دیا ہے۔ شعر کے فرسودہ نظریئے کے ساتھ، فدائیانہ جذبات کے اعلان، مجنونانہ حرکات کے مظاہرے اور والہانہ کیفیات کی نمائش کا ذوق تقویم پارینہ ہو کر رہ گیا ہے۔ اب سیدھی، سچی، میٹھی، پیاری بات پسند کی جاتی ہے۔ آرٹسٹ اور آرٹ کے شیدائی دونوں گروہ، آرٹ کے پردے میں زندگی کے مصائب سے پناہ کا وسیلہ ڈھونڈھتے ہیں۔ یہی آرٹ کا منتہائے نظر ہے اور یہیں نظیر کا کلام ہمہ تن آرٹ یا آرٹ کا مترادف بن جاتا ہے۔

ہر قسم کا آرٹ، آپ اپنی مبادیات ہے۔ نظیر اپنے آرٹ کا موجد ہے، خاتم نہیں۔ خاتم قرار دینا، قوائے انسانی کی حد بندی کر دینا ہوگا۔ نظیر کے طریقہ کار سے استفادہ کرنے والا ضرور پیدا ہوگا مگر نظیر کی تکرار محال ہے۔

مخمور اکبر آبادی

نظیر کی سوگواریاں

(غیر مطبوعہ دیوان سے)

سرشکِ چشم سے موتی بہت پروئے گئے
دلے یہ داغ جگر کے نہ ہم سے دھوئے گئے

غرور نے تو ہمارے بہت ہی کھینچا سر
پھر اُس کو ہم بھی سدا خاک میں ملوئے گئے

ہماری ان کی رہی عمر بھر یہی صحبت
اُدھر وہ ہنستے گئے ہم اِدھر سے روئے گئے

سمائے ایسے ہیں آنکھ کر پھر مرے دل سے
نہ جاگتے میں کبھی اور کبھی نہ سوئے گئے

نظیر کیا ہی مزا تھا کہ کل خوشی سے ہم
گئے تھے یار کو لینے سو آپ ہی کھوئے گئے

نظیر کی فارسی تصانیف

عام طور پر نظیر کے متعلق یہ خیال قایم کر لیا گیا ہے کہ وہ معمولی "میانجی" قسم کے آدمی تھے اور پڑھے لکھے بھی واجبی ہی واجبی سے تھے اور یہ خیال زیادہ تر نظیر کی اُن نظموں کو دیکھ کر قایم کیا گیا ہے، جن میں زیادہ تر ٹھیٹھ ہندی یا ہندوستانی الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ نہیں ہے۔

اسوقت میرے سامنے نظیر کی تین غیر مطبوعہ تصانیف فارسی کی موجود ہیں اور ان کے مطالعہ سے میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ وہ فارسی کے بھی اچھے ادیب و شاعر تھے اور چونکہ اچھی فارسی جاننے کے لئے اچھی عربی دانی کی بھی ضرورت ہے اس لئے یقیناً عربی و فارسی کی تمام متداول کتابیں ان کی نگاہ سے گزر چکی ہوں گی اور وہ اپنے زمانہ کے معمولی "میانجی" نہیں بلکہ اونچے درجہ کے "منشی و معلم" تھے۔

طرزِ تقریر

پیشِ نظر فارسی تصنیفات میں سے ایک تصنیف کا نام "طرزِ تقریر" ہے۔ اس میں انھوں نے صرف یہ بتایا ہے کہ معشوقوں سے چھیڑ چھاڑ کیونکر کی جاتی ہے اور اس سلسلہ میں کہیں کہیں ضلع جگت سے بھی کام لیا ہے۔ ہر چند ان کی یہ تصنیف فارسی کی کوئی سنجیدہ تصنیف نہیں ہے، لیکن یہ اسوقت کا رنگ تھا ورنہ اب تو فارسی میں اس قسم کا لٹریچر بکثرت پایا جاتا ہے۔

طرزِ تقریر میں تقریباً دو سو علیحدہ علیحدہ ٹکڑے ہیں، جن میں سے اکثر "نازنینے را دیدم" یا اس کے ہم معنی فقرہ سے شروع ہوتے ہیں اور پھر اس نازنین سے ان کی بات چیت شروع ہوتی ہے، جس میں کبھی یہ معشوق کو بناتے ہیں اور کبھی وہ انھیں بناتا ہے اور آخر میں نظیر ایک شعر پڑھکر اس صحبت کو ختم کر دیتے ہیں۔ مثلاً:۔

ایک بار وہ کسی نازنین کے پاس گئے، اس نے پوچھا "چہ کسی" (تو کون ہے) انھوں نے کہا "پروانۂ شمع رخیاں" اس نے کہا "مانع پر افشانی" انھوں نے کہا "اجازت؟" اس نے جواب دیا "پروانہ پروانگی نخواہد" اور انھوں نے یہ شعر پڑھکر اپنی ہار مان لی:

گفتم کہ درست گفتی اے شمع
پروانۂ خام بایدم گفت

ایک اور واقعہ انھیں کی زبان میں سنئے:۔

"بروئے نازنینے شرمگیں نگاہ، نگاہ کردم - عرق بر رخش پدید آمد۔ گفتم "گوہر بحر شرم ؟" گفت "کرم نگاہ گرم"

گفتم اے نازنین شرم آگیں ۔۔۔۔ حسن را شرم خوبیٔ دگر ست

یہ کتاب اسی طرح کے سوال و جواب سے بھری ہوئی ہے اور اکثر جگہ صرف ایک ایک لفظ سے مدعا ظاہر کیا گیا ہے، مثالاً ملاحظہ ہو:-

"پیش محبوبے رفتم، دیدم کہ انجیر نہادہ ست و زلف گرہگیر کشادہ — بہ قدر تفاوت بنشستم - گفت "اگر دلپذیر چندے ازیں بگیر" — دانستم بعزم تسخیر، گفتم — "کجا ایں توقیر، اگر لطف ست ہمیں جا عنایت تاثیر - گفت "ایں چہ تقریر" گفتم "از دور انجیر و نزدیک زنجیر، ترکِ انجیر از بیم زنجیر خوش تدبیر" - گفت "چساں ؟" - گفتم

صید رم دارد و صیاد فسوں می خواہد ۔۔۔۔ ہر کسے مصلحتِ خویش نکو می داند

اس سلسلہ میں انھوں نے اپنی پیرانہ سالی کو سامنے رکھ کر بھی بعض نمونے "طرزِ تقریر" کے پیش کئے ہیں اور کافی "پیرافشانی" کا ثبوت دیا ہے، چنانچہ ایک واقعہ ملاحظہ ہو:

نازنینے نسریں بدن، حمایلِ سمن درگلویم انداخت، گفتم "ریشِ من نسترن ست خجلت آرد" گفت "ہمرنگ است مزہ دارد"

ایں سخن چوں بتِ سمنبر گفت ۔۔۔۔ شد دلِ من سمن سمن سردر

اب دو چار مثالیں ضلع جگت کی بھی سن لیجئے:-

برائے شوخے ظرافت شعار حمایل گل بردم، گفت "ہندی ایں ؟" گفتم "ہار"، گفت "زنہار از اصطلاح قمار"

نزد نازنینے سیمیں ذقن رفتم و گفتم "سیب خوش رسیدہ است" گفت "بیار" گفتم "اگر دستم بہ سیب رسد" گفت "بے آسیب نخواہد رسید"۔

اس کتاب میں جتنے واقعات درج ہیں، وہ سب فرضی ہیں، چنانچہ مصنف نے خود کتاب کے اخیر میں لکھا ہے کہ:

"نظیر حقیر، نثر مسرت مشحون و نظم مناسب مضمون بلطف ہمنشینی و ہمراہی نازنینان تحریر نمودہ و خاطرِ خود را فرحت و انبساط برافزودہ"

قدر متین — یہ میاں نظیر کے فارسی خطوط کا مجموعہ ہے جو زیادہ تر انشار کی حیثیت سے لکھے گئے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ ان میں سے بعض ان کے وہ خطوط بھی ہوں جو واقعی انھوں نے اپنے احباب کو لکھے تھے۔

یہ کتاب بہ لحاظ انشا و مطالب "طرزِ تقریر" سے بہتر ہے اور اس کا اندازِ تحریر بھی اس سے بالکل مختلف ہے اس میں مختصر نویسی یا اشارات سے کام نہیں لیا گیا بلکہ پورے جملے لکھ کر تسلسل کو قایم رکھا گیا ہے اور اس میں اشعار بھی اچھے نظر آتے ہیں۔ بعض منظوم خطوط ہیں اور فارسی کی چند غزلیں اور رباعیاں بھی جو نظیر کی فارسی دانی کے ثبوت میں

پیش کیجا سکتی ہیں۔

اس مجموعہ میں ۱۴۳ رقعات ہیں اور ان میں سے شاید چند وہ رقعات جو پھلوں وغیرہ کی رسید میں لکھے گئے ہیں اصلی ہوں تو ہوں، ورنہ سب انشائی حیثیت رکھتے ہیں۔

"تخمِ گل منہدی" کی رسید میں لکھتے ہیں:

قدرداں، قدرفزا، از گل الطافِ تو ہست　　　رونقِ رنگِ حنا در کفِ دستِ چمنم"

بلطفِ تخمِ گل منہدی ندرت نگار، ہمرنگ خیالِ رنگین ادایان گلبنِ تمنا تازہ گردید۔ شفافی آں بتابے کہ تا کاشتہ ہجوم شاخ و برگ و جوشِ غنچہ و گل پیش نگاہ جلوہ نما۔ دوستِ بہار حنا بستہ گلومین خیاباں را بمنت برفرق نہاد تشریف گل کارمید ہو۔ گلشنِ خاطر شگفتہ باد!

کسی اور صاحب کو آئینہ کی رسید میں شکریہ کا خط لکھتے ہیں:

خوشدلی ز آئینہ شد ایں مخلصِ دیرینہ را　　　ہمچناں کز عکسِ روئے مہ رخاں آئینہ را

از توجہ آئینہ خوشنما خورسندی رو نمود و خیالِ چندیں انشراح بمرآت خاطر افزود۔ حلب را بہ وجودِ آں شہرت دیر دارد را نمودش مفاخرت ------"

ایک منظوم رقعہ ملاحظہ ہو جس میں غالباً انھوں نے تیراکی کا میلہ دیکھنے کے لئے رتھ طلب کی ہے:۔

محیطِ بخشش و بذلِ استقامت　　　ملاذ و منبعِ احساں سلامت
چو شوقِ صحبت رنگیں نگارم　　　ہمانا موجِ دریا در شمارم
مگر بعد از سلامِ اُلفت آرا　　　بنوکِ خامہ آرم مدعا را
کہ امروز از برائے سیرِ دریا　　　جہانے حاضر و خلقے ست یکجا
نظر تا میرسد یکسر بہارست　　　چمن بر ساحلِ دریا نثارست
ز غسلِ مردمان و بازیِ آب　　　بہر سو شوخیِ گرداب بیتاب
ز عکسِ گلعذاراں آبِ دریا　　　برنگِ نہرِ گلشن در نظر ہا
بہ ساحل بسکہ مہ رویاں عیاں اند　　　شکارِ دامِ الفت ماہیاں اند
بفرحت قطرہ زن ہر موجِ آب ست　　　مئے مقصود در جامِ حباب ست
بہارِ حسن و آبِ بحر در جوش　　　بہم پہلو بہ پہلو دوش بر دوش
چو بر دریا چنیں رنگیں بہارست　　　دلم از بہرِ آں بس بیقرارست
دریں صورت نظر بر بیقراری　　　عطا سازند رتھ بہرِ سواری

چو زاں مجمع ہمہ شادند امروز　　کنم من ہم دلِ خود عشرت اندوز
کہ باشد دیدنِ عالم غنیمت　　اگر یک لحظہ باشد دم غنیمت
نظیر اکنوں ندارد غیر ازیں یاد　　کہ باشد خانۂ الطاف آباد

اس رقعہ کے دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ عربی الفاظ کا صحیح صرف کر سکتے تھے اور منظر نگاری کے لئے وہ اچھے الفاظ اور اچھی ترکیبیں استعمال کرنے سے عاری نہ تھے۔

چند رقعات میں رباعیاں بھی نظر آتی ہیں، لیکن ان میں سے بعض میں یہ جدت کی گئی ہیں کہ چوتھا مصرعہ ایک ہی رکھا ہے اور اس طرح ان کو ایک مسلسل نظم بنا دیا ہے مثلاً:

دل برد زمن چو نازنینے زیبا　　پُر حیلہ و پُر فریب و پُر ناز و ادا
گفتم کہ دلم دہ بہ تبسم فرمود،　　البتہ مگر تو بعد یک لحظہ بیا،

چوں روزِ دگر بہ آں بتِ عشوہ نما　　گفتم کہ نشد وعدۂ دیروز وفا
بشنید و بخندید و بفرمود، امروز!　　البتہ مگر تو بعد یک لحظہ بیا

اس کے بعد نظیر پھر گئے، کئی بار گئے اور ہمیشہ یہی جواب ملا کہ

البتہ مگر تو بعد یک لحظہ بیا

یہاں تک کہ ساتویں رباعی میں یہ صورت پیدا ہو گئی کہ

ناچار ز روئے عجز گفتم او را　　آں "لحظہ" بفرما کہ چہ باشد، گفت
چنداں نظیر خواہم بتو، گفت　　البتہ مگر تو بعد یک لحظہ بیا،

ایک رقعہ میں مستزاد رباعی بھی پائی جاتی ہے:

ظاہر ز سرائے تو با صد تزئین ــــ اے باغ جمال
ریحان و گل و نرگس و سرو و نسریں ــــ رنگیں تمثال
اسرار چمن در چمن از فہم تو اے یار ــــ بکشاید دیر
یک لحظہ دریں باغ بیا و بنشیں ــــ و الکن فی الحال،

اخیر کے دو مصرعے غلط معلوم ہوتے ہیں۔ تاہم اس سے ان کی مستزاد رباعی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

حُسنِ بازار

یہ "مینا بازار" کے انداز کی چیز ہے، جس میں اکبر آباد کے بعض دوکانداروں کی صفت بیان کی گئی ہے اور ہر اس مبالغہ سے کام لیا گیا ہے جس سے اس نوع کے انشا میں متقدمین کام لیا کرتے تھے۔ عبارت کی رنگینی، تعبیرات کی ندرت، تشبیہات کی جدت، رعایتِ الفاظ وغیرہ سب وہی ہے اور اگر فرق ہے تو صرف اتنا کہ نظیر نے کم لکھا ہے اور دوسروں نے زیادہ، یا یہ کہ نظیر کے یہاں صرف تفنن ہے اور دوسروں کے یہاں اصل مقصود

گلفروش کا حال بیان کرتے ہیں :-

نشستنِ گلفروش در دکان بر خسارِ گلگوں و لبِ خنداں و نزاکت، ہر تارِ پیرہن رگِ نسرین۔ نشان از رنگینی دکانِ چمن در بازار جلوہ گر دد گلشن پیشِ نظر۔ تحریکِ ساعدِ سمن رنگ متحرکِ دستِ ساقی بہ ساغرِ مل و تمثیل بہتر ازیں جنبشِ شاخِ گل بہ مسِ انامل ------

یہ رسالہ بہت مختصر ہے، لیکن اس سے ان کی فارسی دانی پر کافی روشنی پڑتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ابتدائی تعلیم عربی فارسی کی بہت اچھی ہوئی تھی۔

جدتِ تضمین

(نظیر کے غیر مطبوعہ کلیات سے)

رہوں کا ہیکو دلخستہ پھروں کا ہیکو آوارہ
اگر آں ترکِ شیرازی بدست آرد دلِ ما را

خدا اگر مجھ گدا کو سلطنت بخشے تو میں یارو
بہ خالِ ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

ہم اپنا تو بہشت و چشمۂ کوثر سمجھتے ہیں
کنارِ آبِ رکناباد و گلگشتِ مصلےٰ را

زمیں پر آیا جب یوسف اسی دن آسماں رویا
کہ عشق از پردۂ عصمت بروں آرد زلیخا را

جو صاحبِ حسن ہیں ہرگز نہیں محتاج زینت کے
بہ آب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را

بتوں کی گالیوں میں بھی عجب لذت نکلتی ہے
جواب تلخ می زیبد لبِ لعلِ شکر خا را

تو ہستی کی گرہ پر عقل کا ناخن نہ توڑ اے دل
کہ کس نکشود و نکشاید ز حکمت ایں معما را

نظیر اس لطف سے تضمین تو کر مصرعۂ حافظ
کہ بر نظم تو افشاند فلک عقدۂ ثریا را

نظیر کا عارفانہ رنگ

یہ نظم بھی غیر مطبوعہ ہے اور بیدل کے اس شعر کی تفسیر معلوم ہوتی ہے :-

ستم ست گر ہوست کشد کہ بہ سیر سرو سمن درآ
تو ز غنچہ کم نہ دمیدہ ای درِ دل کشا بہ چمن درآ

گر دل میں تیرے بلبل و قمری کا دھیان ہے　　تو ہر نفس تیرے قمری ہیں، بلبل زبان ہے
ہے تو ہی باغ اور تو ہی باغبان ہے　　باغ و چمن ہیں جتنے تو سب اُن کی جان ہے
ہر لحظہ اپنے جسم کے نقش و نگار دیکھ
اے گل تو اپنے حُسن کی آپ ہی بہار دیکھ

بیلا، گلاب، سیوتی، نسرین و نسترن　　داؤدی، جوہی، لالہ و رابیل و یاسمن
جتنی جہاں میں پھولوں کی پھولی ہے انجمن　　یہ سب تجھی میں پھول رہے ہیں چمن چمن
ہر لحظہ اپنے جسم کے نقش و نگار دیکھ
اے گل تو اپنے حسن کی آپ ہی بہار دیکھ

عالم میں تیرے باغ کا اے جاں وہ گھیر ہے　　طوطی، تدرو، بلبل و کبک و بٹیر ہے
باغ و چمن کی تجھ کو عبث گھیر اگھیر ہے　　سر پاؤں سے تو آپ ہی پھولوں کا ڈھیر ہے
ہر لحظہ اپنے جسم کے نقش و نگار دیکھ
اے گل تو اپنے حُسن کی آپ ہی بہار دیکھ

باغِ جہاں کے غنچہ و گل میں نہ ہو اسیر　　قمری کی سُن نظیر، نہ بلبل کی سن صفیر
اپنے تئیں تو دیکھ کہ کیسا ہے بے نظیر　　ہیں حرفِ "من عرف" کے یہی معنی اے نظیر
ہر لحظہ اپنے جسم کے نقش و نگار دیکھ
اے گل تو اپنے حسن کی آپ ہی بہار دیکھ

نظیر اکبرآبادی کی شاعری پر ایک عمومی تبصرہ

(ادب اور شاعری معاشرہ کے صرف طبقۂ اعلیٰ ہی میں نہیں پائی جاتی بلکہ مختلف صورتوں میں ان کے جلوے سماج کی ہر سطح پر نظر آتے ہیں۔ چونکہ ابتک انسانی نظامِ معاشرہ میں فرقِ مراتب رہا ہے لہذا ہر طبقہ کے ادب میں یہی تفاوت نظر آتا ہے۔ نظامِ جاگیرداری کے عہد میں ادب العالیہ طبقۂ امراء کے حلقہ میں پرورش پاتا رہا اور سرمایہ دارانہ جمہوریت کے زمانہ میں طبقۂ وسطیٰ جلوہ گاہِ ادب بنا رہا۔ پھر بھی ان ہر دو زمانوں میں سماج کا نچلا طبقہ بھی اپنے تجربات، واردات جذبات، تخیلات اور زندگی کے ردِ عمل کو شاعری، کہاوتوں اور کہانیوں کے ذریعہ پیش کرتا رہا ہے۔)

اگر دیہاتی کہانیوں، عوام الناس کے قصوں (Folk Lores) جنتا کی کہاوتوں، مزدوروں اور کسانوں کے گیتوں اور عورتوں کے گانوں کا نظرِ غائر سے مطالعہ کیا جائے تو ادب و شاعری کے بہت سے گوہر تابندہ ملیں گے جو دباؤ کی وجہ سے خاک دھول میں ملکر فنا ہوتے جاتے ہیں۔ ادبی بصیرت رکھنے والے کے لئے تخلیقی صلاحیتوں کی یہ بربادی بہت ہی روح فرسا ثابت ہوتی ہے۔ اگر نچلے طبقہ میں بھی زندگی کے وہی مواقع پائے جاتے جو اونچے طبقوں میں پائے جاتے ہیں تو نہ جانے ابتک ہمارا ادب کہاں سے کہاں پہونچا ہوتا، کتنے کالی داس، کتنے فردوسی، کتنے حافظ و سعدی، کتنے شیکسپیر، کتنے شیلے، کتنے غالب اور کتنے میر افقِ ادب پر طلوع ہونے سے پہلے غروب ہو گئے!

ہندوستان کے عوام الناس کا ادب بہت ہی گرانمایہ اور بہت ہی وسیع ہے۔ بھرتھری کے نظمیہ قصے، ہیر رانجھا کی کہانی اور مذہبی دیومالا کے علاوہ مقامی اساطیر اور چھوٹی چھوٹی کہانیاں نہایت ہی بصیرت افروز ہیں بہار میں "بدیسیا" کے جذباتی گیت، "پنچ پھولا" رانی کی کہانی اور "گھاگھ" کی کہاوتیں بہت ہی عام پسند ہیں "جھرٹے" اور "جتیا" کے میلو ڈرامائی رقص و نغمے، چیت اور ساون کے بہکتے ہوئے گیت اور ہولی کے سوانگ ادب اور آرٹ کے بہت سے واضح اور غیر واضح نقوش کے حامل ہیں۔ عورتوں کے گانوں اور گیتوں میں ہجر و وصال کے قصے مظالم و بیداد کی داستانیں، ارمان و تمنا کی نیرنگیاں، من کی موج اور جی کا سوگ، کنواریوں کا چنچل پن اور بیواؤں کا بروگ، زندگی کی مسکراہٹ اور موت کے آنسو سبھی کچھ پائے جاتے ہیں۔

(میکسم گورکی نے اپنے ایک مقالے میں ادب العامہ کو تاریخ جتنی اہمیت دی ہے۔ واقعہ یہی ہے کہ ہم زندگی کی کشمکش کو نمایاں طور سے اسی سطح پر آکر دیکھ سکتے ہیں۔ نظیر اکبرآبادی کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اُس نے زندگی کو اسی سطح پر آکر دیکھا اور اُسے برتا۔ نظیر اپنی تعلیم و تربیت اور اپنے سماجی مقام کے لحاظ سے طبقۂ وسطیٰ سے تعلق رکھتا تھا لیکن اپنے رجحانِ طبع کے زیرِ اثر وہ "پرولیتاری" (Proletariate) تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو ادب میں نظیر کی شاعری ایک استثنائی حیثیت رکھتی ہے۔ بات یہ ہے کہ نظیر نے سماج کی نچلی سیڑھی کی شاعری کو سماج کی اوپر والی سیڑھی پر لاکر پیش کیا۔ اور اُن سے اپنے طبقہ کی زبان و فن کو عوام کے جذبات کا ترجمان بنایا۔ نظیر ایک درمیانی جگہ پر تھا اور دونوں جانب ہاتھ پھیلائے ہوئے تھا۔ میں اوپر عرض کر آیا ہوں کہ ادب و شاعری سماج کے نچلے طبقہ میں ہمیشہ پائی جاتی ہے۔ نظیر نے اُسے نیچے سے اُٹھا کر اوپر کر دیا۔ اسی بات میں اس انوکھے شاعر کا بڑا پایہ ہے۔

شیخ ولی محمد نظیر اکبرآبادی میر تقی میر کا ہمعصر تھا اس نے ۱۲۴۶ھ میں انتقال کیا۔ یہ سلطنت مغلیہ کے زوال کا زمانہ تھا۔ سارے ہندوستان میں اضطراب و ابہام کا دور دورہ تھا۔ سماج میں یاس و قنوط یا خود فریبانہ تعیش پایا جاتا تھا یا پھر انفعالی روحانیت و مذہبیت۔ اس دور کی اُردو شاعری پر یہی اثرات کارفرما ہیں۔ لیکن غیر معمولی طور پر نظیر کی شاعری میں زندگی اور زندگی کی امنگوں کی روشنی بھی نظر آتی ہے۔ نظیر کو یہ روشنی عوام الناس یعنی "پرولیتاریات" کی صحبت سے ملی تھی۔ خلقت عامہ زندگی اور مسرت، قوت اور امید کا بہت بڑا سرچشمہ ہے جب تہذیب و تمدن اپنی بدنظمی کی وجہ سے خطرناک اور مہلک ہو جاتا ہے تو زندگی اپنی نشاۃ اور احیاء کے لئے جنتا کی طرف نظر کرتی ہے۔ انسانیت کے مستقبل پر ایمان، عمل و سعی پر اعتماد اور ارادہ میں استحکام عوام الناس کے وسیع قلب سے پیدا ہوتا ہے۔ اس سرچشمۂ امید پر کتنی ہی پابندیاں عاید کی جائیں، اس بجلی کے خزانے کو کتنا ہی مقید کیا جائے مگر پھر بھی بجلی تڑپ ہی اُٹھتی ہے اور امید کی کرنیں پھوٹ ہی پڑتی ہیں۔ نظیر اکبرآبادی نے جنتا کے سورج سے اپنی زندگی بداماں شاعری کا دیا جلایا۔ میر، سوز، درد، سودا وغیرہ بیجا انفرادیت کی بھول بھلیوں میں چکر کھاتے رہے اور نظیر اجتماعی زندگی کے وسیع سبزہ زار میں کلیلیں کرتا پھرا۔ نظیر کی شاعری کے مطالعہ سے زندگی کے ممکنات پیش نظر ہو جاتے ہیں۔ نظیر کی شاعری اُس عہد کی منفیانہ شاعری کے ریگستان میں ایک شاداب نخلستان ہے۔

نظیر جاگیردارانہ عہد کا شاعر ہے۔ اُس دور میں ادب یا تو دربار میں رقص کرتا تھا یا پسپا و مضمحل انفرادیت کے قید خانہ میں کراہتا رہتا تھا۔ مگر نظیر ان دونوں باتوں سے محفوظ ہے۔ نظیر نے زندگی کی وسعتوں کا مشاہدہ کیا، اجتماعیت کے ساگر میں تیراکی کی اور وہ آزادی کے آکاش کی طرف اُڑا۔ نظیر اپنے زمانے سے مختلف تھا مگر وہ اپنے زمانہ کے اثرات سے دامن کشاں نہ رہ سکا۔ زمانہ نے سب سے گہرا اثر نظیر پر یہ چھوڑا کہ اُس کی شاعری میں تضاد پیدا ہو گیا کیونکہ جس

سماج کی وہ پیداوار تھا اُس سماج ہی میں تضاد پایا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ نظیر ایک درمیانی مقام پر تھا۔ طبقۂ وسطیٰ اور طبقۂ ادنیٰ کے درمیان، سلطنتِ مغلیہ کے زوال کے دور میں طبقۂ وسطیٰ سب سے زیادہ اضطراب و ابہام کا شکار تھا لہٰذا نظیر بھی اُس ہیجان سے بغیر متاثر ہوئے نہ رہ سکا اور کوئی واضح نصب العین نہ رکھنے کے سبب وہ فرار و گریز کی طرف بھی قدم بڑھاتا رہا۔ نظیر کبھی زندگی کے ہنگاموں، اس کے حرص و آز اور اس کے تضاد کا علاج موت کے تصور میں ڈھونڈتا ہے یا تیاگ میں۔ اگر نظیر اجتماعی زندگی کی طرف رُخ نہ پھیرتا، اگر وہ "پرولیتاریات" کی جانب رجوع نہ کرتا تو اس کا حشر بھی وہی ہوتا جو اُس دور کے دوسرے شاعروں کا ہوا۔ مگر مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ نظیر زندگی سے واقف ہو وہ شیش محل یا اپنے مَن کے مندر میں زندگی بسر کرنے کا عادی نہیں۔ وہ دکھ سکھ میں سب کے ساتھ ہے۔ نظیر جنت میں بھی زیادہ وقت نہیں گزار سکتا۔ وہ انسانوں کے درمیان اسی دنیا میں جیون بتاتا ہے۔

نظیر کی شاعری میں تضاد کا مطالعہ اس کی سیرت کے مختلف رجحانات کی آئینہ سامانی کرتا ہے۔ ایک طرف نظیر کی شاعری زندگی سے ہمعنان ہے یہ شاعری زندگی پر گہری تنقید تو نہیں تاہم تصویرِ حیات کے ساتھ ساتھ اس میں زندگی پر ہلکا سا تبصرہ ضرور پایا جاتا ہے۔ اس تبصرہ میں تضاد نمایاں ہے۔ اسی تضاد کے سبب نظیر کی شاعری کا دوسرا رخ یاسی اور گریز کا ہے۔

نظیر شب برات، ہولی، دیوالی، برسات، طفلی، جوانی اور بڑھاپا سب سے واقف ہے اور ان کی تصویریں واقعیت کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ وہ زندہ رہنے کی مسرت سے آشنا ہے۔ وہ اس بات کا قائل ہے کہ "دنیا میں سب کچھ انسان ہی کے لئے ہے" وہ "ریچھ" اور "گلہری" سے بھی دلچسپی رکھتا ہے کیونکہ مظاہرِ حیات مسرت آفریں ہیں وہ لالہ و گل، نسرین و سمن نیلوفر، سوسن، چنبیلی، مدھ مالتی، مولسری، کنول، موگرا، کیتکی، موتیا اور سرسوں کی بہار پر مفتون ہے، کہتا ہے:۔

دنیا نہ کہو اس کو یہ باغ ہے سر بستہ   کیا دست نے قدرت کے باندھا ہے یہ گلدستہ

نظیر کا منفیانہ رُخ "سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاویگا جب لاد چلیگا بنجارا" سے ظاہر ہے۔
نظیر کہتا ہے کہ:

سب جیتے جی کے جھگڑے ہیں سچ پوچھو تو کیا خاک ہوئے
جب موت سے آکر کام پڑا سب قصے قضیے پاک ہوئے

اور

دکھ پا کے مر گیا کوئی سکھ پا کے مر گیا   جیتا رہا نہ کوئی ہر اک آ کے مر گیا

نظیر کا سب سے زیادہ رچا ہوا رنگ قلندرانہ لطف اندوزی میں نظر آتا ہے۔ اس کی نظمیں "من موجی"، "بیخبری کا عالم" "کوڑی نہ رکھ کفن کو" اور "ہر حال میں خوش" شاعر کی اصلی شخصیت کو نمایاں کرتی ہیں اور یوں تو "با ہمہ و بے ہمہ" کی

روح نظیر کی شاعری میں ہر جگہ نظر آتی ہے۔ کہتا ہے :-

ہر آن ہنسی ہر آن خوشی ہر وقت امیری ہے بابا
جب عاشق مست فقیر ہوئے پھر کیا دلگیری ہے بابا
(از مست موجی)

اور
دل کی خوشی کی خاطر ٹکھے ڈال مال دھن کو
گر مرد ہے تو عاشق کوڑی نہ رکھ کفن کو
(از کوڑی نہ رکھ کفن کو)

پھر کہتا ہے :-

افلاس میں ادبار میں اقبال میں خوش ہیں
پورے ہیں وہی مرد جو ہر حال میں خوش ہیں
(از ہر حال میں خوش)

نظیر "غمِ روزگار" کا علاج "غمِ عشق" میں نہیں بلکہ "کیفِ عشق" و "بہجتِ محبت" میں ڈھونڈتا ہے۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ ہر وقت علاج و معالجہ ہی کی فکر میں سرگرداں رہتا ہے بلکہ وہ زندگی کی حقیقتوں میں ڈوب ڈوب کر امرت اور بِس کے تجربے کرتا ہے۔ زندگی کی مسرت زندگی کے وسیع تجربے میں پنہاں ہے۔ جینے کا احساس سب سے بڑی مسرت ہے۔ نظیر کے یہاں جامِ حیات کی تہہ میں غمِ انجام کی تلخی کا احساس بھی ضرور ہے لیکن وہ اس احساس کو من کی موج اور بے خبری و بے خودی کی ترنگ میں بھول جانا چاہتا ہے۔

نظیر بہت بڑا حقیقت نگار (Realist) ہے۔ وہ زندگی کے ہر رخ کو نہایت ہی صداقت کے ساتھ نمایاں کرتا ہے اور وہ تنقیدی حقیقت نگاری (Critical realism) پیش کرتا ہے لیکن کہیں پر بھی وہ انقلابی نہیں۔ وہ جہاد و مقابلہ کی روح سے ناآشنا ہے۔ وہ "پرولیتاری" تو ہے لیکن "پرولیتاریات" میں جذبۂ عمل پیدا نہیں کرتا۔ وہ یہ تو کہتا ہے کہ

مشکِ تتار و مشکِ ختن بھی تجھی میں ہے
یاقوت سرخ و لعل یمن بھی تجھی میں ہے
نسرین و موتیا و سمن بھی تجھی میں ہے
القصہ کیا کہوں میں چمن بھی تجھی میں ہے

ہر لحظہ اپنے جسم کے نقش و نگار دیکھ
اے گل تو اپنے حسن کی آپ ہی بہار دیکھ

لیکن وہ اس خزینۂ قوت میں حرکت و عمل کی لہریں نہیں اٹھا سکتا۔ اس بات کی امید بھی قبل از وقت ہے۔ ایسی تحریکیں بطنِ فطرت میں مستقبل کے لئے پوشیدہ تھیں۔ نظیر کے پاس اگر کوئی پیغام ہے تو وہ قلندری اور بے خودی کا۔ مگر نظیر کبیر اور بھگتی تحریک کے شعراء سے بہت آگے ہے۔ وہ عامۃ الناس کو صرف بلندی سے پیغام ہی نہیں دیتا بلکہ وہ ان کی سطح پر اتر کر ان کے ساتھ زندگی اور انسانیت کے تجربے کرتا ہے۔ وہ صرف "واعظ" نہیں بلکہ "اداکار" بھی

اندر وہ رمز و کنایہ کی زبان میں گفتگو نہیں کرتا بلکہ جنتا کی سیدھی سادی، صاف ستھری زبان میں نغمہ سرائی کرتا ہے وہ اپنی ذات کو ہیئتِ اجتماعی میں ملا دیتا ہے۔ نظیر کی ہمدردیاں بہت وسیع ہیں لہذا اُس کا فن زیادہ تر پروپاگنڈا یا وعظ و پند نہیں بنتا اُس میں واعظانہ تلخی و خشونت نہیں۔ اس کا مقصد اس کے فن میں شیر و شکر ہے۔

نظیر کی شاعری میں واقعیت کے نمونے بے شمار ہیں۔ مثلاً "امیر فقیر اچھے برے آدمی ہیں"۔ "بنجارا نامہ"۔ "برسات کی بہاریں"۔ "دیوالی" وغیرہ نظموں میں حقیقت نگاری کے بہت ہی کامیاب نمونے ملتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

جو اس ہوا میں یار و دولت میں کچھ بڑے ہیں
ہے اُن کے سر پہ چھتری ہاتھی اُپر چڑھے ہیں
ہم سے غریب غربا کیچڑ میں گر پڑے ہیں
ہاتھوں میں جوتیاں ہیں اور پائنچے چڑھے ہیں

(از برسات کی بہاریں)

نظیر کے یہاں تنقیدی حقیقت نگاری کی مثالیں بھی بہت ملتی ہیں مثلاً "ہائے رے افلاس"، "مفلسی"، "جوانی اور بڑھاپے کی لڑائی"، وغیرہ نظموں میں اس کا رنگ جھلکتا ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

دنیا میں لے کے شاہ سے اے یار تا فقیر
خالق نہ مفلسی میں کسی کو کرے اسیر
اشراف کو بناتی ہے اک آن میں حقیر
کیا کیا میں مفلسی کی خرابی کہوں نظیر
وہ جانے جس کے دل کو جلاتی ہے مفلسی

ایک مزاحیہ مگر دلخراش تنقیدی حقیقت نگاری کی مثال دیکھئے:۔

رکھ بوجھ سر پہ نکلا، اشتر ملا تو ایسا،
گھیرا خرابیوں نے لشکر ملا تو ایسا،
بڑھ گئے جو بال سر کے افسر ملا تو ایسا
مفلس کا زرد چہرہ جو زر ملا تو ایسا،
آنسو جو غم سے ٹپکا گوہر ملا تو ایسا

ایک آپ بیتی کی مثال سن لیجئے۔ نظیر معلمی کرکے پیٹ پالتا تھا۔

جو اہل فضل عالم و فاضل کہاتے ہیں
مفلس ہوئے تو کلمہ تلک بھول جاتے ہیں
پوچھے کوئی الف تو اُسے بے بتاتے ہیں
وہ جو غریب غربا کے لڑکے پڑھاتے ہیں
اُن کی تو عمر بھر نہیں جاتی ہے مفلسی

نظیر کا فن "ادب اور زندگی" کی ہم آہنگی کے معیار پر پورا اُترتا ہے۔ اس شاعر کے فن میں زندگی کی نبض کی دھمک ہے۔ میتھو آرنلڈ کے اُصول "شاعری تنقیدِ حیات ہے" کے مطابق نظیر کی شاعری کا مقام بہت اونچا ہو جاتا ہے۔ یہ شاعری محض خیالی اور رموزی نہیں بلکہ حقیقی ہے۔ نظیر اپنے عہد کے صرف شعرائے اُردو ہی سے زیادہ آگے نہیں بلکہ اُس اُردو کے سارے ہندوستانی شعراء سے منزلوں آگے ہے۔ اس کا تضاد اور اسکی

ایک خاص قسم کی صوفیت اُس زمانہ پر نظر رکھتے ہوئے قابلِ معافی ہے۔ اس نے حقیقتوں کو پیش تو کر دیا۔ اُسنے واقعہ پر فریب کا پردہ تو نہیں ڈالا۔ اُس نے حقیقتوں پر تنقید بھی کی لیکن ان کی تلخی سے نجات کا ذریعہ اُس نے قلندری میں ڈھونڈا نظیر کا گریز ایک خاص نوع کا ذہنی گریز ہے۔ وہ ترکِ دنیا کا قایل نہیں اور نہ وہ ماورائیت کو پسند کرتا ہے۔ وہ اسی دنیا میں ہر حال میں خوش رہنا چاہتا ہے اور اپنے بس کی تمام مادی اور اخلاقی آرزوئیں پوری کرنی چاہتا ہے۔ اس کی نجات انفرادی رنگ کی ہے۔ وہ دنیا کو بدل نہیں سکتا۔ یہ کام اقبال اور جوش کے لئے باقی رہ گیا تھا اور یوں تو باوجود عملی نصب العین رکھنے کے اقبال اور جوش میں بھی تضاد پایا جاتا ہے۔ نظیر موت کا خوف دلا کر بے عملی پیدا کرنی نہیں چاہتا بلکہ وہ بیجا تکبر اور غلط حرص و ہوس سے بچانے کی کوشش کرتا ہے، اس کوشش کا اثر اس کے اپنے زمانہ میں کیا ہوا ہوگا، کون جانے مگر موجودہ دور میں موت کی تباہ کاریوں اور بےثباتیوں کا اس کثرت سے تذکرہ عملی قوتوں کو مفلوج کرنے والا ثابت ہوگا۔

اب آیئے میں مختصراً نظیر کی دوسری خصوصیات پر روشنی ڈالنے کی کوشش کروں۔

نظیر کی ہمہ گیر افتادِ طبیعت اور اس کی انسان دوستی (Universality & humanity) اُسے صرف ایک ملکی شاعر نہیں رہنے دیتی بلکہ اُسے ایک بین الاقوامی (International) شاعر بنا دیتی ہے۔ نظیر میں مقامی رنگ (Local colour) کے ساتھ ساتھ انسانی جذبات و احساسات کی ترجمانی بھی ہے۔ اگر "برسات"، "برسات کی بہار"، "ہولی"، "ریچھ"، "گلہری" اور میلے ٹھیلے کے تذکرے ہندوستانی فضاء پیش کرتے اور ملکی کشش رکھتے ہیں تو "انجام"، "تندرستی"، "زر"، "مفلسی"، "پیسا"، "بڑھاپا" وغیرہ نظمیں آفاق گیر انسانی دلچسپی کی سرمایہ دار ہیں۔

نظیر کی ہمہ گیری اس کے مطالعۂ حیات کے تنوع میں پوشیدہ ہے۔ وہ مختلف زاویوں سے زندگی اور انسانیت کا مشاہدہ کرتا اور اُس مشاہدہ کو پیش کرتا ہے۔ کبھی نظیر میں تضاد اس وجہ سے بھی پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ مختلف جذبات و کیفیات کی ترجمانی غیر جانبداری کے ساتھ کرتا ہے۔ اگر نظیر کی فطرت کا تجزیہ کیا جائے تو مندرجۂ ذیل عناصر اُس میں پائے جائینگے

(۱) دل کا گداز۔ نظیر ایک گداز دل کا مالک تھا۔ وہ انسانی کمزوریوں اور حماقتوں کو اچھی طرح سمجھتا تھا پھر بھی وہ انسانیت سے محبت رکھتا تھا۔ وہ انسانی شان و شوکت کی فنا کا راز داں تھا۔ وہ زندگی کی بخششوں اور ناانصافیوں سے آشنا تھا۔ نظیر کا دل بہت ہی حساس تھا اور اس کی آنکھیں بیک وقت مسرور و گریاں رہتی تھیں۔ نظیر کی شاعری میں درد و سوز پایا جاتا ہے۔

(۲) رازِ زندگی سے واقفیت۔ نظیر ایک حقیقت آگاہ شاعر تھا، زندگی اُس سے سرگوشیاں کرتی تھی اور وہ مآلِ حیات کو جانتا تھا۔ وہ اچھی طرح سمجھتا تھا کہ زندگی کا لطف زندگی کو آزادانہ و ہمدردانہ برتنے میں پوشیدہ ہے۔

(۳) رواداری۔ نظیر کے دل کا گداز اور اس کی حقیقت آگاہی اُسے رواداری اور محبت سکھاتی تھی۔ اس کی رواداری

وسیع تھی کہ وہ انسانی غلطیوں سے بھی مسکراتا ہوا چشم پوشی کر لیتا تھا۔ ایک حقیقت آگاہ (Realist) و واقعیت شخص کبھی بھی متعصب نہیں ہو سکتا۔ انتہا پسندی اور جنون نوازی یا تو عجلت سرشت مثالیت پسند (Fanatic / Ideal) کے لئے ہے یا تنگ نظر جاہل کے لئے، لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ نظیر غلطیوں کو سراہتا تھا۔ بلکہ خلاف وہ انسانی خطا کاریوں اور خام خیالیوں پر شدید ہمدردانہ طنز کرتا تھا۔ ہاں اس کی بغل میں ڈھلے والی کی طرح دوزخ کا جغرافیہ نہیں ہوتا تھا۔ کہتا ہے:۔

جو پار اُتارے اوروں کو اُس کی بھی ناؤ اُترنی ہے
جو غرق کرے پھر اسکو بھی یاں ڈبکوں ڈبکوں کرنی ہے

ہمدردیاں بہت وسیع تھیں ۔ غریب امیر، زاہد و رند، تاجر و حاکم، بوڑھے بچے، عورت مرد، انسان حیوان بھی اس کے دل میں جگہ رکھتے تھے۔ اُس نے اپنی وسیع ہمدردیوں کو اپنے آرٹ میں کامیابی کے ساتھ ہے۔ مثالیں دینی طوالت سے خالی نہیں۔ نظیر کے سرسری مطالعہ سے بھی مذکورہ بالا بات کا ثبوت ملجاتا ہے

(۵) صبر ـ عارف شاعر غم روزگار کو ہنسی خوشی کے ساتھ برداشت کر لیتا ہے۔ وہ المناک "انجام حیات کو سمجھتے ہوئے بھی "دنیا کے چمن" سے لطف اندوز ہوتا ہے وہ جیون کے اونچ نیچ اور فنا و بقا کو جانتے ہوئے بھی کہتا ہے کہ:۔

جو فقر میں پورے ہیں وہ ہر حال میں خوش ہیں
ہر کام میں ہر دام میں ہر حال میں خوش ہیں

(۶) ظرافت و مذاح لطیف ـ نظیر کی طبیعت میں ظرافت کا مادہ بہت نمایاں تھا۔ اس ظرافت کا اثر اسکے فن میں بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ وہ ظریف و صاحب مزاح ہے لیکن مضحک اور ہنسوڑ نہیں۔ نظیر کے فن میں عریانی حد سے زیادہ واقعیت پسندی کے سبب پیدا ہوتی ہے۔ اس کا مقصد بھانڈپن یا پھکڑپن نہیں۔ مثلاً۔ "بچپن" کی نظم میں کہتے ہیں:۔

دل میں کسی کے ہرگز نے شرم نے حیا ہے   آگا بھی کھل رہا ہے پیچھا بھی کھل رہا ہے
پہنے پھرے تو کیا ہے ننگے پھرے تو کیا ہے   یاں یوں بھی واہ وا ہے اور وُوں بھی واہ وا ہے

لیکن واقعیت پسندی کی رو میں نظیر کبھی اپنی اصلی متانت اور سنجیدہ ظرافت کی جائز حد سے آگے نکل جاتے ہیں۔ تاہم مجموعی طور پر نظیر کی ظرافت میں بازاریت اور خشونت کی جگہ متانت اور درد (Pathos) پایا جاتا ہے مثلاً "برسات کی بہاریں"۔ "موت سے کسی کو چھٹکارا نہیں"۔ "مفلسی"۔ "پیسہ"۔ "پیسہ ہی سب کچھ کرتا ہے"۔ "آٹے دال کی فکر کرو"۔ "روٹیاں"۔ "پیٹ"۔ "بڑھاپا" وغیرہ وغیرہ۔

درد اور مذاح کی ہم آہنگی ملاحظہ ہو:۔

دریا کے تماشے کو اگر جاویں تو یارو — کہتا ہے ہر اک دیکھ کے جاتے ہو کہاں کھنچ

اور ہنس کے شرارت سے کوئی پوچھے ہے بد خو — کیوں خیر ہے کیا خضر سے ملنے کو چلے ہو

سب چیز کو ہوتا ہے برا ہائے بڑھاپا

نظیر کی ظرافت کی ایک نوع ہمدردانہ طنز (Pathetic satire) بھی ہے۔ مثلاً "ا فلاس" اور دنیا بھی کیا تماشا ہے اس کی مثالیں بہ کثرت ملیں گی۔ غالب کی شاعری میں بھی طنز پایا جا[تا] ہے کہ غالب میں تلخی زیادہ ہے اور نظیر میں درد (Pathos) زیادہ۔ غالب میں نفاست و ن[زاکت] اور نظیر میں وسعت و ہمہ گیری۔

آرٹ میں مذاق کا عنصر بہت پر اثر ہوتا ہے۔ مزاح فن میں رافت و لینت پیدا کرتا ہے ا[ن] ... کرنے والا بنا دیتا ہے۔ ظرافت مصائب کے سمندر میں ایک ہلکی پھلکی مگر محفوظ کشتی ہے۔ جو ... سے بچا لیتی ہے۔ مذاق کا جذبہ رواداری اور وسعتِ قلب و نظر کے سامان مہیا کرتا ہے۔ یہ باتیں ... پوری ہوتی ہیں جب مذاق اور درد میں امتزاج پیدا ہو جاتا ہے۔

"نظیر کی شاعری میں مذاق و ظرافت" ایک علحدہ مضمون کے ذریعہ مکمل طور پر پیش کرنے کی چیز ہے۔ فی الحال میں نظیر کی ظرافت کا منبع و مصدر دریافت کرنا چاہتا ہوں۔ نظیر کی ظرافت کا سرچشمہ بہت گہرا ہے۔ نظیر کے فن کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں مذاق گہری حقیقت بینی کے سبب پیدا ہوتا ہے۔ فطرت خود اپنے اندر بوالعجبی، خندہ آفرین بے جوڑپن، تبسم خیز خامیاں، ہنسی پیدا کرنے والے اضافے اور پر لطف بھولے پن رکھتی ہے۔ نظیر کی واقعیت پسندی اُسے فطرت کے خزانے سے ظرافت کا سرمایہ دلوا دیتی ہے۔ نظیر کی ظرافت تنقید سے زیادہ محض انکشافِ حقیقت سے پیدا ہوتی ہے۔ ملاحظہ ہو "امیر فقیر اچھے برے آدمی ہی ہیں"۔ شاعر کہتا ہے:-

مسجد بھی آدمی نے بنائی ہے یاں میاں — بنتے ہیں آدمی ہی امام اور خطبہ خواں

پڑھتے ہیں آدمی ہی قرآن اور نمازیاں — اور آدمی ہی اُن کی چراتے ہیں جوتیاں

جو اُن کو تاڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

(۷) نظیر کی شاعری میں درد (Pathos) یوں تو ہر جگہ نظر آتا ہے مگر بنجارا نامہ، مآلِ انسان اور ہنس بہت ہی پرسوز نواؤں کی حامل ہیں۔

(۸) نظیر میں تخیل اور تجربہ بہت کافی نظر آتا ہے۔ ہمہ گیر تخیل اور وسیع تجربہ نے نظیر کے فن کو وہ شے بنا دی جو ... تخیل کے ساتھ وسیع تجربہ کی آمیزش نے نظیر میں بیجا جذباتیت پیدا نہیں ہونے دی۔ نظیر کے فن میں جذبہ کا اظہار ...

ت اور متوازن طور پر ہوتا ہے۔ اس کے جذبہ میں جنون سامانی کہیں نظر نہیں آتی۔ نظیر کی نواؤں سے اندرونی ترنم بھی پرواز کرنے لگتا ہے اور اس کا دل بھی دھڑکتا ہے مگر اس دھڑکن میں اختلاج کی کیفیت کبھی نہیں کے استعجیر ایک رومانی (Romantic) شاعر ہے مگر رومانیت کی بداعتدالیوں سے بری ہے۔ تخیل خامیوں کی ازادی وسعت اور روح کے اُفق کا پھیلاؤ رومانیت کی خوبیاں ہیں جنون و وحشت اور انتہا پسند انفرادیت یاں۔ ان خامیوں سے نظیر اپنے وسعتِ قلبی، گداز دل، وسیع ہمدردی اور ظرافت کے سبب محفوظ رہا۔ میں اپنی جخصیت" (Individuality) ضرور نمایاں ہے مگر اس میں بیجا "انفرادیت" (Individualism) نہیں پائی جاتی، وہ ایک "پرولتیاری رومانی" ہے وہ ہیئت اجتماعی کرتا بلکہ اُس کے درمیان رہ کر اپنی ایک خاص جگہ بنا لیتا ہے، نظیر نے حقیقت بینی میں رومانیت کا سراغ پالیا۔ اس سے حقیقتوں کا ایک نئی روشنی میں مشاہدہ کیا۔

نظیر کے فن کے مطالعہ سے ایک اور اہم صلاحیت کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے اندر ایک کامیاب ڈرامہ نویس کی خوبیاں بھی موجود ہیں۔ زندگی کی وسیع واقفیت اور دوسری مذکورۂ بالا خصوصیات کے علاوہ نظیر میں مندرجہ ذیل باتیں ایسی ہیں جو ایک ہوشمند ڈرامہ نگار میں پائی جاتی ہیں۔

(الف) کردار نگاری ۔ نظیر نے زندگی کا مطالعہ مختلف زاویوں سے کیا ہے۔ مشاہدۂ حیات کے وقت اُس پر اکثر غیر جانبداری اور بے خودی کا عالم طاری رہتا ہے۔ نظیر مختلف طبائع اور نوع بہ نوع ادوار و کیفیاتِ حیات کو پیش کرتا ہے۔ ہستی کا مرقع دیکھنا ہو تو "طفلی"، "بچپن"، "بڑھاپا"، "جوانی"، "فقرا کی شان"، "من موجی بے خبری کا عالم"، "کوڑی نہ رکھ کفن کو"، "پیسہ ہی سب کچھ کرتا ہے"، "ہر حال میں خوش"، "مفلسی"، "ہائے رے افلاس" وغیرہ نظمیں ملاحظہ فرمائیں۔ ان نظموں میں کردار نگاری کی بہت سی خام و پختہ مثالیں ملیں گی۔ اگر نظیر ڈرامہ لکھتا تو اسی مواد سے بہت سے شخص کردار پیدا کر لیتا۔

(ب) نظیر جذبات و کیفیات کی ترجمانی نہایت کامیابی کے ساتھ کرتا ہے ملاحظہ ہو "جوانی اور بڑھاپے کی لڑائی"، "نہ کوئی ہمارا نہ ہم کسی کے" وغیرہ نظمیں۔ یہ صلاحیت یوں تو ہر جگہ نمایاں ہے۔ دیکھئے سراج کی بے مثال غزل کو نظیر نے کیسا اپنا لیا۔

عجب اتفاق ہو خود بہ خود مرے دل سے عیش نکل گیا
پڑی آگ غم کی وہ تن میں آکر برنگ شمع پگھل گیا،

اُدھر آہ شعلہ زناں ہوئی اُدھر اشک آنکھوں سے ڈھل گیا
چلی سمت غیب سے اک ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا،

مگر ایک شاخِ نہالِ غم جسے دل کہیں سو ہری رہی

(ت) نظیر الفاظ کے ذریعہ "تصویریت" (Picturesqueness) اور "بت تراشی" (Imagery)

کی مثالیں پیش کرتا ہے ملاحظہ ہو۔ "ہولی"، "دیوالی"، "برسات"، "شب برات"، "طفلی"، "بچپن"، "روپ"، "مفلسی"، "ہائے رے افلاس" وغیرہ۔ نظیر حرکت اور آوازوں کے ذریعہ اپنی تصویروں میں زندگی واردات و جذبات کی عکاسی کر کے تصویر کی روح کو بھی محسوس بنا دیتا ہے۔ سنئے:-

نقشہ ہے عیاں سو طرب و رقص کی رے کا ہے ربط بہم طبلہ و سارنگی
جھنکار مجیروں کی ہے اور شور ہے نے کا مینا کی جھلک، جام ادھر چھلکے
جھمکا نظر آتا ہے ہر اک عیش کی شے کا
دنیا میں عجب روپ جھلکتا ہے روپے کا

اور:- کیسا ہی آدمی ہو پر افلاس کے طفیل کوئی گدھا کہے اُسے ٹھہرا دے کوئی بیل
کپڑے پھٹے تمام بڑھے بال پھیل پھیل منہ خشک دانت زرد بدن پر جما ہے میل
یوں شکل قیدیوں کی بناتی ہے مُفلسی

گھنچکر اپنے دم میں کہیں، چرخ کھاتے ہیں ٹوٹے ہوائی سنگ، کہیں جھمجھماتے ہیں
زن پٹ زپٹ پٹاخے کہیں غل مچاتے ہیں لڑکوں کے غول باندھ کہیں لڑنے جاتے ہیں
کرتی ہے پھر تو ایسی دھواندھماری شب برات

ایک اور تصویر دیکھئے، زندہ تصویر:-

مدت سے ہو رہا ہے جن کا مکاں پرانا اُٹکے ہے اُن کو منہ میں ہر آن چھت پہ جانا
کوئی پکارتا ہے ٹک موری کھول آنا کوئی کہے ہے چل بھی کیوں ہو گیا دوانا
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

(ث) ڈرامہ نگار کے لئے اشیاء کی وسیع واقفیت بھی ضروری بات ہے۔ نظیر بھی دنیا بھر کی چیزوں اور ان کی قسموں سے واقف ہے۔ جانوروں، پرندوں، پھلوں، پھولوں، کھیل تماشہ کی چیزوں، سواریوں کی قسموں، لوازم خانہ داری، بازار کے سامان، رشتہ داریوں، متوسلین کی قسموں، پیشہ وروں وغیرہ سے نظیر کی واقفیت حیرت انگیز ہے۔ اس لحاظ سے وہ شیکسپیر کا مقابلہ کامیابی کے ساتھ کر سکتا ہے۔

(۱۱) نظیر کی شاعری موسیقیت سے ہم آغوش ہے اس کے یہاں داخلی اور خارجی دونوں قسم کی موسیقی پائی جاتی ہے۔ وہ مترنم بحور استعمال کرتا ہے اور بے ساختگی کے ذریعہ روانی پیدا کرتا ہے۔ اُسے الفاظ اور بحور کے استعمال کا ایک خاص سلیقہ ہے۔ اس کے علاوہ نظیر کی شاعری میں ایک داخلی شیریں گداز اور ایک پرکیف

اندرونی ترنم پایا جاتا ہے۔ اُس کی شاعری زندگی کے زیر و بم پر رقص کرتی معلوم ہوتی ہے۔ ہر چند کہ نظیر سادہ اور عام فہم زبان کے استعمال کے ساتھ ساتھ قواعد و املا کی غلطی بھی کرتا ہے اور بر جستگی و صفائی کے باوجود فن عروض کے برتنے میں خامیوں کی مثالیں بھی پیش کرتا ہے تاہم اس کی بنیا دی موسیقیت و ترنم میں کوئی کمی پیدا نہیں ہوتی۔

الغرض نظیر کی شاعری بہت ہی بلند مقام رکھتی ہے اور اُس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ زندگی کی تہوں میں اپنی جڑیں پھیلائے ہوئے ہے۔

اختر اُرینوی

نظیر کی ایک ناکام رات

(ان کے غیر مطبوعہ ترجیع بند سے)

شب کو چمن میں واہ وا، کیا ہی بہار تھی مچی
پھول کھلے تھے پھول پھول، غنچے کھلے کلی کلی،
بیلا، چمیلی، رائے بیل، موتیا، جوہی، سیوتی
بادِ صبا بھی چلتی تھی عطر گلاب میں بسی
حوض بھرے چھلکتے تھے، نہر ہلورے لیتی تھی
بیٹھا بغل میں غنچہ لب، مے کے نشوں کی تازگی
عیش و طرب کی لہر میں رات جب آدھی کٹ گئی
اس میں کہیں سے یک بیک نکلی جو کمر چاندنی

صبح کے ڈر سے ہڑبڑا یار نے گھر کی راہ لی
ہم بھی دغا میں آ گئے، مفت بہار لٹ گئی

رات تو روزِ عیش کی ٹھیری تھی اسکی انجمن
تارے کھلے رتن رتن، پھول کھلے چمن چمن
نرگس یار یاسمن، سوسن طرہ نسترن
کبک تدرو خندہ زن، بلبل و قمری نغمہ زن
شوخ بغل میں گلبدن، سُرخ گلے میں پیرہن
سینہ پہ سینہ، تن پہ تن، عیش و طرب کے سو برن
اس میں رقیبِ دلشکن آیا گجر کالے کے فن،
تھالی کہیں سے لا شتاب دی ہی بجا جو ٹھن ٹھن

صبح کے ڈر سے ہڑبڑا یار نے گھر کی راہ لی
ہم بھی دغا میں آ گئے، مفت بہار لٹ گئی

نظیر کی قدرت زبان و بیان

ایک پری کا سراپا

(غیر مطبوعہ)

خونریز کرشمہ، ناز ستم، غمزوں کی جھکاوٹ ویسی ہے مژگاں کی سناں، نظروں کی انی، ابرو کی کھنچاوٹ ویسی ہے
عیار نظر، مکار ادا، تیوری کی چڑھاوٹ ویسی ہے قتال نگہ اور دشت غضب آنکھوں کی لگاوٹ ویسی ہے،
پلکوں کی جھپک، پتلی کی پھرت، سرمہ کی گھلاوٹ ویسی ہے

جو کافر اس کا عالم ہے، وہ عالم حور کہاں پاوے گر پردہ منہ سے دور کرے، خورشید کو چکر آجاوے
جب ایسا حسن بھبوکا ہو دل تاب بھلا پھر کیا لاوے وہ مکھڑا چاند کا ٹکڑا سا جو دیکھ پری کو غش آوے
گالوں کی دمک، چوٹی کی جھمک، رنگوں کی کھلاوٹ ویسی ہے

تھی زور ادا سے سر اوپر، سنجاف دوپٹہ کی الٹی، بل دار لٹیں تصویر جبیں، جکڑی مینڈھی نیچی کنگھی
دل پیچ نہ کھاوے اب کیونکر اور دیکھ نہ الجھے کیونکر جی وہ رات اندھیری بالوں کی وہ مانگ چمکتی بجلی سی
زلفوں کی کھلت، پٹی کی جمت، چوٹی کی گندھاوٹ ویسی ہے

بیدرد ستمگر بے پروا، چنچل بیکل چٹکیلی سی، دل سخت قیامت پتھر سا اور باتیں نرم رسیلی سی،
ڈوروں کی بان رنگیلی سی، کاجل کی آن کٹیلی سی وہ آنکھیں مست نشیلی سی، کچھ کالی سی، کچھ پیلی سی
چتون کی دغا، نظروں کی کپٹ سینوں کی لڑاوٹ ویسی ہے

اس کافر بت اور نتھ کے انداز قیامت شان بھری اور گہرے چاہ زنخداں میں سو آفت کے طوفان بھری
وہ اڑے صاف ستارہ سے اور موتی سے داماں بھری وہ کان جواہر کان بھرے کن پھولوں بالی جان بھری
بندوں کی ہلت، جھمکوں کی جھمکت، بالی کی ہلاوٹ ویسی ہے

چہرہ پہ حُسن کی گرمی کے ہر آن جھمکتے موتی سے خوش رنگ پسینے کے قطرے سو بار جھلکتے موتی سے
ہنسنے کی ادا میں پھول جھڑیں، باتوں میں ٹپکتے موتی سے وہ پتلے پتلے ہونٹ غضب وہ دانت چمکتے موتی سے

پانوں کی رنگاوٹ قہر ستم، دھڑیوں کی جماوٹ ویسی ہی

تقریر بیاں سے باہر ہے وہ کافر حُسن اہا ہا ہا کچھ آپ نئے، کچھ حُسن نیا، کچھ جوشش جوانی کا اُسکا
لپکیں جھپکیں اُن بانہوں کی ہیں واہ کہوں کیا کیا وہ بانکے بازو ہوش ربا، عاشق سے کھیلیں بانک پٹا

پہنچی کی پہونچ پہنچے پہ غضب، بانکوں کی بندھاوٹ ویسی ہی

وہ گورے گورے ہاتھ غضب، وہ نرم کلائی ناز بھری کچھ شوخ کڑوں کی جھنکاریں کچھ جھنکی چوڑی چاندی کی
یہ عالم دیکھ کے عاشق کا سینہ میں نہ تڑپے کیونکر جی وہ پیاری پیاری انگشتیں وہ پوریں نازک نازک سی

مہندی کی رنگت، فندق کی بنت چھلونکی چھلاوٹ ویسی ہی

کچھ ناز و ادا کی مغروری کچھ جور و جفا کچھ بانک پنا کچھ آمد حسن کے موسم کی، کچھ کافر جسم رہا گدرا
یہ شور جوانی اُٹھتی کا آتا ہے اُمنڈ کر جوں دریا وہ سینہ اُبھرا جوش بھرا وہ حُسن کا عالم جھوم رہا

شانوں کی اکڑ، گردن کی مُڑت، مونڈھونکی کھنچاوٹ ویسی ہی

اس گورے نازک سینہ پر وہ گہنے کے گلزار کھلے چمپے کی کلی ہیرے کی جڑی، توڑے، جگنو، ہیکل، بدھی
دل لوٹے تڑپے، ہاتھ ملے اور جائے نظر ہر دم پھسلی وہ پیٹ ملائی سا کافر وہ ناف چمکتی تارا سی

شوخی کی کھلاوٹ اور ستم، شرموں کی چھپاوٹ ویسی ہی

ہر آن نرالی ہر اک سے اُس شوخ پری کی محبوبی کچھ ناز و ادا کی مرغوبی، کچھ شرم و حیا کی محجوبی،
اب گہنے کی تعریف کروں یا کافر جوڑے کی خوبی پوشاک سنہری عطر بھری، سر پاؤں جواہر میں ڈوبی،

جگنو کی دمک، سینہ کی صفا، کرتی کی پھنساوٹ ویسی ہی

وہ کافر دھج، جی دیکھ جسے سو بار قیامت کا لرزے پازیب، کڑی، پایل گھنگرو، کڑیاں جھڑیاں گجری توڑے

ہر جنبش میں سو جھنکاریں، ہر ایک قدم پر سو جھمکے
وہ چنچل چال جوانی کی اونچی ایڑی نیچے پنجے،
کفشوں کی کھٹک دامن کی جھٹک، ٹھوکر کی لگاوٹ ویسی ہے

قاتل ہر آن نیا عالم، کافر ہر آن نئی جھمکیں
بانکی نظریں، ترچھی پلکیں، بھولی صورت میٹھی باتیں
دل بس کرنیکے لاکھوں ڈھب، جی لینے کی سو سو گھاتیں
ہر آن بھبن، ہر وقت سجیں، ہر دم میں بدلے لاکھ دھجیں
آنکھوں کی لگاوٹ قہر ستم، باتوں کی رکھاوٹ ویسی ہے

تصویر کا عالم نک سک میں، چھب تختی صاف پری کی سی
کچھ چین جبیں کی اینٹھ رہی اور ہونٹوں میں کچھ گالی سی
بیدردی سختی بہتیری، اور مہر محبت تھوڑی سی،
جھوٹی عیاری، ناک چڑھی بھولی، سیانی، کچی سی
ٹھٹھوں کی اوڑ اوٹ اور غضب، قہ قہ کی ہنساوٹ ویسی ہے

نظروں میں صاف اڑائے دل اس طور کی کافر عیاری
اور ہٹ جاوے سو کوس پرے، گر بات کہو کچھ مطلب کی
کہنی مارے، چٹکی لیلے، چھیڑے، جھڑکے، دیوے گالی
ہر آن "چہ خوش" "ہر دم" "اچھا" ہر بات ہنسی کی چہل بھری
رمزوں کا ضلع، غمزوں کا جگت، پھبتی کی پھباوٹ ویسی ہے

یہ ہوش قیامت کافر کا جو بات کہو وہ سب سمجھے
روٹھے مچلے، سو سوانگ کرے، باتوں میں لڑے، نظروں میں ملے
یہ شوخی اور یہ بیتابی اک آن کبھی نچلی نہ رہے
چنچل، اچپل، مٹکے چٹکے، سر کھولے ڈھانپے ہنس ہنس دے
بانہوں کی جھٹک، گھونگھٹ کی ادا جوبن کی دکھاوٹ ویسی ہے

اک شور قیامت ساتھ چلے، نکلے کافر جسدم بن ٹھن
بلدار کمر رفتار غضب، دل کا قاتل، جی کا دشمن
مذکور کروں میں اب یارو اس شوخ کا کیا کیا چنچل پن
کچھ ہاتھ ہلیں، کچھ پاؤں ہلیں، اچھلیں بازو، پھڑکے سب تن
گالی وہ بلا، تالی وہ ستم، انگلی کی نچاوٹ ویسی ہے

اب ایسا حسن کا دریا ہو کس طور نہ لہر دل میں بہے
گر مہر محبت ہو بہتر اور جور جفا ہو تو سہئے
دل لوٹ گیا ہے غش ہو کر بس اور تو آگے کیا کہئے
ملجائے نظیر ایسی جو پری چھاتی سے لپٹ کر سو رہئے
بوسوں کی چپک، بغلوں کی لپٹ، سینوں کی ملاوٹ ویسی ہے

نظیر اکبر آبادی اور عوام

عصرِ حاضر کی تنقید نگاری میں تاریخی تصور کو بنیادی جگہ مل جانے کی وجہ سے ہم جس شاعر یا ادیب کے متعلق کچھ سوچنا یا لکھنا چاہتے ہیں اُسے اُردو ادب کی تاریخ کے مفروضہ ادوار میں سے کسی نہ کسی دور میں جگہ دیکر اُسی دور کی خصوصیات و رجحانات کی روشنی میں اُس کا کلام دیکھتے ہیں۔ تاریخ کو ادوار میں تقسیم کرنے سے کبھی کبھی آسانیاں پیدا ہوتی ہیں لیکن اکثر اس کی وجہ سے ہم کسی نتیجہ پر نہیں پہونچتے کیونکہ انسانی فطرت صرف خارجی اسباب سے نہیں بنتی (اگرچہ خارجی اسباب ہی اصل چیز ہیں اور وہی داخلی اور اندرونی کیفیات کو بھی ترتیب دیتے ہیں) بلکہ کچھ انفرادی اور ذاتی خصوصیتیں ہوتی ہیں جو اس دور کی عام خصوصیات سے علٰحدہ ہوتی ہیں، اس کے علاوہ مختلف الخیال شعرا ماحول کی اپنی ترجمانی سے نئی صورتیں پیدا کر لیتے ہیں۔ اُردو شاعری کی تاریخ کا پس منظر دہلی اور لکھنؤ کی سیاسی و اقتصادی تاریخ اور وہاں کی وہ معاشرتی حالت ہے جس کے سمجھے بغیر اُردو شاعری کا سمجھنا دشوار ہے۔

شمالی ہند میں اُردو زبان کچھ دنوں تک عوام کی چیز رہنے کے بعد دہلی دربار سے وابستہ ہوگئی اور اُردوئے معلّٰی کا نام پاکر ایک معیاری زبان بن گئی۔ تھوڑے دنوں میں لکھنؤ نے بھی اس انحطاط پذیر تمدن کی حفاظت کے سلسلہ میں اُردو کی خدمت شروع کی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُردو زبان اور ادب کا تعلق دہلی اور لکھنؤ سے اس طرح ہو گیا کہ اُسکی ترقی و تنزل انھیں دو جگہوں کی ترقی و تنزل سے وابستہ نظر آنے لگی۔ جو شعرا دوسری جگہ پیدا ہوئے یا بڑھے ان کا تعلق بھی اکثر و بیشتر کسی نہ کسی طرح دہلی و لکھنؤ ہی سے ہوگیا اور شاعری کا معیار انھیں مرکزوں کی وابستگی کے خیال پر جانچا جانے لگا یہاں تک کہ باہر رہنے والوں کے لئے شہرت اور ترقی کی گنجائش ہی نہ رہی ایسی حالت میں جن لوگوں کا تعلق شاہی درباروں سے ہوگیا اُن کا تو کچھ پوچھنا ہی نہیں لیکن جو لوگ براہِ راست دربار کے زیر سایہ نہ تھے وہ بھی اسی معیاری زبان، معیاری ادب، معیاری تہذیب و تمدن کی ترقی کو اصل چیز سمجھنے لگے، یہی وجہ ہے کہ ہم اُن شعراء کے کلام میں جن کی پرورش دربار سے ہوتی تھی یا جن کا مفاد کسی طرح دربار کے مفاد سے وابستہ تھا نیز دوسرے شعراء میں زیادہ فرق نہیں پاتے۔ دونوں کے یہاں ہمیں جو کمی نظر آتی ہے وہ یہی ہے کہ فن شاعری کے لحاظ سے تو وہ تکمیل کا نقشہ پیش کر دیتے ہیں لیکن تخئیل کے لحاظ سے اُن چشموں سے سیراب نہیں ہوتے جن سے شاعری کے موضوعات میں

وسعت اور ہمہ گیری پیدا ہو سکتی ہے۔ یعنی یہ کہ دربار سے وابستہ رہنے والے، تصوف سے دلچسپی لینے والے اور مرکز سے متاثر ہونے والے شاعروں سے ہمارا سابقہ پڑتا ہے اور یہ سب اپنی خصوصیات اور اپنے تعلقات کی وجہ سے عوام سے علحدہ رہتے ہیں۔

مرکزیت، معیار کی پابندی اور دربار سے وابستگی کی وجہ سے اُردو شاعری کا دائرہ بہت تنگ ہو گیا، جو شاعر ان قیود سے کسی طرح نکل سکے وہ البتہ عوام سے اور عوام کے مسایل سے قریب تر آئے لیکن ایسے شعراء کا نام مثال کے طور پر لکھنے کے لئے بھی نہیں ملتا۔ اُردو شاعری کے دورِ متقدمین اور متوسطین میں لے دے کر نظیر اکبرآبادی کا نام سامنے آتا ہے۔ ان کا تعلق براہِ راست نہ دلّی سے تھا اور نہ لکھنؤ سے۔ اُردو ادب کی تاریخ میں نظیر کا اپنا ایک الگ دور ہے وہ کسی دور میں کسی گروہ کے ساتھ شریک نہیں کئے جا سکتے۔ نظیر کی عمر اکبرآباد میں بسر ہوئی اگر نکلے تو گردو پیش کے اضلاع متھرا اور بندرابن وغیرہ تک چلے گئے۔ وہ دلّی اور لکھنؤ دونوں سے الگ اپنی ایک علحدہ دنیا بنا رہے تھے۔ اس لئے نہ تو ہم اُن کے یہاں وہ معیارِ شاعری پاتے ہیں جو دلی اور لکھنؤ کے لئے مخصوص تھی اور نہ کسی دربار سے اُن کا تعلق ہی پایا جاتا ہے، نہ زبان کی وہ صفائی نظر آتی ہے جو ان دو مرکزوں کے لئے مخصوص تھی اور نہ کسی دربار سے اُن کا تعلق ہی معلوم ہوتا ہے۔ اُستادی اور شاگردی کا رشتہ بھی بڑا اثر ڈالتا ہے لیکن ہمیں کہیں سے پتہ نہیں چلتا کہ دلی یا لکھنؤ کا کوئی شاعر اُن کا اُستاد رہا ہو۔ یہ چند باتیں نظیر کو دوسرے شعراء سے بہت الگ کرتی ہیں۔

نظیر نے دربار سے علحدہ ہو کر عوام سے رشتہ جوڑا۔ اُن سے پہلے یا اُن کے بعد اُردو کا کوئی شاعر ایسا نہیں ملتا جس سے ہم اُن کا مقابلہ کریں یا اس کے دور میں انھیں رکھیں اسی لئے میں نے اوپر عرض کیا ہے کہ نظیر کا اپنا ایک علحدہ دور تھا جو تاریخی حیثیت سے اُردو شاعری کے کئی ادوار پر حاوی تھا۔ نظیر کی صحیح تاریخ پیدائش کا پتہ نہیں لیکن یہ معلوم ہے کہ ان کا انتقال سنہ ۱۸۳۰ء میں ہوا۔ عمر کے متعلق تذکرہ نویسوں اور تاریخ ادب لکھنے والوں کا خیال ہے کہ اسّی پچاسی (۸۰، ۸۵) سال سے کم نہیں جیئے اس لئے اگر ہم اُن کی تاریخ پیدائش سنہ ۱۷۴۰ء اور سنہ ۱۷۵۰ء کے درمیان میں مان لیں تو ہمارا کام چل جاتا ہے۔ اُردو شاعری کے دورِ متقدمین کے ابتدائی شعراء کو چھوڑ دیجئے تو بھی عمر کے لحاظ سے نظیر کے ہم عصر کم سے کم بیس مشہور شعراء قرار پاتے ہیں دوسرے درجے کے بعض صاحبانِ کمال اور تیسرے درجے کے شعراء کا ذکر نہیں۔ جنھیں مورخین نے کئی ادوار میں تقسیم کیا ہے وہ سب نظیر کے ہمعصر ہیں۔ اس کی پوری اہمیت شاید ناموں سے واضح ہو سکے۔ صرف اُن کے نام سنئے جنھوں نے اُردو شاعری کے ارتقاء میں حصہ لیا ہے۔ حاتم، مضمون، فغاں، میر، سودا، درد، سوز، مظہر، تاباں، قایم، یقین، حسن، رنگین، نصیر، جرأت، انشاء، مصحفی، رند، ناسخ، آتش (سلسلہ کا خیال نہیں کیا گیا ہے) ان میں سے کون نام ایسا ہے جسے اُردو ادب کی خدمت کے سلسلہ میں کسی نیچے درجہ پر رکھا جا سکتا ہے اور پھر ان میں سے کون ہے جس کی دنیا کی سرحد نظیر کی دنیا سے ملتی ہے؟

شاید کسی کو یہ خیال ہو کہ نظیر اصل میں نظم لکھنے والے تھے غزلگو شعراء سے اُن کا مقابلہ درست نہیں۔ اس سلسلہ میں

شاید یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہو کہ انھیں میں سے بعض شاعر نظم کے بھی اچھے اُستاد تھے۔ میرؔ، سوداؔ، حسنؔ، انشاؔ اور مصحفیؔ نے نظمیں بھی لکھیں لیکن نظیرؔ کے مقابلہ میں یہ لوگ کسی اور دنیا کے بسنے والے معلوم ہوتے ہیں۔ وجہ بالکل ظاہر ہے ان میں سے ہر ایک کا تعلق کسی نہ کسی طرح دربار سے تھا، اس لئے وہ عوام کے قریب نہ آسکے، اُن کی مثنویاں اور دوسری چیزیں زیادہ تر امارت اور اُس کے متعلقات یا انفرادی رنج و غم، ہجو یا مدح کا تذکرہ کرتی ہیں، لیکن نظیرؔ کا کلام پڑھتے وقت یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ خود عوام میں سے تھے، انھیں میں سے اُٹھے اور انھیں کے دکھ درد، ہنسی خوشی، افکار و تاثرات میں شریک رہے۔ اُن کا فن تکمیل کے لحاظ سے بہت ناقص ہے، اُن کی شاعری تراش خراش کے لحاظ سے بہت نامکمل ہے، اُن کے اسلوب میں بےحد ناہمواری ہے، اُن کے تفکر میں گہرائی کا نام نہیں، اُن کے احساسات اور تجربات میں ایک دہقان کی بھونڈی سادگی اور بھدی بے ساختگی ہے لیکن پھر بھی نظیرؔ اپنی دُنیا کے تنہا مسافر تھے جس نے رابنسن کروسو کی طرح سب کچھ خود ہی کیا اور شاعری کے صحیح مصرف کی طرف اشارہ بھی کر دیا۔ انھوں نے احساسات اور جذبات کے لحاظ سے تقریباً ہر طبقہ کے لوگوں کے تجربات اور تاثرات پیش کئے لیکن اُن کی ہمدردیاں عوام ہی کے ساتھ تھیں

عوام کے لفظ سے ایک غلط فہمی پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے اس لئے ضمناً اسے بھی واضح ہو جانا چاہئے۔ بیسویں صدی میں عوام کے لفظ نے مفہوم کے اعتبار سے جو وسعت اختیار کر لی ہے اور سیاسی اصطلاح میں جن بیدار اور سیاسی شعور رکھنے والوں کی طرف اس لفظ کا اشارہ ہوتا ہے وہ نظیرؔ یا اس وقت کے کسی شاعر اور ادیب کے ذہن میں نہیں ہو سکتا تھا۔ نظیرؔ کے یہاں عوام سے مراد تمام عام لوگ ہیں چاہے وہ پیشہ ور ہوں یا کوئی اور۔ بہرحال نظیرؔ کی شاعری کا اصل موضوع عام لوگوں کے محسوسات اور تجربات ہیں۔ ایسا کیوں ہے، مادی طور پر اس کے کیا وجوہ ہیں ہم نے کسی حد تک اوپر کی سطروں میں سمجھ لئے ہیں۔ موضوعات کی دنیا نہایت وسیع ہے لیکن نظیرؔ کے یہاں اس وسعت کے باوجود خیال میں ایک طرح کی مرکزیت ہے جو ہر طرف پھیلنے اور بڑھنے کے باوجود کسی خاص جگہ تک پہونچنے کی کوشش کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے اور وہ خاص جگہ "موضوع سے عوام کا تعلق" ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پہلے کوئی چیز عوام کے نقطۂ نظر سے سوچی ہی نہ جاتی تھی مگر نظیرؔ اپنے ماحول کی وجہ سے ہولی، برسات، عید، شب برات، دیوالی، اندھیری رات اور دوسرے مواقع پر اس کا اظہار کئے بغیر نہ رہتے تھے۔

کلیاتِ نظیرؔ میں غزلیں بھی ہیں اور نظمیں بھی لیکن یہاں موقعہ نہیں ہے کہ اُن کی غزلوں کا ذکر کیا جائے لیکن ایک مختصر سا جایزہ شاید اُن کی نظموں کے سمجھنے میں زیادہ مدد دے سکے [1] تغزل کے لئے جس اعتدال اور ٹھہراؤ کی ضرورت ہے، جذبات میں جس نرمی اور گھلاوٹ کی احتیاج ہے، انداز بیان میں جس رکھ رکھاؤ سے کام لیا جاتا ہے وہ نظیرؔ کو نصیب نہ ہو سکا، اُن کے یہاں خارجیت کا غلبہ غزلوں میں بھی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ خارجیت ہی اُنھیں

[1] فاضل مقالہ نگار کے اس خیال سے مجھے اختلاف ہے، ملاحظہ ہو اسی نمبر میں "نظیرؔ کی غزل گوئی"۔ نیاز

زندہ رکھنے والی چیز ہے۔ وہ اسی خارجیت میں جذبات کی ہلکی ہلکی آنچ دیکر کیف پیدا کرتے تھے۔ کبھی کبھی جذبات کی تیزی خارجی بیان کے جامہ میں بھی نہ سماتی تھی اور وہ کھل کر ایسی باتیں کہنے لگتے تھے جن کو جرأت کی معاملہ بندی کے پہلو میں بھی جگہ نہیں دے سکتے۔ بات یہ ہے کہ جذبات جب تک داخلیت کے قابو میں آکر نوک پلک سے درست نہ ہو جائیں غزل کی چیز نہیں بنتے اور خارجیت جذبات نگاری میں ڈرامائی کیفیت پیدا کرتی ہے جو نظیر کے یہاں بہت ہے۔ غزلوں کا بیان اس سلسلہ میں یوں بھی ضروری ہے کہ نظیر نے اپنی بہت سی نظموں میں وہی عاشقانہ انداز بیان اور موضوع اختیار کیا ہے جو اُن کی غزلوں میں ہے۔ غزلیں بہت زیادہ شخصی اور ذاتی ہونے کی وجہ سے یقیناً نظموں سے الگ ہیں لیکن اثر وہی پیدا کرتی ہیں۔ غزل کے چند شعر دیکھئے اور اُن کا مقابلہ اُن کی نظموں سے کیجئے جن میں کیفیات عشق، ہجر یا وصل کا بیان ہے (مثلاً آندھی، اندھیری رات، ہولی، چاندنی رات وغیرہ)۔ غزل کے شعر یہ ہیں:-

دیکھ کر کُرتی گلے میں سبز دھانی آپ کی
دھان کے بھی کھیت نے اب آن مانی آپ کی

اِک لپٹ کُشتی کی ہم سے بھی تو کر دیکھو ذرا
ہاں بھلا ہم بھی تو دیکھیں پہلوانی آپ کی

دیکھو کہنا مانو مت خالی سلائی سے رکھو
ورنہ کوسے گی ہمیں یہ سُرمہ دانی آپ کی

مجھے تو اُس پہ نہایت ہی رشک آتا ہے
کہ جس کے ہاتھ نے پوشاک تیرے تن کی سی

سچ تو یہ ہے کہ نظیر کے یہاں جذبات کی شاعری کا موضوع بنانے کے فن کی تکمیل نہ ہو سکی، وہ عشق کی کیفیتوں کا بیان کم کر سکتے تھے لیکن عشق اور حسن کا بیان کم نہیں ہوتا۔ ایک طرح کی کُھلی کُھلی سادگی اور بے تکلفی ہے جو بعض جگہوں پر تو یقیناً ایک کیفیت پیدا کرتی ہے لیکن ہر جگہ نہیں۔ جذبات میں گہرائی کی کمی نے اُن کی اکثر نظموں کو خشک بنا دیا ہے اور جب انھوں نے زیادہ سوچا ہے اور داخلیت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے تو سیدھے سادے اخلاق اور تصوف کے مسائل تک پہونچ سکے ہیں۔ جہاں فکری اور فلسفیانہ شاعری کا سوال اُٹھتا ہے وہاں نظیر پیچھے رہ جاتے ہیں۔ وہ انسانی جذبات کے معمولی تاثرات اور تجربات کا ذکر کرتے ہیں، روزانہ کی باتیں دُہراتے ہیں اور کبھی کبھی تصوف اور اخلاق کے مسایل کے سلجھانے کے لئے اشارات اور علامات کا استعمال بھی کرتے ہیں۔ لیکن جہاں نظموں میں اسپنے مادی تجربات کا بیان ہے وہاں اُردو کے بہت کم شاعر اُن کے قریب پہونچتے ہیں۔

اپنے موضوع سے قریب تر آتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ نظیر نے عوام کے جذبات کی ترجمانی کی تو عوام ہی نے نظیر کو زندہ رکھا۔ اُردو شاعری کی معیار پرستی نے نظیر کو ختم ہی کر دیا تھا اگر فقیروں اور گداگروں نے اور معمولی پڑھے لکھے لوگوں نے اُن کے بنجارہ نامہ، آدمی نامہ اور دوسری نظموں کو یاد نہ رکھا ہوتا۔ اُن کے موضوعات کی فہرست ہی پر ایک نظر اس بات کو اچھی طرح واضح کرتی ہے کہ نظیر انسان اور انسانی متعلقات میں سے اُن معمولی چیزوں کو

نظر انداز نہ کرتے تھے جنھیں بڑے بڑے شعراء نہ دیکھتے تھے اور نہ محسوس کرتے تھے، یا اگر محسوس بھی کرتے تھے تو اُس پر لکھنا شاعری کے جوہر کو غلط استعمال کرنے کے برابر جانتے تھے۔ آٹا دال، پیسہ، کوڑی، جھونپڑا، تلاش زر، ہولی، مفلسی، روٹیوں کی تعریف، بنجارہ نامہ، آدمی نامہ اور ایسی ہی دوسری چیزیں اُن کا پسندیدہ موضوع تھیں کیونکہ نظیر غریبوں کے ساتھ اُٹھتے بیٹھتے تھے، متھرا اور بندرابن کے تیرتھوں میں جاتے تھے، مسلمانوں کے عرس اور ہندوؤں کے میلوں میں شریک ہوتے تھے عید اور شب برات کے ساتھ ساتھ ہولی اور دیوالی سے بھی ایک سچے ہندوستانی کی طرح لطف اُٹھاتے تھے۔ اگر انھوں نے مسلمانوں کے خیال سے رسولِ اسلام، حضرت علی، معجزہ حضرت عباس اور سلیم چشتی پر لکھنے کے لئے قلم اُٹھایا تو ہندوؤں کے خیال سے اپنی شاعری کا زیادہ حصہ بھگتی شاعروں کی طرح سری کرشن جی کے لئے وقف کردیا۔ ہولی کی خوشی کا جو بہترین مادی مصرف ہو سکتا تھا اس کا ذکر نہ صرف امراء کے نقطۂ نظر سے کیا بلکہ عوام کو بھی یاد رکھا۔ وہ انھیں کسی حالت میں بھی نہ بھولتے تھے اور سماج کی اس تضاد کی کیفیت کا ذکر ضرور کرتے تھے جس سے طبقات کا فرق پوری طرح نمایاں ہوتا ہے۔ پہلے اور کسی قدر آج بھی فن کاروں کے یہاں تقابل کا آسان طریقہ اثر بڑھانے کے لئے برابر استعمال ہوتا رہا ہے۔ نظیر نے اُسے اپنے شاعرانہ اندازِ بیان کا سانچہ بنا لیا ہے اکثر و بیشتر نظموں میں چاہے عشق و عاشقی کا بیان ہو یا وصل و ہجر کا، موت کا بیان ہو یا مفلسی کا، برسات کا ذکر ہو یا عید کا، امیر اور غریب کو ساتھ ساتھ لائے ہیں۔ مثال کے طور پر «برسات کی بہاریں»[1] دیکھئے:-

کتنوں کو محلوں اندر ہے عیش کا نظارا　　یا سائباں ستھرا یا بانس کا اُسارا
کرتا ہے سیر کوئی کوٹھے کا لے سہارا　　مفلس بھی کر رہا ہے پولے تلے گزارا
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

ہیں جن کے تن ملائم میدے کی جیسے لوئی　　وہ اس ہوا میں خاصی اوڑھے پھرے ہیں لوئی
اور جن کی مفلسی نے شرم و حیا ہے کھوئی　　ہے ان کے سر پہ سرکی یا بورئے کی کھوئی
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

جو اس ہوا میں یارو دولت میں کچھ بڑے ہیں　　ہے ان کے سر پہ چھتری ہاتھی اُپر چڑھے ہیں
ہم سے غریب غربا کیچڑ میں گر پڑے ہیں　　ہاتھوں میں جوتیاں اور پائنچے چڑھے ہیں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

ہے جن کنے مہیا پکا پکایا کھانا　　ان کو پلنگ پہ بیٹھے جھڑیوں کا خط اُٹھانا
ہے جن کو اپنے گھر کا یا نون تیل لانا　　ہے سر پہ اُن کے پنکھا یا چھاج ہے پرانا
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

---

[1] میرے سامنے کلیاتِ نظیر مطبوعہ نولکشور پریس ہے بعض الفاظ اور قوافی کی صحت مجھے کھٹکتی ہے لیکن دوسرے نسخوں سے مقابلہ کا وقت نہیں ہے۔ (احتشام)

ہر جگہ اسی طرح کا تقابل اثر میں اضافہ کرنے کے لئے کیا گیا ہے یہ بات اس سلسلہ میں خاص کر قابلِ غور ہے کہ ہولی دیوالی، عید اور شب برات وغیرہ کے بیان میں نظیر نے ان تیوہاروں کے مذہبی رُخ سے زیادہ اُن کے مادی رُخ کو اُجاگر کر کے امیر و غریب، عوام و خواص پر اُن کے اثر اور ردِّ عمل کا ذکر کیا ہے۔

اس سلسلہ میں جب ہم کسی قدر گہری نظر ڈالتے ہیں تو نظیر کے یہاں ایک طرح کا تخیلی تضاد نظر آنے لگتا ہے جسے تحلیل نفسی کی مدد سے حل تو کیا جا سکتا ہے لیکن بظاہر کوئی بات آسانی سے سمجھ میں نہیں آتی۔ ایک طرف تو نظیر نے دنیا سے لذت اندوز ہونے پر زور دیا ہے، عیش و مسرت پر اُکسا کر اس دنیا کو رنگین بنانے کی دعوت دی ہے، زندگی کے لطف اور جوانی کی سرمستیوں کی طرف اشارہ کر کے رنگ رلیوں میں حصہ لینے کی جانب مائل کیا ہے اور دوسری طرف موت، خدا، نیکی، بدی، فنا اور عقبیٰ سے ڈرا کر عیش و مسرت کی تخیلی لذت بھی ہم سے چھین لی ہے، ایک طرف وہ یہ صدا بلند کرتے ہیں ؎

دیکھ ٹک غافل چمن کو گلفشانی پھر کہاں!

تو دوسری طرف دنیا پرستی کے خلاف وعظ کے ذریعہ سے ترک دنیا پر آمادہ کر دیتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ ہر چیز کا انجام فنا ہے اُس وقت ہمارے کانوں میں ؎

سب جیتے جی کے جھگڑے ہیں سچ پوچھو تو کیا خاک ہوئے جب موت سے آکر کام پڑا سب قصے قضئے پاک ہوئے

کی آوازیں آنے لگتی ہیں اور جوانی کو جوانی کی طرح، زندگی کو زندگی کی طرح بسر کرنے کا جو حوصلہ ہمارے اندر پیدا ہوا تھا وہ ہم میں باقی نہیں رہتا۔ وہ ایک نظم میں جنت پر دنیا کو ترجیح دیتے ہیں تو دوسری نظم میں اس دنیا کی بے ثباتی بیان کر کے ہمارے دماغ میں کشمکش پیدا کر دیتے ہیں۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ ہو کہ اُن کی عمر کے مختلف دور تھے، جوانی اور جوانی کے گرد و پیش کا زمانہ رندی اور لاأبالی پن میں بسر ہو لیکن آخر عمر میں موت اور عقبیٰ کے تخیل نے کمزور پا کر غلبہ حاصل کر لیا۔ خیر یہ بحث مقررہ موضوع سے خارج ہے۔ بات یہ ہے کہ ایک مفکر اور فلسفی اپنی بات کی پچ کرتا ہے اور اپنے خیال پر ایک ضدی کی طرح قائم رہنا چاہتا ہے لیکن ایک عام آدمی ایسا نہیں کر سکتا۔ اُس کی زندگی کے لمحات کسی ایسے نظام کے پابند نہیں بن سکتے جس میں ہر بات معین اور جچی تلی ہو۔ نظیر نہ تو مفکر تھے اور نہ فلسفی۔ یہ اُردو شاعری کی خوش نصیبی ہے اور ہمارے لئے یہی بہت ہے کہ ہم انھیں عام انسانوں کی طرح، عام انسانوں کے جذبات اور تجربات کا ترجمان پاتے ہیں۔ فلسفی اور مفکر نظیر کو پا کر ہم اُس نظیر کو کھو دیتے جو عوام میں گھل مل کر اُن کے متعلق کچھ لکھ سکا۔

نظیر کی شاعری میں انسان ایک زندہ، متحرک، حساس اور مادی اسباب سے مسرور و دلگیر ہو جانے والی مخلوق کی شکل میں آتا ہے "آدمی نامہ" میں انھوں نے مفلس عوام کے زخم پر مرہم لگانے کی کوشش کی ہے جہاں ہر شخص آدمی ہونے کی حیثیت سے ایک ہی کشتی کا سوار نظر آتا ہے۔ انسان کی عظمت کے سامنے طبقات کے تفوق اور پستی کا سر جھکتا ہے۔ ہر شخص جو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا ہوا ہے وہ "آدمی" ہے اور اسی احساس کی تفسیر نظیر کے بہت سے خیالات میں

مجموعی حیثیت سے "آدمی نامہ" میں نظیر نے اپنے خالص بیانیہ انداز میں طرح طرح سے یہی سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ "اشراف اور کمینہ سے لے شاہ تا وزیر" - ہر شخص "آدمی" ہے۔ یہ خیال عوام کے دلوں میں نہ جانے کون سی آگ بھڑکا سکتا تھا لیکن وہ زمانہ طبقاتی اور سیاسی شعور کا نہ تھا۔ تقدیر پرستی نے ان باتوں کے سوچنے کا موقعہ ہی نہ دیا تھا۔ نظیر نے اس خیال سے عوام کے دماغ کو بسانا چاہا تھا تاکہ اُن میں بھی خود شناسی کی پیاس پیدا ہو۔ رمال اور نجومی آج بھی جاہل اور ناسمجھ لوگوں کو دھمکا کر، بہلا کر اور دوسرے طریقوں سے اپنے فریب میں پھنسا لیتے ہیں۔ اُس وقت تو یہ ایک عام بات تھی اور بیچارے عوام آسانی سے اُن کا شکار ہو جاتے تھے۔ نظیر نے اُن جھوٹے خداؤں کا راز فاش کرنا چاہا تھا تاکہ عوام اُن سے بچ سکیں ؎

جہاں میں کیا کیا خرد کے اپنے ہر اک بجاتا ہے شادیانے
کوئی حکیم اور کوئی مہندس، کوئی ہو پنڈت کتھا بکھانے
کوئی ہے عاقل، کوئی ہے فاضل، کوئی نجومی لگا کہانے
جو چاہو کوئی یہ بھید کھولے یہ سب ہیں حیلے یہ سب بہانے
پڑے بھٹکتے ہیں لاکھوں دانا، کروڑوں پنڈت ہزار سیانے
جو خوب دیکھا تو یار آخر خدا کی باتیں خدا ہی جانے

(رمال اور نجومی کے بیان میں)

نظیر نے رمال اور نجومی کا مذاق اُڑا کر نہیں بلکہ نرم، دلکش اور پر اثر ترغیب کی مدد سے لوگوں کا دل اُدھر سے پھیرنا چاہا تھا "پودنے اور گرھ پنکھ کی لڑائی" سے اگر مجازات کو علٰحدہ کر کے دیکھیں تو ہم نہایت آسانی سے اس نتیجہ پر پہونچ سکتے ہیں کہ کمزور بھی شہزور پر فتح پا سکتے ہیں۔ عوام کی ہمدردی کا بہترین ذریعہ نظیر کے پیشِ نظر یہ تھا کہ وہ اُن کے بہت سے بے بنیاد توہمات کو اُن کے دل سے نکال کر انھیں بتا دیں کہ آدمی ہونے کی حیثیت سے وہ بھی سب کے برابر ہیں اور جذبات و احساسات میں خواص سے مشابہت رکھتے ہیں مثالوں سے مضمون کی طوالت بڑھتی جائے گی۔ معمولی طور سے کلیاتِ نظیر کا مطالعہ ان خیالات کو اچھی طرح واضح کر دے گا۔

جن موضوعات کی جانب آج بھی شعراء پوری طرح متوجہ نہیں ہو سکے انھیں نظیر نے بہت پہلے اپنا بنا لیا تھا "ککڑی" اور "تل کے لڈو"۔ "کورے برتن کی تعریف" اور "کوڑی"، "مفلسی"۔ "آٹے دال کا بیان"، "پیسہ" اور ایسے ہی نہ جانے کتنے موضوعات کا انتخاب اُن کے صحیح رجحان کا پتہ دیتا ہے اور یہ رجحان رابطہ عوام کے بغیر بن نہیں سکتا تھا۔ ککڑی اور تل کے لڈو، کورے برتن کی تعریف ایسی نظمیں معلوم ہوتی ہیں جنھیں غالباً نظیر نے بازار کے پیشہ وروں کی فرمائش پر لکھا ہو گا اسی لئے اُن میں علاوہ اس کے وہ ان موضوعات پر سو سال پہلے کی نظمیں ہیں، اور کوئی ایسی خصوصیت نہیں ہے جو انھیں عوام سے پوری طرح متعلق کر سکے۔ شاعرانہ ترغیب کی وجہ سے "کورے برتن کی تعریف" ضرور تھوڑی دیر کے لئے ہماری نگاہوں میں قیمتی برتنوں کو سبک کر دیتی ہے اور غالب کا "جام سفال" یاد آنے لگتا ہے۔

لیکن اسی طرح کی دوسری نظموں کی اہمیت نظرانداز نہیں کی جاسکتی۔ موضوعات پر ایک نظر ڈالئے ''آٹے دال کا بیان''۔ ''مفلسی''۔ ''پیسہ''۔ ''چپاتیاں''۔ ''روٹی کی تعریف'' اور ایسی متعدد نظموں سے ہمارے دماغ پر عجیب وغریب اثر پڑتا ہے۔ اٹھارویں اور اُنیسویں صدی کے نظام معاشرت میں ان چیزوں کا بیان صرف اخلاق اور خداترسی کے تصور پر مبنی تھا اور نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا کے دوسرے ممالک میں بھی ایسے تمدن سے اختلاف کی باقاعدہ کوشش نہیں کی گئی تھی اور نہ آج بھی ہمارے شعراء پوری طرح اس صحیح سیاسی اور معاشرتی قوت سے کام لیتے ہیں لیکن نظیر نے عام انسانوں کی صحبت میں رہ کر ایک حساس شاعر کی طرح ان کی زندگی کے تصادمات کو محسوس کیا تھا، وہ اپنے ''شہر آشوب'' میں عام لوگوں کی بیکاری اور مفلسی کا رونا روتے ہیں اگرچہ اس میں نہ تو سودا کے اندازِ بیان کی تلخی اور تیزی ہے اور نہ تمدن پر اتنی سخت تنقید، لیکن اُس بے اطمینانی کا اظہار ضرور ہے جو مغلیہ حکومت کے زوال کے زمانہ میں اچھی طرح پیدا ہوچکی تھی اور جس کی بنیاد مذہبی نہیں بلکہ قومی تھی۔ نظیر نے کئی نظموں میں قناعت کا زہر آمیز مفہوم پیش کرنے کے بعد بھی افراد کی ضروریات کو خالص مادی نقطۂ نظر سے دیکھا اور جانچا ہے۔ سماج کے نظام کی بدولت کوئی کچھ بن جائے لیکن زندگی کا بنیادی سوال بھوک ہے، نظیر نے اسے محسوس کرنے میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کی بلکہ اپنی پوری قوت کے ساتھ پڑھنے والوں کو بھی ان پر غور کرنے کے لئے مجبور کیا ہے۔ بعض اقتباسات طوالانی بحث سے زیادہ اہم ہیں سے

گر نہ آٹے دال کا اندیشہ ہوتا سدِّ راہ　　　تو نہ پھرتے ملک گیری کو وزیر و بادشاہ
ساتھ آٹے دال کے ہے حشمت و فوج و سپاہ　　　جابجا گڑھ کوٹ سے لڑتے ہوئے پھرتے ہیں آہ
سب کے دل کو فکر ہے دن رات آٹے دال کا

گر نہ آٹے دال کا ہوتا قدم یاں درمیاں　　　منشی و میر و وزیر و بخشی و نواب و خاں،
جاگتے دربار میں کیوں آدھی آدھی رات ہاں　　　کیا عجب نقشہ پڑا ہے آہ کیا کہئے میاں
سب کے دل کو فکر ہے دن رات آٹے دال کا

اپنے عالم میں یہ آٹا دال بھی کیا فرد ہے　　　حسن کی آن و ادا سب اس کے آگے گرد ہے
عاشقوں کا بھی اسی کے عشق سے منھ زرد ہے　　　تاکجا کہئے کہ کیا وہ مرد کیا نامرد ہے
سب کے دل کو فکر ہے دن رات آٹے دال کا

(آٹے دال کے بیان میں)

ان حقیقتوں سے انکار کرکے کون نافہموں کی صف میں جانا چاہے گا؟ پھر روٹیوں کی تعریف شروع ہوتی ہے۔ اس کی مادیت حقیقتاً اتنی ٹھوس ہے کہ ''کامل فقیر''، ''خالق''، اور ''نور'' کے ذکر کے بعد بھی ہمارا ذہن بھوک اور روٹی کے بنیادی سوال سے نہیں ہٹتا بلکہ اور قوی ہوجاتا ہے سے

جس جا پہ ہانڈی چولھا توا اور تنور ہے — خالق کی قدرتوں کا اُسی جا ظہور ہے
چولھے کے آگے آگ جو جلتی حضور ہے — جتنے ہیں نور سب میں یہی خاص نور ہے
اس نور کے سبب نظر آتی ہیں روٹیاں

پوچھا کسی نے یہ کسی کابل فقیر سے — یہ مہر و ماہ حق نے بنائے ہیں کس لئے
وہ سُن کے بولا بابا خدا تجھ کو خیر دے — ہم تو نہ چاند سمجھیں نہ سورج ہیں جانتے
بابا ہمیں تو سب نظر آتی ہیں روٹیاں

پھر پوچھا اُس نے "کہئے یہ ہے دل کا نور کیا؟ — اس کے مشاہدہ میں ہے کھلتا ظہور کیا؟"
وہ بولا سُن کے "تیرا گیا ہے شعور کیا؟ — کشف القلوب اور یہ کشف القبور کیا؟
جتنے ہیں کشف سب یہ دکھاتی ہیں روٹیاں"

اور پھر یہی نہیں بلکہ "اللہ کی بھی یاد دلاتی ہیں روٹیاں" (روٹیوں کی تعریف میں)

اس کے بعد کسی مزید تنقید کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی اور نظیر کی شخصیت کا وہ پہلو اُبھر کر ہمارے سامنے اچھی طرح روشن ہو جاتا ہے جس میں انھوں نے عوام کے مسائل کو عوام ہی کے نقطۂ نظر سے دیکھنے کی کوشش کی۔ اُن کا دل برابر سوال و جواب کرتا رہا، انھوں نے اپنی طویل عمر میں اپنے دور کے نظامِ تمدن کے بہت سے کرشمے دیکھے اور سب کا خاتمہ مادی مجبوریوں پر نظر آیا۔ آج یہ سوال ملک میں برابر اُٹھ رہا ہے کہ ایک حسین اور شریف دوشیزہ عصمت فروشی کی زندگی پر کیوں مجبور ہوتی ہے، ایک نیچے طبقے کا غریب آدمی چوری کی طرف کیوں مائل ہوتا ہے، ایک مفلوک الحال بچہ بھیک مانگنا کیوں شروع کرتا ہے؟ اور جواب کے لئے تجزیۂ نفس سے لیکر مذہب اور اقتصادیات تک بات جاتی ہے۔ تھوڑے سے لوگ جنھوں نے انسانی تمدن کی تاریخ کو انسانی ضروریات اور کشمکش اور حیات کی صحیح روشنی میں پڑھا ہے وہ تو کوئی حکمی جواب دیتے ہیں لیکن دوسرے لوگ خدا کی مصلحت اور تقدیر کہہ کر ان سوالات کو ٹال دینا چاہتے ہیں۔ نظیر نے اس کا وہی جواب دیا ہے جو دنیا کے بہترین ماہرینِ معاشیات دے سکتے ہیں۔ اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ نظیر موجودہ عہد کے کوئی ڈگری یافتہ ڈاکٹر تھے، مقصد صرف اتنا ہے کہ انھوں نے اپنے وسیع تجربات کی مدد سے وہی نتائج نکالے جو حکیمانہ اور عالمانہ تجزیۂ اسباب کے بعد نکالے جاتے ہیں۔ اُنکی نظم "مفلسی" کے بعض حصے ملاحظہ کیجئے:

مفلس میں ہو دیں لاکھ اگر علم اور کمال — سب خاک بیچ آکے ملاتی ہے مفلسی
مُفلس کی کچھ نظر نہیں رہتی ہے آن پر — دیتا ہے اپنی جان وہ ایک ایک نان پر
ہرگز کسی کے دل کو نہیں ہوتی اس کی چاہ — جس طرح کتے لڑتے ہیں اک استخوان پر
ویسا ہی مفلسوں کو لڑاتی ہے مفلسی

جب خوب روپیہ آن کے پڑتا ہے دن سیاہ
پھرتا ہے بوسے دیتا ہے ہر اک کو خواہ مخواہ
ہرگز کسی کے دل کو نہیں ہوتی اس کی چاہ
گر حسن ہو ہزار روپیہ کا تو اس کو آہ
کیا کوڑیوں کے مول بکاتی ہے مفلسی

چوری پہ لاکے ڈالے ہے مفلس کے دھیان کو
آخر ندان بھیک منگاتی ہے مفلسی

یا :-
کوڑی ہے جس کے پاس وہ اہل یقین ہے

کیا ان اشعار میں مفلسی کے نتائج اس بات کی طرف اشارہ نہیں کرتے کہ اکثر اخلاقی برائیوں اور پستیوں کے دور کرنے کا تنہا علاج یہی ہے کہ دولت کی تقسیم صحیح ہو؟ نظیر نے یہاں تک نہ سوچا ہو لیکن شاعر غیر شعوری طور پر بھی سماج کی کشمکش اور تصادمات سے متاثر ہوتا رہتا ہے، ان موضوعات پر میر اپنی سریع الاحساس طبیعت، سودا اپنی ہمہ گیری، مصحفی اپنی پُرگوئی، انشاء اپنی ذہانت اور میر حسن اپنی قوتِ بیان کے باوجود نہ لکھ سکتے تھے کیونکہ وہ پستی یا بلندی جہاں سے کھڑے ہو کر یہ چیزیں دیکھی جا سکتی تھیں انھیں نصیب نہ تھی۔ نظیر کو اس کا موقعہ پوری طرح ملا۔ اس لئے وہ فرضی تخیلات سے آگے بڑھ سکے۔ اندھیری رات کے ساتھ ہندوستانی شعراء کے مہجور اور بیکس نالوں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں لیکن نظیر کے لئے اندھیری رات ایک ایسے روحانی وصل کا سامان مہیا کرتی ہے جسے عملی طور پر عشق کرنے والے ہی اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ آندھی سے لوگ کتنا ہی منغّص ہوں لیکن نظیر نے اُسی کو اپنے ارمانوں کی تکمیل کے لئے مفید پایا۔ عشق و محبت کی یہ عملی تشریح جس میں تخیلِ محض کی بھیانک بلند پروازیاں ڈھونڈے نہیں ملتیں، موسموں اور تیوہاروں کا بیان، مفلسی اور اُس کے لوازم کا انسانی عقاید اور جذبات سے تعلق، کرشن جی، حضرت علی، سلیم چشتی اور نانک ہر ایک سے عقیدت کا اظہار، انھیں چیزوں میں ہمیں اُردو شاعری کے وہ اجزاء ملتے ہیں جو صرف تخیل کے بھروسہ اور کتابی معلومات کی مدد سے پیش نہیں کئے گئے بلکہ حقیقتاً عوام الناس کی روزمرہ کی زندگی، اُس کی کشمکش، اُس کے تضاد اور اُس کے تجربات کی بنیاد پر لکھے گئے ہیں۔ اُنکی شاعری میں نظامِ تمدن کے بدلنے کی ایک دبی اور سہمی ہوئی خواہش کہیں کہیں سے جھانکتی ہوئی ضرور دکھائی دیتی ہے لیکن شاعری کی روح انقلابی نہیں ہے اور شاید اُس وقت ہو بھی نہیں سکتی تھی۔

احتشام حسین رضوی

لاہور میں نگار بک ایجنسی

کی کتابیں آپ کو مکتبہ دانش مزنگ۔ لاہور سے بھی مل سکتی ہیں۔

نظیر، کبیر کے رنگ میں

(ایک غیر مطبوعہ مسدس سے)

جو مرنا مرنا کہتے ہیں وہ مرنا کیا بتلائے کوئی
جو، ہر، باہیں کھول لے جب آئی آئی چھوڑ دوئی
سی ڈالی آنکھ دورنگی کی جب یکرنگی نے مار سوئی
نہ مردوں کا غل شور رہا نہ عورت کی کچھ آہ اوئی
ماٹی کی ماٹی، آگ اگن، جل نیر، پون کی پون ہوئی
اب کس سے پوچھے کون موا اور کس سے کہئے کون موئی

نقارا ڈھول بجتا تھا اور کیا کیا تھی آواز نئی
جب پھوٹ گیا پھر دیکھو تو آواز وہ اس کی کہاں گئی
نر مادہ دونوں ایک ہوئے جب آن بھرم کی کھال پھٹی
نہ نر کا کچھ نرمول رہا نہ مادہ کی پہچان رہی
ماٹی کی ماٹی، آگ اگن، جل نیر، پون کی پون ہوئی
اب کس سے پوچھے کون موا اور کس سے کہئے کون موئی

ہر چار طرف اُجیالی تھی اُس تیل سکورے، باتی کی — وہ جوت نہ تھی اُس دیوے کی تھی اور کسی کی اجیالی
سب گھر کے بیچ اجالا تھا، کیا لوک بندھی تھی نور بھری — جب دیوا بجھ کر سرد ہوا پھر چھائے گئی کل اندھیاری

ماٹی کی ماٹی، آگ اگن، جل نیر، پوَن کی پوَن ہوئی
اب کس سے پوچھے کون موا اور کس سے کہئے کون موئی

تھا جب تک خاصا دودھ بنا تھی اسمیں کیا کیا چیز دہری — براق ملائی ماکھن تھا اور کھویا کادھا اور ربڑی
جب پھٹکر ٹکڑے دودھ ہوا پھر کہاں گئی وہ چکنائی — نہ دودھ رہا نہ دہی رہی نہ روغن مسکہ، چھاچھ، مہی

ماٹی کی ماٹی، آگ اگن، جل نیر، پوَن کی پوَن ہوئی
اب کس سے پوچھے کون موا اور کس سے کہئے کون موئی

یہ بات نہ سمجھے اور سنو، جو لکڑی میں تھی آگ لگی — جب بجھ کر ٹھنڈی راکھ ہوئی پھر اسکی آنچ کہاں پہونچی
یاں ایک طرف کو دولھا تھا اور ایکطرف کو دولھن تھی — جب دونوں ملکر ایک ہوے پھر بات رہی کیا پردے کی

ماٹی کی ماٹی، آگ اگن، جل نیر، پوَن کی پوَن ہوئی
اب کس سے پوچھے کون موا اور کس سے کہئے کون موئی

یاں جنکو جینا مرنا ہے اے یار انھیں کو ڈرنا ہے — جب دونوں دُکھ سُکھ دور ہوئے پھر جینا ہے نہ مرنا ہے
اس بھول بھلیاں چکر میں ٹک رستہ پیدا کرنا ہے — سب چھوڑ بھرم کی باتوں کو اس بات اوپر دل دھرنا ہے

ماٹی کی ماٹی، آگ اگن، جل نیر، پوَن کی پوَن ہوئی
اب کس سے پوچھے کون موا اور کس سے کہئے کون موئی

نظیر کے مختصر سوانح

سید ولی محمد متخلص بہ نظیر اکبر آبادی - ان کے والد کا نام سید محمد فاروق تھا - نوری دروازہ آگرہ میں رہا کرتے تھے - شرفائے اکبر آباد سے تھے - ان کے والد عظیم آباد کے کسی نواب کے مصاحب ہو گئے تھے - ان کو نواب سلطان خاں قلعہ دار آگرہ ابن آخر خاں کی دختر بیاہی تھیں - نواب سلطان خاں دہلی کے رہنے والے تھے - عرصہ سے آگرہ آرہے تھے - سید محمد فاروق کے کوئی اولاد عرصہ تک نہ ہوئی - اُن کی بیوی فقرا کی آستانہ بوسی میں لگی رہتیں مگر کوئی پھل نہ ملا - اتفاقیہ ایک دن اُن کے مکان پر ایک شاہ صاحب آگئے - اُن کی مدارات میں کوئی کمی نہ کی اور اپنا مدعا عرض کیا اور دعا کی طالب ہوئیں - بزرگ نے ارشاد فرمایا "پھولوں کا دونہ روزانہ ایک ہفتہ تک جمنا میں چھوڑ دو - خدا نے چاہا تو جیتا جاگتا بیٹا پاؤ گی اور اُس بچّے کی خوشبو سے دور دور مہک پھیلے گی۔"

پیدائش میاں نظیر سنہ ۱۱۴۸ھ[1] میں پیدا ہوئے - ماں باپ کے سایہ میں پرورش پائی - یہی سال ہے کہ میر تقی میر گیارہ برس کی عمر میں اپنے سوتیلے ماموں قاضی سراج الدین علی خاں آرزو اکبر آبادی کے پاس دہلی چلے گئے - اسوقت آگرہ کا صوبہ دار نصرت یار خاں[2] تھا - علمی مجالس قایم تھیں - میر ہادی فضایل خاں - ملا محمد سعید اعجاز - ملا زاہد خلف قاضی محمد اسلم ہروی کے تلامذہ کی گرم بازاری تھی[3] - یہ ضرور ہے کہ کچھ دن پہلے شاہ مبارک آبرو[4] - شرف الدین مضمون[5] - اسد اللہ انسان[6] آگرہ سے جا چکے تھے - احسان اللہ شیخ وقت کا دور تھا - عید گاہ کے پاس قیام تھا - بایزید قلندر سرائے گیلانی میں رہتے تھے - محمد باعث عالم صوفی کا ڈنکا بج رہا تھا - یہ عالم گنج میں مقیم تھے اُن کے پاس ہی میر تقی میر کے والد سید علی متقی رہا کرتے تھے - یہیں ابو الفتح اکبر آبادی طبیب کا مطب بھی تھا -

میاں نظیر نے ہوش سنبھالا تو مولوی محمد کاظم - ابن مولوی دوست محمد نبیرہ میر رفیع الدین محدث متوفی سنہ ۱۱۹۵ھ[7] ملا ولی محمد شارح مثنوی مولانا روم متوفی سنہ ۱۱۲۷ھ[8] اسلاف کے آثار علمیہ پر فضل و کمال کی مجلس قایم کئے بیٹھے تھے - طالبان علم اُنکی درسگاہوں سے فیض یاب ہوتے - اُن ہی کی سیر میاں نظیر نے بھی کی -

---

[1] ذکر غالب - [2] مرات العالم بختاور خاں عالمگیری - [3] نکات الشعرا - [4] تذکرہ ریختہ گویان مرتبہ فتح الحسنی گردیزی - [5] چمنستان شعرا [6] بوستان اخبار مرتبہ مولوی سعید احمد مارہروی -

شعر و شاعری کا عام چرچا تھا۔ میر سجاد سجاد۔ محمد محسن محسنؔ سے اساتذہ وقت آگے پیچھے دہلی جا بسے اور خان آرزو اور میر تقی میر اکبر آبادی کے مراختہ کی زینت بنے۔ مولوی امجد علی اصغر کی شاعری ابتدائی تھی۔ میاں نظیر پر بھی رنگ چڑھ رہا تھا۔ خوب کہنے لگے تھے ؎

شہر سخن میں اب جو ملا ہے مجھے مکاں　　کیونکر نہ اپنے شہر کی خوبی کروں بیاں

دیکھی ہیں آگرہ میں بہت ہم نے خوبیاں　　ہر وقت اس میں شاد رہے ہیں جہاں تہاں

رکھیو الٰہی اسکو تو آباد جاوداں،

نظیر نے مشورہ سخن کسی سے نہیں لیا۔ فطری شاعر تھے۔" اگر شاگرد ہو سکتے تھے تو میر کے ہو سکتے تھے۔"

عہدِ جوانی میاں نظیر کی منچلی طبیعت تھی۔ جوانی آئی اور غضب کی آئی۔ ارد گرد بنکیروں کے جمگھٹے رہتے تھے۔ بچپن سے ورزش کا شوق تھا داؤ پیچ کی کشتی بھی لڑ لیا کرتے تلوار۔ بانک پٹا۔ بَنَم غرض کہ کسی ہتھیار کے چلانے میں بند نہ تھے۔

شباب کا عالم اور اس پر بانکے نوجوانوں کی ہمراہی۔ لڑنا بھڑنا طبیعت میں داخل تھا ؎

بانکے بھی ہو کے ہم نے اس دید کو اڑایا　　شمشیر اور سپر کو اک عمر کھڑکھڑایا

بانک پٹا بنم گدکا ولٹھ پھرایا　　جھمکا تمہارا اسدم ہم کو جو یاد آیا

نظیر جس مزاج کا آدمی تھا اور کلام سے ترشح بھی ہے کہ عمر کا بڑا حصہ لہو ولعب میں صرف کیا۔ عوام کی سوسائٹی میں شریک تھے۔ لوگ پچیسی کھیل رہے ہیں تو یہ بھی برابر کے شریک جوا ہو رہا ہے تو اس میں بھی داؤ رکھنے کو حاضر ہیں۔ شطرنج میں بند نہیں گنجفے میں عاری نہ تھے۔ چوسر کا پانسہ ایسا پھینکتے کہ بگڑی بازی بن جائے۔ گیڑیاں بھی کھیلیں۔ کبوتر بھی اڑائے۔ لال بھی لڑائے تیرے بھی۔ کنکوے سے بھی شوق رکھا۔ غرض کسی کھیل میں کم نہ تھے۔[۱]

شطرنج

عجب یہ شطرنج کا سا نقشہ بچھا ہو دن رات خوب اس جا　　جو بات چاہے کرے کسی کو نہ کہے بُرو اس کو مات اس جا

ہزاروں منصوبے دل میں باندھے بتانے چالوں کی گھات ہجا　　نہیں ہو اک چار چو کہ قائم سبھوں کی بازی ہو مات اس جا

پڑے بھٹکتے ہیں لاکھوں دانا کروڑوں پنڈت ہزاروں سیانے

جو خوب دیکھا تو یار آخر خدا کی باتیں خدا ہی جانے

کنکوے بازی

لاتا ہے پھیر پھار کے تکل جو اپنی داں　　کہتا ہے کوئی اُن سے خبردار ہو میاں،

اب پیچ پڑتے کو ہے نہ دے اتنی ٹھمکیاں　　گھبرا کے کتنے اس کے نہ پھنسنے دو میری جاں

اچھا نہیں ہے مفت کھپانا پتنگ کا

کبوتر بازی کا شوق بہت تھا۔ کہتے ہیں ؎

اپنے تو لڑکپن سے ہیں دم ساز کبوتر

کیا بلبل و قمری، و چھپے، پدّی و پدّے   چنڈول، اگن، لال، بئے، ابلقے، طوطے

کیا طوطی و مینا و بئی، تیتر و شکرے   طائر ہیں غرض بازی و اشغال کے جتنے

کی غور تو ہیں سب میں سرافراز کبوتر

آگرہ کی تیراکی دور دور مشہور ہے۔ نوچندی کا میلہ زباں زد ہے۔ خود تو تیراکی کے اُستاد تھے ہی۔ برسات میں تیراکی کا میلا ہوا۔ پہلو میں نوخیزوں کو لئے ہوئے تیرنے گئے۔ ایک مسدس میں تیراکی کا مفصل حال لکھا ہے اور اس کے جس قدر متعلقات ہیں وہ سب قلمبند کئے ہیں ؎

جمنا کا پاٹ گویا صحن چمن ہے بارے   پیراک اس میں پیریں گویا کہ چاند تارے

منہ چاند کے سے ٹکڑے تن گورے گورے پیارے   پریوں سے بہہ رہے ہیں منجدھار اور کنارے

کچھ وار پیرتے ہیں کچھ پار پیرتے ہیں

اس آگرہ میں کیا کیا اے یار پیرتے ہیں

ہندوانی تہواروں سے بہت دلچسپی لیتے تھے۔ دیوالی ہو یا ہولی۔ راکھی ہو یا اور کچھ، دل وجان سے لطف اُٹھاتے تھے۔ یہ وہ وقت تھا کہ ہندو اور مسلمانوں میں کوئی بیگانگی نہ تھی۔ وہ مقامی تہذیب و تمدن میں رنگ گئے تھے۔ خواہش میں مبتلا ہونا بھی ایک طرح کی وضعداری سمجھی جاتی تھی۔ اور اس کو آزاد خیالی کہتے تھے۔

ہولی مہذب نگاہوں میں بدتہذیبی کا کامل مظاہرہ ہے۔ مگر اُسوقت دلبستگی کا مشغلہ تھا۔ میاں نظیر بھی اس دلبستگی سے کیسے بچے رہتے۔ وہ خود مینوا کا سوانگ بھرتے۔ خوش رو ہمراہ ہوتے۔ شہر کی گلیوں میں گشت لگتا۔

"جب پھاگن رنگ جھمکتے ہوں، تب دیکھ بہاریں ہولی کی"

اس کی خاطر برج تک گئے اور ہولی کی رنگ رلیاں منا آئے اس کے علاوہ دیوالی اور دسہرہ بھی اُن کے لئے کچھ کم دلچسپی کا باعث نہ تھے۔ ایک جگہ کہتے ہیں :-

ہے دسہرے میں بھی یوں تو فرحت و زینت نظیر   پر دوالی بھی عجب پاکیزہ تر تہوار ہے

ہندوانی تہواروں میں بسنت بہت بھاتا تھا ؎

ملکر صنم سے اپنے ہنگام دل کشائی   ہنس کر کہا یہ ہم نے اے جاں بسنت آئی

جوانی دیوانی تھی "موتی" کو دل دے بیٹھے۔ شب و روز خوشوقتی میں گزرنے لگے۔ اٹھائیسویں سال گرہ تھی کہ سورج مل جاٹ خلف بدن سنگھ جو صفدر جنگ وزیر احمد شاہ کا منہ لگا تھا (۱۱۶۶ھ) آگرہ آ دھمکا۔ فاضل خاں

قلعہ دار کو دھوکا دے قلعہ پر قبضہ جمایا۔ سربفلک عمارات ڈھائیں، خانقاہیں تباہ کیں۔ علمی ادارے تباہ کئے۔ امراء کے گھر لوٹے، ملبۂ عمارات و سامانِ قلعہ ڈیگ لے گیا۔ «سوہارام جاٹ» ظالم کو آگرہ کا حاکم بنا گیا۔ اس نے سورج مل سے بڑھ کر خزانہ کی تلاش میں رہی سہی نفیس اور عالیشان عمارتیں بھی کھدوا ڈالیں اور شہر کے ساہوکاروں پر اس قدر ظلم توڑے کہ ہزارہا نفوس نے گھر بار چھوڑ دوسری جگہ کی راہ لی۔ محلہ کے محلے ویران ہو گئے۔[لہ] یہ مصیبتیں میاں نظیر کے آنکھوں دیکھتے گذریں۔ خوشحالی کا زمانہ گزر گیا۔ عمر چار کم چالیس کی تھی کہ ۱۱۸۲ھ میں تیس برس بعد میر تقی میر وطن لوٹے۔ آگرہ کے شعراء میر صاحب سے ملنے گئے۔ میاں نظیر بھی ایک دوست کے کہنے سے حاضرِ خدمت ہوئے۔ ایک غزل سنائی جس کا مطلع یہ تھا

نظر پڑا اک بت پری وش نرالی سج دھج نئی ادا کا جو عمر دیکھو تو دس برس کی پہ قہر آفت غضب خدا کا

ختمِ غزل پر میر صاحب نے اظہار خوشنودی کیا۔[عہ]

آگرہ کا آنا میر صاحب نے خود اپنی سوانح عمری «ذکرِ میر» میں یہ لکھا ہے۔ وہاں (اکبر آباد) کے شعرا مجھے اُستادِ فن سمجھ کر اکثر ملاقات کے لئے آتے تھے۔ صبح و شام دریا کنارے جا بیٹھتا۔ اس طرف باغات اور اُس طرف قلعہ اور امرائے عظام کی حویلیاں تھیں اور بیچ میں گویا نہرِ بہشتی بہ رہی تھی۔ میں اکثر جاتا اس سیر کا لطف اُٹھاتا تھا۔ شعر و سخن کا شور ایک عالم پر چھایا ہوا تھا۔ اس لئے اکثر حسین خوش ترکیب جامہ زیب پاکیزہ طینت موزوں طبع میرے گرد جمع رہتے تھے اور میری بہت عزت و توقیر کرتے تھے۔ دو تین بار تمام شہر میں پھرا اور وہاں کے علماء فقرا اور شعرا سے ملا۔ کوئی ایسا مخاطب نہیں ملا کہ اس سے دلِ بیتاب کو تسلی ہو۔ میں نے کہا سبحان اللہ یہی وہ شہر ہے جس کے ہر کوچہ میں عارفِ کامل، فاضل، شاعر، منشی، دانشمند، فقیہ، متکلم، حکیم، صوفی، محدث، درویش، متوکل، شیخ، ملا، حافظ، قاری، امام، موذن، مدرسہ، مسجد، خانقاہ، تکیہ، مہمانسرا، مکان اور باغ تھے۔ آج وہاں کوئی آدمی ایسا نہیں کہ اس کی صحبت سے لطف اُٹھاؤں۔ میری نظروں میں سارا شہر ایک خرابۂ وحشت ناک تھا۔ بہت رنج ہوا اور واپس آ گیا۔ چار مہینے اس طور سے وطن مالوف میں گزارے۔ چلتے وقت بہت حسرت ہوئی اور وہاں سے سورج مل کے قلعوں میں آ گیا۔[سہ]

میاں نظیر بھی حوادثاتِ مقامی سے اثر پذیر ہوئے۔ کایا ہی پلٹ گئی، شائستہ مزاج، منکسرانہ طبیعت کے آدمی ہو گئے۔ زمانہ کے ہاتھوں ایسے ستائے گئے کہ معاش کی فکر دامنگیر ہوئی۔

ملازمت پرانی کمائی پاس تھی۔ مکتب داری شغل لے بیٹھے۔ کچھ روز کو متھرا گئے۔ پھر لوٹ آئے۔ یہاں قلعہ دار مرہٹہ «بھاؤ» تھا۔ اُس نے بلایا اور آپ سے پڑھنا شروع کیا۔ یہاں سے چھٹے تو نواب محمد علی خاں امرائے آگرہ سے تھے، مکان مائی تھان میں تھا۔ اُن کے یہاں لڑکوں کو پڑھانے جانے لگے۔ یہیں سے لالہ بلاس رائے کھتری سے راہ و رسم ہو گئی۔ جب نواب کے یہاں سے جدا ہوئے تو رائے صاحب نے سر آنکھوں پر بٹھایا اور اپنے بچوں کو سپردگی میں دیا اور اُن کی جملہ ضروریات کی

لہ مفتاح التواریخ صفحہ ۴۰۵۔ عہ زندگانی بے نظیر (ملخص)۔ سہ ذکر میر

کفالت اپنے ذمہ لی۔ لالہ کے چھ لڑکے من سکھ رائے گوربخش، ہربخش، مولچند، بنسی دھر اور شنکر داس زیرِ تعلیم تھے۔

لطیفہ محلہ تاج گنج سے ٹٹو پر سوار ہو کر بائی نقان آتے۔ ایک روز ٹٹو نے شوخی کی۔ چابک ہاتھ میں تھا۔ اُس کے رسید کیا ایک راہ گیر بھی قریب ہی تھا۔ اُس کے وہ لگتا ہوا ٹٹو کے لگا۔ اس نے کہا میاں میرا ایسا کیا قصور تھا کہ صبح ہی صبح چابک سے خبر لی۔ میاں نظیر اتر پڑے اور اُس سے معافی کے خواستگار ہوئے اور زبردستی اس کے ہاتھ میں چابک دیکر کہا میاں ایک میرے بھی جڑ دو، بدلا ہو جائے گا۔ وہ کہکر پچھتایا۔ انھوں نے پیچھا نہ چھوڑا۔ مجبور ہو کر چابک اُن کے چھوا کر چلتا بنا اس تاریخ سے پھر چابک ہاتھ میں نہیں لیا ٹٹو اپنی رائے سے چلتا اور منزلِ مقصود تک پہونچ جاتا۔

آخر عمر میں راجہ بلوان سنگھ والیِ کاشی کی سرکار سے تعلق ہو گیا تھا ؎

کہتے ہیں جس کو نظیرؔ سنئے ٹک اسکا بیاں ۔۔۔ تھا وہ معلم غریب بزدل و ترسندہ جاں

میاں نظیر میں قناعت پسندی و استغنا کی شان آگئی تھی۔ کسی امیر کے آگے دستِ سوال دراز کرنا برا سمجھتے تھے۔ جاٹ گردی کا دور مصیبت کا دور تھا۔ مفارقت وطن گوارا نہ کی۔ متھرا گئے چند روز بعد لوٹ آئے اور نہ حاکم وقت کا مدح خواں بنکر کچھ ہاتھ گرم کرتے۔ مرہٹوں کا زمانہ بھی دیکھا قلعہ دار کے اُستاد بھی رہے مگر الگ تھلگ ہی رہے۔

نواب واجد علی شاہ نے شہرت سنکر ایک قاصد معہ روپیہ کے طلبی کے لئے بھیجا۔ وہ میاں نظیر کے پاس آیا اور راہ خرچ دیا رات بھر ان کے گھر میں روپیہ رکھے رہے۔ تردد کی وجہ سے نیند نہ آئی۔ کہنے لگے ادنیٰ تعلق سے تو یہ ترددات ہیں، جب پورا تعلق ہو گا تو خدا جانے کیا حال ہو گا۔ کم بخت کو پھینکو۔ یہ کہکر روپیہ واپس کئے اور لکھنؤ نہ گئے[1]۔

میاں نظیر کے نواسے داماد داروغہ نوازش علی کی زبانی یہ بھی کہنا ہے کہ مہاراجہ چندو لال وزیر اعظم حیدر آباد نے بھی بلایا تھا مگر نہ گئے

فضل سے اللہ کے اس کو دیا عمر بھر ۔۔۔ عزت و حرمت کے ساتھ پارچہ و آب و نان

میر قدرت اللہ نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے:- "بہ معلمی اوقات گذاری می کرد و بہ کشادہ پیشانی ایام زندگی بسر می برد"

علمی لیاقت فارسی علوم میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ عربی میں بھی طالب علمانہ استعداد تھی۔ ہندی۔ پنجابی اور سنسکرت پر کم عبور تھا۔ انکسار سے فرماتے ہیں ؎

فہم نہ تھا علم سے عربی کے کچھ اُسے ۔۔۔ فارسی میں ہاں مگر جانے تھا کچھ این و آں

مذہب میاں نظیر اپنے باپ کے نام کے اعتبار سے سنی نظر آتے ہیں، مگر میاں نظیر کو لوگ امامیہ کہتے ہیں۔ لیکن بعض بزرگ کہتے ہیں کہ تفضیلی تھے۔ نماز روزہ کے بہت معمولی پابند تھے۔ حتیٰ کہ عید کی نماز کا دوگانہ بجائے عید گاہ کے گھر ہی میں ادا کر لیتے۔

تعزیہ داری البتہ تعزیہ داری بڑی خوش اعتقادی سے کرتے۔ پچاس روز متواتر مجالس ۶۰ ۱ منعقد ہوتیں۔ سال بھر کی کمائی اس میں صرف کر دیتے تھے۔

---

[1] زندگانی بے نظیر

صوفیانہ وضع

انقلابِ زمانہ کا مزہ چکھے ہوئے تھے ادھر صوفیا کی صحبت، ان کے مکان کے قریب مولوی احمد شاہ قادری الحجبزی رہا کرتے تھے۔ مسجد میں شاہ غلام رسول رہتے تھے، مشائخ وقت سے تھے۔ اُن کی خدمت میں وقت کا بڑا حصہ گزارتے۔ ذکر و فکر اور تسبیح و مصلّے سے تو زیادہ کام نہ تھا مگر مضامینِ تصوف دل پر نقش ہونے لگے۔ سادہ وضعی، میانہ روی، صداقت، حلم و مروت، غرضکہ شیخ کی صحبت سے جملہ صوفیانہ صفات سے متصف ہو گئے۔ اس زمانہ کا نتیجۂ فکر بھی صوفیانہ خیالات کا مجموعہ ہے۔ بعض نظمیں معرفت اور تصوف کے اسرار کے حق میں آئینہ کا حکم رکھتی ہیں۔ اور یہی چیز مایۂ ناز ہے اُردو شعرا میں صرف اُن کو ہی یہ فخر ہے اور بجا فخر ہے کہ وہ مسایل تصوف کو مثال سے سمجھا کر وہ بات پیدا کر دیتے تھے جو حضرت عطار نے منطق الطیر میں کی ہے۔

شاعری

میاں نظیر کی شخصیت ما بہ الامتیاز جو ہے وہ شاعرانہ ہے، لکھا جا چکا ہے کہ اُن کو اوائلِ عمر سے شعر و شاعری سے ذوق کا

فردِ غزل کے سوا شوق نہ تھا کچھ اسے — اپنے اسی شوق میں رہتا تھا خوش ہر زماں

میاں نظیر نے مشورۂ سخن کیا یا نہیں یا کسی اُستاد کے آگے زانوئے تلمذ تہ کیا یا نہیں اس کے متعلق تذکرہ نویس خاموش ہیں میاں نظیر فطری شاعر ہیں ناسخ اور غالب کی طرح اُن کو بھی زورِ فکر اور جودتِ طبع نے شاہراہِ سخن میں اپنا راہنما بنایا۔ نظیر کا انداز سب سے جدا ہے۔ اسوقت میں یہ طرز رائج اور مرغوب نہ تھی اور کوئی اس رنگ میں کہنے والا بھی نہ تھا۔ اس اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ جہاں وہ اپنے اندازِ خاص کے موجد تھے وہاں انھوں نے خود ہی اپنے لگائے ہوئے پودے کو پروان چڑھایا اور کسی فرد کے احسان سے گرانبار ہونا گوارا نہیں کیا۔[لہ]

میاں نظیر عموماً نظمیں راہ چلتے کہا کرتے۔ ملکوں کی گلی سے شہر آتے ٹوانی کچھ ایسی سدھ گئی تھی کہ کسی نے میاں کو سلام کیا اور وہ ٹھہر گئی۔ راہ چلتے لوگ اُن سے نظموں کی فرمایش کرتے۔ کنجڑا ملا اس نے کہا میاں ککڑی پر بھی کچھ کہدو۔ فقیر ملا کوئی قصہ کہہ دیجئے کہ اُس کے ذریعہ بھیک مانگ کھاؤں، ایسی ہی صدہا نظمیں راہ چلتے کہہ ڈالیں۔ انھیں نظموں کی وجہ سے شہرت دور دور تک ہوئی۔

لطیفہ — تاج گنج سے آتے ہوئے چند بیڑنیوں نے روک لیا۔ تقاضہ تھا کہ کچھ کہدو۔ انھوں نے بہت ٹالا مگر وہ کاہے کو میاں کو چھوڑتیں مجبور ہو کر اُن دونوں سے پوچھا کہ تمھارے نام کیا ہیں۔ ایک نے کہا "جمنا"، دوسری نے کہا مجھکو "گنگا" کہتے ہیں، انھوں نے دعا کے لئے ہاتھ اُٹھائے اور کہنے لگے

یارب مری دعا کو جلدی قبول کیجے — جمنا میں لگا بلی گنگا کے پار کر دے

لطیفہ — مائی تھان جاتے ہوئے کناری بازار پڑتا ہے۔ کوٹھے پر سے ایک مہوش نے مسکرا کر کہا کہ میاں ہم کو بھی اپنا کلام سنا دو۔ یاد کر لیں گے گائیں گے اور کمائیں گے۔ اور اس فرمایش پر بہت جز بز ہوئے اس کا اصرار بڑھ رہا تھا

لہ نقاد جلد ۱ نمبر ۵ صفحہ ۵۰

اور وہ ماننے والی نہ تھی۔ کہنے لگے ؎

لکھیں ہم عیش کی تختی پہ کس طرح ایجاں قلم زمین کے اوپر دوات کوٹھے پر

وہ حبیب پکر چپ ہو گئی یہ آگے چلتے ہوئے۔

لطیفہ۔ میاں نظیر دوپہر کا کھانا رائے صاحب ہی کے یہاں کھاتے ایک روز بیسنی روٹی بھی کھانے میں شامل تھی۔ اچار کے لئے جی چاہا۔ گھر میں بچا نہ تھا۔ بھولارام پنساری کا لڑکا بھی اُن کے پاس پڑھنے آ بیٹھا تھا۔ اس سے کہا لالہ جا اپنے چاچا سے کہو میاں نے آم کا اچار منگایا ہے۔ وہ لپکا ہوا پھلکتی آیا۔ دوکان پر گاہکوں کی بھیڑ لگی تھی۔ لڑکے نے میاں نظیر کا نام لیا کہ اچار منگا رہے ہیں۔ بھولارام نے مٹکی میں سے چنگل بھر دونے میں رکھ لڑکے کو حوالے کیا اور سودا دینے میں لگ گیا۔ یہ لئے اُستاد کے پاس پہونچا۔ منتظر بیٹھے تھے۔ دونہ کھول کر جو دیکھا تو چوہا مصالحہ میں لت پت تھا۔ انھوں نے اس کو رکھوا دیا شام کو رائے صاحب آئے اُن سے کہا بھولا کو بھی بلوا لو ایک لطیفہ ہے وہ آیا تو ایک نو تصنیف مخمس پڑھا:۔

پھر گرم ہوا آن کے بازار چوہوں کا ہم نے بھی کیا خوانچہ تیار چوہوں کا
سر پاؤں کچل کوٹ کے دو چار چوہوں کا جلدی سے کچومر سا کیا مار چوہوں کا
کیا زور مزیدار ہے اچار چوہوں کا

بھولارام بولا، میاں کہیں چوہوں کا اچار بھی ہوا ہے۔ کہنے لگے تم ہی تو بھیجتے ہو اور دونہ منگا کر سامنے رکھدیا۔ وہ بیچارہ بڑا خفیف ہوا اور سب نے فرمائشی قہقہہ لگایا۔ ایسی اکثر باتیں مشہور ہیں۔

اخلاق و عادات

میاں نظیر میں علم بہت آگیا تھا۔ خلیق و متواضع بحد تھے جس مجلس میں بیٹھتے اخلاق کے ندرے شمع انجمن معلوم ہوتے۔ نادرہ سنج ایسے تھے کوئی بات لطیفہ سے خالی نہ تھی جو بات ہوتی نظم میں مخمس ہوتی؛ احباب اور ہم صحبتوں کو اپنی لطافت سے شگفتہ کر دیتے جود و احسان میں بھی کبھی کمی نہ کی۔ میاں نظیر کے اخلاق کی اُنکی زندگی میں دور دور شہرت ہو گئی تھی ابوالقاسم میر قدرت اللہ نے اپنے تذکرہ (مرتبہ ۱۲۲۱ھ) میں ان کے متعلق یہ لکھا ہے کہ:۔

"شیخ ولی محمد اکبر آبادی شاعرے ہست دیرینہ مشق کہ بالفضل دراں نواح علم استادی می افرازد و نرد محبت و اخلاص باہر کس می بازد، بسیار سلیم الطبع وخوش اختلاط و نہایت نیک طینت و مستحکم ارتباط شنیدہ می شود"

میاں نظیر کے مرنے کے چار پانچ برس بعد نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ نے "گلشنِ بے خار" لکھا جس میں ہے:۔

"نظیر در حلم و خلق و انکسار بے نظیر روزگار است"

حضرت شہباز "زندگانی بے نظیر" میں لکھتے ہیں کہ پاس پڑوس میں جو غریب غربا تھے ان کی خبر گیری فرماتے۔ محتاج کو دیکھ کر ان کا دل دکھ جاتا تھا۔ کسی کو خالی نہ پھیرتے تھے اور جو وقت پر کچھ نہ ہوتا تو نہایت گڑگڑا کر معذرت کرتے بڑے صاحبِ ہمت تھے اور اپنی ہمت کے آگے وہ شاہی گنج و خزانہ کو بھی کوئی چیز نہ سمجھتے تھے زیورِ حیا سے آراستہ تھے جو اہلِ مروت کا خاصہ ہے۔

حلیہ ۔ حلیہ کے متعلق میاں نظیرؔ نے جو نقشہ کھینچا ہے وہ حاضر ہے:۔

سست روش پست قد سانولا ہندی نژاد — تن بھی کچھ ایسا ہی تھا قد کے موافق میاں
ماتھے پر اک خال تھا چھوٹا سا مسّے کے طور — تھا وہ بڑا آنکھ اور ابروؤں کے درمیاں
وضع سبک اُس کی تھی تس پہ نہ رکھتا تھا ریش — مونچھیں تھیں اور کانوں پر پٹے بھی تھے پنبہ ساں
پیری میں تھی جس طرح اس کو دل افسردگی — ویسی ہی تھی ان دنوں جن دنوں میں تھا جواں

آنکھیں، کسرتی بدن، ستواں ناک، کتابی چہرہ تھا، بلا کی ذہانت تھی خوش قیافہ۔ شگفتہ مزاج تھے۔

لباس کرتہ۔ سیدھے پردے اور نیچی چولی کا انگرکھا۔ عرض اور لمبے برکا پائجامہ۔ پگڑی چکردار محمد شاہی کنگری دار ہوتی تھی۔ پٹکہ کمر پر باندھتے تھے۔ جاڑے میں فرخ آبادی چھینٹ کا چوغہ، پیر میں گھیتلی جوتی ہاتھ میں آڑو کی چھڑی اور دو انگوٹھیاں عقیق سرخ اور فیروزے کی اُنگلی میں رہتی تھیں۔

تصانیف و تالیف میاں نظیر کا خط اچھا تھا پروفیسر شہباز نے اُن کی تحریر دیکھی ہے۔ میرے پاس بھی اُن کے ہاتھ کی لکھی ہوئی غزل ہے۔ اغلب ہے کہ اس کا عکس شایع ہو۔

لکھنے کی یہ طرز تھی کچھ جو لکھے تھا کتاب — پختگی اور خامی کے اُس کا تھا خط درمیاں

ایک کتاب خالق باری کے طرز پر لکھی۔ قصہ لیلیٰ مجنوں مثنوی حسن و عشق۔ نثر میں انشاء نظیر (ایک نسخہ کتب خانہ شیعیہ محمدیہ میں ہے) قدر متین نہم قرین۔ بزم عیش، رعنائے زیبا۔ یہ کتابیں داروغہ نوازش حسین سے پروفیسر شہباز لے گئے۔ ایک کتاب سہ نثر ظہوری کی طرز پر ہو دو ... دوست مخمور اکبرآبادی کے پاس ہو۔ کئی دیوان ہیں۔ صدہا نظموں کا مجموعہ ہے۔ سید عابد علی نے ان کے کلام کا بڑا مجموعہ مرتب کیا ہے جو ... کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

خانگی زندگی میاں نظیرؔ نے ادھیڑ عمر میں مسماۃ تہور النسا بیگم بنت عبدالرحمان خاں چغتائی خلف محمد علی بیگ صوبہ دار برہان پور سے نکاح کیا یہ چغتائی خاندان محلہ تاج گنج میں ملکوں کی گلی کے نزدیک رہتا تھا۔ شادی کے بعد میاں نظیر بھی نوری دروازہ اُٹھ آئے خود ایک قطعہ زمین متصل محل بیگم باندہ خرید لیا تھا اور اوسط درجہ کا مکان بنا لیا تھا۔ تمام عمر اسی میں رہے اور اسی میں سپرد خاک ہوئے۔

مرغوب کھانا میٹھے چاول اور کھچڑی بہت پسند تھی۔ لیمو کا اچار۔ گلگلے۔ چٹے زیادہ اچھے لگتے۔ پھلوں میں مئو کا خربزہ۔ آم شریفہ۔ اپنی اپنی فصل پر شوق سے کھاتے۔ دعوت میں کم جاتے۔

خادم ایاز (غلام) امام بخش چھچھو کرتے تھے۔ بخیبن۔ گلاب۔ بختاور۔ لونڈیاں تھیں۔ ایاز کے ذمہ گھوڑے کی خدمت تھی۔

آخری ایام عمر کا کافی حصہ طے ہو چکا تھا گوشہ نشینی کے سوا چارہ کیا تھا۔ گھر میں رہتے دالان کے سامنے صحن میں دو درخت نیم اور بیری کے تھے اُس کے سایہ میں بوریا اور کمبل بچھا کر بیٹھے رہتے نزدیک و دور کے لوگ آتے اُن سے بات چیت رہتی۔

لطیفہ مولوی محمد ابراہیم مرحوم ساکن گلاب خانہ، یہ گولنداز وں کے خاندان سے تھے نوّے، یا سو کے قریب قریب عمر پائی تھی وہ یہ لطیفہ سناتے کہ ایک روز شہر سے میاں نظیر کے ملنے جلنے والے اُن کے گھر پہونچے کنڈی کھٹکھٹائی تھوڑی دیر میں دیکھتے کیا ہیں کہ میاں نظیر نے دروازہ کھولا تو تمام جسم پر آرد گندم کا غبار لگا ہوا ہے، سب نے پوچھا میاں خیر تو۔ یہ بولے تمھاری بھاوج بگڑ بیٹھی ہیں آٹا کون پیستا، روٹی کون پکاتا۔ سوچا خود ہی آٹا پیس کر روٹی ڈال لوں کہ اتنے میں تم لوگ آ گئے سب نے کہا تم اپنا کام کر چکے، اب ہم اپنا کام کئے دیتے ہیں سب نے مل جُل کر کھانا پکایا اور خود بھی کھایا اور اہلیہ میاں نظیر کو منا کر کھلا پلا دیا اور گھر لوٹ آئے۔ آخر عمر میں پیری کا غلبہ کافی ہو گیا تھا کم سخن بھی ہو گئے تھے۔

بہر نظر دیکھیں گے اس عہد شکن کی صورت — دیکھئے کونسا یارب وہ زمانہ ہوگا،
تلخیِ مرگ جسے کہتے ہیں افسوس افسوس — ایک دن سب کے تئیں زہر یہ کھانا ہوگا

دیکھ لے اس چمنِ دہر کو دل بھر کے نظیر
پھر ترا کاہے کو اس باغ میں آنا ہوگا

علالت سنہ ۱۲۴۳ھ میں فالج میں مبتلا ہوئے۔ مکتب داری شغل تھا مجبور رہے۔ میاں گلزار علی اسیر ایسے بدشوق تھے کہ گلستاں و بوستاں سے آگے پڑھنے کی قسم کھالی تھی جوان ہونے کو آئے میاں نظیر نے ان کو بلایا اور کہا بھیا تم اب یہ مکتب داری کا کام سنبھالو ورنہ کہاں سے گزر اوقات ہوگی، وہ بولے میں فارسی کے منتہی طلباء کو کیسے درس دے سکتا ہوں، کوئی ابوالفضل پڑھتا ہے کوئی ظفرا اور جرچاچ کا سبق لیتا ہے "میاں" میں کیا پڑھا سکتا ہوں یہ لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں بولے جاؤ میاں خدا کا نام لو پڑھاؤ۔ چنانچہ یہ پڑھانے لگے اور ہر ایک طالب علم کو بخوبی تعلیم دینے لگے (کہن داروغہ نوازش علی) اس سے اسیر اپنی ولایت کے قائل تھے

وفات ۹۸ سال کی عمر ہو گئی تو ۲۶ صفر سنہ ۱۲۴۶ھ مطابق ۱۶ اگست سنہ ۱۸۳۰ء کو انتقال ہوا امامیہ طریق پر تجہیز و تکفین ہوئی۔ نماز جنازہ دو مرتبہ پڑھائی گئی۔ سنیوں نے علحدہ پڑھی۔ ہندو مسلمان ہزارہا شریک تدفین تھے۔ اپنے مکان ہی میں زیر نیم دفن کئے گئے۔ زمین دوز قبر پختہ بنوا دی گئی۔ جو آج شکستہ حال میں ہے۔ علامہ سیماب اکبر آبادی مقبرہ تعمیر کرانے کی فکر میں ہیں۔

عرس سالانہ عرس ہوتا تھا بینواؤں کا جماؤ ہوتا تھا۔ موسیقی نواز آتے تھے اور رات بھر یہ میلا رہتا تھا اب بہت کمی پر ہے۔

بے تاج گنج میں اب تو نظیر کا میلا — نظیر کیا کہ عجب بے نظیر کا میلا

اولاد میاں نظیر کے ایک صاحبزادہ خلیفہ سید گلزار علی اسیر اور ایک دختر امامی بیگم تھیں۔ جو میر نجف علی عرف مرزا جان کو بیاہی گئی تھیں۔ انھیں کی صاحبزادی ولایتی بیگم تھیں جن سے حضرت شہباز نے میاں نظیر کے حالات معلوم کئے تھے۔ میاں اسیر کی خواجگان دہنکوٹ کے یہاں شادی ہوئی انسے میاں نثار علی نذیر اور مصاحب بیگم تھیں، جو مرزا آغا علی ساکن تاج گنج کو بیاہی گئی تھیں۔ داروغہ مرزا نوازش علی بیگ ولایتی بیگم کے ہی داماد تھے۔ اس خاندان میں سے مرزا آصف علی صاحب و مرزا سخاوت علی صاحب موجود ہیں۔

تلامذہ میاں نظیر کے شاگرد بہت کم ہیں یہ شاگرد کم کیا کرتے تھے فیض سخن نہ ہو تو یہ مشورہ سخن ہی نہ دیتے۔ حضرت اسیر حضرت باطن حکیم محمدی ظاہر۔ نبی بخش عاشق۔ لالہ بدھ سین صافی۔ شیخ مداری ضمیر۔ قاضی حسین علی تجو۔ خدا بخش موج۔ دیدار بخش لہر۔

انتظام اللہ شہابی

نظیر کا معیاری تغزل

(ایک غیر مطبوعہ تضمین)

جہاں میں ہم سے جو پُر غم رہے رہے نہ رہے　　خوشی و عیش سے باہم رہے رہے نہ رہے
جو یاں بہت رہے یا کم رہے رہے نہ رہے　　ہم اشکِ غم ہیں اگر تھم رہے رہے نہ رہے
مژہ پہ آن کے ٹک جم رہے رہے نہ رہے

نہ ہیں کعبہ نہ دیرِ مغاں کی رونق ہیں　　نہ حسنِ دشت ہیں نہ گلستاں کی رونق ہیں
کوئی کہے تو بھلا ہم کہاں کی رونق ہیں　　رہیں وہ شخص جو بزمِ جہاں کی رونق ہیں
ہماری کیا ہے اگر ہم رہے رہے نہ رہے

میاں ہماری تو آنکھوں میں دم ہے بر سرِ راہ　　یہ آرزو ہے تمھیں دیکھ لیویں بھر کے نگاہ
ہمارا وقت تو رخصت کا آ لگا اب آہ　　ملو جو ہم سے تو مل لو کہ ہم بہ نوکِ گیاہ
مثالِ دانۂ شبنم رہے رہے نہ رہے

ہم اپنے درد کو اب کس طرح کریں اظہار　　کہ فرصتِ عمر کی ٹھہری ہے آکے مثلِ شرار
کس آرزو پہ بھلا دیویں اپنے دل کو قرار　　بقا ہماری جو پوچھو تو جوں چراغِ مزار
ہوا کے بیچ کوئی دم رہے رہے نہ رہے

کسی کی سن کے زبانی مرا یہ حالِ تباہ   چلا ہے گھر سے مجھے دیکھنے وہ نورِ نگاہ
ہزار غم سے یہ بھاری ہے ابتو غم واللہ   مجھے ہے نزع وہ آتا ہے دیکھنے اب آہ
کہ اُسکے آتے تلک دم رہے رہے نہ رہے

بتوں کے عشق میں جینے سے ہاتھ دھو بیٹھے   جو صبر و ہوش کو کھونا ہوا ہے سو کھو لیجئے
جہاں تلک بنے منھ آنسوؤں سے دھو لیجے   یہی ہے عزم کہ دل بھر کے آج رو لیجے
کہ کل یہ دیدۂ پرنم رہے رہے نہ رہے

تمھاری بزم میں اسوقت ہم جو حاضر ہیں   نجانیو کہ ہمارے یہ بارِ خاطر ہیں
ہم اپنے کام میں اے یار یار شاطر ہیں   برنگِ اشک رواں ہم بھی اک مسافر ہیں
جو چلتے چلتے کہیں تھم رہے رہے نہ رہے

جفا و جور میاں تم نے ہم پر جو کچھ کی   یقیں ہے تم کو کہ ہم نے وہ سب خوشی سے سہی
ہزار بات کی اک بات پر یہ سن لو جی   تمھارے غم میں غرض ہم تو دیچکے ہیں جی
بلا سے تم کو بھی اب غم رہے رہے نہ رہے

ہوس ہے ابتو یہی نقدِ دل تلک دیجے   شراب عیش کو خوباں میں بیٹھ کر پیجے،
بھرا ہے شوق بہت دل میں آہ کیا کیجے   نظیر آج بھی چل کر بتوں سے مل لیجے
پھر اشتیاق کا عالم رہے رہے نہ رہے

ادبیاتِ اُردو میں نظیر اکبر آبادی کا فنی و لسانی درجہ

کسی دور کے کسی شاعر پر تبصرہ کرنے کے لئے اُسی دور کے اسالیب و محاورات اور طرزِ کلام کو پیشِ نظر رکھنا شرطِ انصاف ہے۔ شیخ ولی محمد نظیر اکبر آبادی دورِ چہارم کے شاعر تھے اور یہ وہ دور تھا کہ لکھنؤ میں جرأت، انشاؔ، اور مصحفی و رنگین کا طوطی بول چکا تھا، اور ان سے پہلے ولی دکنی، شاہ مبارک آبرو، شرف الدین مضمون، محمد شاکر ناجی، غلام مصطفےٰ خاں یکرنگ، میر تقی میر، میر حسن، میر سوز وغیرہ شعرائے اردو شاعری کی بساط پر انگڑائیاں لے چکے تھے۔ نظیر اکبر آبادی کے سامنے انھیں کے فرمودات تھے اور انھیں کا اسلوبِ بیان تھا۔ ان کے علاوہ فارسی شعراء کا کلام بھی ہندوستان میں صدیوں سے موجود تھا اور بطورِ علومِ متداولہ ان کی منثور و منظوم کتابیں مکاتب میں شریکِ درس و تدریس تھیں۔ سعدی، حافظ، صائب، نظیری، وحشی، آصفی، خسرو اور بیدل کا فارسی کلام عام طور پر مطبوع و مقبول سمجھا جاتا تھا۔

میاں نظیر انھیں دیسی اور بدیسی باغوں کے خوشہ چیں تھے۔ عربی فارسی اچھی جانتے تھے، چنانچہ اُن کے کلام میں جابجا ایسے الفاظ اور ایسی ترکیبیں پائی جاتی ہیں جن سے اُن کے علوم متداولہ مشرقیہ پر عبور کا پتہ چلتا ہے، مثلاً نہاں سازیاں، تراندازیاں، تشئید، سخن دلکشا، فسوں نگار، کنارہ گیر، عجز انتما وغیرہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ وہ خود بھی معلّم تھے اور یہی شغل اُن کا کفیلِ حیات تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ اُردو اپنے تمام مصطلحات و محاورات کے ساتھ مکمل ہو چکی تھی۔ اور اس میں زیادہ سے زیادہ قوتِ بیان موجود تھی۔ ہند و تہذیب اور اسلامی تہذیب بھی تشنۂ تکمیل نہ تھی اور (بین الاقوامی؟) قانونِ معاشرت بھی مرتب ہو چکا تھا۔ ہندوستان کی دو بڑی قومیں، ہندو اور مسلمان، باہم متحد تھے۔ مسلمان ہندوؤں کے اور ہندو مسلمانوں کے تہواروں اور میلوں تماشوں میں کشادہ دلی کے ساتھ شریک ہوتے تھے۔ مذہبیات اور معتقدات میں دونوں کو غلو تھا، لیکن تعصب دونوں میں نہ تھا۔ اسی خوشگوار ماحول میں میاں نظیر اکبر آبادی کی شاعری پروان چڑھی اور یہی ماحول اُن کی شاعری پر محیط رہا۔

کلیاتِ نظیر کے بالاستیعاب مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں نظیر نے شب برات اور عید پر نظمیں کہی ہیں وہاں ہولی دیوالی اور بسنت پر بھی اظہارِ خیال کیا ہے۔ جہاں حضرت علی کرم اللہ وجہہ، حضرت عباسؓ، پنجتن پاک، اور حضرت سبز

سلیم چشتی کے متعلق اظہارِ عقیدت کیا ہے وہاں سری کرشن پر بھی بعنوانِ مختلف اُن کی کئی نظمیں ہیں۔ اور ایک نظم گرو نانک پر بھی ہے اس کے علاوہ مہادیو۔ بھیروں۔ درگا اور بلدیو پر بھی اُن کی نظمیں موجود ہیں۔[1] اِن نظموں میں لسانی توازن کا یہ حال ہے کہ جو نظم جس کے متعلق کہی گئی ہے اُسی اعتبار سے الفاظ و مصطلحات کا استعمال بھی کیا گیا ہے۔ اِن خصوصیات و مختارات نے نظیر کو بین الاقوامی شاعر بنا دیا۔ اور جس طرح عوام مسلمانوں نے اُن کے کلام سے دلچسپی لی اسی طرح ہندوؤں نے بھی اُنھیں اپنا شاعر مان لیا اور یہ اسی بین الاقوامی قبولیت کا نتیجہ ہے کہ نظیر کا کلام اس دور میں بھی وقتاً فوقتاً شایانِ تنقید سمجھا جاتا ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اُن کے کلیات میں بھی اُردو شاعری کا وہی اسلوب ہے جو ادوارِ قدیم میں تھا اور جو (فی زماننا) متروک و مردود ہے۔

نظیر کے کلام میں بارے۔ تئیں۔ ٹک۔ میرے کنے۔ ہووے گا۔ اُس کے ہاں۔ آخرش۔ ذری۔ آیاں۔ جایاں۔ تس اوپر۔ آن کے۔ تلک۔ مت۔ پرکھیہ۔ پنہانا۔ بجھادیا۔ دوانہ۔ تب۔ یاں۔ واں۔ دکھلا۔ بتلا۔ ہرز بجائے ہر) کر کر (بجائے کرکے) ہے گا۔ ندان (نادان) چل بچل۔ ٹھک ٹھکا۔ جھپ سے۔ ڈب۔ چلپاں۔ جھمک۔ جھمک کر۔ ابار، کرنا بود وباشے (بود و باش) چلون (چلمن) مزدور (مزدور) جدھر تدھر۔ دِوالیں (دیواریں) کالیاں۔ ہانگو ہوں۔ جاگہ (جگہ) زور تماشا۔ اُگستیاں ہیں وغیرہ الفاظ جابجا پائے جاتے ہیں اور حیرت یہ ہے کہ یہی الفاظ اپنی ترقی یافتہ اصلاحی صورت کے ساتھ بھی اُن کی نظموں میں موجود ہیں۔

نظیر نے جو زمانہ پایا ہے اُس میں اِن الفاظ کا استعمال کچھ زیادہ قابلِ اعتراض نہیں مگر بعض لغزشیں اُن کے علمی اقتدار کو بنظرِ شبہ دیکھنے پر بھی مجبور کرتی ہیں یعنی سمجھ میں نہیں آتا کہ جو شخص عربی اور فارسی میں شعر کہہ سکتا ہو بحیثیت معلم عربی کی نحو و صرف اور فارسی کے قواعد سے کما حقہ واقف ہو اور بقولِ بعض جس نے مرزا غالب اکبر آبادی کو درس دیا ہو۔ وہ ایسی غلطیاں کیونکر کر سکتا ہے؟

مثلاً اَصَل بفتحِ صاد مہملہ۔ زارا بجائے زار۔ قرَض خواہ بحرکتِ رائے مہملہ۔ حرَف بحرکتِ رائے مہملہ طیوروں بجائے طیور۔ اعضا بجائے عصا۔ ورنے بجائے ورنہ۔ زَہر بفتحِ ہائے ہوز۔ جوان و لڑکے، مفلس و کنگال۔ سارنگی و نے۔ جامہ و انگیا۔ دولت و گھربار (واوِ عطف کا غلط استعمال) مثلِ پھول (اضافت کا غلط محل) گل و ریحان تماشا۔ گلستان تماشا۔ زلف پریشان تماشا (بہ اعلانِ نون بغیر اضافت) ناقہ سوار (بجائے ناقہ سوار) یہ ایسی غلطیاں ہیں جو عربی فارسی میں تجربہ رکھنے والے کے قلم سے کسی طرح متوقع نہیں ہو سکتیں۔ مگر نظیر کے یہاں علیٰ حالہٖ موجود ہیں۔

غالباً اس کا سبب یہ ہے کہ میاں نظیر کی شاعری کا مُنتہا ہی "عوام کی ترجمانی عوام میں" تھا۔ اسی لئے وہ عوام

---

[1] غالباً ہندوستانی یا ملکی شاعر کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ نیاز

کی زبان پر چڑھے ہوئے الفاظ اپنی نظموں میں اُسی تلفظ یا لہجے کے ساتھ دانستہ لاتے تھے جو عوام کا محاورہ تھا۔
وہ جس سوسائٹی کے شاعر تھے اُس سوسائٹی کے رجحانات اُسی کی زبان اور اُسی کے پیرایۂ بیان میں ادا کرنا پسند کرتے
تھے۔ ادبیات میں "طبقاتی تقسیم" کا مقصود و منشا بھی یہی ہے کہ ایک ادیب یا شاعر کو تمام طبقات سے اس قدر
قریب اور اُن کے جذبات کو اتنا چھوتا ہوا چلنا چاہئے کہ کوئی طبقہ بعید القلم اور "اچھوت" نہ رہ جائے۔ اگر میاں نظیر
اپنی سوسائٹی کی ترجمانی اُسی ماحول میں رس بس کر نہ کرتے تو یقیناً اُن کے کلام کو قبولیتِ عام حاصل نہ ہوتی
"نظیر کی شاعری اُس طبقے کی نمائندگی کرتی ہے جسے اُس دَور کے خاص خاص مشاہیر شعرا نے پست سمجھ کر ٹھکرا دیا
تھا اور ناقابلِ توجہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا تھا۔ نظیر کی نگاہ جزئیاتِ زندگی کے ہر ذرے کو کروٹ بدلواتی نظر آتی ہے۔ وہ اُن موضوعات
کی گہرائی میں حقایق و معارف ٹٹولتے ہیں جہاں ایک بلند بانگ جذباتی شاعر کی نگاہ صرف سطحی نقش و نگار کی مصوری میں
مصروف ہوتی ہے۔ گو اُن کی بعض نظمیں جذباتی نقطۂ نگاہ سے مطلق عریاں اور یکسر حیا سوز بھی ہیں۔ تاہم اُن کی بیشتر نظموں کا
افادی پہلو بہت بلند اور بے نظیر ہے۔"
ان اغلاط کے علاوہ مندرجہ ذیل مصرعوں میں جو فنی عیوب و اسقام ہیں وہ بھی اسی نظریے کے تحت میاں نظیر کو غیر محتاط
اور قابلِ الزام ٹھہراتے ہیں۔
"لیا ہے ہم سے دل ودیں بھی ہو طلب کرتے"۔۔ دل ودیں میں واو عطف کا محل یہاں کس قدر غلط ہے
لکھنا یہ تھا کہ "لیا ہے ہم سے دل، اور دین بھی ہو طلب کرتے"۔۔ مگر یہ کہہ گئے دل ودیں۔ ممکن ہے یہ سہوِ کاتب ہو
ایک جگہ کہتے ہیں "رنگت کو اُس کی اپنی پوشاک سے ملائی"۔۔ کہنا یہ چاہتے تھے کہ اُس کی رنگت (رنگ) اپنی
پوشاک سے ملائی۔ مگر کہہ نہ سکے۔ "کہ اب تو کم ہے روانی ترے سخن کی سی"۔۔ یہاں سی کا محل بالکل غلط ہے۔
"جُل دے گیا ہے شاید اغیار ہنستے ہنستے"۔۔ "اغیار" کے ساتھ "دے گیا" دیکھئے ـــــ
"ورنہ کس میں تھی بھلا یہ قدرت و یہ اقتدار"۔۔ قدرت اور یہ کو معطوف کرنے کی غلط مثال ـــــ
"پردہ جو ترے غم کا اگر دل سے اُٹھاؤں"۔۔ "جو" بھی ہے اور "اگر" بھی۔
یہ تو تھا اُن کا علمی و فنی اسلوبِ شاعری۔ جو اُن کے دَور کی طرح (عربی و فارسی قواعد کی بنا پر) موجودہ دَور میں بھی
غیر مسلّم اور ناقص سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے کہ گو اردو کا تصفیہ و تجزیہ دَورِ مابعد میں ہوا لیکن عربی اور فارسی زبانوں کے
قواعد اُس وقت بھی وہی تھے جو آج ہیں۔
"اگر نظیر کی شاعری لسانی نقطۂ نگاہ سے دیکھی جائے تو اُس میں بعض خصوصیات اُسی زمانہ کے لحاظ سے ممتاز بھی پائی
جاتی ہیں۔
مثلاً الفاظ کا ترنم اور کثرت۔ مرادفات کی فراوانی۔ موسیقی آمیز بحریں اور ہر موضوع کے متعلق بیش از بیش معلومات

لیکن اس میں شک نہیں کہ میاں نظیر کی شاعری ایک مخصوص ماحول میں محدود ہے اور اس میں عالمگیر جذبات (Univer-sal Emotion) کے مقابلے میں مقامی رنگ (Local Colour) زیادہ ہے جو صرف اکبر آباد یا آگرہ کی فصیلوں کا پروردہ نظر آتا ہے۔

نظیر نے جتنی نظمیں بحرِ متدارک مخبون (شانزدہ رکنی) میں کہی ہیں اُن میں ایک مخصوص ترنم، اور غیر معمولی موسیقی پائی جاتی ہے۔ ایک مصرع میں بہت سے متوازن وہم قافیہ الفاظ رکھکر وہ ایک ایسا جزرومد پیدا کردیتے ہیں کہ الفاظ بجائے خود رقصاں معلوم ہوتے ہیں۔ ذخیرۂ الفاظ اُن کے پاس بہت زیادہ ہے اس لئے کہ وہ اُردو میں بھاشا، سنسکرت، ہندی، عربی، فارسی پنجابی غرض جس زبان کا لفظ اُنھیں ملتا ہے اُس کو بے تکلف کھپا دیتے ہیں اور موسیقی قائم رکھنے کے لئے اگر اُنھیں عروض یا لسانی قانون توڑنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو وہ اس کی بھی پرواہ نہیں کرتے۔

اُن کی نظمیں عموماً تفصیلی ہیں۔ جن میں زندگی کے ہر گوشے کو بے نقاب کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ نظموں میں افسانویت بھی بطورِ خاص پائی جاتی ہے۔ مشرقی رسم ورواج کی ترجمانی اور مشرقی امیال وعواطف نظیر کی نظموں میں نسبتاً زیادہ ہیں۔ جن کو مغربی احساسات کی ہوا بھی نہیں لگی۔

گو میاں نظیر ایک مخصوص ماحول اور خاص سوسائٹی کے شاعر تھے تاہم اُس دَور کی مروجہ زبان اور محاوروں کو اُن کی شاعری میں اس قدر دخل ہے کہ اُن کی کوئی نظم محاوروں سے خالی نہیں۔ اکثر نظموں کے بند کسی خاص محاورے ہی پر موزوں کئے گئے ہیں اور میری دانست میں اُردو کا کوئی محاورہ ایسا نہیں، جو کلیاتِ نظیر میں کسی نہ کسی ڈھب سے موجود نہ ہو۔

لوگ کہتے ہیں وہ کثیر الکلام تھے اور اُن کا بہت سا کلام ضائع ہوگیا۔ یہ اُن کے ساتھ ایک قسم کا حُسنِ ظن، یا اس حیثیت کا ایک دعوائے بے دلیل ہے کہ گویا یہ لوگ اُن کے زمانہ میں خود موجود تھے۔ سنا ہے کہ اب بھی اُن کی بعض غیر مطبوعہ اور گم شدہ نظموں اور غزلوں کا پتہ چلا ہے۔ یہ اس دورِ ترقی کی ایک اُپج ہے کہ میر ونظیر، غالب وداغ کے کلام کی طرف عوام کا رجحان دیکھکر بعض شعرا اپنے نوزائیدہ ہائے فکر کو اُن کی طرف منسوب کردیتے ہیں اور جب عوام اس فریب میں آجاتے ہیں تو وہ اپنی کامیابیٔ فکر پر خوب قہقہے لگاتے ہیں۔ تحقیقِ جدید کی حقیقت اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

میاں نظیر اکبر آبادی کے کلیات میں ۲۰۶ نظمیں اور غزلیں پائی جاتی ہیں اور انھیں کو اُن کا تمام سرمایۂ سخن سمجھنا چاہئے۔ ان میں ۲۷ غزلیں۔ ایک قصہ۔ ۲ واسوختیں۔ ۵۴ مخمس۔ ۲۲ مسدس۔ ۲ ترکیب بند۔ ایک مستزاد۔ ایک مربع اور ۹۵ نظمیں ہیں۔ نظموں کا اسلوب وہ نہیں ہے جو آج کل مروج ہے۔ بلکہ اُن کی صورت بھی مسدس یا مخمس یا ترکیب بند یا ترجیع بند کی سی ہے۔ صرف اُنھیں یکرنگیٔ موضوع کے اعتبار سے "نظم" کہا جا سکتا ہے۔ ورنہ تمام کلیات مسدس اور مخمس ہی سے بھرا پڑا ہے۔

ان نظموں میں معتقداتی چند نظموں کو چھوڑ کر چند نظمیں بر سبیلِ عبرت ونصائح ہیں مثلاً بے ثباتیٔ دنیا۔ بیانِ فنا۔ بیانِ موت۔ بڑھاپا وغیرہ۔ چند وہ نظمیں ہیں جو قلندروں اور گداگروں کے لئے لکھی گئی تھیں مثلاً کوڑی۔ فلوس۔ جھونپڑا۔ بنجارہ نامہ

ہنس نامہ وغیرہ۔ چند وہ نظمیں ہیں جو خوانچہ والوں کو لکھ کر دی گئی تھیں مثلاً تل کے لڈو۔ ککڑی۔ تربوز وغیرہ۔ چند نظمیں وہ ہیں جو مداریوں اور بازیگروں کے لئے لکھی گئیں مثلاً جنگِ بلبلان۔ ذکرِ مرغان۔ گلہری کا بچہ۔ ریچھ کا بچہ۔ ہرن کا بچہ۔ جنگِ جانوران اور اژدھے کا بچہ۔ دو تین نظمیں مقامیات پر ہیں مثلاً تعریفِ اکبرآباد۔ صفتِ تاجگنج وغیرہ اور چند نظمیں وہ ہیں جو اپنے ہندو دوستوں کو خوش کرنے کے لئے دیوتاؤں اور بزرگانِ ہنود پر کہی گئی ہیں۔

میاں نظیر ہندو عمائدینِ شہر کے بچوں کو پڑھاتے تھے۔ تاجگنج سے ٹٹو پر آتے تھے۔ راستہ میں مداری، فقیر خوانچہ والے اور لہو و لعب پسند جاہل حضرات اُنھیں ملجاتے تھے اور اپنے مذاق کے مطابق اُن سے نظمیں لکھوا لیتے تھے۔ اس حساب سے گویا میاں نظیر کا تمام کلام "جنسِ سرِ راہ" معلوم ہوتا ہے اور اسی لئے بعض ناقدین کا خیال ہے کہ میاں نظیر کی بقا اُن کے ہم اعتقاد دہم فرقہ مورخوں یا ہندی پرست اور ہندو نژاد اربابِ علم و جاہ کے پروپگنڈے اور "ہل جزاء الاحسان الا الاحسان" پر منحصر ہے۔ اگر کلیاتِ نظیر میں چند منقبتیں اور ہندو صنمیات و مذاق (Hindu Mythology) پر بکثرت نظمیں نہ ہوتیں یا ان کی بعض قلندرانہ موسیقی آمیز نظمیں سوانگ بھرنے والوں اور بے نوا فقیروں کی زبان پر نہ رہ جاتیں تو میاں نظیر کا اس دور تک زندہ رہنا دشوار تھا۔

مگر میں اس بات سے متفق نہیں ہوں۔ میاں نظیر جس رنگ اور جس مذاق کے شاعر ہوں اس سے بحث نہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُن کی شاعری موجودہ سوسائٹی اور تہذیب کے ارتقا کی آئینہ دار ہے۔ آج ادبی رجحانات کی تعمیری بلندیاں اُنھیں بنیادوں پر قایم نظر آتی ہیں، جو بارھویں صدی ہجری میں میاں نظیر نے علی الرغم خواص رکھی تھیں۔ اگر یہ بنیادی قایم نہ ہوتیں تو شاعری کا تعمیری متعینہ محتاجِ تکمیل رہ جاتا اور مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پچاس سال کے بعد موجودہ سوسائٹی کا رجحان پھر اسی سطح پر آجائے گا جس سطح سے یہ ارتقائی بنیادیں اُٹھائی گئی تھیں۔ ملک کا عام رجحان متحدہ قومیت کی طرف بیش از بیش معلوم ہوتا ہے اور میاں نظیر کی اساسِ فکر متحدہ قومیت ہی پر تھی۔

اس تمام تجزیے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ لسانیات میں میاں نظیر کی شاعری اُنھیں شاعرِ عوام (Poet of Masses) کی صف میں بہت بلند جگہ دیتی ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ فطرت نگاری اور مخلوط معاشرت کی ترجمانی میں نظیر اکبرآبادی کے سر پر اولیت کا سہرا باندھا جا چکا ہے۔ نظمِ مسلسل کی بنیاد میاں نظیر ہی کے ہاتھوں رکھی گئی ہے اور بھاشا آمیز اُردو میں قاآنی کی سی روانی اُنھیں کی جودتِ طبع کا حصہ ہے۔ الآن کما کان۔

ہم لعب لسبعہ ر جاہلوں کا ہی ہے مقطع [illegible]

سیماب اکبرآبادی

نظیر کی جزئیات نگاری و زباندانی

نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کی طرح اور نقادوں نے بھی نظیر پر یہ الزام لگا دیا ہے کہ وہ حاطب اللیل ہے اور رطب و یابس کی کوئی پرواہ نہیں کرتا نظیر کے طرفداروں نے اس کے لمبے چوڑے جواب بھی دئے۔ مگر افسوس کہ اس مضمون میں اس تنقیح و تنقید کی گنجایش نہیں۔ کہنا صرف یہ ہے کہ نظیر کے کمال فن کو نقادوں نے دیکھا ہی نہیں اور غضب یہ کیا کہ بعض حروف کے خارج الوزن ہو جانے پر ان کو مجرم بنا دیا۔ حالانکہ غور سے دیکھا جائے تو ایک ایسے ماہر زبان کے یہاں اگر اس قسم کی بعض فروگزاشتیں بھی ہوں تو وہ مورد الزام نہیں ہو سکتا۔ اگر اُن لوگوں کے قول کو صحیح مان لیا جائے جو کہتے ہیں کہ "شعر می گویم بہ از آبحیات — من ندانم فاعلاتن فاعلات" تو پھر نظیر کا دامن بالکل پاک ہو جاتا ہے اور اگر اُن کی رعایت خاطر کی جائے جو عروض کو شعر کا جزو لاینفک قرار دیتے ہیں تو زیادہ سے زیادہ نظیر پر بھی وہی معمولی سے اعتراض ہو جائیں گے جو اوروں پر ہوئے ہیں۔ مگر اس خیال کے ماورا نظیر کے کلام کو دیکھا جائے تو ایک اور ہی دنیا نظر آئے گی۔ اس کہنے سے میرا مطمح نظر وہ نہیں جو آج کل کے بعض نقادوں کا ہے۔ جن کی نظر میں نظیر صرف اس لئے بلند ہے کہ اُس نے ایسے زمانے میں نظم کی بنیاد ڈالی جب دوسرے شاعر مثنوی اور غزل کے سوا اور کسی طرف رُخ ہی نہ کرتے تھے، دوسرا فرقہ کہتا ہے کہ خیر ایسا تو ہو سکتا ہے نظم کی طرف توجہ تعجب خیز اور حیرت افزا نہیں۔ بلکہ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ دیسی۔ قومی۔ ملکی چیزوں کی جس قدر نظیر کے کلام میں افراط ہے اور جس خیر و خوبی سے ان کا تذکرہ اس کے یہاں ہے۔ وہ اسوقت تو کیا اسوقت کے بھی کسی ہندوستانی شاعر کے یہاں موجود نہیں۔ یہی دو چیزیں ہیں جو کم از کم اسوقت تک نظیر کے خیرخواہوں کی نگاہ میں ہیں۔ اسی پر اس کو ہندوستان کا شیکسپیر بتایا گیا ہے اور اسی لئے اُس کو ملکی شاعر مانا گیا ہے۔ یہی اس کا کمال شاعری ہے اور یہی اس کے کلام کی معراج۔

میں نے بھی نظیر کے کلام کو متعدد مرتبہ دیکھا ہے اور سب سے بڑی دو چیزیں ان کے کلام میں نظر آئیں۔ جنکو ذرا تفصیل کے ساتھ بیان کرنا چاہتا ہوں۔

شاعری کی داخلی اور خارجی خصوصیات میں سے اس وقت میں صرف دو چیزوں کو لینا چاہتا ہوں زبان اور معلومات اور ان میں سوائے انشا کے کوئی دوسرا شاعر نظیر کا مقابل نہیں ٹھہرتا۔ نظیر جس چیز کا ذکر کرتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ اُس کی

تمام متعلقات اور ضروری چیزیں اُس کے گرد و پیش کھڑی ہوئی ہیں اور وہ اُن کو دیکھ دیکھ کر اشعار میں نظم کرتا جاتا ہے۔ اُن میں کی اکثر چیزیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کو دوسرے لوگ جاننا تو کیسا پہچانتے بھی نہیں۔ اور اگر پہچانتے بھی ہیں تو دوسرے ناموں سے۔ مگر نظیر چونکہ ان کی اصل و حقیقت سے باخبر ہے وہ بغیر کسی تکلف کے اُن کو ایسے ناموں سے یاد کرتا ہے جس کی دوسروں کو ہوا بھی نہیں لگی۔ اسی چیز کو ہم تفصیل کے ساتھ آگے چل کر لکھیں گے۔

شاعر کے لئے سب سے ضروری چیز زبان کی مہارت کے بعد اُس کا مطالعہ و مشاہدہ ہے۔ مطالعۂ فطرت ہی تخیل کے پیدا ہونے کا اصل راز ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو اس کی تخیل ایک مرغ پر شکستہ کی مانند بے حس و حرکت بنکر رہ جاتی ہے۔ خیال کی بلند پروازی، معانی کا تنوع، مضامین کی رنگارنگی سب اسی کی ماتحت ہیں اور نظیر مطالعۂ فطرت کا بادشاہ ہے۔

دنیا میں ہزاروں رسوم ہیں جو ہر تہوار اور ہر شادی و غم کے موقعے پر برتی جاتی ہیں مگر اُن کے جزئیات کا سمجھنا ہر شخص کا کام نہیں۔ مگر نظیر کو دیکھئے کہ وہ بغیر اس کے کسی چیز پر نگاہ ڈالتا ہی نہیں۔

ہولی ہندؤں کا تہوار ہے اور سرسری نگاہ ڈالنے والے یہی جانتے ہیں کہ اس میں رات کو آگ جلائی جاتی ہے۔ صبح کو رنگ کھیلا جاتا ہے، کچھ پکوان وغیرہ بھی پکتا ہے اور بس۔ معلومات کی اتنی ہی کائنات ہے اور اس کے آگے اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ لیکن نظیر ہولی کو دیکھتا ہے تو اس کے ایک ایک جزو پر نگاہ ڈالتا چلا جاتا ہے اور اس کو دیکھکر سمجھ میں آتا ہے کہ یہ چیزیں تو وہ ہیں جن کو ہم سب دیکھتے ہیں مگر کبھی ذہن میں نہیں رہتیں اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ ہمارا مطالعہ اتنا گہرا نہیں ہے۔ نظیر کے یہاں ہولی کی کئی نظمیں ہیں اور ہر ایک میں جزئیات کا عمیق مطالعہ ہے۔ ایک نظم جس میں صرف پانچ شعر ہیں کہتا ہے

بتوں کے زرد پیراہن میں عطر چنپا جب مہکا ہوا نقشہ عیاں ہولی کی کیا کیا رسم اور رہ کا

چوتھا شعر ہے :-

چھڑکن رنگ خوباں پر عجب شوخی دکھاتا ہے کبھی کچھ نازکی "اُہ اُہ"، کبھی انداز "رہ، رہ" کا

پہلے شعر میں اس رسم کا ذکر ہے کہ بسنت سے لیکر ہولی تک زرد کپڑے پہنے جاتے ہیں اور پھر شرفا کے یہاں یہ بھی دستور ہے کہ چنپا کا عطر لگایا جاتا ہے۔ چوتھے شعر میں رنگ ڈالتے وقت "اُہ اُہ" اور "رہ، رہ" کی آواز کا بیان یہ سب اسی غایر مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ دوسری جگہ کہتے ہیں :-

یا سوانگ کہوں یا رنگ کہوں یا حُسن بتاؤں ہولی کا سب ابرن تن پر جھمک رہا اور کیسر کا ماتھے ٹیکا

ابرن یا ابرک کا بدن پر جھمکنا، ماتھے پر کیسر کا ٹیکا۔ ایسی باتیں ہیں جنھیں ہم جانتے تو ہیں مگر یاد نہیں۔ ہم کو رنگ اور رنگ بھری پچکاریاں تو ضرور یاد رہتی ہیں کہ جب یہی طوفان نشاط اپنے عروج پر پہونچتا ہے تو رنگ کے بجائے بڑے بڑے مہذب لوگوں میں کیچڑ مٹی سے کام لیا جاتا ہے اور جب رنگ کی بھری ہوئی پچکاریوں سے کام نہیں چلتا تو رنگ کی بھری ہوئی لٹیاں لنڈھائی جاتی ہیں۔ اسی چیز کو نظیر ہمارے سامنے نئی بنا کر پیش کرتا ہے۔

کہیں ہوتی دھینگا مشتی ہے کہیں ٹھہری کھینچا تانی ہے　　کہیں ٹیاں جھکتی رنگ بھری کہیں چلتا کیچڑ پانی ہے

یہ سب جانتے ہیں کہ ہولی میں گانا بجانا بھی ہوتا ہے۔ مگر نظیر کی واقعات نگاری صرف اس کلیہ پر قانع نہیں رہی بلکہ اس نے اُن تمام سازوں کے نام بھی لئے اور پھر جو جو خاص اہمیت رکھنے والے لوگ ان جلسوں میں شریک تھے اُن کا بھی ذکر کردیا

کچھ طبلے کھٹکے، تھال بجے، کچھ ڈھولک اور مردنگ بجی　　کچھ چھیڑیں بین ربابوں کی کچھ سارنگی رچھ چنگ بجی

کچھ تار طنبوروں کے جھنکے کچھ دھمدھمی اور مرچنگ بجی　　کچھ گھنگرو چھم چھم چھم چھم چھم کچھ گت گت پر آہنگ بجی

ہیں کیا کیا سر میں رنگ بھرے اور سوانگ بھی کیا کیا آتے ہیں　　کر باتیں ہر دم چُہل بھری خوش ہنستے اور ہنسلاتے ہیں

کچھ جوگی چیلے بیٹھے ہیں کچھ کامنیوں کے گاتے ہیں　　کچھ اور طرح کے سوانگ بنیں کچھ ناچتے ہیں کچھ گاتے ہیں

ہر آن نظیر اس فرحت کا سامان دکھایا ہولی نے

اسی کے ساتھ ساتھ برسات کا ایک منظر بھی دیکھتے چلیئے۔ برسات ہندوستان کا محبوب موسم ہے۔ تکلف نگار شاعر ہمیشہ برسات کی بہاریں ناظرین کے سامنے پیش کرتے رہے ہیں۔ آسمان پر بھورے بادل اودی بدلیاں۔ کالی گھنگھور گھٹائیں پپیہے کا زور، مور کا شور، بادِ بہاری کا چلنا۔ درختوں کا لہلہانا۔ سبزے سے تمام جنگل میں مخملی فرش بچھ جانا، جھیلوں تالابوں ڈبروں کا لبریز ہونا یہ سب چیزیں ایسی ہیں جن سے کم وبیش ہر سننے والا متاثر ہوتا ہے، مگر نظیر کی جزئیات نگاری اس سے آگے اور بڑھتی ہے اور وہ محلوں اور مکانوں کی دیواروں میں کٹی ہوئی جالیوں کو بھی دیکھتا ہے جن پر سب کی نگاہ نہیں پڑتی، لکھتا ہے:۔

بجلیوں کی اُجالیاں بارہ دری کی جالیاں　　عیش کی جھومیں ڈالیاں ہلتی گلوں کی ڈالیاں

برسات پر نظیر کی مختلف نظمیں ہیں اور اُن سب میں کوئی نہ کوئی ایسی ہی خصوصیت موجود ہے جیساکہ اوپر کے لکھے ہوئے شعر میں ایک اچھوتا خیال پیش کیا گیا ہے اسی طرح برسات کے اس مخمس میں جس کا پانچواں مصرع یہ ہے کہ:۔

آ یار چل کے دیکھیں برسات کا تماشا،

ایک خیال کو نظم کیا ہے جو کہیں میری نگاہ سے نہیں گزرا۔ ہندو مذہب میں ہر چیز کے متعلق کچھ کام کرنے والے دیوتا مانے گئے ہیں۔ جیسے اگنی دیو آگ کا اور پَوَن دیو ہواؤں کے چلانے کا موکل ہے اسی طرح میگھ راج۔ بادلوں کا دیوتا ہے۔ نظیر کو اکدم اس کا خیال آتا ہے اور وہ اس خیال کو اس طرح ادا کرجاتا ہے:۔

قاصد صبا کے دوڑے ہر طرف منھ اُٹھا کر　　ہر کوہ و دشت کو بھی کہتے ہیں یوں سنا کر

ہاں سبز جوڑے پہنو ہر دم نہا نہا کر　　کوئی دم کو میگھ راجا دیکھے گا سب کو آکر

یہ خیال کہ برسات میں مکانات ہر وقت پناہ مانگتے رہتے ہیں سبھی کو معلوم ہے اور عجب نہیں ہے کہ کسی نے مکانوں کے

گرنے کا ذکر بھی کیا ہو۔ مگر یہ مجھے یقین ہے کہ اس تفصیل اور تجزیۂ مصیبت کا سہرا صرف نظیر ہی کے سر ہے۔ وہ مکان کا گرنا تو کوئی نئی بات نہیں جانتا مگر ڈسکی ایک ایک چیز کو بتا کر اپنے بیان کو سب سے الگ کر کے اتنا زوردار بنا دیتا ہے کہ پھر اس کا مقابلہ دشوار ہو جاتا ہے چنانچہ برسات کی پھسلن کی مناسبت سے اس خمسہ کے پانچویں مصرع کی ردیف بھی "پھسل پڑا" رکھی ہے اور چھتا۔ کوٹھا۔ اٹاری۔ در۔ چھت۔ دیوار۔ دروازہ۔ پاکھے۔ پچھیت۔ چھپر۔ ان سب کو پھسلانے کے بعد مفلس۔ غریب۔ فیل سوار۔ پالکی نشین۔ پیادہ۔ سوار۔ ہاتھی سوار۔ خر۔ نوکر۔ آقا۔ کو بھی پھسلا دیا ہے اور پھر خیال آتا ہو کہ لاؤ کچھ کیچڑ کا حال لکھ کر یہ بھی تفصیل کے ساتھ بتا دیں کہ یہ واقعات کہاں کہاں ہوئے، ملاحظہ ہو:-

چکنی زمیں پہ یاں تئیں کیچڑ ہے بے شمار — کیسا ہی ہوشیار پہ پھسلے ہے ایکبار
نوکر کا بس نہ اس میں کچھ آقا کا اختیار — کوچے گلی میں ہم نے تو دیکھا ہے کتنی بار
آقا جو ڈگمگائے تو نوکر پھسل پڑا

کوچے میں کوئی اور کوئی بازار میں گرا — کوئی گلی میں گرکے ہے کیچڑ میں لوٹتا
رستے کے بیچ پاؤں کسی کا رپٹ گیا، — اس سب جگہ کے گرنے سے آیا جو بچ بچا،
وہ اپنے گھر کے صحن میں آکر پھسل پڑا

دلدل جو ہو رہی ہے ہر ایک جا پہ رسمسی — مر مر اُٹھا ہے مرد تو عورت رہی پھنسی
کیا سخت مشکلات ہیں کیا سخت بیکسی — اُس کی بڑی خرابی ہوئی اور بڑی ہنسی
جو اپنی جا ضرور کے اندر پھسل پڑا

کوئی اور ہوتا تو اپنے گرنے کو چھپاتا مگر نظیر پر تو سعدی کا سایہ پڑا ہے اور لوگوں کو پھسلن کی نذر کر کے خود بھی پھسلے ہیں اور بُری طرح پھسلے ہیں کہتے ہیں اور صاف صاف کہتے ہیں:-

کیچڑ سے ہر مکاں کی تو بچتا بہت پھرا — پر جب دکھائی دی کھلے بالوں کی اک گھٹا
بجلی بھی چمکی حُسن کی منھ برسا ناز کا — پھسلن جب ایسی آئی تو کچھ بس نہ پھر چلا،
آخر کو واں نظیر بھی آکر پھسل پڑا

الغرض نظیر کی سیکڑوں نظمیں ہیں جن سے ان کے مشاہدہ فطرت اور تجزیہ نگاری کا ثبوت ملتا ہے مگر اس بات کو کبھی نہ بھولنا چاہئے کہ کوئی شخص اگر اس مطالعہ فطرت و قدرت کا اعلےٰ اور زبردست ماہر بھی ہے پھر بھی یہ بات اس کے بس کی نہیں ہے کہ وہ اُس کو بیان کردے۔ اس روانی بیان اور اس چرب زبانی کے واسطے سب سے بڑی ضرورت زبان کے جاننے کی ہے۔

نظیر کی جزئیات نگاری کا یہ عالم ہے کہ اُن کو مفصل بیان اور تشریح پسندی کا خوگر بنایا ہے اس کا حتمی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا مگر یہ بے تکلف اور بے باکانہ کوئی واقعہ پیش کرتے ہیں تو الفاظ کا ایک موجزن سمندر ہماری نظر کے سامنے آجاتا ہے اور ہم حیران رہ جاتے ہیں۔

حمد کو اس طرح شروع کرتے ہیں:۔

کل عالم تیری یاد کرے تو مالک سب کا سچا ہے

اس ارض و سما کے عرصے میں یہ جتنا کھیل کھچا ہے　　یہ ٹھاٹھ تجھی نے باندھا ہے یہ رنگ تجھی نے رچا ہے
حیوان پکھیرو نر ناری کیا بوڑھا بالک بچا ہے　　کیا دانا بینا ہوش بھرا کیا بھولا ناداں کچا ہے

کل عالم تیری یاد کرے تو مالک سب کا سچا ہے

ہشیار و دانا مست بڑا عیار نظر ناقص کامل　　سردار غریب ادنیٰ اعلیٰ زیرک سیانا ناداں غافل
رمال نجومی گھڑیالی ملا بھمن پنڈت عاقل　　کیا بید جہندس ابجد داں کیا عالم فاضل کیا جاہل

کل عالم تیری یاد کرے تو مالک سب کا سچا ہے

ابدال قطب اور غوث ولی ہے دھیان میں تیرے حال سبکا　　کیا گیانی دھیانی نارمن کیا جوگی جنگم گُرو چیلا
تو پالنے والا ہے سب کا اور سب کا تجھ سے دھیان لگا　　کیا شاہ نظیر اور کیا راجا کیا مفلس کیا کنگال گدا

کل عالم تیری یاد کرے تو مالک سب کا سچا ہے

دریا و سمندر جھیل نہر ندی نالے ڈبرے جوہڑ　　سیپی گھونگے کوڑی موتی گھڑیال اور ناکے سوس مگر
جونکیں کھنبیں گُنیں جھینگے مرغابی بطخ بگلے اشیر　　کیا لاچی پروی اور بھنور کیا کچھ مگر کیا جی جنتر

کل عالم تیری یاد کرے تو مالک سب کا سچا ہے

پھلواری باڑی باغ چمن ہے سب کو یاد تری ہی بھلی　　توائی والی رکھوالی کیا برچھ پھلی کیا پیڑ بلی
کوئی مالا پھیرے کوئی سمرن ہے سب کے دلمیں یاد ڈھلی　　کیا چوٹی جڑ کیا پھل کونپل کیا ٹہنی پتا کلی کلی

کل عالم تیری یاد کرے تو مالک سب کا سچا ہے

ہیں دشت بیاباں اور وادی عرصہ میداں صحرا جنگل　　ویرانہ بن جھاڑ اور شجر بوٹی جھاڑی بیڑ اور جبل
بیلو پاکھر نرما پیپھل کچنار سنبھالو بٹر پیپل　　کیا ابر ہوا کیا برق گھٹا کیا دل بادل کیا جل اور تھل

کل عالم تیری یاد کرے تو مالک سب کا سچا ہے

رابیل نگیسر مولسری مدمالت بیلا اور سمن　　دوپہری گیندا گل لالہ نافرماں گل زعفران مدن
جائی جوئی شبو نرگس سنگار چنبیلی سیم بدن　　کیا پھول گلابی گل طرہ کیا ڈیلا بانسہ سکھ درسن

کل عالم تیری یاد کرے تو مالک سب کا سچا ہے

انگور سنگترہ نارنگی۔ بر سیو۔ سدا پھل سیتا پھل، نارنج جھنبیلی اور کولے کھٹے۔ میٹھے۔ کمرکھ۔ گلگل
آنب۔ جامن۔ ملکری۔ بادام۔ چھوارے اور جا پھل کیا گولر۔ کھٹے مولسری، کیا ختقالو۔ کیا کٹھل بڑھل

کل عالم تیری یاد کرے تو مالک سب کا سچا ہے

سیار۔ ثوابت۔ لوح و قلم۔ جنات عدن، فردوس و فلک خورشید سے لے مہتاب تلک، مہتاب سے لے خورشید تلک
آثار طبایع قوس، جدی، میزان، اسد، سرطان، ہر اک کیا رضواں غلماں جنت کے کیا عرش بریں کیا حور و ملک

کل عالم تیری یاد کرے تو مالک سب کا سچا ہے

گرھ پنکھ، کلنگ اور پار کوئی سارس بگلا کویل تیتر سرخاب ترمتی زاغ و زغن سیمرغ اور سارس مور سفر
بہری لگھڑ طوطا مینا۔ ہدہد شکرے باشے تیتر کیا بلبل قمری۔ لعل بیا۔ کیا مکھی بھنگا اور مچھر

کل عالم تیری یاد کرے تو مالک سب کا سچا ہے

گج گینڈا ارنا شیر بلنگ آہو ہرنی روبہ گیدڑ سیہی۔ نیولا۔ سانڈا۔ بچھو افعی چیتل چیتی اژدر،
کچ کوہی۔ باڑ کرگ۔ چرغ۔ گرگٹ چلپاسہ موش دگر کیا جل مانس۔ کیا بن مانس کیا ہاتھی گھوڑا بیل شتر

کل عالم تیری یاد کرے تو مالک سب کا سچا ہے

کوئی خالق۔ باری سب مولا۔ رحمان رحیم اللہ تنگری کوئی الکھ روپ کرتار کہے نرکال نرنجن نردھاری،
کوئی رام رام کہکر سمرے کوئی بولے شیو شیو ہری ہری کوئی داتا دینت دیو اٹل کوئی راچھس دیوت جن پری

کل عالم تیری یاد کرے تو مالک سب کا سچا ہے

پیراکی کے میلے پر جو نظم لکھی ہے اسے دیکھئے ایسے ایسے محاورات اور الفاظ استعمال کئے ہیں جن کے معنی آج لغت میں ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل سکتے۔ ملاحظہ ہو:۔

کلٹری۔ چادر بند۔ ناند چکوا۔ مینڈا۔ بھنوار جھالن۔ چکر سمپٹ مالا مینڈا گھمیر۔ تختہ۔ کشتی پچھار۔ کڑا یہ سب وہ اصطلاحیں ہیں جنھیں نظیر نے زیادہ سے زیادہ ایک بند میں بتا دیا ہے۔

کبوتر بازی کا ذکر آگیا ہے تو وہ ایک ایسا کبوتر باز معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اہل زبان۔ یا زباندان۔ یا شاعر تو اسے کیا سمجھے گا کوئی بڑے سے بڑا کبوتر باز بھی مشکل ہی سے معلوم کر سکے گا کہ میاں نظیر کیا فرما رہے ہیں، نام و اقسام مع رنگ وغیرہ ملاحظہ کیجئے:۔

بصرئی۔ کابلی۔ شیرازی۔ چوپا چندن۔ سبزے۔ لکھی۔ شستر۔ اگر۔ طاوسی۔ کل پوٹیے۔ نیلے گلی جھیٹر لقے چتیے جوگے گھیرے۔ پٹیٹ۔ چپ تقتے۔ کھرے۔ زرچے۔ گل آنکھ۔ لل آنکھ۔ اودے۔ زردے۔ کابرے۔ مسی۔ توسی۔ پلکے۔ سیمابی۔ گھاگرا۔ تنبوتے۔ پان لال۔ اگرئی۔ سرمئی عنبری۔

خال - بھورے - نگسی - تانبڑے - بیرے - ہمترے - کاسنی - لوٹن - ان سب باتوں کو دیکھتے ہوئے جب غور کیا جاتا ہے تو نظیر ہندوستان بھر کے شعراء میں ممتاز معلوم ہوتا ہے - مگر اس کے کمال کا یہیں خاتمہ نہیں ہوتا - وہ زبان کا حافظ ہی نہیں بلکہ موجد بھی ہے - اگر اُس کی نظموں کو بغور پڑھا جائے تو بعض میں آپ کو ایسے الفاظ ملیں گے - جو نظیر نے وضع کئے - مگر پھر بھی اُن میں آج کل کے موجدوں کی سی بے راہ روی نہیں بلکہ انھیں اُصولوں پر جو زبان میں مقرر ہو چکے تھے -

الغرض نظیر زباندانی کے لحاظ سے ہندوستان کے شعراء میں اپنا جواب نہیں رکھتا اور ایجاد و الفاظ کی وجہ سے وہ زبان اُردو کا زبردست محسن ہے -

عبدالباری آسی

سلطانوں کی، انور پاشا کی، اور اتاتورک کی ٹرکی

اگر قدیم و جدید ٹرکی کے مفصل حالات وانقلاب سے آپ واقف ہونا چاہتے ہیں تو یہ کتابیں پڑھیے :

۱- **سلطانی محلوں کے راز** - اس کتاب میں سلطان عبدالعزیز، سلطان مراد، سلطان عبدالحمید کے شاہی محلوں کے حیرت انگیز سربستہ راز جمع کر دئے گئے ہیں - آجتک اس موضوع پر اُردو میں کوئی کتاب لکھی نہیں گئی۔ ضخامت ۵۷۰ صفحہ - سرورق بہت شاندار - قیمت ایکروپیہ بارہ آنے

۲- **انور پاشا** - غازی انور پاشا کی شجاعت وبسالت کے محیرالعقول کارناموں، ان کی پاک محبتوں اور سلطان کے خلاف بھیانک انقلابی کارروائیوں کی یہ عجیب داستان ہے - دو جلدوں میں ختم ہوئی ہے - دونوں کی مجموعی ضخامت ۹۵۰ صفحہ ہے - سرورق پر غازی کی تصویر - ایک جلد کی قیمت ایک روپیہ بارہ آنہ - ایک ساتھ دونوں جلدوں کی قیمت تین روپیہ -

۳- **کمال اتاتورک** - غازی کمال پاشا کے حالات اور تازہ ترکی انقلاب پر اس سے بہتر کوئی کتاب لکھی ہی نہیں گئی - یہ ایک انقلابی ترک مصنف کی تصنیف ہے اور لاجواب ہے - کتاب کے سرورق پر کمال آتاترک اور عصمت پاشا کی تصویریں ہیں - اور کتاب کے اندر سولہ صفحے کے ہاف ٹون نہایت ہی قیمتی بلاک موجود ہیں - اُردو زبان میں اس کتاب کی نظیر مل نہیں سکتی - کتاب میں خود غازی کی اپنی بیان کی ہوئی سوانح حیات بھی موجود ہے - ضخامت ۵۰۰ صفحہ قیمت ایک روپیہ بارہ آنے -

نوٹ : نمبر ۱ و ۲ کی کتابیں مشہور ترک سپہ سالار ہز ایکسلنسی جمال پاشا الغزی کی تصنیف ہیں اور تینوں کتابوں کا ترجمہ ملیح آبادی صاحب نے اپنے خاص انداز میں کیا ہے -

پتہ : - "روزانہ ہند" نمبر ۷، اسا گردت لین - کلکتہ

سخنورانِ دکن

مرتبہ سید تسکین عابدی - مبارک عہد عثمانی کے (۲۰۰) شعراء کا مکمل تذکرہ - حضور بندگان عالی و شاہزادگان والاشان کے نایاب تصاویر کے علاوہ شعرائے عصر کے متعدد فوٹو بلاکس - صفحات (۲۵۰) -　ملنے کا پتہ : **مکتبہ ابراہیمیہ تاجر کتب حیدرآباد**

نظیر کا تبصرہ کارگاہِ عالم پر

(ایک غیر مطبوعہ مخمس)

کرتا ہے کوئی جور و جفا پیٹ کے لئے — سہتا ہے کوئی رنج و بلا پیٹ کے لئے
سیکھے ہے کوئی مکر و دغا پیٹ کے لئے — پھرتا ہے کوئی بے سروپا پیٹ کے لئے
جو ہے، سو ہو رہا ہے فدا پیٹ کے لئے

عاجز ہیں اس کے ہاتھ سے کیا شاہ کیا وزیر — محتاج ہیں اسی کے لئے بخشی و امیر
منشی، وکیل، ایلچی، متصدی و مشیر — چاکر، نفر، غلام، تونگر، غنی، فقیر
سب کر رہے ہیں فکر سدا پیٹ کے لئے

صراف، خوردے[1] سے لگا سیٹھ ساہوکار — دلال، جوہری، یہ کناری[2] کے پیشہ وار
پنساری اور بزاز، اناجوں کے کاروبار — بیوپاری، لین دین، بیج[3]، قرض اور ادھار
ہے سب نے ٹھکٹھکا یہ کیا پیٹ کے لئے

اب خلق میں ہیں چھوٹے بڑے جتنے پیشہ ور — سیکھے اسی کے واسطے سب کسب اور ہنر
صحاف، جلد ساز، کماں گر، سفال گر — زیں دوز، گلفروش، بساطی جدھر تدھر
بیٹھے ہیں سب دکان لگا پیٹ کے لئے

کیا مینے ساز کام کے اور کیا مرصع کار — حکاک کیا، مصور و نقاش و زرنگار
دیکھا تو نا سونار ہے کوئی نہ اب لوہار — سب اپنے اپنے پیٹ کے بندے ہیں میرے یار
پیشہ ہر اک نے سیکھ لیا پیٹ کے لئے

گندھی کے مغز میں بھی یہی رچ رہی ہے بو — کھینچے ہے جب گلاب، نکالے ہے عطر کو
شیشی کسی کو، سینک سے کے پھوئے کسی کو دو — ہر دم چھڑک گلاب لگا تن سے عطر دو
لپٹیں ہر اک کو دے ہے سنگھا پیٹ کے لئے

---

[1] اس سے مراد وہ دوکاندار ہیں جن کے یہاں روپیہ بھنایا جاتا ہے۔ [2] آگرہ کا کناری بازار مراد ہے۔ [3] یہ لفظ صاف پڑھا نہیں گیا، ممکن ہے بیاج کا مخفف ہو۔ جو سود کے معنے میں بولا جاتا ہے۔

رنگریز بیٹھے رنگتے ہیں رنگت ہزار یا — سرخ و گلابی، زرد، سیہ، سبز دھاریا
مخمل کوئی بنی، کوئی مشرو، کٹاریا — جنگل میں جاکے دیکھا تو پھر واں بھی نیاریا
نت خاک چھانتا ہے پڑا پیٹ کے لئے

بدنام ہے اسی کے لئے خلق میں کلال، — ذبّاح بھی کرے ہے اسی کے لئے حلال
صیاد بھی اسی کے لئے پھیلاتا ہے جال، — ٹھگ بھی اسی کے واسطے پھانسی گلے میں ڈال
ہر وقت کاٹتا ہے گلا پیٹ کے لئے

نٹ کھٹ، اُچکّے، چور، دغاباز، راہ مار — عیار، جیب کترے، نظرباز، ہوشیار
سب اپنے اپنے پیٹ کے کرتے ہیں کاروبار — کوئی خدا کے واسطے کرتا نہیں شکار
بلّی بھی مارتی ہے چوہا پیٹ کے لئے

حجام کے بھی دل میں اسی کا ہے غم بھرا — جب سر بھگو بھگو کے چلاتا ہے اُسترا
مونڈا اُسے، جو آگیا کوئی بُرا بھلا — گاہک، اگر چہ کے خایہ ہے، گنجا ہوا ستیا
یاں گھوٹ گھاٹ صاف کیا پیٹ کے لئے

بیٹھے ہیں چوک میں جو کہاتے حکیم جی — ڈبیا ہر اک دوا کی بنی ہے دھری سجی
پیسے دوا کے آویں تو آنکھوں میں آوے جی — بیمار کا تو کچھ نہیں کرتے علاج جی
اپنا ہی کچھ کرے ہے دوا پیٹ کے لئے

پوتھی بغل میں مارکے بامن بھی جا بجا — پھرتا ہے مین، میکھ، تُلا، دھن بچارتا
پنڈت بھی ہے اسی کے لئے پشت سے پڑھا — بھڈری پھرے ہے دان سنیچر کا مانگتا
مصّر بھی بانچتا ہے کتھا پیٹ کے لئے

بانکا سپاہی خوب شجاعت سے بےجگر — وہ بھی اسی کے واسطے لے تیغ اور سپر
لڑتا ہے توپ، تیر، تفنگوں میں آنکر — کھاتا ہے زخم، خون میں ہوتا ہے تربتر
آخر سب اپنا دے ہے کٹا پیٹ کے لئے

جس تن میں درد ہوتا ہے چُبھنے سے ایک پھانس — اُس تن میں تیر کھاکے نہیں کھینچتا ہے سانس
نٹ کی طرف بھی دیکھ کے اُٹھتی ہے دل میں دھانس — کیا جان بیچ، چڑھکے رسن پر اُٹھاکے بانس،
کس کس طرح کرے ہے کلا پیٹ کے لئے

فاضل کے فضل میں بھی اسی کی ہے التجا — عامل نجومی کا بھی اسی پر ہے مدعا

مُلّا بھی دن گزارے ہے لڑکے پڑھا پڑھا / شاعر بھی دیکھئے تو قصیدے بنا بنا
کیا کیا کرے ہے وصف و ثنا پیٹ کے لئے

قاضی کے حال میں بھی یہی بات ہے گواہ / مفتی کے قصد کی بھی یہ شاہد ہے خواہ مخواہ
بید اور حکیم کی بھی اسی پر ہے اب نگاہ / عطار کے بھی درد کو دیکھا تو وہ بھی آہ
دن رات کوٹتا ہے دوا پیٹ کے لئے

بیٹھے ہیں مسجدوں میں مُصلّٰی بچھا بچھا / جُبّہ پہن کے، ہاتھ میں تسبیح کو پھرا
واعظ کے ہر سخن میں ہے کھانے کا مدعا / عابد بھی دعوتوں کی عبادت ہے کر رہا
زاہد بھی مانگتا ہے دعا پیٹ کے لئے

پڑھتے ہیں اب قرآن جو مُردے کا لیکے نام / پھولوں میں بیٹھ کرتے ہیں پنج آیتیں تمام
دوزخ میں یا بہشت میں مُردے کا ہو مقام / کچھ ہو پر ان کو حلوہ و مانڈے سے اپنے کام
خوش ہو گئے جب ان کو ملا پیٹ کے لئے

دیتے ہیں اب جو فاتحہ گھر گھر میں نیک خو / حلوے کو کھا کے، کھیر کے چاٹیں طباق کو
مردے کی ناک میں نہیں کھانے کی پہونچی بو / واں فاتحہ قبول ہو یا نا قبول ہو
چنگل انھوں نے مار لیا پیٹ کے لئے

عاشق کنے جو دیکھی ہے سو نعمتوں کی چیٹ / لڑکی بھی اپنی کھول کے چھاتی، دکھا کے پیٹ
گودی میں بیٹھ جاتی ہیں ہر دم بغل میں لیٹ / کھانے پہ رکھ کے چاٹ لگاوٹ کی کر لپیٹ
کیا کیا کرے ہیں ناز و ادا پیٹ کے لئے

دیتا ہے راگنی میں کلاوت تو سُر چڑھا / گاتا نہیں وہ روٹی کو کہتا ہے یوں کہ "آ"
کھونٹی مروڑ بین کی اور دایرہ بجا / قانون اور رباب کو سو سو طرح جگا
کیا زیر و بم کو دے ہے ملا پیٹ کے لئے

قرنائے والا لیوے ہے روٹی کو اپنے جھانک / شہنائی والے کی ہے کچھ اس سے زیادہ ہانک
اور جھانجھ والے کی بھی اسی پر ہے پھینک پھانک / نقارچی بھی اپنے نقاروں کو سینک سانک
کیا کیا ٹکوریں دے ہے لگا پیٹ کے لئے

رنڈی جو ناچتی ہے پر بزاد پھلجھڑی / سر پاؤں سے تمام جواہر میں ہے جڑی
چتون لگاوٹوں کی جتا کر گھڑی گھڑی / ے شام سے سحر تئیں ہے ناچتی کھڑی
سو سو طرح کے بھاؤ بتا پیٹ کے لئے

کسبی کے گھر کو دیکھا تو واں بھی یہی پکار　　جو جائے، اُس کے دوڑ کے ہوئیں گلے کا ہار
کُرتی کبھی دکھا، کبھی انگیا تڑاتے دار　　جاتی ہیں جھپ پلنگ اوپر لیٹ ایکبار
سب کھوئے اپنی شرم و حیا پیٹ کے لئے

وہ کسبیاں جو ہوتی ہیں راضی ٹکے تلک　　سینے کو کیا دکھاتی ہیں اپنے چٹک مٹک
شہوت کی آگ میں جو کوئی آگیا بھٹک　　اُن کی بلا سے بھڑوا سڑی یا ہو آتشک
اپنا ٹکا وہ، مانگ لیا پیٹ کے لئے

خوش مسخرا ہوا کوئی حرمت کے تئیں گنوا　　حرمت بلا سے جاتی رہی پیٹ تو بھرا
طبلے کوئی اُٹھا، کوئی سارنگیاں بجا　　ہر دم اسی کے واسطے غیرت سے ہاتھ اُٹھا
دیتے ہیں ننگ و نام اُڑا پیٹ کے لئے

اُلفت نہیں ملاپ کی، سب میں پڑا ہے بیر　　مانے کوئی حرم کو کوئی پوجتا ہے دیر
کھانے کی سب بہار ہے، کھانے کی سب ہی سیر　　کہتا ہے اب فقیر بھی دیگر دعائے خیر
بابا کچھ آج مجھ کو دلا پیٹ کے لئے

ہے جن کے پاس منصب و جاگیر و ملک و جاہ　　خوباں اسی کے ساتھ کریں ہیں بہت نباہ
کھانے کی ساری دوستی، کھانے کی سب ہی چاہ　　دیکھا جو خوب غور سے ہم نے تو واہ واہ
معشوق بھی کرتے ہے وفا پیٹ کے لئے

جتنے جہاں کے بیچ ہیں کم ذات یا اصیل　　سب اپنے اپنے پیٹ کی رکھتے ہیں قال و قیل
شیر و پلنگ گرگ، ہرن، چیونٹی اور فیل　　کوا، بٹیر، ہنس، لگھڑ، باز، گدھ، چیل،
سب ڈھونڈھتے پھرے ہیں غذا پیٹ کے لئے

لاکھوں میں کوئی لے ہے محبت سے حق کا نام　　ورنہ سب اپنے پیٹ کے حیلے ہیں مکر و دام
نا عاقبت کا دھیان نہ راہِ خدا سے کام　　سمجھا نہ کچھ حلال نہ جانا کہ ہے حرام
جو جس سے بن سکا سو کیا پیٹ کے لئے

کیا رند کیا غریب و گدا، شوخ کیا شریر　　زردار کیا، تونگر و محتاج کیا فقیر
ہر دم سبھوں کو دیکھ اسی حال میں اسیر　　اپنی بھی یہ دعا ہے شب و روز اے نظیر
دے شرم و آبرو سے خدا پیٹ کے لئے

پورے ہیں وہی مرد جو ہر حال میں خوش ہیں

(نظیر کا ایک غیر مطبوعہ مسدس)

جو فقر میں پورے ہیں وہ ہر حال میں خوش ہیں   ہر کام میں، ہر بات میں ہر حال میں خوش ہیں
گر مال دیا یار نے تو مال میں خوش ہیں   بے زر جو کیا تو اسی احوال میں خوش ہیں
افلاس میں، ادبار میں، اقبال میں خوش ہیں
پورے ہیں وہی مرد، جو ہر حال میں خوش ہیں

چہرہ پر ملالت نہ جگر میں اثرِ غم،   ماتھے پہ کہیں چین نہ ابرو میں کہیں خم،
شکوہ نہ زباں پر نہ کبھی چشم ہوئی نم   غم میں بھی وہی عیش، الم میں بھی وہی دم
ہر بات، ہر اوقات، ہر افعال میں خوش ہیں
پورے ہیں وہی مرد، جو ہر حال میں خوش ہیں

گر یار کی مرضی ہوئی سر جوڑ کے بیٹھے،   گھر بار چھڑایا تو وہیں چھوڑ کے بیٹھے
موڑا انھیں جیدھر، وہیں منھ موڑ کے بیٹھے   گودڑی جو سلائی تو وہی اوڑھ کے بیٹھے
اور شال اُڑھا دی تو اُسی شال میں خوش ہیں
پورے ہیں وہی مرد، جو ہر حال میں خوش ہیں

جینے کا نہ اندوہ، نہ مرنے کا ذرا غم   یکساں ہے انھیں زندگی و موت کا عالم
واقف نہ برس سے، نہ مہینے سے وہ اکدم   نہ شب کی مصیبت، نہ کبھی روز کا ماتم
دن، رات، گھڑی، پہر، مہ و سال میں خوش ہیں
پورے ہیں وہی مرد، جو ہر حال میں خوش ہیں

گر اس نے اوڑھایا تو لیا اوڑھ دوشالا   کمل جو دیا تو وہی کاندھے پہ سنبھالا
چادر جو اُڑھا دی تو وہی ہو گئی بالا   بندھوائی لنگوٹی تو وہی ہنس کے کہا "لا"
پوشاک میں، دستار میں، رومال میں خوش ہیں
پورے ہیں وہی مرد، جو ہر حال میں خوش ہیں

گر کھاٹ بچھانے کو ملی کھاٹ پہ سوئے   دوکاں میں سُلایا تو وہ جا ہاٹ (بازار) پہ سوئے

رستے میں کہا سو، تو وہ جا باٹ (راستہ) پہ سوئے — گر ٹاٹ بچھانے کو دیا ٹاٹ پہ سوئے
اور کھال بچھا دی تو اسی کھال میں خوش ہیں
پورے ہیں وہی مرد، جو ہر حال میں خوش ہیں

پیالا جو دیا ہاتھ، تو نکلے ہو بھکاری — بٹھلا کے کھلایا تو وہیں عمر گزاری
میانہ پہ چڑھایا تو لگے کرنے سواری — اور پاؤں چلایا تو وہی بات سنواری
جس چال میں رکھا وہ اسی چال میں خوش ہیں
پورے ہیں وہی مرد جو ہر حال میں خوش ہیں

گر موٹھ منگا دی تو وہی چاب لی خوش ہو — اور جوار بھنا دی تو وہی چاب لی خوش ہو
سوکھی جو دلا دی تو وہی چاب لی خوش ہو — رُوکھی جو اُٹھا دی تو وہی چاب لی خوش ہو
اور دال کھلائی تو اسی دال میں خوش ہیں
پورے ہیں وہی مرد، جو ہر حال میں خوش ہیں

دی بھوک اگر یار نے تو بھوک کو مارا — دلشاد رہے کر کے کڑاکے پہ کڑاکا (فاقہ پر فاقہ)
پانی جو ملا پی لیا، جس طور کا پایا، — روٹی جو ملی تو کیا روٹی میں گزارا
اور چھال چبائی تو اُسی چھال میں خوش ہیں۔
پورے ہیں وہی مرد، جو ہر حال میں خوش ہیں

گر اُس نے کہا سیر کرو جا کے جہاں کی — تو پھرنے لگے جنگل دبر، مارے جھانکی
کچھ دشت و بیاباں میں خبر تن کی نہ جاں کی — اور پھر جو کہا سیر کرو حُسنِ بتاں کی
تو چشم و رخ و زلف و خط و خال میں خوش ہیں
پورے ہیں وہی مرد، جو ہر حال میں خوش ہیں

قشقہ کا ہوا حکم تو قشقہ وہیں کھینچا — جُبّہ کی رضا دیکھی تو جبہ وہیں پہنا
آزاد کہا گر تو وہیں سر کو منڈایا — جو رنگ کہا اس نے وہی رنگ رنگایا
کیا زرد میں کیا سبز میں کیا لال میں خوش ہیں
پورے ہیں وہی مرد، جو ہر حال میں خوش ہیں

اُن کے تو جہاں میں عجب عالم ہیں نظیر آہ — ہیں ایسے تو دنیا میں، وہ کم ہیں نظیر آہ
کیا جانیے فرشتہ ہیں کہ آدم ہیں نظیر آہ — ہر وقت میں، ہر آن میں خورم ہیں نظیر آہ
جس ڈھال میں ڈھالا وہ اُسی ڈھال میں خوش ہیں
پورے ہیں وہی مرد، جو ہر حال میں خوش ہیں

ایک رقاصہ کا عروج وزوال

(نظیر کی ایک غیر مطبوعہ مسلسل غزل)

کیا دل لگاویں مہرباں ہم حُسنِ صورت سے کہیں — نہ واں ثبات اُس سے بہم نہ یاں قیام اپنے تئیں
تھا اک مکانِ دلکشا، رشکِ چمن جس کی فضا — تھی اُس جگہ رونق فزا، رقاصہ شوخ اک نازنیں
قد حسرتِ سروِ چمن، لب غیرتِ لعلِ یمن — جعدِ معنبر پُرشکن، نوکِ مژہ نشتر قریں
نازو ادا کی گرمیاں، غارتگرِ صبر و تواں — طورِ تکلم درفشاں، طرزِ تبسم شکریں
کیا کیا لگاوٹ بے بدل کیا کیا رکھاوٹ برمحل — کیا کیا بناوٹ، ہل پہ ہل کرتی تھی وہ زہرہ جبیں

گردوں نے اک گردش جو کی زار و عجوزہ بن گئی، — وہ نوجوانی، تازگی، دیکھا تو کوسوں تک نہیں
وہ گل سا مکھڑا زرد ہے، گرمی کا عالم سرد ہے — جاں رنج سے پر درد ہے، آزردہ دل، اندوہگیں
جوں بید لرزاں دست و پا، ہو جائے چوبِ گل عصا، — ہر موجِ سنبل رشک تھا، یکسر ہے برگِ یاسمیں
نہ چشم میں مستی رہی، نہ خو میں وہ تندی رہی، — نہ لب میں وہ سرخی رہی، نہ منھ میں وہ دُرِ ثمیں
دیکھ اس کو میں نے ناگہاں، پوچھا کچھ اپنا کر بیاں — تھی کل تو رشکِ گلستاں، ہے آج خارِ ...

بولی نظیر، عبرت میں رہ، کیا پوچھنے کی ہے جگہ
یاں کی یہی ہے رسم و رہ، گاہے چناں گاہے چنیں

بھونچال

(نظیر کا ایک غیر مطبوعہ مسدس)

سن بارہ سو اٹھارہ میں یہ واردات تھی　　اول جمادی بارھویں تاریخ سات تھی
دن بدھ کا جمعرات کی وہ آدھی رات تھی　　بھونچال کیا تھا قدرتِ خالق کی بات تھی
دریا و کوہ، شہر و بیاباں ہلا دیا،
اک آن میں ہلا دیا اور پھر تھما دیا

تھی آدھی رات جب ہوا بھونچال کا گزر　　پتّا سا تھرتھرا گیا، پتال کا جگر
ساتوں طبق کے ہل گئے سُکّان سربسر　　در بولے الحفیظ تو دیواریں الحذر
دریا و کوہ، شہر و بیاباں ہلا دیا
اک آن میں ہلا دیا اور پھر تھما دیا

اجزائے ارض قاف سے تا قاف ہل پڑے　　اجگر اچل اٹل کے کلیجے اوگل پڑے
انساں گھروں میں، دشت میں وحشی نکل پڑے　　طایر بھی آشیانوں میں اپنے اُچھل پڑے
دریا و کوہ، شہر و بیاباں ہلا دیا،
اک آن میں ہلا دیا اور پھر تھما دیا

گڑھ، کوٹ، قلعہ، روئے زمیں پر دہل گئے　　کانپیں انگیں، بُرج، کنگورے بھی ہل گئے
سنگیں محل مکان تھے، سو وہ بھی اُدھل گئے　　اینٹوں کے زہرہ پھٹ گئے، پتھر پگھل گئے
دریا و کوہ، شہر و بیاباں ہلا دیا
اک آن میں ہلا دیا اور پھر تھما دیا

باہر کواڑ لڑ گئے، زنجیریں ہل پڑیں — کڑیاں کڑک کڑک کے چھتوں سے نکل پڑیں
چھجے، ستون کانپنے، منڈیریں دہل پڑیں — دیواریں جھوم جھوم کے پنکھا سی جھل پڑیں

دریا و کوہ، شہر و بیاباں ہلا دیا
اک آن میں ہلا دیا اور پھر تھما دیا

گھر گھر میں شور ہوگیا اور غل گلی گلی — روئے زمیں پہ پڑ گئی اکدم میں کھلبلی،
کوئی اللہ اللہ کہہ اٹھا، کوئی علی علی — کوئی یا حسین کہہ اٹھا، کوئی رام رام جی

دریا و کوہ، شہر و بیاباں ہلا دیا
اک آن میں ہلا دیا اور پھر تھما دیا

لرزہ میں آ کے ڈالیاں نخلوں کی ہل گئیں — دہشت سے جل بچل ہو جڑیں بھی کچل گئیں،
تھرائے گاو ماہی کی چولیں ادسل گئیں — جل تھل کے ہوش اڑ گئے، رگیں نکل گئیں

دریا و کوہ، شہر و بیاباں ہلا دیا
اک آن میں ہلا دیا اور پھر تھما دیا

تھیں جتنی جتنی اصلِ زمین کی رسائیاں، — ایک زلزلہ نے سب وہ پکڑ ہل ہلائیاں
بھونچال نے یہ جیسی ہوائیں دکھائیاں — ایسی ہزاروں اس کی ہیں قدرت نمائیاں

دریا و کوہ، شہر و بیاباں ہلا دیا
اک آن میں ہلا دیا اور پھر تھما دیا

بھونچال کی دھمک کا وہ سنتے ہی کڑکھڑا — جی ہیبتوں میں آ گیا اور دم نکل چلا
اوروں کے دل کی کیا کہوں، جانے وہی خدا — پر میں تو جانا صورِ سرافیل پھنک گیا

دریا و کوہ، شہر و بیاباں ہلا دیا
اک آن میں ہلا دیا اور پھر تھما دیا

قدرت کی تیغ کی ہے یہ کچھ آب دردری — کھنچتے ہی جس کے پڑ گئی سینہ میں تھرتھری
دارائی کام آئی نہ یاں کچھ سکندری — اکدم میں تھرتھرا گئی سب خشکی و تری

دریا و کوہ، شہر و بیاباں ہلا دیا
اک آن میں ہلا دیا اور پھر تھما دیا

اعترافِ نظیر

اے نظیرِ بے نظیر و شاعرِ فطرت نگار — بے خزاں ہے تیرے گلزارِ تخیل کی بہار

فرشِ انجم ہے تری فکرِ رسا کی راہ میں — دیر اور کعبہ برابر ہیں تری درگاہ میں

فرقِ این و آں روا رکھتا نہیں تیرا شمار — جیسے فطرت کی حقیقت کا ہے تو ہی راز دار

سرد رو ذرات سے ذوقِ نظر لیتا ہے تو — گلشنوں سے مرہمِ داغِ جگر لیتا ہے تو

مدحِ فطرت گرچہ میرا مستقل مضمون ہے — میری فکرِ شعر کی طفلی تری ممنون ہے

کارواں تیرا اندھیرے کی طرف چلتا نہیں — جذبۂ نفرت تری تخئیل میں ملتا نہیں

کرشن کی بنسی کی تانوں پر بھی جھوم اُٹھتا ہے تو — اور موذن کی اذانوں پر بھی جھوم اُٹھتا ہے تو

سوئے طوفاں تیرا رنگیں بادباں اُٹھتا نہیں — تیرے سینے سے تعصب کا دھواں اُٹھتا نہیں

انجمن میں تیری شیخ و برہمن سب ایک ہیں — خار و گل سب ایک ہیں دشت و چمن سب ایک ہیں

نبض میں کانٹوں کی دوڑاتا ہے تو خونِ گلاب — خود اُلٹ دیتی ہے تیرے سامنے فطرت نقاب

فی الحقیقت تو ہے نباضِ جہانِ رنگ و بو — کاسۂ خورشید انجم ہیں ترے جام و سبو

زندگانی زمزمے گاتی ہے تیرے ساز پر — بربطِ زہرہ کا دھوکا ہے تری آواز پر

خود ہے تو اپنی کتابِ دل کے ہر اک باب میں — ہیں مقدس مستیاں تیری شرابِ ناب میں

تیری فطرت شاعرانہ کجبگی سے دور ہے — تیرا دل شمعِ خودی کے نور سے معمور ہے

تو نے درباروں میں فرعونی کا گن گایا نہیں — تیری غیرت نے بھِک کر ہاتھ پھیلایا نہیں

دے سکے دھوکا نہ تجھکو سکّہ ہائے سیم و زر — جانبِ رفعت رہے مائل ترے قلب و جگر

گم رہی ظلمت تری شمعِ عمل کے سامنے — سر نہ تیرا جھک سکا اہلِ دول کے سامنے

زر کا جادو تیرے دل پر بے اثر ثابت ہوا — جب تجھے پرکھا تو مردِ باخبر ثابت ہوا

ہے حریفِ دورِ گردوں دورِ پیمانہ ترا
مدتوں تک وقت دہرائے گا افسانہ ترا

احسان دانش

تاریخ انتقال نظیر اکبرآبادی

نظیر اکبرآبادی کو انتقال کئے ہوئے (۱۱۲) برس ہو چکے۔ ربع صدی قبل تک اُن کی تاریخی شہرت بہت محدود رہی۔ اُن کے جاننے والوں میں بڑا حصہ عوام الناس کا ہے۔ خواص شعرا اور مستند ادبا میں اُن کا تذکرہ بہت معمولی انداز سے کیا جاتا اور جُہلا یا بازاری فقرا کے شاعروں میں اُن کا شمار ہوتا۔

خدا رحمت کرے پروفیسر شہباز پر، جنھوں نے خیالی اور اجمالی سوانح عمری لکھکر اُنھیں زندہ کیا اور مشہور نام رہیا جناب مخمور اکبرآبادی جن کی بدولت روحِ نظیر کو بقائے دوام حاصل ہوئی۔ جنوری ۱۹۴۰ء کا "نگار" پھر اُن کی ایک پائدار یادگار قایم کر رہا ہے یقین ہے کہ ان کارناموں کے بعد مرحوم نظیر کم نظری کا شکار نہ ہوں گے۔

نظیر اکبرآبادی کو کم حیثیت اور کم لیاقت شاعر سمجھنا کوتاہ فہمی ہے۔ وہ اپنے زمانے میں بھی وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے اور اس زمانے میں بھی بلند مرتبت سمجھے جاتے ہیں۔ کسی شاعر کو کسی خاص رنگ کی وجہ سے زمرۂ شعرا سے خارج نہیں کیا جاسکتا۔ ہر شاعر کا انداز، ہر شاعر کا مذاق، اکثر اور بیشتر اپنے ماحول اور زمانے کا تابع ہوتا ہے۔ جس موضوع اور تخیل میں وہ اپنی فکر کی جولانی دکھاتا رہتا ہے اور جس رنگ میں وہ پختگی پیدا کر لیتا ہے وہی اُس کی طرز خاص بن جاتی ہے اور اُسی کی بدولت وہ صاحب طرز کہا جاتا ہے۔ نظیر اپنی حقیقت نگاری اور سادہ کاری میں بے نظیر ہیں اُنکی شاعری کو ڈنڈوں پر گانے والی شاعری سمجھکر ذلیل سمجھنا ذی وقار شاعروں اور ادیبوں کے لئے موزوں نہیں۔ وہ اپنے عہد کے مسلّم مقبول شاعر تھے اور عوام الناس ہی نہیں، خواص الناس بھی اُن کو بہترین شاعر مانتے تھے۔

میرے جدِ امجد اور مرزا غالب کے معتقد علیہ حضرت سید شاہ صاحب عالم مارہروی ایک مرتاض اور ممتاز بزرگ تھے اور شاعری سے بحدِ کمال شغف رکھتے تھے، اگرچہ اُن کی عمر گوشہ نشینی اور عزلت گزینی میں گزری مگر حکمائے اشراقیین کی طرح ایک عالم پر اُن کی نظر رہتی۔ نظیر اکبرآبادی کی رحلت کے وقت وہ اپنی عمر کے ۲۵ مراحل طے کر چکے تھے۔ عام اصنافِ سخن کے علاوہ بخصوصیت تاریخ گوئی میں بھی بلند پایہ رکھتے تھے۔ جس سال نظیر کا انتقال ہوا ہے اُسی سال دو اور مشہور بزرگوں نے وفات پائی۔ حضرت صاحب نے تینوں مرحومین کے لئے ایک ساتھ (سوانحِ غم آگیں) سے تاریخ نکالی

جو نظیر کی شہرت کا ایک معمولی مگر بین ثبوت ہے۔ اس موقع پر کہ اُن کی یادگار میں نگار کا نظیر نمبر نکل رہا ہے اس تاریخ کا شایع ہونا بے موقع نہ ہوگا۔ وہو ہذا۔

راقم احسن مارہروی

آں شیخ نظیر اکبر آباد　　در ریختہ صاحبِ مضامیں
اشعار، خوشش بود سراسر　　بر طرزِ جدید و تازہ آئیں
بر طبعِ بلیغ او بود ختم　　حُسنِ تجنیس و لطفِ تزئیں
واں اعظم میر بلگرامی　　آں سیدِ باوقار و تمکیں
ذاتش بہ برادرانِ خمسہ　　بود است بزرگوارِ دیریں
یک طور نمودہ زندگانی　　عمرش بگزشتہ از ثمانیں (۸۰)
واں خواجۂ نقشبند دہلی　　با طبعِ لطیف و وضعِ شیریں
از حضرتِ عمِّ ما کہ نامش　　مشہور بود ز ہند تا چیں
یعنی آں شاہِ آلِ احمد　　ممدوحِ اکابر و اساطیں
ہم یافتہ خرقۂ خلافت　　ہم کردہ حصولِ فیضِ تلقیں،
ایں جملہ شدند راہیِ خلد　　یکبارہ بہ رخشہا زدہ زیں

بہرِ ایں واقعات تاریخ
گردیدہ — سوانحِ غم آگیں،
۳۴۶ ۱۲ ۵

ہفت روزہ "غنچہ" کا سالگرہ نمبر

دیکھنے کی چیز ہوگا جو جنوری سنہ ۱۹۴۰ء کے پہلے ہفتہ میں شایع ہو رہا ہے، اسکے مضمونوں، نظموں اور کارٹونوں وغیرہ میں بچوں کی دلچسپی اور فایدہ کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے، اس کے علاوہ اس میں آرٹ پیپر پر متعدد دلچسپ تصاویر بھی شایع ہوں گی۔ سالگرہ نمبر کی علٰحدہ قیمت چار آنہ ہوگی لیکن مستقل خریداروں سے اس کی الگ قیمت نہیں لیجائے گی۔ اس لئے اگر آپ غنچہ کے مستقل خریدار نہیں ہیں تو اب فوراً بنجائیے تاکہ یہ شاندار سالگرہ نمبر آپ مفت حاصل کر سکیں۔ ایجنٹ صاحبان اور مشتہرین حضرات جلد توجہ فرمائیں۔

منیجر "غنچہ"، بجنور (یو-پی)

ملاحظات

نظیر نمبر کے مقالہ نگار

جسوقت مینے نظیر نمبر شایع کرنے کا ارادہ کیا، تو اس وقت یہ بھی جایزہ لیا کہ کن کن حضرات کو اس سے دلچسپی ہو سکتی ہے اور ملک کے کون کون سے ادیب و نقاد اس کو "درخورِ اعتنا" سمجھیں گے۔

چونکہ اتفاق سے جناب لطیف اکبرآبادی (جن کا ایک نہایت پاکیزہ مقالہ نظیر کی شاعری پر اس سے قبل شایع ہو چکا تھا) میرے ہی پاس مقیم تھے اس لئے انکے مشورہ سے چند عنوانات تجویز کئے گئے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہ کس عنوان کے لئے کس کو زحمتِ تحریر دیجائے یہ اشاعت اسی خیال کا نتیجہ ہے، جس کی تحریک سب سے پہلے جناب لطیف کے مضمون سے ہوئی تھی اور اس کے انجام کو بھی میں حقیقتاً انھیں کا احسان سمجھتا ہوں —— جناب لطیف نے خود بھی ایک مقالہ لکھا، دوسروں کو بھی اس طرف توجہ دلائی اور سب سے بڑی بات یہ کہ انھیں کی وساطت سے نظیر کا غیر مطبوعہ کلیات اور اسکی بعض فارسی تصانیف سے استفادہ کا موقعہ ملا۔ نظیر کی تصویر جناب سید عابد حسین صاحب ساکن شاہ گنج آگرہ کا عطیہ ہے اور دستخطی تحریر جناب انتظام اللہ صاحب شہابی اکبرآبادی نے مہیا کی ہے۔ لیکن تصویر چونکہ بہت بوسیدہ ہو چکی تھی اس لئے جناب تسکین عابدی نے اس کو اُبھار کر اور نقش میں ضروری سائے ڈالکر از سرِ نو جان ڈالدی۔ جناب تسکین، حیدرآباد کے ایک نوجوان ہیں جو خوش فکر ادیب بھی ہیں اور نازک قلم نقاش بھی۔ آپ روغنی، آبی اور پنسلی ہر قسم کے نقوش طیار کرتے ہیں اور نہایت پاکیزہ سلیقہ کے ساتھ۔

پہلا مقالہ میرا ہے، اس میں زیادہ تر نظیر کے تغزل کو پیش کیا گیا ہے کیونکہ یہی چیز نگاہوں سے مخفی تھی اور غالباً نظیر کے آخر حصۂ عمر کا کارنامہ ان کی غزلیں ہی ہیں۔ یہ میں نے اس لئے کہا کہ نظیر نے جس نظم میں خود اپنی شبیہ پیش کی ہے وہ اس وقت کی لکھی ہوئی ہے جب وہ بوڑھے ہو چکے تھے چنانچہ تحریر فرماتے ہیں:

وضع سبک اس کی تھی، تپسیہ نہ رکھتا تھا ریش
مونچھیں تھیں اور کانوں پہ پٹے بھی تھے پنبہ سان

پیری میں تھی جس طرح اُس کو دل افسردگی
ویسی ہی تھی اُن دنوں، جن دنوں میں تھا جواں

اور اسی نظم میں ایک شعر یہ بھی ہے:

فردِ غزل کے سوا، شوق نہ تھا کچھ اسے
اپنے اسی شغل میں رہتا تھا خوش ہر زماں

ظاہر ہے کہ نظیر کا یہ شعر ان کی ساری عمر کے مشغلہ پر منطبق نہیں ہو سکتا، کیونکہ انھوں نے نظمیں بھی بکثرت لکھی ہیں اور اسلئے اسکی تاویل صرف یہی ہو سکتی ہے کہ آخر عمر میں شاید وہ صرف غزلیں کہا کرتے تھے۔ بہرحال مینے ان کے تغزل پر اس لئے زیادہ زور دیا کہ پبلک کے لئے یہ بالکل نئی چیز ہے اور ساتھ ہی ساتھ ان کی بعض غیر مطبوعہ نظموں کا انتخاب بھی پیش کر دیا تاکہ ان کی "ہمہ رنگی" سامنے آجائے —— دوسرا مضمون جناب مجنوں گورکھپوری کا ہے جس میں انھوں نے نہایت قابلیت کے ساتھ نظیر

کی شاعری کی حقیقی روح کو ظاہر کیا ہے اور وہ یہ کہنے میں بالکل حق بجانب ہیں کہ نظیر ہندوستان کا پہلا شاعر تھا جس نے غزل کی عام روش سے ہٹ کر نظم نگاری کی بنیاد ڈالی اور واقعیت و جمہوریت سے ہماری شاعری کو آشنا کیا ـــ تیسرا مقالہ جناب لطیف کا ہے جس میں انھوں نے نظیر کے نہ صرف شاعرانہ بلکہ اخلاقی مسلک کو پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ اس کی شاعری کا ارتقاء وہ بلند تصوف تھا جہاں انسان، "زائیدۂ لانہایت" نظر آتا ہے ـــ چوتھا مقالہ جناب مخمور کا ہے، جس میں انھوں نے نہ صرف ایک اچھے نقاد بلکہ نظیر کے ہموطن ہونے کا بھی پورا حق ادا کر دیا ہے۔ جناب مخمور روح نظیر میں بھی "مصنف آبحیات" کے ساتھ رعایت کر گئے تھے اور اس مقالہ میں بھی انھوں نے اس گرہ کو نہیں کھولا کہ آزاد نے کیوں نظیر کی شاعری پر ایسی غیر شاعرانہ رائے ظاہر کی۔ خیر شیفتہ کے متعلق تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ سوائے تغزل کے ان کو اصناف نظم میں کسی اور چیز سے دلچسپی نہ تھی، اسی لئے انھوں نے نظیر کو سوقی شاعر کا خطاب دیدیا، لیکن آزاد کی نسبت تو سوائے اس کے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کا ذوقِ شعری نہایت ناقص تھا اور ان کی ہر تصنیف سے اس فطری خامی کا پتہ چلتا ہے۔ لیکن شاید مخمور صاحب کو یہ کہنے کی ہمت نہ ہوئی۔

نظیر کی فارسی تصانیف پر جو مقالہ لکھا گیا ہے اس سے مقصود یہ ہے کہ نظیر کی فارسی دانی کا علم بھی لوگوں کو ہو جائے۔

اس کے بعد جناب اختر ارینوی اور جناب احتشام حسین صاحب رضوی کے مقالے ہیں اور دونوں اپنی اپنی جگہ داد سے مستغنی ہیں۔ کیا خوب بات کہی ہے جناب اختر نے کہ نظیر کی شاعری کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ زندگی کی تہوں میں اپنی جڑیں پھیلائے ہوئے ہے اور کتنا صحیح نقد کیا ہے جناب احتشام نے کہ نظیر کی شاعری فرضی تخیلات سے بہت بلند واقع ہوئی ہے اور اس کی دنیائے عشق و محبت میں تخیلِ محض کی بھیانک بلند پروازیاں بالکل نہیں پائی جاتیں۔

جناب سیماب بعض ذاتی افکار کی وجہ سے اپنا مقالہ زیادہ کاوش کے ساتھ تیار نہ کر سکے اور یہی وجہ ہے کہ نظیر کے متعلق ان کی رائے "زیادہ سوچی سمجھی ہوئی رائے" کی حیثیت نہیں رکھتی ـــ جناب سیماب نے بعض اُن الفاظ کا ذکر کرتے ہوئے جو اب متروک ہیں اور نظیر کے عہد میں استعمال کئے جاتے تھے تحریر فرمایا ہے کہ "نظیر نے جو زمانہ پایا ہے اُس میں ان الفاظ کا استعمال زیادہ قابلِ اعتراض نہیں"۔ اس سے مراد ان کی یہ ہے کہ ایک حد تک قابلِ اعتراض ضرور ہے۔ لیکن کیوں؟ اس کی کوئی وجہ تحریر نہیں فرمائی۔ نظیر کے زمانہ میں ان کا استعمال جائز بھی ہونا اور ناقابل اعتراض بھی نہ ہونا، عجیب و غریب منطق ہے۔

فاضل مقالہ نگار نے نظیر کی شاعری میں بعض فنی و لسانی غلطیاں بھی بتائی ہیں، لیکن جیسا کہ خود انھوں نے ظاہر کیا ہے نظیر "عوام کی زبان پر چڑھے ہوئے الفاظ اپنی نظموں میں اسی تلفظ و لہجہ کے ساتھ دانستہ لاتے تھے جو عوام کا محاورہ تھا"۔ علاوہ اس کے بعض غلطیاں نظیر کے یہاں ایسی پائی جاتی ہیں جن سے اسوقت کے بڑے بڑے اساتذہ بھی محفوظ نہ تھے۔ خصوصیت کے ساتھ ح - ع - ہ - ر - کا تقطیع سے گرنا کہ اُردو فارسی کے اکثر اساتذہ اس کی پرواہ نہ کرتے تھے۔ پروفیسر شہباز نے "زندگانی بے نظیر" میں کافی مثالیں اساتذہ کے کلام سے اس کے ثبوت میں نقل کی ہیں۔

جناب سیماب نے ایک اعتراض یہ بھی کیا ہے کہ "نظیر کی بعض نظمیں جذباتی نقطۂ نگاہ سے مطلق عریاں اور یکسر حیا سوز بھی ہیں"

"جذباتی نقطۂ نگاہ" کی تعیین میری سمجھ میں نہیں آئی۔ کیا ان کے نزدیک فنی ولغوی حیثیت سے عریانی نہیں ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو پھر "جذبات کی عریانی" کیا بطور نتیجۂ نظم یا "افکار خوانی" معلوم کی گئی ہے۔ بہر حال فاضل مقالہ نگار کا جو مدعا بھی ہو، میں اسکے ماننے کے لئے طیار نہیں کہ نظیر کی عریانی کو تو "مطلق عریاں" و "یکسر حیا سوز" کہکر ان کے درجۂ شاعری کو گرایا جائے اور سعدی و میر وغیرہ ایسے اساتذہ کے کلام کی عریانی کو "مطلق" "نہ دیکھا جائے" اور "یکسر" نظر انداز کردیا جائے۔

"عریانی" انسانی زندگی کا ایسا جزو لازم ہے کہ کوئی بڑے سے بڑا انسان بھی اس کا دعویٰ نہیں کرسکتا کہ اس کا جامۂ تقدس کبھی آلودہ نہیں ہوا، البتہ فرق یہ ہے کہ نظیر کا ظاہر و باطن یکساں تھا وہ جب عریاں ہوتا تھا تو عریاں کہتا بھی تھا، برخلاف ان بہت سے شعراء کے جن کی خلوت وجلوت میں سیاہ و سفید کا فرق ہوتا ہے، لیکن ان کی ریاکاری کبھی اس کی اجازت نہیں دیتی کہ شاعری میں وہ کبھی اپنی صحیح زندگی کو بھی پیش کریں۔ علاوہ اس کے یہ بھی قابل غور ہے کہ اگر نظیر نے چار نظمیں عریاں بھی ہیں تو ۴۸ ایسی بھی کہی ہیں جو "مطلق" اخلاقی ہیں اور "یکسر" "تصوف" اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ چار نظموں کو دیکھ کر تو عریاں کہدیا جائے اور چالیس کو سامنے رکھ کر اس کے درویش وصوفی ہونے پر حکم نہ لگایا جائے۔ معلوم ہوتا ہے، سیماب صاحب نے بجائے خُذ ماصفا کے خذ ماکدر کو معیارِ نقد مقرر کیا ہے۔

اس سے بھی عجیب تر بات حضرت سیماب نے یہ کی ہے کہ ان کو کثیر الکلام سمجھنا صرف حُسنِ ظن ہے اور ان کا کلام صرف اسی قدر ہے جتنا مطبوعہ کلیات میں پایا جاتا ہے، یعنی ۲۷ غزلیں، ۹۵ نظمیں، ۲۳ مسدس، ۲ ترکیب بند، ایک مستزاد، ایک مربع حالانکہ ان کا غیر مطبوعہ کلیات جو میرے پیش نظر ہے، مجموعہ ہے، ۲۰۲ غزلوں، ۴۸ نظموں، تین مستزاد اور ایک واسوخت کا۔ میں نے اپنے مضمون میں تمام تر غیر مطبوعہ کلام کا اقتباس دیا ہے، کیا سیماب صاحب کہہ سکتے ہیں کہ وہ نظیر کا نہیں ہے اور کیا وہ بھی "بعض شعراء کی نوزائیدہ ہائے فکر" کا نتیجہ ہے۔ افسوس ہے کہ اس کے رنگ تغزل کی بلندی کا اعتراف نہ کرکے، سیماب صاحب بھی نظیر پر وہی ظلم کرنا چاہتے ہیں جو شیفتہ اور آزاد نے روا رکھا تھا۔ اگر سیماب صاحب میرے مضمون کو پڑھنے کی زحمت گوارا فرمائیں گے تو یقیناً ان کو اپنی رائے بہت کچھ بدلنا پڑے گی۔

جناب آسی نے ہر چند نظیر کی زباندانی اور جزئیات نگاری پر بہت سرسری نگاہ ڈالی ہے، تاہم کام کی چیز ہے۔ میں جناب احسن مارہروی کا بھی شکر گزار ہوں کہ انھوں نے جناب سید شاہ عالم مارہروی کا ایک فارسی قطعہ بھیجکر بزم نظیر میں حصہ لینے کی زحمت گوارا فرمائی اور جناب احسان دانش کا بھی کہ انھوں نے "اعتراف نظیر" ایک عمدہ نظم مرحمت فرمائی۔ جناب سراج احمد صاحب علوی، جناب تمکین کاظمی اور جناب شنکر سروپ بھٹناگر کے مقالے دیر سے پہونچے اس لئے شایع نہ ہوسکے، تاہم ان کی توجہ کا شکر گزار ہوں۔

نیاز

نگار

ہندوستان کے اندر سالانہ چندہ پانچ روپیہ ششماہی تین روپیہ
ہندوستان کے باہر سالانہ چندہ آٹھ روپیہ یا بارہ شلنگ

ششماہی چندہ میں "نگار" کا جنوری نمبر
بوجہ اضافۂ ضخامت وقیمت شامل نہ ہوگا

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

ہمیشہ یاد رکھئے کہ پرچہ نہ پہونچنے کی اطلاع اگر اُسی مہینہ کے اندر نہ دی گئی تو آیندہ مہینہ کے اخیر تک پانچ پیسے کے ٹکٹ آنے پر دوبارہ روانہ ہوگا (کیونکہ ڈاک خانہ اب پچھلے پرچوں کا محصول پنچ گنا وصول کرتا ہے) اور اُس کے بعد قیمتاً یعنی ۸ر کے ٹکٹ وصول ہونے پر۔

مینجر "نگار"

جلد (۳۷)	فہرست مضامین فروری سنہ ۱۹۴۰ء	شمار (۲)

ملاحظات	اڈیٹر	۲
عہدِ قدیم کا انسان کیا نہ جانتا تھا	اڈیٹر	۹
کلام ماہر لکھنوی	ع۔ ن	۱۴
اپنے ایک اشتراکی دوست سے!	گلاب چند	۲۴
دنیائے آب کی کہانی	اڈیٹر	۳۱
بڑا گھر	شنکر سروپ بھٹناگر	۳۸
مخدوم کی شاعری	محبوب حسین (عثمانیہ)	۴۳
قصاص کی کرسی	اڈیٹر	۴۹
علم کی طیار کی ہوئی دوزخ	اڈیٹر	۵۲
مکتوبات نیاز	اڈیٹر	۵۵
جامعہ میں ایک مہمان کے ساتھ	فضل الدین اثر	۶۱
باب الاستفسار	اڈیٹر	۶۷
تنوعات	اڈیٹر	۷۶
منظومات	تمکین۔ فراق۔ نجم آفندی۔ خلیل اللہ قریشی۔ جگر۔ انجم۔ ابد۔ نبی احمد۔ بہار	۷۳

دفتر نگار سے ایک ہفتہ وار اخبار "جنگ" کا اجرا، اشتہار صفحہ ۸۰ پر ملاحظہ فرمایئے

جنگ کے آیندہ امکانات۔ (ملاحظات)

جنگ جہاں کہیں بھی ہو، خوفناک چیز ہے، لیکن یہ جنگ جتنی خطرناک ہے، اتنی ہی عجیب بھی ہے، اور "ہٹلر و اسٹالین" کے اتحاد نے، امکانات و قیاسات کی دنیا کو اتنا وسیع کر دیا ہے کہ ذہن انسانی مشوش ہو کر رہ گیا ہے اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ آیندہ کے متعلق کیا حکم لگائے

ہٹلر کے نقطۂ نظر سے

اسوقت قدرتاً ہر شخص کے دماغ میں یہ سوال چکر لگا رہا ہے کہ اس جنگ کا حقیقی مقصود کیا ہے اور روس کیوں یہ چاہتا ہے کہ جرمنی کامیاب ہو۔ بعض کا خیال ہے کہ گزشتہ اگست میں مابین روس و جرمنی ایک سمجھوتا یورپ کو دو حصوں میں تقسیم کر دینے کا ہو چکا ہے جس کا نام حسب بیان رابن ٹراپ، آر پلین (R. Plan) ہے

اس قیاس کے مطابق، یورپ کے موجودہ جغرافیہ میں جو تبدیلی یہ دونوں چاہتے ہیں اس کو آپ نقشہ میں دیکھئے یعنی فن لینڈ اور ناروے کی سرحدوں کے نقطۂ اتصال سے ایک سیدھا خط جنوب کی طرف بحرِ روم تک کھینچا جائے اور اس خط کے مشرق پر جتنے ممالک ہیں وہ روس کے زیر اثر آ جائیں اور مغربی جانب کے ممالک پر جرمنی کا اقتدار ہو جائے یعنی بالٹک ریاستیں، مشرقی پولینڈ، رومانیا، بلغاریہ اور یونان کا مشرقی حصہ، سوویٹ یونین میں شامل ہو جائے اور سویڈن، ناروے، ہنگری اور یوگوسلیویا اور مغربی یونان پر نازی حکومت کے اثرات قایم ہو جائیں

جن لوگوں نے یہ قیاس قایم کیا ہے وہ ثبوت میں یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ جرمنی کا روس کو اس بات کی اجازت دیدینا کہ وہ بالٹک ریاستوں اور فن لینڈ پر قبضہ کرے، بغیر اس سمجھوتے کے ممکن ہی نہیں کہ اس کے عوض جرمنی کا بھی کوئی حصہ مقرر ہو گیا ہو گا اور وہ حصہ "سویڈن و ناروے" ہو سکتا ہے یا ریاستہائے بلقان یا دونوں

اگر یہ کہا جائے کہ ہٹلر نے روس کے ان جارحانہ اقدامات کو صرف اس لئے منظور کیا ہے کہ وہ اس کے عوض روس سے خام پیداوار حاصل کریگا، تو یہ اس لئے درست نہیں ہو سکتا کہ اول تو روس کی خام پیداوار اتنی زاید نہیں کہ وہ کسی اور ملک کو فراہم کر سکے اور دوسرے یہ کہ جرمنی و روس کے درمیان ذرایع نقل و حرکت اس قدر خراب ہیں کہ جرمنی، روسی پیداوار سے کوئی فایدہ اٹھا بھی نہیں سکتا۔ اس لئے ظاہر ہے کہ جرمنی نے سودا کچھ اور ہی کیا ہو گا اور وہ سوائے ریاستہائے بلقان اور سویڈن، ناروے کے کچھ نہیں ہو سکتا

اس لئے اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جرمنی کا آیندہ قدم کیا ہو گا۔ جب تک فن لینڈ کا مسئلہ طے نہیں ہو جاتا اسوقت تک تو جرمنی یونہی خاموش بیٹھا رہیگا، لیکن روس جونہی خلیج فن لینڈ کو عبور کر کے ناروے کی سرحد تک پہونچے گا کہ بحیرہ بالٹک میں جرمنی کی فوجی نقل و حرکت شروع

وسویڈن اور ڈنمارک (ریاستہائے اسکنڈی نویا) کے خلاف شروع ہو جائے گی ظاہر ہے کہ یہ ممالک جرمن افواج کا مقابلہ نہیں کر سکتے، اسلئے ان کا بھی وہی حشر ہوگا جو بالٹک ریاستوں کا ہوا اور اس طرح بہت سی کار آمد معدنیں بھی جرمنی کے ہاتھ آجائیں گی اور بحر شمال میں وہ زیادہ آسانی سے ہلاکت پھیلا سکے گا

جب یہ ہو چکے گا تو پھر روس کی باری آئے گی اور وہ ریاستہائے بلقان کا رخ کریگا۔ جرمنی خاموش رہیگا یہانتک کہ روس کا پورا دباؤ ترکی پر پڑجائے اور جب جرمنی یہ دیکھ لیگا کہ ترکی کے اقدامات کو روس نے روک دیا ہے تو پھر وہ رومانیا، ہنگری اور یوگوسلیویا کو ہضم کرنے کیلئے دوڑ پڑیگا

اس سلسلہ میں سب سے بڑا سوال اٹلی کے رجحان کا ہوگا، لیکن بظاہر اس کی کوئی امید نہیں کہ وہ روس و جرمنی کا ساتھ دیگا، کیونکہ ان کے ساتھ دینے سے اس کو پانے کی اتنی توقع نہیں جتنا اندیشہ کھو دینے کا ہے اور اس لئے قوی امکان اس بات کا ہے کہ فرانس و برطانیہ کے ساتھ اٹلی، اسپین اور ہنگری، کا بھی معاہدۂ اتحاد ہو جائے گا۔ ہر چند یہ ضروری نہیں کہ یہ تمام حکومتیں لڑنے ہی کے لئے طیار ہو جائیں

اسٹالین کے نقطۂ نظر سے

دوسری جماعت کا مطالعہ بجز بزل فکر کی رائے کے مطابق ذرا اس سے مختلف ہے اور وہ اس جنگ کو جرمنی و اتحادیئین کی جنگ نہیں قرار دیتی بلکہ اشتراکیت و غیر اشتراکیت کی جنگ قرار دیتی ہے چونکہ روس سب سے بڑی بری حکومت ہے اس لئے وہ برطانیہ کو جو سب سے بڑی بحری قوت ہے، ہمیشہ حاسدانہ نگاہوں سے دیکھتی چلی آرہی ہے۔ علاوہ اس کے چونکہ روس، برطانیہ کو سرمایہ داری کا سب سے بڑا حامی بھی سمجھتا ہے، اس لئے دوسرا سبب عناد کا یہ بھی ہے

برطانیہ کے خلاف روس کی یہ برہمی لینن ہی کے وقت سے چلی آرہی ہے، جس نے کھلم کھلا اپنی پالیسی کا اعلان ان الفاظ میں کر دیا تھا کہ "لندن کا راستہ دہلی ہو کر گیا ہے" اور اب اسٹالین اس کی تکمیل جرمنی کے ساتھ شریک ہو کر کرنا چاہتا ہے

حقیقت یہ ہے کہ اسٹالین نے اتنی گہری پالیسی اختیار کی ہے کہ ساری دنیا اس کے دھوکہ میں آگئی ہے۔ کچھ عرصہ سے برطانوی مبرین یہ سمجھنے لگے تھے کہ اسٹالین نے انقلابی پالیسی ترک کر دی ہے اور اب وہ قدامت پرست جمہوریت کی طرف مایل ہوتا جا رہا ہے، حالانکہ یہ بالکل غلط ہے اسٹالین بدستور انقلابی پالیسی کا حامی ہے اور مقصد بر آری کے لئے وہ اپنے آپ کو بجائے سیاہ کے سفید دکھانا چاہتا ہے۔ ایکبار ۱۹۲۱ء میں لینن نے ظاہر کیا تھا کہ "اسوقت روس میں تو ہماری پوزیشن مضبوط ہے، لیکن اتنی طاقت ہم میں نہیں ہے کہ بین الاقوامی ملوکیت کا مقابلہ کر سکیں، اسلئے ہماری پالیسی یہی ہو سکتی ہے کہ موقعہ کا انتظار کریں۔" چنانچہ اس موقعہ کا انتظار ہوتا رہا یہاں تک کہ اب بوساطت جرمنی اس سے فایدہ اٹھانے کی کوشش ہو رہی ہے

یہ خیال کہ روس اشتراکی اصول کو ترک کرتا جاتا ہے، صحیح نہیں اور اکابر روس نے ہمیشہ اس کی تردید کی ہے، چنانچہ ۱۹۳۵ء میں وہاں کے سکریٹری جنرل ڈیمی ٹروو (Dimitroff) نے ایک تقریر کے دوران میں کہا تھا کہ:- "ہم پر یہ الزام قایم کیا جاتا ہے کہ ہم اشتراکی اصول سے ہٹتے جا رہے ہیں۔ لیکن یہ خیال کرنا کتنی بڑی حماقت ہے۔ ہم مارکس اور لینن کے صحیح پیرو ہو ہی نہیں سکتے جبتک موقعہ و محل کے لحاظ سے اپنی ترکیبوں میں تغیر و تبدل نہ کرتے رہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ہم بظاہر اشتراکی اصول سے ہٹتے ہوئے نظر آئیں، لیکن یہ بھی ہماری ترکیب ہوگی جس کے ذریعہ سے اشتراکی مقاصد کو پورا کیا جائے گا"

اب اسٹالین کی پالیسی پر غور کیجئے۔ اسٹالین اس خیال کو ظاہر کر چکا ہے کہ تجارتی مسابقت سے زیادہ کوئی چیز سرمایہ دار ممالک کو تباہ کرنے والی نہیں، اس لئے ان کو آپس میں لڑاتے ہی رہنا چاہئے۔ اپنے مقاصد کی توضیح کرتے ہوئے ۱۹۲۷ء میں اسنے ظاہر کیا تھا کہ "گزشتہ جنگ، جرمنی کو تباہ نہ کر سکی، بلکہ بغض و عناد کا بیج اس میں بو گئی اور فاتح قوموں کے خلاف ایسا شدید جذبۂ انتقام پیدا کر گئی جس کو دور کرنا ناممکن ہے۔ اسی کے ساتھ وہ یہ کتنا بڑا فایدہ پہونچا گئی کہ روس کی سرمایہ داری ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی، پھر کون کہہ سکتا ہے کہ آیندہ جو جنگ ہونے والی ہے اس کے نتایج ہمارے لئے اس سے بہتر نہ ہوں گے؟"

۲۴ اگست ۱۹۳۹ء کو روس کے مشہور اشتراکی اخبار پراوڈا (Pravda) نے اسٹالین کی اسی پالیسی کو دوسرے

الفاظ میں اس طرح ظاہر کیا تھا کہ :- "پہلی جنگ ملوکیت نے جب لوگوں کو اقتصادی تباہی میں مبتلا کیا تو اشتراکی انقلاب نے اسکا خاتمہ کیا اور اب اگر جنگ ہو گئی تو یورپ و ایشیا کی بہت سی سرمایہ دار حکومتیں انقلاب کا شکار ہونگی اور انکے سر سے بھی یہ عذاب دور ہوگا"

پراوڈا کے اس بیان پر ایک انگریز صحافی (Lancelot Lawton) نے لکھا تھا کہ "اگر پراوڈا کی یہ پیشین گوئی صحیح نکلی تو اسکے معنے یہ ہیں کہ سوویٹ جمہوریتیں، دریائے رھائن کے سواحل پر، بحر روم کے علاقوں اور مشرق بعید میں بھی قایم ہو جائیں گی اور یہ انجام بڑا دردناک ہوگا"

اسٹالین کے بیانات سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس سلسلہ میں سرمایہ دار حکومتوں سے کوئی بڑی لڑائی لڑنا نہیں چاہتا، چنانچہ ۱۰ مارچ ۱۹۳۹ء کی تقریر میں اس نے ظاہر کیا تھا کہ :- "ہم کو اس کا خیال رکھنا چاہئے کہ مبادا دوسروں کے بھڑکانے سے ہم آگ میں پھاند پڑیں اور دوسرے اس سے فایدہ اٹھائیں"

اسی قسم کا خیال کامریڈ مخلس (Mekhlis) نے ظاہر کیا تھا کہ "سرخ افواج کا مقصود تو صرف یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سوویٹ جمہوریتوں کی تعداد بڑھائی جائے، اور اس باب میں اسٹالین سے بہتر ناخدا اور کوئی نہیں ہو سکتا"

اس لئے اسٹالین کا ہٹلر سے مل جانا اس لئے نہیں ہے کہ وہ نازیت کو پسند کرتا ہے بلکہ اس لئے کہ وہ اس سے ڈرتا ہے۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ پولینڈ کے مسئلہ میں یورپین حکومتیں ضرور لڑیں گی اور آخر میں تباہ ہوں گی اور یہی وہ وقت ہوگا جب روس کو اپنی اشتراکیت پھیلانے کا موقعہ ملیگا۔ چنانچہ پولینڈ کے مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے وہاں کی اشتراکی جماعتوں نے فیصلہ کر دیا تھا کہ "ہمیں لڑائی سے علحدہ رہنا چاہئے، لیکن جب فریقین کمزور ہو جائیں تو ہمیں مداخلت کر کے انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کرنا چاہئے"

ہٹلر خود روس و جرمن اتحاد کا حامی تھا، اس کا یقین تو نہیں ہو سکتا، لیکن جب برطانیہ نے پولینڈ کی حفاظت کی ضمانت لیلی تو اس کے لئے چارۂ کار صرف یہی تھا کہ وہ اسٹالین کو ملائے۔ ہر چند وہ اسٹالین کو اپنا دوست نہیں سمجھتا اور جانتا ہے کہ اس کا کیا ارادہ ہے لیکن اسی کے ساتھ وہ اس سے بھی واقف ہے کہ روس کی فوجیں، جرمنی فوجوں کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتیں اور اگر اخیر میں اسٹالین سے جنگ کرنا پڑی بھی تو فیصلہ جرمنی ہی کے حق میں ہوگا

بہرحال اسٹالین و ہٹلر کا اتحاد جو نوعیت بھی رکھتا ہو، اس میں کلام نہیں کہ روس ابھی تک فایدہ ہی فایدہ میں ہے آدھا پولینڈ اس کو ملگیا، بالٹک ریاستوں پر اس کا قبضہ ہو گیا اور اگر فن لینڈ کو بھی اس نے فتح کر لیا تو بحر اطلانٹک کی طرف وہ برطانیہ کے لئے بڑے خطرہ کی چیز ثابت ہوگا

لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی غور کرنا چاہئے کہ فن لینڈ پر قبضہ کرنے کے بعد وہ کیا کرے گا؟ قیاس چاہتا ہے کہ اس کے بعد وہ کسی طرف اقدام نہ کریگا بلکہ لڑائی کا رنگ دیکھے گا۔ اگر اتحادیئن کو کامیابی حاصل ہوئی۔ (اور ظاہر ہے کہ اتحادیئن کی اس کامیابی کا سبب ناکہ بندی ہوگی) تو جرمنی کی اقتصادی حالت اتنی خراب ہو جائے گی کہ وہاں انقلاب پیدا کرنا آسان ہو جائے گا اور وہ جرمنی پر اسی آسانی کے ساتھ قابض ہو جائے گا جس آسانی سے پولینڈ اور ریاستہائے بالٹک پر قابض ہوا ہے اور جرمنی ایسے زبردست

ملک کا اشتراکی ہوجانا گویا سارے یوروپ کا اشتراکی ہوجانا ہے

اگر کامیابی نے جرمنی کا ساتھ دیا تو بیشک اسٹالین کی پوزیشن نازک ہو جائے گی، کیونکہ جرمنی کا مقابلہ کرنے کی ہمت اس میں نہیں ہے، علاوہ اس کے ایک بڑا سوال جاپان کا بھی ہے جو اسے جرمنی سے علحدہ نہیں کرسکتا۔

فرض کیجئے کہ برطانیہ کو شکست ہوئی تو کیا جاپان خاموش بیٹھا رہے گا اور اس کو تنہا فایدہ اُٹھانے دیگا، ہرگز نہیں، وہ فوراً جزایر فلپائن، ہانگ کانگ، فرانسیسی انڈوچائنا اور جزیرہ نمائے ملایا پر قبضہ کرکے برما اور ہندوستان کا رخ کرے گا اور پھر اس وقت روس، بغیر جرمنی کی مدد کے جاپان کو ہندوستان کی طرف بڑھنے سے نہیں روک سکتا۔

بلقانی ریاستوں کو سامنے رکھ کر آپ نے بحث کے دو پہلو مطالعہ کرلئے، لیکن ایک تیسرا پہلو اور بھی ہے، وہ یہ کہ اس جنگ کا اثر ریاستہائے بلقان پر کیا پڑے گا اور سیاسی و اقتصادی نظر سے فریقین کے وہ کونسے اغراض ان ریاستوں سے وابستہ ہیں جو استحوان جنگ ثابت ہوسکتے ہیں

ریاستہائے بلقان (یعنی ہنگری، رومانیا، یوگوسلیویا، بلغاریہ) کا جائزہ وقوع ایسا ہے کہ نہ جرمنی اُن سے بے نیاز ہوسکتا ہے اور نہ وہ جرمنی سے۔ کیونکہ ان ریاستوں کی خام پیداوار کا نصف حصہ جرمنی ہی کے کام آتا ہے اور جرمنی کی صنعتی ترقیاں رُک جائیں اگر یہاں سے لوہا، تانبہ، تماکو، لکڑی اور پٹرول وغیرہ کی برآمد بند ہو جائے۔ جرمنی یہ بھی پسند نہیں کرتا کہ یہ ریاستیں صنعت وحرفت میں ترقی کرکے بازاروں میں اپنی جگہ علحدہ پیدا کریں وہ چاہتا ہے کہ یہ ریاستیں صرف خام اشیاء پیدا کرکے جرمنی کی ضروریات کو پورا کرتی رہیں اور وہ ان ٹھوس کارآمد چیزوں کے عوض میں انھیں آئینہ، کنگھا، تیل، غازہ وغیرہ تکلفات کی چیزیں فراہم کرتا رہے وہ ان کو اپنی مستعمرات یا نوآبادیاں سمجھتا ہے اور یوروپ کی کسی اور سلطنت کا درخور یہاں گوارا نہیں کرسکتا۔ علاوہ اس اقتصادی سبب کے اس کی سیاسی اغراض بھی ان ریاستوں سے وابستہ ہیں

روس کے تعلقات، ریاستہائے بلقان سے اقتصادی نہیں ہیں کیونکہ خام پیداوار کی خود اس کے یہاں بھی کمی نہیں، لیکن بلغاریا اور یوگوسلیویا کی سلافی آبادی سے اس کے جذباتی و روایاتی تعلقات بیشک دیرینہ ہیں، کیونکہ اُنیسویں صدی میں بلقان کی سلافی آبادی نے جب ترکی اور جرمنی کے چنگل سے آزاد ہونے کی کوشش کی تو روس ہی نے ان کی مدد کی تھی۔ علاوہ اسکے اس کا سیاسی تعلق بھی سرزمین بلقان سے کم نہیں ہے، کیونکہ اوکرائن، کریمیا اور قاف پر اس کا تسلط اسی وقت قایم رہ سکتا ہے جب بحر اسود (Black Sea) خطروں سے پاک رہے اور آبنائے باسفورس کا تعلق سرزمین بلقان ہی سے ہے

ہرچند قیام بالشویت کے بعد، روس کے اثرات بلقان میں کم ہوگئے ہیں، لیکن بلغاریہ اور یوگوسلیویا کی سلافی آبادیاں اسوقت روس کی طرف مایل ہیں اور اگر روس و جرمنی، دونوں بلقان کی طرف بڑھیں تو ہوسکتا ہے کہ کسی وقت یہاں کی سلافی آبادی، روس کی طرف مایل ہوجائے اور روس و جرمنی کے تعلقات اچھے نہ رہیں، لیکن اٹلی کا سوال اس سے زیادہ

اہم ہے اور وہ روس کا اقدام بلقان کی طرف کسی طرح گوارا نہیں کرسکتا۔ اٹلی بلقان سے دوگونہ تعلقات رکھتا ہے یعنی یہاں کی خام پیداوار بھی حاصل کرتا ہے اور بحر اڈریاٹک کے سواحل اور اپنے مستعمرات افریقہ کی حفاظت کے لئے بھی اس کے اثرات کا یہاں قایم رہنا ضروری ہے۔ اسی لئے اس نے سنہ ۳۹ء میں البانیہ پر قبضہ کرلیا کیونکہ البانیہ اور جزایر ڈوڈ کینز سے وہ ترکی اور یونان دونوں پر دباؤ ڈال سکتا ہے

اٹلی، بلقان میں اپنا قبضہ تو وسیع کرنا نہیں چاہتا، لیکن وہ یہ ضرور چاہتا ہے کہ بلقانی ریاستوں کا ایک اقتصادی بلاک ایسا بن جائے کہ جرمنی کا اقتصادی دباؤ اور روس کا سیاسی اثر وہاں نہ بڑھنے پائے۔ ہٹلر اور مسولینی میں باہم جو سمجھوتا ہوا تھا اس سے اٹلی کو (سوائے قبضۂ البانیہ کے) اور کوئی خاص فایدہ اسوقت تک نہیں پہونچا اور اب روس کے ساتھ جرمن تعلقات نے اس کو اور زیادہ مشتبہ کردیا ہے۔ وہ اس سے بھی ڈرتا ہے کہ روس کی مداخلت یہاں اشترا کی تحریک پیدا کردیگی جسے وہ اقتصادی وسیاسی دونوں حیثیتوں سے اپنے لئے نقصان رساں سمجھتا ہے

فرانس و برطانیہ کے تعلقات، بلقان میں زیادہ تر سرمایہ دارانہ رہے ہیں۔ انھوں نے زیادہ کوشش اس بات کی کی کہ یہ ریاستیں صنعتی ترقی زیادہ کریں اور جرمنی کو صرف خام پیداوار بھیجنے کا ذریعہ نہ بنی رہیں، لیکن اس میں بہت کم کامیابی ہوئی۔ کیونکہ جرمنی یہاں کی خام پیداوار کے عوض اپنے مصنوعات فراہم کیا کرتا ہے اور اسے یہاں بہت اچھا سودا سمجھا جاتا ہے، علاوہ اس کے یہاں کی خام پیداوار کی کھپت نہایت آسانی سے جرمنی میں ہوجاتی ہے اور دوسرے دور دراز ملکوں کو بھیجنے کی زحمت گوارا نہیں کرنا پڑتی

جرمنی نے بلقان میں اپنا اقتدار قایم کرنے کے لئے بعض سیاسی حربوں سے بھی کام لیا ہے، مثلاً اس نے یہ بھی کیا کہ ان ریاستوں میں جہاں کہیں جرمن آبادی یا جرمن نسل سے تعلق رکھنے والی آبادی پائی جاتی تھی اس کو آمادہ کیا کہ وہ اپنے مطالبات حکومت سے تسلیم کرائے اور اپنے جداگانہ حقوق حکومت سے حاصل کرے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نازیت کے جراثیم آہستہ آہستہ ہر جگہ پھیل گئے اور جرمن رائش کا خوف لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوگیا۔ چنانچہ اسوقت ۳۵ لاکھ جرمن آبادی، ہنگری، یوگوسلیویا، رومانیا اور سوویٹ یونین میں پھیلی ہوئی بتائی جاتی ہے

اس تحریک کا نتیجہ یہ ہوا کہ اور قوموں کو بھی اپنے افراد کے حقوق کا احساس پیدا ہوگیا، یعنی ہنگری بھی کہنے لگا کہ رومانیا اور یوگوسلیویا میں ۲۵ لاکھ ہنگیرین پھیلے ہوئے ہیں، بلغاریا بھی رومانیا میں اپنی بارہ لاکھ کی آبادی کا ذکر کرنے لگا، روس بھی سربیا میں اپنی دو لاکھ آبادی کی حمایت پر آمادہ ہوگیا اور اس طرح بلقان کی تمام ریاستوں میں انقلاب واختلاف کے جذبات پیدا ہوگئے چنانچہ ہنگری اور بلغاریا دونوں چاہتے ہیں کہ ان کا جتنا علاقہ رومانیا اور یوگوسلیویا نے لے لیا ہے وہ انھیں واپس ملجائے اور اگر بلقان پر جرمنی یا روس نے حملہ کیا تو ہنگری اور بلغاریہ کو بھی لالچ دلاکر وہ اپنے ساتھ ملالیں گے جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ فتح پولینڈ کے بعد ہی بلغاریا نے روس سے معاہدۂ تجارت کی گفتگو شروع کردی

یونان کی حالت البتہ ذرا مختلف ہے، کیونکہ اسے جرمنی کا اتنا خوف نہیں ہے جتنا اٹلی کا ہے ہر چند دونوں میں ایک نوع کا معاہدۂ اتحاد ہوچکا ہے لیکن یونان مطمئن نہیں ہے اور اسی لئے برطانیہ کا دامن نہیں چھوڑتا کہ اگر کسی وقت اٹلی نے حملہ کیا تو برطانیہ ہی اسے بچا سکتا ہے

ترکی، جسے اسوقت ریاستہائے بلقان کے لیڈر کی حیثیت حاصل ہے، بیشک فرانس و برطانیہ سے معاہدہ کرچکا ہے، لیکن اس معاہدہ کی نوعیت ایسی نہیں ہے کہ وہ روس و جرمنی سے جنگ کرنے پر بھی مجبور ہو۔ اگر روس نے بلقان پر حملہ کیا تو اتحادیین کے جہاز مجبور ہوں گے کہ وہ درۂ دانیال سے گزر کر اپنی فوجیں بلقان میں اُتاریں اور یہ وقت میرے خیال میں ترکی کے لئے بہت نازک ہوگا اور نہیں کہا جا سکتا کہ حالات اسے کیا پالیسی اختیار کرنے پر مجبور کریں گے

یہ ہیں وہ سیاسی پیچیدگیاں جن سے بلقانی ریاستیں اسوقت دوچار ہیں اور ان کا جو نتیجہ بھی ہو، لیکن تین باتیں بظاہر بہت کھلی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ایک یہ کہ فرانس و برطانیہ کا اثر وہاں وہ نہیں رہا جو اس سے قبل پایا جاتا تھا اور اس کی بڑی وجہ یہ کہ بلقانی آبادی کی حفاظت کی ذمہ داری جو برطانیہ کی طرف سے لی گئی تھی وہ پوری نہیں ہوئی اور ہٹلر نے جو دست درازیاں آسٹریا زیکوسلوویکیا اور پولینڈ پر کی ہیں ان کو دیکھ کر بلقانی ریاستیں بھی ڈر رہی ہیں کہ اتحادیین جب تک مدد دینے کا فیصلہ کریں اسوقت تک کہیں وہ ختم نہ ہو جائیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ روس کی مداخلت نے جرمنی کے اثرات کو جو یہاں پائے جاتے تھے بہت کم کر دیا ہے۔ اور اٹلی ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کرچکا کہ اسے کیا راستہ اختیار کرنا چاہئے۔ روس کے ساتھ مگر وہ کام نہیں کر سکتا اور جرمنی سے بھی وہ اس لئے خفا ہے کہ اس نے روس کو کیوں بلقان میں مداخلت کا موقعہ دیا۔ تیسری بات یہ ہے کہ بلقانی ریاستیں اب پوری طرح محسوس کر رہی ہیں کہ دول عظمیٰ میں سے کوئی ان کو تباہی سے نہیں بچا سکتا، جب تک وہ خود آپس میں اتحاد پیدا کرکے روس و جرمنی کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم نہ کریں — بہر حال دریائے ڈینوب کی وادیوں پر اسوقت جنگ کے بادل منڈلا رہے ہیں اور نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کس وقت برس پڑیں۔

تازہ خبروں سے معلوم ہوتا ہے کہ جرمنی کو پٹرول کی سخت ضرورت ہے اور وہ رومانیا کو مجبور کر رہا ہے کہ وہ اسے پٹرول فراہم کرے۔ ظاہر ہے کہ رومانیا پر حملہ کرنے کے لئے یہی اک بہانہ کافی ہے۔ اگر جرمنی نے حملہ شروع کر دیا تو روسی فوجیں یقیناً رومانیا کے مشرقی علاقہ (بسربیا) کی طرف بڑھیں گی لیکن پولینڈ کی طرح یہاں کامیابی آسان نہیں ہے، کیونکہ بلغاریہ، ہنگری اور ترکی اس کو کبھی گوارا نہ کریں گے اور پھر اٹلی اور یونان کو بھی اس آگ میں کودنا پڑے گا

رہا یہ سوال کہ اتحادیین اس صورت میں کیا کریں گے، اس کا بڑا انحصار اس امر پر ہے کہ مغربی محاذ کا اسوقت کیا رنگ رہتا ہے۔

عہدِ قدیم کا اِنسان کیا نہ جانتا تھا

آج دنیا کی علمی ترقیاں اور اصولِ اخلاق کی بلندیاں بہت حیرت انگیز نظر آتی ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس آسمان کے نیچے دنیا میں کوئی چیز نئی نہیں ہے اور عہدِ حاضر کے اکثر اختراعات و ایجادات کا سراغ تاریخ انسانی کے عہدِ ماضی تک پہونچتا ہے۔ آپ کو شاید یہ سنکر تعجب ہوگا کہ بڑے بڑے پہیوں اور دبا ؤ ڈالنے والے انجنوں کا اسٹیم کے ذریعہ سے حرکت میں لانا، عہدِ قدیم کے انسان کو بھی معلوم تھا اور طباعت و جلد سازی سے بھی وہ بخوبی واقف تھا۔

ولادتِ مسیح سے صدیوں پہلے، رُوم کے برتن بنانے والے روز کے استعمالی حروف بر ٹائپ کے ذریعہ سے اپنے نام نقش کر دیتے تھے، اور نویں صدی عیسوی میں اہلِ چین بلاک بنا بنا کر کتابیں چھاپا کرتے تھے۔

قدیم اسکندریہ میں، اشتہاروں کے لئے ستون نصب کئے گئے تھے اور انھیں پر اعلانات وغیرہ گوندسے چسپاں کئے جاتے تھے۔ روم میں بڑے بڑے تختوں کا بھی رواج تھا جن پر سیاہ و سرخ حروف میں اشتہارات تحریر کئے جاتے تھے۔

اُر کے کھنڈروں سے جو چیزیں دستیاب ہوئی ہیں، اُن سے ثابت ہوتا ہے کہ مسیح سے ساڑھے تین ہزار سال قبل عراق کی سُمیری آبادی ڈامر اور اسبستوس[۱] (Asbestos) کا استعمال جانتے تھے۔ اسی طرح کنکریٹ اور سیمنٹ کی عمارتیں بنانا بھی انھیں معلوم تھا۔

آگ بجھانے کا انجن مسیح سے ۲۰۰ سال قبل ہی یونان میں ایجاد ہوچکا تھا اور روم میں تو باقاعدہ آگ بجھانے والا بریگیڈ بھی تھا۔ قدیم دُنیا میں خود حرکت کرنے والی (Automobile) مشینیں بھی پائی جاتی تھیں، چنانچہ اسکندریہ کے معبد میں ایک ایسی مشین رکھی ہوئی تھی جس کے اندر سکہ ڈالنے سے مقدس پانی کی ایک مقدار از خود مل جاتی تھی۔ فراعنہ سے پہلے بطلیموسی خاندان کے زمانہ میں ایک مشین کا بنا ہوا آدمی طیار کیا گیا تھا۔ روم میں نہ ٹوٹنے والا شیشہ بھی لوگوں نے بنا لیا تھا جو ہتوڑوں کی ضرب سے بھی نہ ٹوٹ سکتا تھا، لیکن وہ طریقہ آج تک دریافت نہیں ہوسکا۔

---

[۱] ایک ریشہ دار معدنی چیز جو آگ کو قبول نہیں کرتی جیسے ابرک۔

سَن کا کپڑا طیار کرنا مصرِ قدیم کے نہایت ابتدائی عہد کے لوگوں کو معلوم تھا جس کا ثبوت مومیائی شدہ لاشوں کے لباس سے ملتا ہے۔ توریت میں جن لباسوں کا ذکر کیا گیا ہے اُن سے پتہ چلتا ہے کہ معبدوں کے پردے اور راہبوں کے لباس نہایت نفیس کپڑے کے ہوتے تھے۔ تین ہزار سال قبل کی مومیائی شدہ لاشوں کے کپڑوں میں اب بھی وہی نرمی پائی جاتی ہے اور اُن کا رنگ تو ایسا نظر آتا ہے گویا ابھی نیا تھان سامنے کھول کر رکھ دیا گیا ہے۔

افلاطون نے، پانی سے چلنے والی گھڑی میں ایک ٹیڑھی نلی لگا کر اس کو الارم کلاک بنا لیا تھا۔ جس وقت پانی اس نلی کی سطح تک پہونچتا تھا تو وہ دوسرے ٹیوب سے اتنی تیزی کے ساتھ گزرتا تھا کہ اس سے سیٹی کی آواز پیدا ہوتی تھی افلاطون نے یہ ایجاد اس لئے کی تھی کہ اس کے شاگردوں کو صبح چار بجے اس کا علم ہو جائے اور وہ اُٹھ بیٹھیں۔ ایک پانی سے چلنے والی گھڑی کا ہشت پہل مینار جو آخری صدی قبل مسیح میں طیار کیا گیا تھا، اب بھی پایۂ تخت یونان میں قایم ہے۔

خارجی گرمی پہونچا کر انڈوں سے بچہ نکالنے کا طریقہ قدیم مصریوں کو بھی معلوم تھا چنانچہ ان مشینوں سے بیک وقت سات سات ہزار انڈوں سے بچے نکالے جاتے تھے۔ ان مشینوں میں اُپلے یا بھوسے کی آگ سے گرمی پہونچائی جاتی تھی۔۔ وٹرو ویس (Vitruvius) نے جو پہلی صدی قبل مسیح میں پایا جاتا تھا، اس زمانہ کے آلہ لئے مکبر الصوت (Loud Speaker) کا ذکر کیا ہے جن کو Echea (یعنی آواز بازگشت کو قوی کرنے والا) کہتے تھے۔ یہ کانسے کے ظروف تھے جو تھیٹر کی دیواروں کے چھوٹے چھوٹے سوراخوں میں نصب کر دئے جاتے تھے، آواز ان سے ٹکرا کر بہت بلند ہو جاتی تھی اور بہت سریلی ہو کر سامعین کے کانوں تک پہونچتی تھی۔ اسی طرح کے آواز بڑھانے والے آلات اسٹیج کی طرف بھی ستونوں سے نصب کر دئے جاتے تھے تاکہ آواز کا تموج بڑھ جائے۔ یہ مختلف سایز کے ہوتے تھے اور اس طرح سُر میں ایک دوسرے سے گھٹا بڑھا کر ملائے جاتے تھے کہ اُن سے بالکل انسانی آواز پیدا ہو۔

فولاد کے نہایت عمدہ پھل بنانا بھی انھیں معلوم تھا، جس کا ثبوت تلواروں اور خنجروں کے پھل سے ملتا ہے۔ ان پر وہ کچھ نشانات بھی بنا دیتے تھے جو مٹتے نہ تھے۔ فولاد کو اس قدر سخت بنا دینے کا راز ابتک کسی کو معلوم نہیں ہو سکا۔ قدیم اہلِ ہند کے لوگوں کو معلوم تھا کہ زنگ نہ لانے والا لوہا کیونکر طیار کیا جاتا ہے، چنانچہ دہلی میں ساڑھے تین سو سال قبل مسیح جو لوہے کی لاٹ نصب کی گئی تھی وہ آج تک موجود ہے اور اس پر زنگ کا نام نہیں۔ یہ فن بھی ابھی تک دریافت نہیں ہوا۔ ہاتھی دانت کو اُبال کر نرم کرنا اور اس سے مجسمے طیار کرنا یہ فن بھی عہدِ قدیم کے انسان کو معلوم تھا جو ابتک ہمیں معلوم نہیں ہوا۔

قدیم روما میں مکانوں کو گرم رکھنے کے لئے یہ ترکیب کی جاتی تھی کہ گرم ہوا فرشِ مکان کے نیچے اور دیواروں کے اندر دوڑا دی جاتی تھی۔ چونکہ فرش اور دیواریں پتھر کی ہوتی تھیں اس لئے سردی میں ان کی ٹھنڈک بہت بڑھ جاتی تھی

اور اس کو دور کرنے کے لئے یہ ترکیب اختیار کی جاتی تھی۔

معبدوں میں عجیب وغریب میکانکی ترکیبوں سے کام لیا جاتا تھا، مثلاً قربانگاہ کی آگ سے یہ کام بھی لیا جاتا تھا کہ ہوا کو پھیلا کر نلوں کے اندر سے لیجاتے تھے اور مصنوعی چڑیوں کے اندر سے یہ ہوا گزر کر مختلف آوازیں پیدا کرتی تھی۔ سنگین بتوں میں حرکت بھی میکانکی طریقوں سے پیدا کی جاتی تھی۔ چنانچہ اسکندریہ کے معبد سراپیس کے گنبد میں ایک مقناطیس اس طرح رکھدیا گیا تھا کہ بت کے سر کو وہ کھینچتا تھا اور وہ بت اٹھ کھڑا ہوتا تھا۔ بہت سے معبدوں میں قربانگاہوں کے پتھر کے نیچے، ہوا کا خزانہ بنا رہتا تھا جس کا تعلق زیر زمیں نلوں کے ذریعہ سے ایک ایسے ظرف سے تھا جو پانی سے بھرا رہتا تھا۔ جب گرمی سے اس کا پانی جوش کھاتا تھا تو ایک دوسرے ظرف میں چلا جاتا تھا جو اس کے پاس ہی معلق رہتا تھا اور جب اس کا وزن بڑھ جاتا تھا تو پوشیدہ پہیوں کے ذریعہ سے مندر کا دروازہ کھولدیا کرتا تھا اور کوئی آواز پیدا نہ ہوتی تھی۔

مصر کے پوجاری علم مناظر و مرایا (Optics) سے بخوبی واقف تھے۔ جب کوئی شخص پوجا کرتا تھا تو مندر کی پشت کی دیوار پر دفعتاً بت کا چہرہ نمودار ہوجاتا تھا، اس کی ترکیب یہ تھی کہ بت کے سامنے ایک مقعر (Concave) آئینہ ہوتا تھا جس کے ذریعہ سے سامنے کی دیوار پر بت کا عکس پڑتا تھا۔

اپالو کے بت کا جلوس جس وقت باہر نکالا جاتا تھا تو وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اپنے تخت سے اٹھتا تھا اور پھر بیٹھ جاتا تھا۔ اس کی ترکیب یہ تھی کہ بت کھوکھلی لکڑی کا ہوتا تھا اور اس کے اندر گیس سے بھرا ہوا غبارہ رکھدیا جاتا تھا جو اسے ابھارتا رہتا تھا۔

صنعت وحرفت میں فیکٹری سسٹم اسوقت کی چیز بتائی جاتی ہے لیکن سنٹ آگسٹائن ہپو کا بشپ لکھتا ہے کہ عہد قدیم میں بھی یہ طریقہ رائج تھا اور ایک ہی چیز مختلف کاریگروں کے ہاتھ سے نکل کر تیار ہوتی تھی۔

پریسیڈنٹ روزولٹ صدر امریکہ کی یہ اقتصادی تدبیر کہ غلہ کے ذخیرے محفوظ رکھنا چاہئے تاکہ ضرورت کے وقت کام آئیں، پیغمبر یوسف کو بھی معلوم تھی، جنھوں نے مصر میں اس پر عمل کیا تھا۔ قدیم مصر میں غلہ کے مستقل کھتے رکھے جاتے تھے اور آجکل کی طرح غلہ کا تبادلہ غلہ سے، تقاوی، فصلوں کا بیمہ اور بھاؤ کی نگرانی سب وہاں پائی جاتی تھی اشیاء خوردنی کو محفوظ رکھنے کی ترکیب بھی انھیں معلوم تھی، چنانچہ اسوقت کی محفوظ کی ہوئی مچھلیاں ابتک اچھی حالت میں دریافت ہوئی ہیں۔ ان کو کپڑے میں لپیٹ کر صحرا کے آیوڈین (Iodine) ملے ہوئے پانی میں رکھدیتے تھے۔

ہیروڈوٹس، جو چوتھی صدی قبل مسیح میں پایا جاتا تھا، لکھتا ہے کہ امراء مصر اپنے ہاتھ میں Quartz (ایک قسم کا پتھر) کی چھوٹے چھوٹے گیند رکھا کرتے تھے تاکہ ہاتھ ٹھنڈے رہیں۔

برف بنانا یا برف سے چیزوں کو ٹھنڈا رکھنا بھی پچھلے لوگوں کو معلوم تھا۔ گڑھوں میں مٹی کے پیالے رکھکر برف جمانا قدیم اہل ہند کو معلوم تھا اور اسکندر اعظم کے زمانہ میں آسمانی برف کو دبا دبا کر گڑھوں میں بھر دیتے تھے اور عرصہ تک اس سے کام لیتے تھے۔ نیرو پہلا بادشاہ تھا جس نے شراب کو برف میں لگا کر ٹھنڈا کرنا رائج کیا۔ سنیکا اور پلوٹارک اب سے بہت پہلے نباتاتی اُصول کے عادی تھے اور رامسیس ثانی (فرعون مصر) نے ۱۲۵۰ قبل مسیح میں ایک مانع شراب نوشی لیگ قایم کی تھی۔

علاج کی غرض سے بجلی کا استعمال بھی عہد قدیم میں رائج تھا، چنانچہ دردِ سر میں ایک ایسی مچھلی کا استعمال ہوتا تھا جس کی برقی رو اعصاب میں سکون پیدا کر دیتی تھی۔ عمل جراحی کے لئے مردم گیاہ (Man Drake) بوٹی کھلا کر ایک انسان کو تین چار گھنٹے تک کے لئے بیہوش و بے حس بنا دیا جاتا تھا۔ مٹی کی تختیاں جو سواحلِ دجلہ سے دریافت ہوئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ۸۰۰ ق۔م، اسیریا کے ایک بادشاہ کا علاج مُلٹھی سے کیا گیا تھا بابل کے کھنڈروں سے ۱۵۰۰ سال قبل مسیح کی جو گلی تختیاں دستیاب ہوئی ہیں ان میں بخار کی مکھی کا ذکر پایا جاتا ہے جس سے مراد مچھر ہے۔ گویا یہ حقیقت انسانِ قدیم کی دریافت کی ہوئی ہے کہ مچھر سے فصلی بخار پھیلتا ہے۔

قدیم مصر میں آبپاشی کی نہروں کو گھاس وغیرہ سے صاف رکھنے کے لئے لقلق (ایک چڑیا بگلا یا سارس کے قسم کی) پالے جاتے تھے اور یونان میں طاعون کے چوہے فنا کرنے کی خدمت سانپوں کے سپرد تھی۔ بعض امراض کے ٹیکہ کا رواج قدیم ہندوستان اور چین میں پایا جاتا تھا۔

بدن کی مالش کے ذریعہ سے علاج ۴۰۰ سال قبل مسیح پایا جاتا تھا اور یونان کا ایک حکیم ۵۰ سال قبل مسیح میں علاوہ مالش کے سرد پانی، مینہ کے پانی اور ننگے پاؤں ریت پر چلانے سے بھی کیا کرتا تھا اور شاہ آگسٹس کا علاج ایک طبیب موسٰی نامے نے اسی طریقہ سے کیا تھا۔

زخمیوں کے لئے مصنوعی اعضا بھی طیار کئے جاتے تھے، چنانچہ ۲۱۸ قبل مسیح میں کیٹی لائن (Cateline) کے پردادا کے لئے جنگ قرطاجنہ میں ایک مصنوعی ہاتھ تیار کیا گیا تھا۔ انگلستان کے رایل کالج آف سرجنس میں ایک مصنوعی پاؤں ۳۰۰ سال قبل مسیح کا بنا ہوا رکھا ہے۔ قدیم ہند کے باشندے پلاسٹر سے مصنوعی ناک، ہونٹ اور کان بناتے تھے۔

رومہ و یونان کی قدیم تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ غدودوں کا علاج کوئی نئی چیز نہیں ہے، اور مریضوں کو جوش دیا ہوا پانی پلانا بھی انھیں معلوم تھا۔ ہیروڈوٹس لکھتا ہے کہ (Cyrus) شاہ فارس اپنے ساتھ ہمیشہ جوش دیا ہوا پانی چاندی کے برتنوں میں رکھا کرتا تھا، اسی طرح رومہ کا مشہور بادشاہ نیرو بھی ہمیشہ اُبلا ہوا پانی پیتا تھا۔

پمپائی میں بعض قدیم آلات ایسے دستیاب ہوئے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ عورتوں کے بعض امراض کا علاج آپریشن سے کیا جاتا تھا۔ یہ آلات لوہے کے ہیں، لیکن اس قدر تیز و صاف ہیں کہ آج بھی ان سے آپریشن کیا جا سکتا ہے۔ جولیس قیصر اپنی ماں کے پیٹ سے آپریشن کے بعد ہی پیدا ہوا تھا اور اسی لئے یہ آپریشن اب بھی اسی کے نام سے منسوب ہے اور اُسے (Caesarian Section) کہتے ہیں۔ چوتھی صدی قبل مسیح کے بعض کاسہائے سر ایسے ملے ہیں جن پر جراحی کے نمایاں نشانات موجود ہیں۔

سکندر اعظم کے زمانہ میں لاشوں کا پوسٹ مارٹم ہوتا تھا (اگرچہ ارسطو اسے پسند نہ کرتا تھا) مصر قدیم کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ دو ہزار سال قبل مسیح، موتیا بند کے آپریشن کا وہاں رواج عام تھا۔ بعض مومیائی شدہ لاشیں ایسی بھی ملی ہیں، جن کے دانت مصنوعی ہیں اور بعض کی آنکھیں بھی۔

بال اُگانے کے لئے رینڈی کا تیل دوسرے کسی تیل میں ملا کر اکثر استعمال کیا جاتا تھا۔ پہلی صدی عیسوی میں ڈاکٹر جانتے تھے کہ انسانی جلد پر سورج کی مصنوعی روشنی، بلور کے شیشے کے ذریعہ سے حاصل کی جا سکتی ہے اور محدب شیشوں کے ذریعہ سے بدن جل سکتا ہے۔

قدیم زمانہ میں ڈاکٹروں کو فیس بھی دی جاتی تھی، چنانچہ پلینی (Pliny) لکھتا ہے کہ شاہی طبیبوں کو علاوہ اُس فیس کے جو عام لوگوں سے ملتی تھی سالانہ ۲،۵۰ پونڈ ملا کرتے تھے اور روم کے مشہور طبیب (Galen) کی فیس ۵۰ پونڈ تھی۔

روحوں کو بلانا اور میز کا گردش میں لانا قدیم مصر میں بھی رائج تھا، مصر ہی سے یہ رسم یونان میں پہونچی اور پھر تمام عیسوی دنیا میں عام ہو گئی۔

حضرت موسیٰ سے بہت پہلے قوتِ مقناطیس سے کام لیکر خود اپنے آپ کو بیہوش کر لیتے تھے اور بعض بیماریوں کا علاج اسی عالم بیہوشی میں بتاتے تھے۔ سنٹ آگسٹائن کا بیان ہے کہ ایک پادری اپنے آپ کو ایسا بیہوش و بے حس بنا لیتا تھا کہ اس پر زخموں کا بھی اثر نہ ہوتا تھا اور اسی عالم میں وہ غیب کی باتیں بتایا کرتا تھا۔

ہمیشہ یاد رکھئے

کہ پرچہ نہ پہونچنے کی اطلاع اگر اُسی مہینہ کے اندر نہ دی گئی تو آئندہ مہینے کے اخیر تک پانچ پیسے کے ٹکٹ آنے پر دوبارہ روانہ ہوگا۔ (کیونکہ ڈاک خانہ اب پچھلے پرچوں کا محصول پنج گنا وصول کرتا ہے) اور اس کے بعد قیمتاً یعنی ۸ روپے کے ٹکٹ موصول ہونے پر۔

مینجر نگار

کلامِ ماہر لکھنوی

"طاقِ نسیاں" کی جستجو اکثر ایسے جواہر پاروں سے روشناس کرتی ہے جو "گردِ تغافل" کے تہ بہ تہ طبقوں میں پوشیدہ ہو گئے ہیں مگر دستِ طلب کی معمولی سی تحریک جب انھیں نمایاں کر دیتی ہے تو آنکھوں میں چکاچوند ہونے لگتی ہے۔

نواب مولوی میر مہدی حسین ماہر مرحوم انہی "جفا کشیدۂ روزگار" افراد میں سے ہیں جنھیں دنیا نے اُن کے بعد بھلا دیا اور ایسا کہ جیسے وہ کبھی تھے ہی نہیں۔

آج یہ اُن کی نہیں، ادب کی خوش قسمتی ہوگی کہ اُن کے کلام سے اربابِ ذوق کا تعارف ہو جائے اور معلوم ہو کہ خاک غفلت میں کیا صورتیں ہیں جو اب تک پنہاں ہیں۔

ماہر لکھنؤ کے مشہور "خاندانِ اجتہاد" کے ایک ممتاز فرد تھے، اس لئے اُن کے نام کے ساتھ مولوی لکھا جاتا ہے اور قدرت نے دنیاوی جاہ و جلال، مال و دولت عطا کیا تھا اس لئے نواب کہے جانے لگے۔

ابتدائی عمر میں عربی صرف و نحو اور ادبیات کی تحصیل کی اور معلوم نہیں کہاں تک پڑھا۔ تاج العلماء مولانا سید علی محمد (متوفی ۱۳۱۱ھ) سے مختصر معانی پڑھنے تک کا پتہ کتابوں سے چلتا ہے اس کے بعد شاعری کا ذوق پیدا ہوا اور منشی مظفر علی خاں اسیر کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہوئے اور برابر اُنھی کو اپنا کلام دکھاتے رہے۔ اس طرح ماہر کا ادبی سلسلہ صرف ایک واسطہ سے مشہور اُستادِ سخن مصحفی تک پہونچ جاتا ہے۔

یہ زمانہ وہ تھا کہ جب لکھنؤ کی شاعری میں رندانہ بے باکیوں کا دور دورہ تھا اور ابتذال کی فراوانی تھی۔ خود منشی اسیر کے ممتاز شاگرد امیر مینائی ایسے "مقدس" اور "مذہبی" انسان کا کلام "اچکوں" وغیرہ کی ایسی رکیک لفظوں سے خالی نہ رہا مگر حیرت ہوتی ہے یہ دیکھ کر کہ ماہر کا کلام اس طرح کے ابتذال سے بالکل پاک ہے۔

لکھنؤ کی شاعری کے خصوصیات انگیا چوٹی، کاجل، مسّی وغیرہ کا اُن کے یہاں پتہ بھی نہیں، اُنھوں نے اپنے لئے ایک دنیا ہی الگ بنائی تھی جہاں تمام کائنات عالم اُن کے سامنے تھی اور ہر ایک سے تشبیہات کے ذریعہ وہ بوقلموں نصائح و مواعظ اور مضامین کا خزانہ فراہم کرتے تھے۔

یہ وہ انفرادی رنگ ہے جس میں ماہر اپنی آپ مثال نظر آتے ہیں۔ اس کے اوپر سیر حاصل بحث بعد کو آئے گی

جہاں آپ کو کائنات عالم شاعر کے پیش نگاہ دکھلائی دے رہی ہوگی۔ ابھی دوسرے خصوصیات کو سُنئے جو عام طور سے شاعری کے محاسن میں سمجھے جاتے ہیں۔

ماہر کے کلام میں یہ خصوصیات نمایاں طور پر پائے جاتے ہیں :-

صفائی وسادگی۔ لطف زبان۔ محاورات۔ شوکتِ الفاظ۔ فارسی ترکیبوں کا اعتدال۔ مشکل پسندی۔ طنز۔ محاکات۔ ندرت اسلوب۔ جذبات کی تحلیل۔ منظر کشی۔ حکیمانہ وعظ و نصیحت اور اخلاقی شاعری۔

یہ وہ چیزیں ہیں جو شاعری کے اصل جوہر سے متعلق ہیں اور اس کے علاوہ تشبیہ۔ استعارہ۔ مراعات النظیر۔ طباق و تضاد ایہام تناسب وغیرہ وغیرہ جو شاعری کے خارجی زیور ہیں۔ انھوں نے ناسخ کے بعد اسے لکھنؤ کی شاعری میں اکثر مقصد اصلی کی حیثیت اختیار کرلی تھی مگر ماہر نے اُنھیں وہی ضمنی درجہ عطا کیا ہے جس کے مستحق ہیں۔

اب ہر ایک عنوان کے تحت میں کچھ اشعار ملاحظہ فرمائیے :-

صفائی وسادگی

ماہر کے کلام میں ایسے اشعار کثرت سے ہیں جن میں تکلف و تصنع کا لگاؤ نہیں معلوم ہوتا ہے شعر کہا نہیں گیا بلکہ الفاظ نے مجتمع ہوکر خود شعر کی شکل اختیار کرلی ہے۔ ملاحظہ ہو :-

میں عزیزوں سے بھلا ترکِ وفا کیا کرتا — خون میں خون ملا تھا تو جدا کیا کرتا
آپ بیٹھا ہوا زخموں پہ چھڑکتا ہوں نمک — اور اب مجھ سے محبت کا مزا کیا کرتا

ہم نے تو جان نذر دی، دل کو فدا کیا — اب تم بتاؤ چاہنے والوں سے کیا کیا

نہ پوچھو عشق نظریں کہ کیا گزرتی ہے — تڑپ رہا ہوں کلیجہ پر تیر کھائے ہوئے

اُنہی سے پوچھئے صدمہ اسیروں کی جدائی کا — کلیجے سے لگائے بیٹھے ہیں جو آشیاں میرا

جنازہ لا کے لحد پر پٹک دیا سب نے — میں بارِ دوش تھا، اک دفن بھی بہانہ ہوا

ہزاروں آپ کی ہوتیں ادائیں اُس میں بھی — بری بھی بات جو منھ سے نکل گئی ہوتی،

وہ دن خدا دکھائے کہ قاصد یہ دے خبر — لیجے وہ آپ آتے ہیں خط کے جواب میں،
مضمون پتے کے لکھ کے مجھے خوب بن پڑی — غصہ نکالنے وہ خود آئے جواب میں

جگر و دل کو تو کھوئے ہوئے گزری مدت — پھر نجانے کہ یہ سینہ میں تڑپتا کیا ہے

کچھ ایسا پڑ گیا ہے محبت میں تفرقہ — دل کی ہمیں تو دل کو ہماری خبر نہیں

خوشی یہی ہے تو اچھا سنو گلہ دل کا — کسی طرح سے سہی ہو تو فیصلہ دل کا
وہ دیکھ لیں تو نہ ہو دل نہ ولولہ دل کا — لڑے نگاہ تو ہو جائے فیصلہ دل کا

کسی کے آنے کا احسان اب نہیں مجھ پر — لحد پہ جو مری آیا پئے ثواب آیا

لاکھوں ہی حسرتیں ہیں تمنائیں سیکڑوں
بستی جو میرے دل میں بسی۔ ہے کہیں نہیں

آئینہ لیکے جاؤں نہ کیونکر میں سامنے
اُن کی کسی طرح سے ادھر کو نظر تو ہو،

یہی نشانِ دلِ حزیں ہے
تھمے جہاں ہاتھ دل وہیں ہے

ایک نے حق میں ہمارے نہ کہا کلمۂ خیر
سب کا مُنھ دیکھتے ہم مجمع محشر میں رہے

نجانے جنبش ابرو میں دل پہ کیا بنتی
ہنسی ہنسی ہی میں تلوار چل گئی ہوتی،

عدم سے آئے ہیں، جائیں گے پھر عدم اک دن
اس ابتدا کو ہم انجام کار سمجھے ہیں،

دل کو برباد کیا آرزوؤں کو بے گھر
تم سا عالم میں کوئی خانہ بر انداز نہیں

باغ میں آکے اسیرانِ قفس کیا بہلیں
سب ہوائیں ہیں ہوائے پر پرواز نہیں

لطف زبان

ماہر کو بجا طور سے اپنی زبان دانی پر ناز تھا کیونکہ وہ لکھنؤ کے ایک ایسے گھرانے سے تعلق رکھتے تھے جہاں بیرونی عناصر کا اثر بالکل نہیں پڑا تھا۔ پھر اُن کی صحبت بھی ارباب کمال اور سخنوروں کا مجمع تھی۔ مولانا علی میاں کامل۔ بنے صاحب مشاق وغیرہ کا ہر وقت کا اُٹھنا بیٹھنا تھا اس لئے ان کی زبان اور نکھر گئی۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں:-

نظم اشعار میں بھی حسن بیاں ہے ماہر
جس کو کہتے ہیں زباں، ہم وہ زباں رکھتے ہیں

ذیل کے شعروں میں زبان کا لطف خاص طور پر نمایاں ہے:-

تنگ ہوں زیست سے، اے موت مسیحائی کر
جان آجائے اگر روح بدن سے نکلے

تھا قیام اپنا بہار چمنستاں کی طرح
وہ وطن ہی نہ رہا ہم جو وطن سے نکلے

دیکھو خرام ناز سے دبتا ہے دل مرا
پھر یہ کہوگے ہم سا کوئی نازنیں نہیں

رسوائے خلق بھی ہوئے، منھ پر بھی آئی بات
وصلت میں اور کیجیے مجھ سے نہیں نہیں

توبہ! یہیں کہیں چھپے بیٹھے ہو میری جاں
یہ بھی کہیں ہوا ہے کہ ہو اور کہیں نہیں

دل مرا اب نگہ تند کو بر مانے دو
تیر خالی جو گیا، دور کرو، جانے دو

جائے کس طرح طنطنہ اُن کا،
ابھی اُٹھتی ہوئی جوانی ہے

سنتے ہو اے کلیم اُن کی صدا؟
جن کو دعوائے لن ترانی ہے

دل وجگر کی تمنائیں قتل ہوتی ہیں
اُجڑ رہے ہیں مرے گھر بسے بسائے ہوئے

نہ دل میں حسرتیں اب ہیں، نہ دل ہی سینہ میں
بتوں کی راہ میں بیٹھے ہیں گھر لٹائے ہوئے

منھ میں دم بھر کو زباں بن کے اگر دل ٹھیرے
مجھ کو پھر درد کی باتوں کا مزا مل جائے

خطا مجھی سے ہوئی، اب جو کچھ کہوں مجرم
چلو، سدھارو، مبارک تمھیں گلہ دل کا،

تم ہنسو پھولوں سے بلبل کو میں بڑھکر چھیڑوں
باغ میں آکے کوئی گل تو کھلائیں ہم تم

رنج میں رنج ہی شاید سبب تسکیں ہو
آؤ روتے ہوئے دل کو تو رلائیں ہم تم

دیکھو پھولی ہے شفق، وقت ئے سرخ ہے یہ
آگ میں آگ چلو اور لگائیں ہم تم

مجمع ہے اک خدائی کا ماہر کے دفن میں
تم بھی چلو شریک ہو کارِ ثواب میں

دنیا اِدھر کی جن سے ہوا کرتی تھی اُدھر
وہ کروٹیں فقط ترا بیمار لے گیا

ڈھونڈھیں تڑپ تڑپ کے مریض جہاں ہزار
جو درد تھا وہ آپ کا بیمار لے گیا

شکست رنگ سے گل دیتے ہیں یہ صاف صدا
خزاں نصیب چمن، ہم بہار لیکے چلے

وہ عندلیب تھے ہم جن کے دم سے لطف چمن
چلے جو اڑکے تو رنگ بہار لیکے چلے

جہاں میں آئے تھے ماہر تو تھی سبکدوشی
چلے تو سر پہ گناہوں کا بار لیکے چلے

محاورات

یہ حقیقتاً زباں دانی کا اہم شعبہ ہے۔ جتنا شاعر کو زبان پر اقتدار ہوگا اُتنا ہی محاورات اُس کے یہاں زیادہ لطف سے نظم ہوں گے چنانچہ ماہر کے یہاں یہ ذخیرہ بہت فراواں ہے۔ ملاحظہ ہو:-

گھر اُن کے جاکے سنا یہ عوض میں خاطر کے
سرا بھی کیا جو چلے آئے مُنھ اُٹھائے ہوئے

بتا یہ کوچۂ دلدار کا ہے اے قاصد
ہزاروں بیٹھے ہیں واں دھونیاں رمائے ہوئے

نصیب آنتوں میں کھلتے ہیں دیکھئے کس کے
بڑھے ہیں قتل کو وہ آستیں چڑھائے ہوئے

تقاضا سن کا ہے الڑھ پنے سے راہ چلو
ادا یہ کہتی ہے چال اور بھی بنائے ہوئے

منعمو عالم فانی میں خوشی ہے معدوم
کان بجتے ہیں کہ نوبت کی صدا آتی ہے

سچ تو کہتے ہیں کہ سولی پہ بھی نیند آتی ہے
شمع پر سو گئے پروانے تو کچھ دل ٹھہرے

کرتے ہیں ہم کو ذبح جو وہ آستیں چڑھائے
لوگوں کا ٹھٹھ لگا ہے تماشائے عام ہے،

راز دل کہتے ہو بیمار سے کچھ خیر تو ہے
نہ سہی غیر کوئی، حال مرا غیر تو ہے،

بھرا ہوا تھا نجانے یہ کب کا اے گردوں
برس پڑا مری تربت پہ جب سحاب آیا،

کہے نہ دل کی تو کیونکر نہ ہو گلہ دل کا
کبھی تو مُنھ سے بھی پھوٹے کچھ آبلہ دل کا

مہندی پاؤں کی نہ چھٹ جائے گی چلئے دو گام
آپ بھی پاس ہیں تربت بھی مری دور نہیں

شوکت الفاظ

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ شوکتِ الفاظ فارسی ترکیبوں ہی سے پیدا ہوتی ہے، یہ خیال کلیتہً صحیح نہیں ہے۔ خالص اردو الفاظ کے اجتماعی تیور بھی شوکت کا باعث ہو سکتے ہیں،

بہرحال یہ امر ایک حد تک قابلِ تسلیم ہے کہ غزل میں شوکتِ الفاظ کی زیادہ ضرورت نہیں ہے۔ یہ چیز قصیدہ کے لئے زیادہ موزوں ہے۔ ناسخ نے غزل میں اس خصوصیت کا بہت استعمال کیا جس کی وجہ سے اُن کی غزل کے شعر اکثر قصیدہ میں کھپائے جانے کے قابل ہیں۔ غزل میں شوکتِ الفاظ کسی موقع پر اس حد تک ممدوح ہے کہ شعر میں ایک تیکھاپن پیدا ہوجائے۔ اس کے لئے محل کی شناخت شاعر کی سلاستِ طبع اور صحتِ ذوق پر مبنی ہے۔

ماہر نے غزل میں اس جنس کا استعمال کمی کے ساتھ کیا ہے۔ پھر بھی بعض اشعار میں یہ خصوصیت نمایاں طور پر موجود ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

لگا اتنی تو آگ اے آتشِ فرقت سراپا کو، — سپند آسا اُڑا دوں مجمرِ دل سے سویدا کو

آفریں اے زورِ بازو، مرحبا اے جذبِ عشق — لے اُڑا کنجِ قفس زور پر پرواز سے

تن خاک ہے تو زیست کا کیا اعتبار ہے — جو عضو ہے غبار کا نقش و نگار ہے

کہتا ہے اُٹھ کے زور میں یہ دردِ دل مرا — یا میں رہوں زمین پہ یا آسماں رہے

او دلِ جانباز رہیو با ادب شمشیر پر — یہ وہ جادہ ہے جہاں سر بھی قدم بنجائے گا

آپ دیکھتے ہیں کہ ان اشعار میں ایک خاص قوت مضمر ہے اور وہ ایک ایسے ہی محل پر ہے جہاں کمزور اندازِ معانی کی نوعیت کو برقرار ہی نہیں رکھ سکتا۔

فارسی ترکیبوں کا اعتدال

ہندوستانی مسلمانوں کے اندر گزشتہ صدی کے آخر تک فارسی زبان کا اتنا رواج تھا کہ عام طور سے خط و کتابت فارسی ہی میں ہوتی تھی، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اُن کے اردو کلام میں فارسی ترکیبوں کا کثرت سے استعمال ہوا، اس سے کوئی شاعر مستثنیٰ نہیں ہے۔ میر تقی میر ایسا اُستاد جس کے یہاں صفائی و سادگی شاعرانہ اعجاز کے درجہ پر پہونچ گئی ہے وہ بھی اس طرح کے اشعار ضرور کہہ گزرتا ہے:۔

ہنگامہ گرم کن جو دلِ ناصبور تھا — پیدا ہر ایک نالہ سے شورِ نشور تھا،

آتش بلند دل کی نہ تھی ورنہ اے کلیم — یک شعلہ برقِ خرمنِ صد کوہِ طور تھا،

صد موسمِ گل ہم کو تہِ بال ہی گزرے — مقدور نہ دیکھا کبھو بے بال و پری کا

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام — آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا

پھر کسی اور کا کیا ذکر، غالب نے اپنے فطری ذوقِ فارسی کے غلبہ سے اس میں کچھ اضافہ کردیا اور ایسے اشعار بھی کہدئے جن میں اگر روابطِ اردو کے نہوں تو معلوم ہی نہو کہ یہ شعر فارسی کا ہے یا اُردو کا۔ بہرحال اس سلسلہ میں عدمِ اعتدال اس حد تک کہ اُردو زبان جس کی متحمل نہ ہو کسی طرح ممدوح نہیں۔ ماہر نے فارسی ترکیبوں کا جہاں تک استعمال کیا ہے

اس میں اعتدال کا پہلو ملحوظ رکھا ہے۔ اُن کی فارسی ترکیبیں طبیعت پر بار اور زبان پر گراں نہیں ہیں۔

ہمراہ بوئے غنچہ کرو تم بھی سیرِ باغ
سب قفل کھل گئے ہیں طلسمِ بہار کے

ملالِ رنجشِ ہر آشنائے یار رہا
صفائی جن سے کی مرے قلب میں غبار رہا

مثالِ دانۂ باروۂ روئے آتش ہوں،
نہ ہوش اُڑیں جو چمک درد کی اُٹھا نہ کرے

برق آہِ غمِ سوزاں جو نکل کر چمکی،
دود دل بھی صفتِ ابرِ بہاراں نکلا

سبب ہے کیف فلک کا مری عرق ریزی
یہی شراب تھی مینائے آسماں کے لئے

بھرا خون قاتل کے دامن میں جب
بہارِ ریاضِ ادا ہو گیا،

کیا محو طی ارض کوئی رہگزر میں ہے
ہے پیچیدگی غبار طریق سفر میں ہے

ہمتِ مردانگی غم کے شکنجوں میں خموش
جنتری میں تار جب کھنچتا تھا بے آواز تھا

گر نہ سیکھئے قدر تو نا قدر دانی آپ کی
ہر ادا ہے ناز پرورِ دِ جوانی آپ کی

مشکل پسندی یہ ایک خاص طرزِ کلام ہے جس کے ساتھ معنی ذرا غور کرنے کے بعد واضح ہوں۔ موجودہ زمانہ کے بہت سے تعلیمیافتہ اور روشن خیال لوگ اس جنس شاعری کو بہت پسند کرتے ہیں:۔

پاؤں اُلجھے رہے دامن سے طریق غم میں
ہاتھ طے کرکے رہ چاک گریباں نکلا

ضعف جب ساری مرا ہنگام بزم ساز تھا
چنگ کا نالہ شکست رنگ کی آواز تھا

ضعف میں جب طائر تصویر سے کچھ ساز تھا،
رنگ کا تھمنا بدن پر مانع پرواز تھا

ہجر میں سنتا کوئی کیونکر مری فریاد کو
دودِ دل ہنگام نالہ سرمۂ آواز تھا

تصویر رنگ دادہ ہوں دیکھو قرارِ دل
روکے ہے دوڑتے ہوئے خوں کو وقارِ دل

احساں نہ لے تو مثل ترا بھی کہیں نہیں
اکسیر ہے وہ خاک جو دامن نشیں نہیں،

بیقراری سبب بستگی خاطر ہے،
جب گرہ کھل گئی کچھ آنسوؤں کی دل ٹھہرے

وجود بحر جہاں ہے بقدر تاب و تواں،
بہت ہے یہ، جو کوئی دم حباب باقی ہے

آتش قدم ہوں قید عجب کا مقام ہے
زنجیر اشک ریختۂ موم خام ہے

دشت وحشت میں شرر اُڑتے تھے جب
برق اُلجھی تھی مری زنجیر سے

طنز طنزیہ انداز کا کلام ایک خاص صنف سخن ہے جو اگر صحیح طور پر صرف ہو جائے تو وجدان کو ایک خاص لطف و کیفیت بخشتا ہے۔ ماہر کے کلام میں یہ بہت حسن کے ساتھ استعمال ہوا ہے:۔

جلجائے دل زبان سے عاشق نہ اف کریں
ارشاد ناز کا ہے ادا کا پیام ہے

عشاق کو یہ شرع محبت کا حکم ہے
گردن پہ ہو چھری تو تڑپنا حرام ہے

نہ آتے آپ جو دم کو تو اور کیا ہوتا
تڑپ تڑپ کے طبیعت سنبھل گئی ہوتی

عشاق پاس آکے یہ اُن کی بلا سنے
ہے ہے، ہے دل کی۔ ہائے جگر کی پکار ہے

مہربان چین جبیں کو مری رہنے دیجئے
کہیں مٹتا ہے جو قسمت کا لکھا ہوتا ہے

خاک جس طرح جلا کر گئے دل لوگوں نے
ہم سے تو شمع بھی اس طرح جلائی نہ گئی

اسی کو اور زیادہ مخفی انداز سے یوں کہا ہے:۔

دل وہ تھے جن سے جلائی نہ گئی شمع کبھی
اور جو بھولے سے جلائی تو بجھائی نہ گئی،

نزع میں روتے ہو کیوں یاد کرو ہجر کے دن
دل مرا آج بھی گھبرائے تو گھبرانے دو

مجھ پہ تو طعن تھے آیا ہے اب آئینہ کیوں
دل جو تنہائی میں گھبرائے تو گھبرانے دو

ہر روز سرفراز تو کرنا محال ہے
اُس کو بھی کیجئے عذر جو ہو گاہ گاہ میں

میں ہی تو تھا سبب استراحت عالم
مری ہی نیند کے اُڑنے سے سب کو خواب آیا

ستمگر و ستم ایجادیاں چلی جائیں
نہ اُٹھ رہے کوئی بیداد آسماں کے لئے

رنگ الفت جو کوئی چیز نہیں، جانے دو
اک کلی دل بھی ہے، مرجھائے تو مرجھانے دو

ذکر بحرین تو ہوتا ہے سنا کر مجھ کو
خیر آنکھوں سے بھی دو اشک نکل جانے دو

محاکات

کسی کیفیت یا حالت کا اس طرح اظہار کہ تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جائے اور اُس کا تصورِ کامل دل میں پیدا ہو جائے "محاکات" ہے۔ اس کا مفہوم "منظر کشی" سے کسی حد تک وسیع ہے کیونکہ "منظر کشی" کا تعلق صرف حسیات سے ہوتا ہے۔ ماہر کے کلام میں محاکات کا جوہر اعلیٰ پیمانہ پر موجود ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

نازنیں ہاتھ سے شکنوں کو مٹایا جلدی
جب نشان وصل کے سمٹے ہوئے بستر میں رہے

دم نکلتے ہوئے دیکھا تو کہا گھبرا کر
ارے مجھ سے بھی تو کہدے کہ یہ کیا ہوتا ہے

اس کو کیا کہتے ہیں یوں جاگ کے کاٹیں راتیں
وصل کی شب جو ہوئی شام سے آرام کیا،

کچھ بھی ہے اعتبار تمھارے مزاج کا
آئے تو بے بلائے، بلایا تو ہٹ گئے

چاک ہونے کا یہ وحشت نے کیا تھا خوگر
ہاتھ سینہ تک آیا کہ گریباں نکلا،

پھر پھر کے آپ سونگھ رہا ہوں میں اپنی بو
بازو پہ سر وہ رکھ کے جو لیٹے تھے خواب میں

برہم تو میری دیدے ہیں اُف رے بچپنا
آنکھوں پہ اپنے ہاتھ رکھے ہیں حجاب میں

تڑپوں میں وقت نزع نہ کیوں لیکے ہچکیاں
گھٹ گھٹ کے رو رہے ہیں مجھے وہ حجاب میں

ندرتِ اسلوب سیدھی سی بات ایک نئے انداز میں کہی جائے جو خاص کیف و اثر پیدا کردے۔ ماہر کے یہاں یہ خصوصیت بہت نمایاں ہے۔ ملاحظہ ہو :-

(۱) تکمیل بربادی کی آرزو :-

نقش و نگار خاک سے صورت نما ہوں پھر — آ اے ہوائے فنا کہ ترا انتظار ہے،

(۲) ملامت گردوں کا شکوہ :-

شرر و برق کو روکے، نہ کوئی پارے کو — میرے دم بھر کے تڑپ لینے میں کیا ہوتا ہے
کوئی آزردہ ہے شمعوں سے نہ شبنم سے تنگ — اک مرے رونے میں کیا جانیے کیا ہوتا ہے

(۳) دل گمشدہ کی یاد :-

خیال دل مجھے یادش بخیر آتا ہے — چراغ جل کے مرے سامنے بجھا نہ کرے

(۴) ناوک قاتل کا استقبال :-

لے وہ پیکان سرِ ناوک قاتل آیا — پیشوائی کو بڑھ اے آہ، مرا دل آیا،

(۵) منزلِ آخرت کی صعوبت :-

جانے والو سفر قبر کی سختی دیکھو — بارِ جاں پھینک کے رہ رو سوئے منزل آیا

(۶) ابرو و شمشیر کی مشابہت :-

ابرو کی جنبشوں پہ جو چاہو وہ اب کہو، — سیکھے ہو یہ ادا مجھے تلواریں مار کے

(۷) حیات بخشی کی آرزو :-

گر یاد عا دیتی ہوں تو شانہ ہلا دو تم — کچھ سو رہے ہیں چین سے جھماں مزار کے

(۸) دفن :-

سب مل کے دفن خاک کے پتلوں کا دیکھ لیں — خشکی میں ڈوبتے ہیں سفینے غبار کے

(۹) تقاضائے وصل :-

انکار میرے گھر سے فقط سن کا ہے سبب — دل میں اگر رہے تو مری جاں کہاں رہے

(۱۰) جواب دہی سے معذوری :-

جواب دوں تجھے اے عیب پوش بھیڑ میں کیا — گنہ کی طرح سے گھیرے ہیں اہل محشر بھی

(۱۱) خواہش دیدار :-

اُلٹو نقاب مُنھ سے دکھا بھی چکو جمال — ایسا نہ ہو کہ لوگ کہیں تم حسیں نہیں

جذبات کی تحلیل شاعری کی "کارگاہ شیشہ گری" میں یہ کام بڑا نازک ہے۔ اس کے لئے صحیح فطرت کی نباضی کی ضرورت ہے۔ ماہر اکثر اس مرحلہ میں کامیاب ہوئے ہیں:-

سب اسیران قفس دیکھ کے رہ جاتے ہیں ‏— ساتھ والوں سے اگر کوئی رہا ہوتا ہے
آئینہ لیکر میں اُن کے ہاتھ سے نادم یہ ہوں ‏— ایسی ہی کوئی ادا تھی جس پہ اُن کو ناز تھا

میں سمجھتا ہوں کہ ماہر کی کائنات شاعری میں ایک یہی شعر ناز کے لئے کافی ہے:-

میرے آگے تیلیاں توڑیں نہ قیدیِ قفس ‏— زورِ بازو پر کبھی مجھ کو بھی اپنے ناز تھا
دوستوں نے بھر کے آہ سرد میری جان لی ‏— شمع کے پروانے بھی دشمن تھے صرصر کی طرح
صیاد کی تسلیوں کا اعتبار کیا، ‏— کھڑکی کھلے قفل کی تو سمجھیں کہ ہاں چلے،

منظر کشی حیات کی اجتماعی صورت اس طرح نظم ہو جائے کہ آنکھوں کے سامنے تصویر پھرنے لگے:-

پچھلے سے مست بیٹھے ہیں اس انتظار میں ‏— پھوٹے شفق تو جام مئے ارغواں چلے
یہ شکل اُن کی دم صبح شام وصلت ہے ‏— نگاہ نیچی ہے، بیٹھے ہیں سر جھکائے ہوئے
وہی ہیں میرے جنازے پر آج آئے ہوئے ‏— ادھر جو دیکھتے ہیں مُنہ اُدھر پھرائے ہوئے
سب کے ہمراہ جھکے دیکھ رہے ہیں وہ بھی ‏— جان کا میری نکلنا بھی تماشا کیا ہے
رندان بادہ کش نے کھولے قبا کے بند ‏— پنکھے چلے جہاں میں جو ابر بہار کے
پھیلائے پاؤں سوتے ہیں تکیہ پہ سر نہیں، ‏— کیا گر رہی ہے کس کی نظر کچھ خبر نہیں
لڑ بھڑ کے کس سے سوئے ہیں اکس سے بگاڑ ہے ‏— کون اُن کی لے رہا ہے بلائیں خبر نہیں

حکیمانہ وعظ و نصیحت اور اخلاقی شاعری یہ چیز غزل کے اصل مفہوم سے تو خارج ہے مگر اساتذہ نے اصطلاحی غزل کے ذیل میں اس کی جگہ نکال کر شاعری کو کارآمد بنا دیا ہے۔ ماہر کے یہاں تشبیہات و استعارات کے ماتحت اور کائنات عالم سے نتیجہ اخذ کرنے کے ذیل میں جسے میں ماہر کا مخصوص رنگ سمجھتا ہوں اور جس کا ذکر آئندہ کروں گا۔ وعظ و نصیحت اور اخلاق کا ذخیرہ بڑی کثرت کے ساتھ ہے مگر میں اس مقام پر خالص وہ اشعار پیش کروں گا جن میں براہ راست یہی ہے اور کچھ نہیں، اس سے آپ کو خود ماہر کے طبعی رجحان اور اخلاقی میلانات کا پتہ بھی لگیگا۔ فرماتے ہیں:-

کان رکھکر نہ کبھی میں نے سنی بات اُس کی ‏— آدمیت سے جو خارج کوئی انساں دیکھا
منعموں کے گھر بنانے کا نتیجہ یہ ہوا ‏— آپ سوئے کنج مرقد میں عمارت رہ گئی
انہی باتوں پہ ہے ماہر تجھے مطلب کی طلب ‏— منہ سے مانگا تو دل آگاہ دعا سے نہ ہوا

جس کو ہنگامِ دعا شغلِ نظر بازی رہا — چشم بنکر قفلِ دربائے اجابت رہ گئی
فاش پایا جبکہ رازِ عسرتِ اربابِ فقر — پردہ رکھ لینے کو دنیا میں قناعت رہ گئی

اپنا ثبات بجز جہاں میں نہ جان تو — مٹتا ہے جبکہ نقش آبِ رواں میں ہے

دیکھئے کچھ اس پیشکش کو کرے او منعم قبول — آبرو سی چیز کشتیِ کفِ سائل میں ہے

نہ دیکھو گر تو ہوں کم ظرف مثلِ جامِ جم بیشک — اگر دیکھو تو گنجائش ہے مجھ میں ایک عالم کی

فقیری قناعت کا باعث ہوئی — بری بھی تو اچھی بسر ہو گئی

ہے آبرو کی طلب گر تو کر ہنر حاصل — بقائے بو ہے تو قدرِ گلاب باقی ہے
نہ فیض پائیگا اس خاکداں سے او غافل — سراب پر تجھے امیدِ آب باقی ہے
نہ تن کے دیکھ ہر اک بار حسن کو غافل — یہ آب و تاب بدن تا شباب باقی ہے

جھک کے چل ماہر ہر اک سے رہ گزارِ دہر میں — کھائی ہے ٹھوکر اُنھوں نے جو اُٹھا کر سر چلے

(باقی) ع۔ن

چند قابلِ مطالعہ کتابیں

مضامینِ محمد علی :- مرتبہ محمد سرور صاحب پروفیسر جامعہ۔ یہ اس دور کی تاریخ ہے جب ملتِ اسلامیہ کے تنِ مردہ میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑی اور برسوں کے خوابیدہ مسلمان جاگ اُٹھے۔ قیمت مجلد ؏

مضامینِ رشید :- پروفیسر رشید احمد صدیقی کے مضاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے، یہ مضامین کیا ہیں دریائے لطافت سے سینچی ہوئی کشتِ زعفران، تر و تازہ، شاداب اور فرحت بخش کتاب کی ظاہری خوشنمائی میں بھی خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ قیمت مجلد ؏

میدانِ عمل :- ملک کے مشہور و معروف ادیب منشی پریم چند کا بے نظیر ناول جوان کے تمام پچھلے کارناموں پر بھاری ہے۔ قیمت مجلد ؏

بیوہ :- منشی پریم چند آنجہانی نے ایک بیوہ کے حالات دردناک پیرایہ میں لکھے ہیں۔ ضمناً یہ بھی بتایا ہے کہ ایک بیوہ کو کیسی زندگی بسر کرنا چاہئے۔ قیمت مجلد عہ

منیجر نگار لکھنؤ

اپنے ایک اشتراکی دوست سے!

دسمبر کے نگار میں "معراجِ تمدن" کی سرخی سے ایک مضمون میری نظر سے گزرا۔ مقالہ نگار کا روئے سخن میرے دو گزشتہ مضامین کی طرف ہے۔ جواب الجواب کا میں قایل نہیں ہوں۔ لیکن معترض نے میرے مضامین سے دو تین حوالے جو نقل کئے ہیں ان میں تغیر و تبدل کر دیا ہے۔

مقالہ نگار نے مجھ پر یہ اعتراض کیا ہے کہ مینے نہ اشتراکیت کا وسیع مطالعہ کیا ہے اور نہ کسی اشتراکی سے مجھے تبادلۂ خیال کا موقعہ ملا ہے، ورنہ میں نازیت و فاسیت کو اشتراکیت کے ساتھ ملا کر نہ دیکھتا۔ خاکسار کے جہل کے متعلق معترض کا ارشاد بجا اور درست ہے، لیکن بادب گزارش ہے کہ مقالۂ مذکور میں اشتراکیت، نازیت اور فسطائیت کو ایک ثابت کرنے کی میں نے ایک جگہ بھی کوشش نہیں کی ہے۔ میرے الفاظ ملاحظہ ہوں:۔ "لیکن اس کے بعد ہی ایک دوسری چیز جمہوریت کی حریف بن کر آ کھڑی ہوئی ------ جسے کہیں نازیت کہتے ہیں، کہیں فاسیت اور کہیں بالشیوزم اور ہر جگہ اس کا آلۂ کار بھی --- ایک ہی ہے یعنی شخصِ واحد یا ایک منظم جماعت کی مطلق العنانی"

آگے چل کر مقالہ نگار نے یہ بھی اعتراض کیا ہے کہ "مینے جمہوریت کا مفہوم آزادانہ رائے دہندگی تک محدود کر دیا ہے" حالانکہ جمہوریت کی تعریف میں نے یہ کی ہے "کہ عنانِ حکومت عوام کے ہاتھ میں آجائے اور حکومت کا ہر کام عوام کے مشورہ سے عوام کے ہاتھوں اور عوام کے فایدے کے لئے کیا جائے"

اس کے بعد میں نے موجودہ جمہوری ریاستوں کے نظام (Constitution) پر ایک طایرانہ نظر ڈالی تھی۔ جہاں تک میرا خیال ہے اسی سے معترض کو غلط فہمی ہوگئی اور انھوں نے سمجھ لیا کہ امریکہ، انگلستان و فرانس کی حکومتوں کو میں جمہوریت کا معیار قرار دے رہا ہوں۔ اس کے بعد مقالہ نگار نے جمہوریت کے کھوکھلے پن کو دکھایا ہے، لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ اعتراضات نفسِ جمہوریت پر کئے جا رہے ہیں یا ان ریاستوں پر جو جمہوری ہونے کے مدعی ہیں۔ ظاہر ہے کہ جمہوری اُصول پر اعتراض نہیں ہو سکتا۔ جمہوری حکومتوں ہی پر نکتہ چینی کی گئی ہوگی لیکن اس کی کیا ضرورت تھی جبکہ میں خود لکھ چکا تھا کہ حقیقتاً امریکہ اور انگلستان تک جمہوریت سے عاری نظر آتے ہیں امریکہ میں دولت کی پرستش ہو رہی ہے تو انگلستان میں بھی قدیم روایات کا بت لوگوں سے ابتک سجدۂ عبودیت

کر رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اب تک صرف سیاسیات میں جمہوریت کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن تاوقتیکہ اجتماعیات کے ہر شعبے میں جمہوری نظام نہ قایم ہو جائے۔ جمہوریت کی کامیابی دشوار ہے اور گارنر کا یہ قول بالکل درست ہے کہ جمہوریت بیک وقت ایک سیاسی نظام بھی ہے، معاشرتی اصلاح بھی ہے اور مذہبی تخیل بھی۔

اس کے بعد معترض نے چند تنقیحات قایم کر کے ان کے جواب دینے کی کوشش کی ہے لیکن یہ تنقیحات اور ان کے جواب اسی قسم کے ہیں جو حامیانِ اشتراکیت کی نوکِ زبان رہا کرتے ہیں اور جو عموماً سطحی ہوتے ہیں کیونکہ ننانوے فی صدی اشتراکی علمی حیثیت سے بہت پست ہوتے ہیں اور بغیر کافی تعلیم حاصل کئے ہوئے معلمانہ اندازِ گفتگو اختیار کر لیتے ہیں۔

موجودہ نظامِ معاشرت کی خامیوں سے کون انکار کر سکتا ہے اور اس کی ناانصافیوں کی کون حمایت کرے گا؟ اسی لئے سرمایہ داروں اور طبقۂ امرا کے مظالم پر جب ان کی نظر پڑتی ہے تو ان کے جذبات اس طرح اُبھر آتے ہیں کہ غور و فکر کی صلاحیت بالکل رخصت ہو جاتی ہے اور بغیر یہ سوچے ہوئے کہ اشتراکیت یا اشتمالیت قابلِ عمل بھی ہے یا نہیں، یہ حضرات اسی طرف مایل ہو جاتے ہیں۔ یہ قاعدہ ہے کہ انسان کے دل و دماغ پر جب کوئی چیز مسلط ہو جاتی ہے تو اس کے معائب پر نظر کم پڑتی ہے۔ اسی بنا پر اگر میں یہ کہوں کہ اشتراکیت سے اکثر اشتراکی خود نابلد ہیں تو اسے مبالغہ نہ سمجھنا چاہئے۔ مارکس اور انجل کے نام تو اشتراکیوں کے زبان پر ہوتے ہیں۔ لیکن ان میں ایسے کتنے ہیں جو مارکس کو سمجھ سکتے ہوں؟ بہت سے تو ایسے ملیں گے جو مارکس کی تصانیف سے بھی ناواقف ہوں گے۔

موجودہ دور کی اشتراکیت تمام و کمال معاشیات کے نظریوں پر قایم ہے (موجودہ دور کی تخصیص سے اشتراکی متعجب نہ ہوں۔ اس شریعت کا پیغمبر صرف مارکس ہی نہیں۔ بلکہ اس کے قبل بیسیوں اور بھی گزر چکے ہیں، چنانچہ خود افلاطون بہت بڑا اشتمالی تھا) لیکن ان بزعمِ خود ہمہ داں اشتراکیوں کو اس خارزار میں قدم رکھتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے۔

روس کی کامیابیوں کو اشتراکیت کی کامیابی بتانا بھی ہمارے ایسے ہی مداحانِ اشتراکیت کا کام ہے۔ شاید ان حضرات کو خبر نہیں کہ جس روز لینن نے وہاں (New Economic Policy) کا نفاذ کیا: اسی روز اشتراکیت کی بنیادیں ہل گئیں اور میں نہیں کہہ سکتا کہ اب وہ اسٹیلن کی موجودہ پالیسی کو کس قسم کی اشتراکیت کہیں گے۔ میری مراد سیاسی نہیں بلکہ اس کی اقتصادی پالیسی سے ہے جو بیس سال کی طویل کوششوں کے بعد اسٹالین نے اعترافِ شکست کے طور پر پیش کی ہے اور جس میں ذاتی جائیداد و املاک رکھنے کی بھی اجازت دی گئی ہے؟ تجارت کرنے اور کارخانے قایم کرنے کے لئے بھی عوام کو آزاد چھوڑ دیا گیا ہے۔

روس کی ترقیوں کا میں منکر نہیں ہوں اور نہ اس کے کارناموں کو میں جھٹلانا چاہتا ہوں۔ میری تو غرض اتنی

ہے کہ اس کا راز نہ اشتراکیت میں پنہاں ہے اور نہ بولشوزم میں۔ بلکہ لینن اور اسٹالین کی اپنی مخصوص فطری صلاحیتوں میں، اور روس کی نیم وحشی آبادی میں۔

اسے روس کی خوش نصیبی کہئے کہ اسے لینن اور اسٹالین ایسے رہبر مل گئے اور یہ ان دونوں کی خوش بختی تھی کہ انھیں تختۂ مشق بنانے کے لئے ایسا ملک ہاتھ آ گیا جو مطلق العنانی کی ہر صدا پر لبیک کہنے کے لئے پشتہا پشت سے عادی تھا۔ روس کی یہ نئی کایا پلٹ اشتراکیوں کے لئے واحد معجزہ ہو تو ہو۔ لیکن تاریخ اسی روس میں ایسے ہی دو اور معجزوں کا پتہ دیتی ہے۔ ایک سنہ ۹۸۸ء میں۔ جبکہ (Vlademir) نے خود بھی مسیحیت قبول کی اور روسیوں کو بھی ایسا کرنے کے لئے مجبور کیا۔ دوسری مثال تو بہت حال کی ہے یعنی پیٹر اعظم کے اصلاحات۔ کیا تاریخ روس کے یہ دونوں واقعات انقلاب سے کم درجہ رکھتے ہیں؟ اور کیا سنہ ۱۹۱۷ء کے انقلاب کی طرح عوام ان پر عمل کرنے کے لئے مجبور نہیں کئے گئے تھے؟

بیرونی دنیا کے لئے انقلاب روس کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ بیسویں صدی کے آغاز سے، خاندانِ آدم کا وہ طبقہ جو اب تک کچلا جا رہا تھا اس پر تلا ہوا نظر آ رہا تھا کہ اپنے حقوق منوا کر رہے گا۔ جنگِ عظیم کا نشتر خاطر خواہ فائدہ نہ پہونچا سکنے پر بھی بالکل رایگاں نہ گیا اور بہتیرے ملکوں سے صدیوں کے منجمد موادِ فاسد کو نکال دینے میں کامیاب ہوا۔ اقوامِ عالم خوابِ غفلت سے آنکھ ملتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے اور حصولِ مقصد کے لئے سبھوں نے الگ الگ لائحۂ عمل مقرر کیا۔ چین۔ جاپان۔ روس۔ ایران۔ ترکی۔ اٹلی وغیرہ سبھوں نے اپنے حیاتِ نو کے لئے علحدہ علحدہ اور نئی نئی طرز معیشتیں ایجاد و اختیار کیں۔ اس میں کون ناکامیاب رہا اور کون کامیاب اس کا فیصلہ آنے والے مورخین کریں گے۔ میں تو اسے صرف اتفاق ہی کہوں گا کہ روس میں کرنیسکی حکومت (Kerensky Govt:) کو اپنی اندرونی نااتفاقیوں کی باعث، لینن کے ہاتھوں شکست ہوئی اور روس کی ساری ترقیوں اور کامیابیوں کا سہرا لینن کے سر رہا، کیونکہ انقلاب روس کے بعد خواہ کوئی بھی حکومت ہوتی اس کی ترقی کی داستان وہی ہوتی جو آج ہے۔ اور اگر نہیں تو پہلے اشتراکی حضرات ایران۔ ترکی۔ اٹلی۔ جاپان کی کامیابیوں کے لئے کونسی تاویل پیش کرتے ہیں؟ مجھے یقین ہے کہ اسکا جواب اشتراکی یہی دیں گے کہ "روس کے دوش بدوش دوسرے ممالک کو کھڑا کرنا عین حماقت اور جہالت ہے کیونکہ روس اور ان ممالک کی حکومتوں میں "چند اصولی اختلافات ہیں" ان کے یہاں ریاست ہی سب کچھ ہے۔ روس کے یہاں ریاست کوئی چیز نہیں۔ وہاں ادنیٰ اور اعلیٰ کے لفظ لایعنی نہیں ہیں، وہاں طبقوں کی بلندی اور پستی متعین چیز ہے، لیکن روس میں نہیں۔ العرض دونوں میں اُصولی اختلافات ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ جس حد تک اُصول وضع کرنے کا تعلق ہے میں کیا، ہر شخص انھیں بے تامل قبول کریگا۔ لیکن یہاں بحث اُصول سے نہیں بلکہ ان پر عمل کرنے سے ہے۔ اعتراضات دو قسم کے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان

اُصول میں کچھ تو قطعی ناقابلِ عمل ہیں اور بعض ایسے ہیں جنھیں قابلِ عمل تو کہا جا سکتا ہے، لیکن درحقیقت ان پر عمل نہیں ہوتا۔ مندرجہ بالا اُصول کی حقیقت نمبروار ملاحظہ ہوں :-

نمبر ۱ - دوسری حکومتیں انسانی کمزوریوں پر نظر رکھتے ہوئے یہ نہیں قبول کرتیں، کہ کبھی انسان اس منزل تک پہونچ سکتا ہے، جب اسے ریاست کی ضرورت باقی نہ رہے۔ اس کے برعکس کارل مارکس کا خیال تھا کہ ضرورت اور افلاس یہی ام الخبائث ہے خواہ افراد ہوں یا اقوام دونوں کے ارتکاب جرم کی باعث یہی ضرورت ہوا کرتی ہے اگر ضرورت یعنی افلاس کا خاتمہ کر دیا جائے تو دنیا کو نہ پولیس کی حاجت رہ جائے گی اور نہ فوج کی اور چونکہ اشتمالیت اسی افلاس کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دینے کا ذمہ لیتی ہے اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ ریاست کا آلۂ جبر واحتساب عضوِ معطل ہو کر نہ رہ جائے۔ چونکہ روس بھی صحیفۂ کارل مارکس کا پیرو ہے، اس لئے وہ بھی مدعی ہے کہ رفتہ رفتہ وہ اس معراج تک پہونچ جائے گا۔ بفرضِ محال اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ مارکس کا یہ ہوائی قلعہ عملی جامہ پہن بھی سکتا ہے تو اس کے لئے سب سے ضروری شرط یہ ہے کہ ساری دنیا مارکس کی پیرو ہو جائے اور ایک دفعہ روسو (Rousseau) کی ذہنی (State of nature) تمام روئے زمین پر ساری وطاری ہو جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے لینن نے ساری دنیا کو اشتمالی بنا دینے کی کوشش کی تھی اور ایک کامیاب انقلابِ عالم کا خواب دیکھنے لگ گیا تھا۔ لیکن بہت جلد اس تجویز کی حماقت اس پر ظاہر ہو گئی اور اُسے کنارہ کش ہو جانا پڑا لیکن بطور ائیڈیل یہ اُصول اب بھی روس میں موجود ہے۔ اور اشتمالی کم از کم اس کا خواب ضرور دیکھ لیا کرتے ہیں۔

نمبر ۲ - بلند و پست کی تفریق غیر فطری ہے۔ اس کو فنا کر کے سبھوں کو مساوی حقوق دینا چاہئے۔ غیر اشتراکی دنیا اب بھی اس پر مصر ہے کہ خواہ کچھ بھی کیا جائے بلند و پست کی تفریق نہیں مٹائی جا سکتی۔ یہ دوسری بات ہے کہ کل کا اعلیٰ طبقہ آج ادنیٰ ہو گیا۔ اسی طرح آج کا ادنےٰ کل اعلیٰ ہو جائے۔ لیکن یہ ناممکن ہے کہ سب ایک ہی سطح پر لا کر کھڑے کر دئے جائیں۔ خود روس میں کیا ہوا؟ یہ تو درست ہے کہ زار کے وقت کی اشرافیت اب وہاں باقی نہیں ہے۔ لیکن کیا اس سے انکار ممکن ہے کہ اس کی جگہ ایک دوسری ذرا پست درجہ کی اشرافیت پیدا نہیں ہو گئی۔ آپ لاکھ انسانیت پرست بن جائیں لیکن پست کاموں سے جو ذہنی پستی پیدا ہو جاتی ہے اُسے کیسے دور کر دیں گے؟ یہ کیونکر ممکن ہے کہ کھیتوں میں کام کرنے والا مزدور، انجنوں میں کوئلہ جھونکنے والا انسان، یا صحرائے گوبی میں جانوروں کا گلہ بان، اسی قسم کی زندگی بسر کرنے لگ جائے گا جیسا کہ مابعد الطبیعات کا ایک معلم سائنس کا ریسرچ سکالر یا کمیونسٹ پارٹی کا جنرل سکریٹری بسر کرتا ہے۔ عموماً اشتراکیت پسند جماعت اس کا یہ جواب دیتی ہے "یہ کون کہتا ہے۔ ہمارے پیش نظر تو صرف روٹی کا سوال ہے۔ اشتراکیت کا مقصد تو صرف اکثریت کو افلاس اور فاقوں سے بچانا ہے۔ پھر چونکہ افلاس نام ہے ضروریاتِ زندگی کی عدم فراہمی کا اور امارت نام ہے لوازم زندگی کا بہ افراط پائے جانے کا، اس لئے اشتراکیت

انھیں دونوں میں توازن پیدا کر دینا چاہتی ہے۔

اگر اشتراکیت صرف اتنے ہی کے لئے کوشاں ہے۔ تو باادب گزارش ہے کہ دوسری ریاستوں کو تو چھوڑیے خود جرمنی اور اٹلی میں بھی یہی کچھ ہو رہا ہے وہاں بھی ذاتی جائداد اور املاک پر اگر کلیتاً نہیں تو کافی حد تک ریاست کا قبضہ ہو گیا ہے۔ ساہوکار اور کارخانوں کے مالکوں پر بہت کچھ پابندیاں عاید کر دی گئی ہیں (Labour Legislation) کی ہمہ گیری دن بدن بڑھتی جا رہی ہے آمدنی اور سرمایہ پر ٹیکس۔ بڑھاپے اور علالت کا بیمہ۔ جسمانی خطرات اور نقصانات کے لئے تاوان وغیرہ سب اسی مقصود کے حصول کے ذریعے ہیں اور جب زمانہ کی رفتار کا یہ رخ ہو اور ہم سب تدریجاً اشتراکیت کی طرف گامزن ہوں تو محض اصطلاح پر جھگڑنا کہاں کی دانشمندی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نظامِ سرمایہ داری پر اشتراکیت کی اکثر نکتہ چینیاں قابلِ قدر ہیں۔ لیکن انقلابِ روس اور سوویٹ نظام حکومت کے بغیر بھی یہ خامیاں ظاہر ہو کر رہتیں کیونکہ آزاد سرمایہ داری کی تباہ کاریاں ایسی نہ تھیں کہ چھپائے چھپ جاتیں۔

نمبر ۳۔ غیر روسی اشتراکی اس پر بہت زور دیتے ہیں کہ حقیقی معنوں میں جمہوریت روس ہی میں ہے۔ کیونکہ دوسری ریاستوں کی طرح یہاں کی حکومت سرمایہ داروں کی دست نگر نہیں ہے بلکہ حکومت پر سوویٹ کو اقتدارِ کلی حاصل ہے نیز غیر ممالک کی طرح یہاں حکومت کی مشین اوپر سے نیچے نہیں آتی بلکہ نیچے سے اوپر جاتی ہے۔ یہاں کے (Local bodies) (پنچایت۔ یونین بورڈ۔ لوکل بورڈ۔ ڈسٹرکٹ بورڈ) سے بہت کچھ مشابہت رکھتے ہیں اور ان کے فرائض بھی انھیں جیسے ہیں۔ دیہاتوں، قصبوں، کارخانوں، چھوٹے شہروں سے سوویٹس کی ابتدا ہوتی ہے۔ ان کے اوپر ضلع اور صوبہ کے سوویٹس ہوتے ہیں اور سبھوں کے اوپر کونسل آف سوویٹس (Council of Soviets) قایم ہے۔ یہی یہاں کی مجلسِ قانون ساز ہے۔ اور ملک کی کیبنٹ (The council of Peoples Commissars) کا بھی یہی انتخاب کرتی ہے سوویٹس کے ممبروں کا انتخاب الکشن کے مروجہ قاعدے کے مطابق نہیں ہوتا۔ بلکہ سوویٹ کا صدر، عام میٹنگ میں امیدواروں کے نام پیش کرتا ہے۔ ان کی موافقت میں تقریریں ہوتی ہیں۔ حکومت کے کارنامے پیش کئے جاتے ہیں اور آخر میں حاضرین سے ہاتھ اٹھوا کر ممبروں کے انتخاب ہو جانے کا اعلان کر دیا جاتا ہے۔ عوام الناس کے اثر و اقتدار کو بڑھانے کی دوسری قابلِ ذکر چیز اجتماعیت ہے (Collectivism) ہے جس کو حکومت سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن اندرونی انتظامات بالخصوص کارخانوں اور کاشتکاری کا نظم و نسق یہاں اسی کے ذمہ ہے سمجھنے کے لئے اسے (Board of Directors) کہیے لیکن دونوں میں یہ فرق ہے کہ یہاں ممبران تمام و کمال کارخانے کے مزدوروں پر مشتمل ہوتے ہیں اور کارخانہ کے نفع و نقصان سے انھیں بحث نہیں

ہوتی۔ ان کا کام صرف انتظام کی دیکھ بھال ہے اور جہاں تک اپنے مخصوص کارخانے کا تعلق ہے وہ Trade Unions کی خدمت بھی یہی انجام دیتے ہیں اور اس طرح سوویٹ پر بھی ان کا کافی اثر رہتا ہے۔

یہاں میں نے محض ایک ہلکا سا خاکہ پیش کرنے پر اکتفا کی ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ حقیقت کو بے نقاب کروں پہلے سوویٹ کے طریقۂ انتخاب پر بھی ایک بے لاگ نظر ڈال لیجئے۔ پہلی قابلِ لحاظ بات یہ ہے کہ ممبروں کے انتخاب کا حق صرف مزدور، کسان اور فوج کو حاصل ہے دوسرے طبقوں سے قطع نظر اس کو بھی ایک حد تک (Universal Adult Suffrage) کہہ سکتے ہیں لیکن تاوقتیکہ انتخاب کرنے والی جماعت کو اتنا علم و شعور نہ ہو کہ وہ اچھی طرح "حکومت اور انتخاب" کے معنی سمجھ سکے عام رائے دہندگی کا حق لایعنی سی بات ہے۔ چنانچہ مل نے کہا تھا "عام رائے دہندگی کے لئے عام تعلیم لازمی شرط ہونی چاہئے" اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جس وقت کسی امیدوار کا نام پیش کر کے ایک جادو بیان مقرر حاضرین کے جذبات مشتعل کر دیتا ہے تو غیر ارادی طور پر بھی اس کی حمایت میں ہاتھ اُٹھ ہی جاتے ہیں۔ مزید براں ووٹ برسرِ عام لئے جاتے ہیں۔ امیدوار حکومت کا منتخبہ آدمی ہوتا ہے اور انتخاب کرنے والوں میں بھی ایک جماعت حکومت کی حمایتی ہوتی ہے جو ہر ممکن پروپیگنڈے سے کام لیتی ہے۔ نیم خواندہ یا جاہل عوام کا تو ذکر ہی فضول ہے۔ عاقل اور پڑھے لکھے تک اس ماحول اور ایسی فضا میں حق و ناحق میں تمیز نہیں کر سکتے اور (Mass Psychology) کے غلبہ میں آ ہی جاتے ہیں۔ ممکن ہے کہ کچھ غیر معمولی فہم و فراست کے لوگ اس طوفانِ بدتمیزی میں بھی اپنے ہوش و حواس درست رکھ سکیں، پھر بھی حکومت کے خلاف کب آواز بلند کر سکیں گے؟ اور اگر بفرضِ محال یہ بھی مان لیا جائے تو پھر وہاں ان کی سنتا کون ہے؟

یہ اُصولی اعتراض تھا لیکن درحقیقت روس میں اتنا بھی نہیں ہوتا۔ کہنے کے لئے تو حکومت سوویٹس کے قبضہ میں ہے اور سوویٹس پر "کلکٹوز" قابض ہیں۔ لیکن واقعتاً وہاں (Communist Party) مطلق العنانی ہے۔ یہ کون نہیں جانتا کہ روس میں اسٹالین کیا حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن اکثر حضرات کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ اسے روسی حکومت سے کچھ بھی تعلق نہیں ہے۔ وہ محض کمیونسٹ پارٹی کا جنرل سکریٹری ہے۔ پھر پارٹی کے ممبران کچھ ہی کیوں نہ ہوں لیکن اتنے منظم ہیں کہ کلکٹو اور سوویٹ میں ان کے سوا دوسرے کی رسائی نہیں ہوتی پھر یہ بات بھی نہیں کہ صرف ان کی تنظیم یا بے لوث خدمت قوم انھیں برسرِ اقتدار کئے ہوئے ہے، بلکہ اس پارٹی کی قوت کا راز روس کی خفیہ پولیس یعنی (O.G.P.U.) میں پوشیدہ ہے۔ جس کے مظالم کی داستان لیول کے ہیبتناک افسانوں سے کم روح فرسا نہیں، حکومت یعنی پارٹی کے خلاف کسی کی مجال نہیں کہ اشارتاً بھی کچھ کہہ سکے۔

روسی قتلِ عام کی داستانوں سے کون واقف نہیں؟ ملک میں اخبارات بھی ہیں۔ جلسے بھی ہوتے ہیں۔ تجویزیں بھی پاس کی جاتی ہیں، لیکن ہوتا وہی ہے جو حکومت چاہتی ہے۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ روس میں عوام

کی زندگی وبالِ جان ہوگئی ہے ملک اس قید و بند کی وجہ سے بغاوت پر آمادہ ہے۔ روسی صدیوں سے اسی قسم کی زندگی کے عادی ہیں۔ زار کے زمانہ میں بھی حکومت کے خلاف لب کشائی ناممکن تھی، اسی وقت بھی شاہی پولیس کے مظالم کچھ کم نہ تھے اور دوسری قسم کی پابندیاں بھی آج کی پابندیوں سے کہیں زیادہ تھیں اور یہ ایک حقیقت ہے کہ روس کے لئے زار کی حکومت کے مقابلہ میں بولشیوک حکومت ہر لحاظ سے بہتر ثابت ہوئی ہے۔

اب روس کی اس کمیونسٹ پارٹی کا جرمنی کے نازی اور اٹلی کی فاسسٹ پارٹی اور ان کا حکومت پر جو اقتدار ہے اس سے مقابلہ کیجئے تو یہ تمیز بھی دشوار ہو جائے گی کہ کون کس کا چربہ ہے۔

یہاں میں نے صرف تین ہی اصول سے بحث کی ہے۔ لیکن انھیں اصول کو لیا ہے جو اشتراکیوں کے لئے مایۂ ناز ہیں۔ بہرحال میرا مقصد صرف یہ دکھلانا ہے کہ کوئی حکومت محض اچھے اصول بنا کر کامیاب اور دوسروں کے لئے قابلِ تقلید نہیں ہو سکتی۔

گلاب چند

چند سیاسی کتابیں

جدید دستور کا خاکہ:- از جناب زین العابدین احمد صاحب مترجمہ جناب شفیق الرحمٰن صاحب قدوائی بی۔ اے (جامعہ) یہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا ایک پمفلٹ ہے، جو موجودہ سیاسی گتھی کو سمجھنے کے لئے بہت ضروری ہے قیمت ۲ر

دیہی جنس:- دیہی جنس اور دیہات کی نئی تعمیر پر ایسی کتاب جو دیہات سدھار کے کام کرنے والوں کے لئے مفید ہے از جی۔ سی کمار پا صاحب۔ قیمت ۲ر

ہندوستان میں زراعت کا مسئلہ:- از زین العابدین مترجمہ مولوی شفیق الرحمٰن صاحب قدوائی بی۔ اے (جامعہ) اس مختصر سے پمفلٹ میں کاشتکاروں کی کثرت اور زمین کی قلت کسانوں کے افلاس اور انکے قرضے وغیرہ سے بحث کی گئی ہے قیمت

شہری آزادی:- اس کتاب میں بیرونی ممالک کے انجمنوں اور اُن کے شہری حقوق کا ذکر کرتے ہوئے اعداد و شمار ... کہ کس طرح موجودہ حکومت ہندوستانیوں کو انکے حقوق سے محروم کرنے کے درپے ہے جن سے اُن کی زندگی وابستہ ہے۔ قیمت

ہندوستان میں برطانوی حکومت:- از ڈاکٹر زین العابدین صاحب یہ تو سب جانتے ہیں کہ برطانیہ ہندوستان کو ... کر رہا ہے لیکن بہت کم لوگ یہ جانتے ہیں کہ کس طرح اور کس حد تک لوٹا جا رہا ہے۔ اسکے سمجھنے کے لئے یہ کتاب پڑھئے جس میں برطانوی سامراج کی اقتصادی اور مالی پالیسی کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ قیمت ۸ر

منیجر نگار لکھنؤ

دنیائے آب کی کہانی

کرۂ زمین کا چوتھائی حصہ خشکی ہے باقی تین چوتھائی پانی۔ حصۂ آب کا رقبہ ۱۴ کرور مربع میل سے زیادہ ہے جو زمین کے شمالی حصہ میں ۶۱ فی صدی پایا جاتا ہے اور جنوبی حصہ میں ۳۹ فی صدی۔

ہر سال پانی کی ایک تہ ۱۲ فٹ ۹ انچ کی موٹی، بھاپ بنکر اُڑ جاتی ہے، گویا بہ الفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ ۵۲..،...،...،...،...،... فٹ مکعب، یا ...،...،...،...،۱۵۰۰ ٹن پانی ہر سال سورج کی گرمی کے نذر ہو جاتا ہے جسکی تلافی بارش اور دریاؤں سے ہوتی رہتی ہے۔ قطبین کے علاقہ میں پانی ایک اور شکل میں بھی پایا جاتا ہے، جس کا نام تودۂ برف ہے ان تودوں کا نہایت ہی تھوڑا حصہ ہر سال پگھلتا ہے، ورنہ اگر یہ تمام تودے پگھل جائیں تو سوائے اونچے پہاڑوں کی چوٹیوں کے ساری دنیا غرقِ آب ہو جائے۔

سب سے بڑے تودے، گرین لینڈ کے سمندر میں پائے جاتے ہیں۔ آپ کو یہ سُن کر شاید حیرت ہوگی کہ گرین لینڈ کا سمندر بعض جگہ چھ ہزار فٹ کی موٹی تہ میں چار چار لاکھ مربع میل تک منجمد ہو جاتا ہے اور اس سے تقریبًا ایک ارب ٹن پگھلا ہوا پانی ہر سال سمندروں میں پہونچتا رہتا ہے۔

برفیلے تودوں کی تعداد، جو شمال سے جنوب کی طرف بہہ کر آتے ہیں، اوسطًا ۴۲۰ ہے اور اس وقت تک سب سے بڑا تودہ، ۶۵ فٹ اونچا اور ۱۷۰۰ فٹ لمبا دیکھا گیا ہے جس کا وزن کروروں ٹن ہونا چاہئے، جب سنہ ۱۹۱۲ء میں ٹٹانک جہاز برف کے تودوں سے ٹکرا کر غرق ہوا تو تودوں کی دیکھ بھال کرنے کے لئے ایک بین الاقوامی جماعت مقرر کی گئی تاکہ انکو توڑتی رہے اور جہازوں کی آمد و رفت مخدوش نہ رہے، لیکن پوری طرح اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ ایکبار وقتِ واحد میں پانچ سرنگیں لگا کر ایک تودہ کو اُڑانا چاہا لیکن اس کا نتیجہ صرف یہ نکلا کہ تودہ میں صرف پندرہ فٹ گہرا اور ۲۰ فٹ لمبا سوراخ پیدا ہو سکا۔ ایک مرتبہ بہت زیادہ قوی ڈائنامیٹ بجلی کے ذریعہ سے استعمال کیا گیا، لیکن اس نے بھی کوئی اثر نہ کیا۔

تودوں کا بہت بڑا حصہ (تقریبًا ۸۰ فٹ کا) پانی کے نیچے رہتا ہے، اس لئے جب وہ کبھی سمندر کے گرم چشموں میں پہونچ جاتے ہیں، تو پگھلنے لگتے ہیں اور بہت سے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہو کر فنا ہو جاتے ہیں۔

سمندروں کے متعلق یہ خیال کرنا کہ کبھی وہ خشک ہو سکتے ہیں بالکل مہمل ہے، بعض کا خیال ہے کہ سمندروں کا جتنا پانی بھاپ بنکر اڑتا ہے، اتنا انھیں واپس نہیں ملتا۔ بعض کو یہ بھی اندیشہ ہے کہ سمندروں کے پانی کے دباؤ سے کسی وقت زمین کا شق ہو جانا بھی ممکن ہے۔ ایک امریکن ماہر کا بیان ہے کہ ان بلورات کے لئے جو سمندروں کی تہ میں بنتے رہتے ہیں پانی کی ضرورت ہوتی ہے اور جتنا پانی ان میں ہر سال صرف ہوتا ہے اس سے یہ اندازہ کیا جاتا ہے کہ سمندر کا پانی ہر سال دس انچ کم ہو رہا ہے اور اس طرح گویا بارہ ہزار سال میں اسے خشک ہو جانا چاہئے، لیکن آسٹریلیا کے ایک ماہر کی رائے اس کے خلاف ہے وہ کہتا ہے کہ گزشتہ دس ہزار سال کا تجربہ بتاتا ہے کہ سمندروں کے پانی میں کوئی کمی نہیں آئی ہے، اس لئے یہ خیال کہ کسی وقت سمندر خشک ہو جائیں گے بالکل بے معنی ہے۔

کرۂ ارض کے پانی کی تقسیم جغرافیہ والوں نے مختلف سمندروں کے نام سے کی ہے۔ تین بڑی بڑی تقسیمیں یہ ہیں بحر پاسفک، بحر اٹلانٹک، بحر ہند۔ بعض نے قطبین کے حصۂ آب کے بھی علٰحدہ نام رکھے ہیں، لیکن حقیقتاً وہ ہیں انھیں تینوں سمندروں کے حصے۔

ان سمندروں میں بحر پاسفک سب سے بڑا اور بہت زیادہ گہرا سمندر ہے۔ شمالاً جنوباً ۹۶۳۰ میل تک چلا گیا ہے اور شرقاً غرباً ۱۰۶۰۰ میل تک۔ اس کی گہرائی کا اوسط ۱۴۰۰۰ فٹ سے کچھ زاید ہے۔ سواحل جنوبی امریکہ کی طرف اس کی گہرائی ۱۸ ہزار سے ۲۵ ہزار فٹ تک دریافت ہوئی ہے اور جزایر فلپائن کے پاس ۳۵ ہزار فٹ تک۔ یعنی اگر ایورسٹ کی چوٹی جو دنیا کی سب سے اونچی چوٹی ہے اس حصۂ آب میں ڈالدی جائے اور اس کے اوپر برطانیہ کا سب سے اونچا پہاڑ، بن نوس (Ben Nevis) اُٹھا کر رکھدیا جائے، تو بھی دو ہزار فٹ پانی ان کے اوپر نظر آئے گا۔ نیوزیلینڈ کے شمال مشرق اور جزیرہ گوام (Guam) کے قریب بھی جو جزائر فلپاین کے پاس ہے ۳۱ ہزار فٹ تک گہرائی دریافت کی گئی ہے۔

بحر پاسفک کا پچاسواں حصہ ایسا ہے جو ۲۳ ہزار فٹ سے زیادہ گہرا ہے اور ایک چوتھائی سے زیادہ ۱۶ اور ۲۰ ہزار فٹ کے درمیان گہرا ہے۔

ایک مسافر جو شمالی افریقہ سے ہندوستان کی طرف سفر کرتا ہے، وہ بحر ہند میں اکثر یہ نظارہ دیکھتا ہے کہ رنگین روشنیاں پانی کی موجوں سے کھیل رہی ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ جب برشگالی ہوائیں سمندر میں تموج پیدا کر دیتی ہیں اور بڑی بڑی لہریں اُٹھنے لگتی ہیں تو آفتاب کی روشنی ان میں یہ گُل کھلاتی رہتی ہیں۔

بحر ہند کی گہرائی کا اوسط ۱۳ ہزار فٹ ہے گویا بحر اٹلانٹک کی گہرائی کے اوسط سے ۱۲۰ فٹ زیادہ۔ چھوٹے سمندروں میں آرکٹک کی گہرائی کا اوسط سب سے کم ہے یعنی ۴ ہزار فٹ۔ بحر روم کی گہرائی کا اوسط اس سے ۲ ہزار فٹ زیادہ

سب سے چھچھلا پانی خلیج فارس کا ہے یعنی اوسطاً ۸۴ فٹ - بالٹک کا پانی اس سے دو چند گہرا ہے اور انگلش چینل (نہر انگلستان) اس سے بھی کچھ زیادہ یعنی اوسطاً ۱۹۲ فٹ - بحیرۂ شمالی (North Sea) البتہ نسبتاً گہرا ہے اور اس کی گہرائی کا اوسط ۳۱۲ فٹ ہے -

جس طرح ہم کو زمین پر پہاڑ اور وادیاں وغیرہ نظر آتی ہیں، اسی طرح سمندر کے اندر بھی موجود ہیں بعض مقامات پر سمندری پہاڑوں کی چوٹیاں پانی کے اوپر نکل آئی ہیں اور انھیں کا نام جزایر ہے، چنانچہ جزائر گلاپوگس (Galapagos) جو جنوبی امریکہ کے مغربی ساحل کی طرف پائے جاتے ہیں، اس سلسلۂ کوہ کی چوٹیاں ہیں جو آبنائے پناما سے جنوب مشرق کی طرف پانی کے اندر ہی اندر چلا گیا ہے -

مغربی بحر پاسفک میں بکثرت جزایر پائے جاتے ہیں اور وہ سب کے سب سمندری پہاڑوں کی چوٹیاں ہیں شمالی اٹلانٹک میں ایک سلسلۂ کوہ ۱۲۰۰ فٹ کی گہرائی میں اندر ہی اندر چلا گیا ہے جو اسکاٹ لینڈ کو آئس لینڈ سے ملاتا ہے - الغرض اسی طرح کے بہت سے سلسلے پہاڑوں کے پانی کے اندر پائے جاتے ہیں، شمالی اٹلانٹک میں سلسلۂ کوہستان بہ نسبت وسطِ اٹلانٹک کے کم پایا جاتا ہے، جہاں بعض پہاڑوں کا سلسلہ ۷۰۰۰ میل تک چلا گیا ہے -

بحرِ ہند میں سماترا کے مغرب اور جاوا کے جنوب میں ایک متوازن سلسلہ پہاڑیوں اور وادیوں کا نہایت عجیب غریب پایا جاتا ہے - پہلے ایک وادی مابین جزایر سماترا و نساوی پائی جاتی ہے جو ماوراء جاوا بارہ ہزار فٹ گہری ہے اور اسی کے متوازی ایک سلسلۂ کوہ چلا گیا ہے - اس کے بعد پھر دوسری وادی بالکل متوازی ۲۱ ہزار فٹ کی ملتی ہے اور پھر ایک سلسلۂ کوہ اسی کے ساتھ ساتھ چلتا نظر آتا ہے -

---

سمندر کی سطح کبھی ساکن نہیں ہوتی اور اس کا پانی ہمیشہ مدوجزر میں رہتا ہے، اسی لئے اس کا درجۂ حرارت بھی ۲۴ گھنٹے میں ایک نہیں رہتا - دن میں ہوا کے ٹمپریچر کے مقابلہ میں اس کا ٹمپریچر ایک ڈگری زیادہ رہتا ہے اور رات کو ڈیڑھ ڈگری گرم -

سمندر کا پانی اپنی حرارت بالکل سورج سے حاصل کرتا ہے گو تھوڑی مقدار حرارت کی اندرون زمین سے بھی اسے پہونچتی رہتی ہے - سورج کی کرنیں کس گہرائی تک اپنا کام کرتی ہیں اور وہ کس مقدار کی حرارت پانی میں پیدا کر سکتی ہیں، اس کا صحیح علم ابھی تک حاصل نہیں ہو سکا، لیکن ایک بار تحقیق سے یہ ضرور معلوم ہوا تھا کہ ایک صاف روشن دن میں جبکہ ہوا نہ تھی، ۶۵ فٹ کی گہرائی میں بحر روم کا پانی بہ نسبت سطح کے ½ ڈگری زیادہ گرم تھا -

سطحِ آب سے لیکر بارہ ہزار فٹ کی گہرائی تک سمندروں کا ٹمپریچر معلوم کرنے کی بہت کوشش کی گئی ہے، لیکن اس کے نتائج ایسے نہیں، جن کی بنا پر کوئی کلیہ قایم ہو سکے - خطِ استوا پر واقع ہونے والا حصۂ آب اور خطِ استوا سے

اِدھر اُدھر بٹے ہوئے حصہ میں سورج کی گرمی کا اثر ضرور مختلف ہوتا ہے، لیکن اس میں بھی کوئی یکسانیت نہیں ہو اور مختلف موسموں میں اتنی کمی بیشی ہوتی رہتی ہے کہ اس کی بنا پر کوئی اصول نہیں متعین کیا جا سکتا۔

گرمی کے زمانہ میں دنیا کا سب سے زیادہ گرم حصۂ آب خلیج فارس ہے جس کا ٹمپریچر اس زمانہ میں ۹۶ ڈگری رہتا ہو بحر احمر (Red Sea) بھی تقریباً اتنا ہی گرم رہتا ہے، یعنی ۹۴ ڈگری۔ خلیج بنگال اور اسی طرح خطِ استوا پر واقع ہونے والے بحر ہند کے اور حصوں میں بھی بارش سے پہلے درجۂ حرارت ۸۶ تک پہونچ جاتا ہے۔ جاپان کے شمالی مشرقی حصۂ آب کا ٹمپریچر بہت بدلتا رہتا ہے یعنی جب کم ہوتا ہے تو ۲۰ ڈگری تک گر جاتا ہے اور بڑھتا ہے تو ۸۲ تک پہونچ جاتا ہے، اس کا سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ وہاں زمین کے اندر سے کبھی گرم چشمے اُبلتے ہیں اور کبھی سرد۔

سمندروں کے ٹمپریچر پر مقدارِ نمک کا اثر ہوتا ہے، یعنی جس حصۂ آب میں جتنا زیادہ نمک پایا جائے گا، اتنا ہی زیادہ سرد ہوگا۔

سمندر کا پانی خالص پانی نہیں ہے، بلکہ اس میں بہت سی اور چیزیں بھی ملی ہوئی ہیں۔ اسوقت تک دنیا میں ۹۰ عناصر دریافت ہوئے ہیں جن میں تیس سمندروں کے پانی میں ملتے ہیں، یہاں تک کہ سونا اور چاندی بھی پانی میں موجود ہے، لیکن اتنی کم مقدار میں کہ اس سے کوئی تجارتی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ نمک اور نمک والے عناصر البتہ اس میں زیادہ پائے جاتے ہیں۔

بحر اٹلانٹک سب سے زیادہ نمکین سمندر ہے، اس کے بعد بحر ہند کا نمبر ہے۔ خطِ استوا پر واقع ہونے والے حصوں میں نمک زیادہ پایا جاتا ہے اور قطبین کے حصوں میں سب سے کم۔ خلیج فن لینڈ اور بوتھنیا کا پانی نسبتاً بہت صاف ہے۔

سمندروں کے پانی کا نمک نکال کر اس کو پینے کے قابل بنانا آسان ہے۔ اس کا طریقہ قدیم سیاحوں کو بھی معلوم تھا اور اب تو خیر یہ عام بات ہو گئی ہے۔

سمندر کے پانی کو گہرے نیلے رنگ کا کہتے ہیں جو بظاہر صحیح معلوم ہوتا ہے، لیکن شاید حقیقت یہ نہیں ہے، آپ اگر بلندی سے اسکو دیکھیں تو پچھلا پانی سبز نظر آئے گا، جس کا سبب یہ ہے کہ اس میں ریت ملی رہتی ہے۔ گہرے حصوں میں بھی بعض جگہ رنگ سبز نظر آتا ہے، جس کا سبب ان بیشمار کیڑوں کا جھنڈ ہے جو چھوٹی مچھلیوں کی غذا کے لئے قدرت نے سمندروں میں پیدا کئے ہیں۔ شمالی اٹلانٹک اور بحر ہند و بحر پاسفک کے منطقۂ معتدلہ میں پانی کا رنگ عام طور پر واقعی نیلا نظر آتا ہے، لیکن جتنا آپ قطب شمالی کی طرف بڑھتے جائیں گے، اتنا ہی زیادہ سبز ہوتا جائے گا یہاں تک کہ بحیرۂ شمالی کا پانی خالص سبز رنگ کا نظر آئے گا۔ بحر روم کا نیلگوں رنگ بہت مشہور ہے، لیکن صرف مشرقی حصہ کا

مغربی حصہ کا مایل بہ سبزی ہے۔ رنگ کا تعلق پانی کی صفائی سے بھی ہے۔ یعنی پانی جتنا زیادہ صاف ہوگا، اتنا ہی زیادہ نیلگوں نظر آئے گا۔ پانی کی صفائی دیکھنے کے لئے سفید رنگے ہوئے گول توے، اندر ڈالے جاتے ہیں یہاں تک کہ وہ نظر نہ آئیں۔ چنانچہ اسی طریقہ سے سرگاسو (Sargasso) سمندر کا پانی بہت زیادہ شفاف معلوم ہوا ہے، کیونکہ سات فٹ قطر کا توا، ۱۶۲ فٹ کی گہرائی میں بھی وہاں صاف نظر آتا ہے، برخلاف اس کے بحر شمالی میں ۶۰ اور ۱۰۰ فٹ کے درمیان ہی نظر سے غائب ہو جاتا ہے۔ پانی کے اندر کرنوں کے نفوذ کا بھی تجربہ کیا گیا ہے، چنانچہ معلوم ہوا ہے کہ بحر روم میں بارہ ہزار فٹ تک روشنی کا اثر پایا جاتا ہے، لیکن جب ڈاکٹر بیب (Beebe) نے ایک خاص آلہ کے ذریعہ سے، ساحلِ برموڈا کے قریب تک پہونچنے کی کوشش کی تھی، تو دو ہزار فٹ کے بعد انکو سوائے تاریکی کے کچھ نظر نہ آتا تھا۔

لہروں کی پوری ضخامت و قوت کا اندازہ بھی کھلے ہوئے سمندروں ہی میں ہو سکتا ہے۔ کیونکہ دنیا کی کوئی بڑی سی بڑی جھیل ایسی نہیں ہے جہاں لہریں اپنی قوت کے ساتھ اُٹھ سکیں۔ بحر اٹلانٹک، بحرِ ہند اور بحر پاسفک میں چونکہ ہوا بہت زور سے چلتی ہے اس لئے وہاں موجوں کو پوری قوت کے ساتھ اُٹھنے کا موقعہ ملتا ہے۔ مشہور ہے کہ سمندر کی لہر پہاڑ کی طرح اُٹھتی ہے اور وہ واقعی ایسی ہی معلوم بھی ہوتی ہے، کیونکہ جب مسلسل اونچی اونچی لہریں اُٹھتی ہیں اور پانی کے تھپیڑوں سے جو چھینٹے اُڑ اُڑ کر آتے ہیں ان کے اندر سے سامنے کی فضا دھندلی ہو جاتی ہے اور لہروں کی بلندی پہاڑ ہی کی طرح نظر آتی ہے طوفان کے وقت لہروں کی بلندی پہاڑ ہی کی طرح نظر آتی ہے طوفان کے وقت لہروں کی بلندی عموماً چالیس پچاس فٹ ہوتی، گو کبھی کبھی طوفانی حالت میں وہ ستر فٹ تک پہونچ جاتی ہے ورنہ یوں سکون کی حالت میں اس کی بلندی ۲۰ فٹ سے زیادہ نہیں ہوتی۔

اگر ہوا کا رُخ بھی وہی ہو جو سمندر کے ہیجان کا ہے اور اس کی رفتار زیادہ ہو تو لہروں کا تسلسل بہت بڑھ جاتا ہے۔ لہروں کی قوت ڈھلواں ساحلوں پر بہت بڑھ جاتی ہے۔ بحر اٹلانٹک اور بحرِ شمالی میں لہروں کا دباؤ فی مربع فٹ ۳ ½ ٹن دریافت کیا گیا ہے، حالانکہ سڑک کو ٹھنے والے رولر کا دباؤ فی مربع فٹ ایک ٹن کے قریب ہوتا ہے۔

سمندر کی تباہ کاریاں تو ظاہر ہی ہیں، لیکن اس کا ایک تعمیری پہلو بھی ہے۔ ۳۵ سال کے عرصہ میں برطانیہ کی ۴۶۶۴ ایکڑ زمین اگر دریا برد ہوئی تو ۴۸ ہزار ایکڑ زمین دوسری جگہ سمندر نے دے بھی دی۔

سمندر کے اندر جتنی دولتیں پنہاں ہیں ان کا اندازہ مشکل ہے، لیکن سب سے بڑی دولت اس کا مگنیشیم ہے۔ یہ ایک چمکدار دھات ہے جس کی چادریں، سلاخیں اور ستون وغیرہ بن سکتے ہیں، اور نئی دنیا نے امیدیں

قایم کی ہیں کہ آیندہ تمام مکانوں کی تعمیر اسی دھات سے ہوگی اور کرۂ زمین ان تعمیروں سے جگ مگ جگ مگ کرنے لگے گی۔

اندازہ کیا گیا ہے کہ جو اشیاء سمندر میں پائی جاتی ہیں ان کے $\frac{1}{250}$ حصہ سے ۶۰ لاکھ ٹن مگنیشیم، گیارہ کرور ستر لاکھ ٹن نمک، ۹ کرور ۴۰ لاکھ ٹن چاندی، ۳۰ لاکھ ٹن سونا حاصل ہو سکتا ہے۔ مونگا بھی سمندر کی بڑی دولت ہے جسکا علم عہدِ قدیم کے انسان کو بھی تھا، اور موتی کی قدر و قیمت تو خیر سبھی کو معلوم ہے۔

بعض چھوٹے چھوٹے سمندر ایسے ہیں جن کے چاروں طرف خشکی کا حصہ ہوتا ہے اور اصطلاح میں ان کا نام بحرِ محاط (Inland Sea) ہے۔ اس قسم کے سمندروں میں سب سے بڑا بحر خزر (Caspian Sea) ہے، جس کا رقبہ ایک لاکھ ستر ہزار مربع میل ہے۔ ان کو ہم ایک لحاظ سے جھیل بھی کہہ سکتے ہیں، یہ جھیلیں پہاڑوں میں بھی پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ ایورسٹ کی چوٹی پر بھی ایک جھیل ہوائی جہاز سے دیکھی گئی ہے، لیکن وہاں تک کوئی پہونچ نہیں سکا۔ یہ جھیل بہت چھوٹی ہے، مگر بڑی جھیلوں میں سب سے اونچی جھیل ٹٹی کاکا ہے جو جنوبی امریکہ کے پہاڑ میں سطح آب سے ۱۲۵۰۰ فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ بعض جھیلیں ایسی ہیں جو سطح آب سے بہت نیچے واقع ہیں۔ ان میں بحرِ مُردہ Dead Sea خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے یہ سمندر کی سطح سے ۱۲۹۲ فٹ نیچے واقع ہے۔

گہری جھیلوں میں سب سے زیادہ مشہور سائبیریا کی بیکال جھیل ہے جس کی گہرائی کا اوسط ۲۳۰۰ فٹ ہے، لیکن بعض جگہ اس کی گہرائی اس سے دوچند ہے۔ افریقہ کی جھیل ٹنگانیکا دنیا کی سب سے لمبی جھیل ہے جو ۴۵۰ میل تک چلی گئی ہے اور گہری بھی بہت ہے یعنی بعض مقامات پر اس کی گہرائی ۴۷۰۰ فٹ ہے۔

یوروپ کی سب سے بڑی جھیل لڈوگا ہے جو روس اور فن لینڈ کے درمیان سرحد پر واقع ہے اس کا رقبہ سات ہزار مربع میل ہے، لیکن گہرائی بہت کم ہے یعنی صرف ۷۳۰ فٹ۔

سب سے بڑا دریا دنیا کا وہ ہے جو مسوری (Missouri) اور مسی سپی (Mississippi) سے مل کر بنتا ہے۔ یہ امریکہ میں واقع ہے اور اس کی لمبائی چار ہزار دو سو میل ہے۔

اس دریا سے ۱۲۵۰۰۰۰ مربع میل زمین میں آبپاشی ہوتی ہے جو امریکہ کا ایک تہائی حصہ ہے۔ دریائے ایمزن بھی چار ہزار میل کا لمبا دریا ہے اور اس سے ۲۷۲۲۰۰۰ مربع میل زمین سیراب ہوتی ہے یہ دریا اتنا چوڑا ہے کہ ۲۳۰۰ میل تک اس میں بڑے بڑے جہاز چلے جاتے ہیں اور ۵۰۰ میل تک چھوٹے جہاز۔ اس کی گہرائی کا اوسط ۱۲۰ فٹ ہے۔ بارش کے زمانہ میں اس کا پاٹ کہیں کہیں ۵۰ میل کا ہو جاتا ہے۔ اس کا دہانہ ۲۰۰ میل چوڑا ہے۔

دریائے نیل بھی دنیا کا نہایت مشہور دریا ہے۔ یہ ۴۰۵۰ میل لمبا ہے، لیکن رقبۂ آبپاشی بہت کم ہے۔

بعض دریا ایسے بھی ہیں جو اپنا راستہ بدلتے رہتے ہیں۔ مثلاً مسی سپی، یا شمالی چین کا یلو (Yellow River)

بعض ایسے دریا بھی ہیں، جو سمندر میں نہیں گرتے۔ ان میں وسط ایشیا کا دریائے تارم بہت مشہور ہے۔

دنیا کی سب سے اونچی آبشار امریکہ کی ونی زولا ہے۔ یہ ایک میل کی بلندی سے گرتی ہے اور اتنا شور پیدا کرتی ہے گویا ہزاروں گھنٹے بجائے جا رہے ہیں۔ ہندوستان میں آبشار جوگ جو (Western Ghat) میں واقع ہے ۸۳۰ فٹ کی بلندی سے گرتی ہے۔ برٹش گائنا کی ایک آبشار ۸۲۲ فٹ کی بلندی سے گرتی ہے اور ۷۴۱ فٹ تک تو بالکل عمودی شکل میں گرتی ہے۔

چوڑی آبشاروں میں امریکہ کی نیاگرا بہت مشہور ہے جس کی چوڑائی چار ہزار فٹ ہے، اس کے بعد افریقہ کی کی آبشار وکٹوریا ہے۔

ل۔ احمد صاحب کے افسانے

انشائے لطیف:۔ اردو ادب میں صاحب "لالہ رخ" کا نام محتاج تعارف نہیں اور افسانہ نویسی میں جو معیار ل۔ احمد صاحب نے پیش کیا ہے وہ اپنی جگہ ایک مثال ہے۔ ان کا ہر افسانہ علم و حکمت، جذبات، واردات اور نفسیات کی بولتی تصویر اور اردو ادب میں مستقل اضافہ ہوتا ہے یہ چند افسانوں کا مجموعہ ہے۔ آپ کو اگر سلاست زبان کے ساتھ نفسیات شباب اور جذبات حسن و عشق کی صحیح نقاشی دیکھنا ہے اور ادب و شعریت کا ذوق ہے تو اس مجموعے کو دیکھئے، پونے تین سو صفحات۔ قیمت مجلد دو روپیہ۔

نغمات:۔ اس مجموعہ میں جناب ل۔ احمد صاحب کے ساتھ مختصر ترین فسانے اور ادب پارے شامل ہیں، جسے نثری شاعری کے شہ پاروں کا ایک وجد آفریں کارنامہ کہا جا سکتا ہے۔ اردو کی لطافت و نفاست کا اندازہ کرنے کے لئے اس انتخاب کا دیکھنا ازبس ضروری ہے۔ ۱۳۶ صفحے۔ قیمت مجلد ایک روپیہ۔

زندگی کے کھیل:۔ ل۔ احمد صاحب کی بارہ کہانیوں کا نیا مجموعہ ہے جس میں معاشرتی خرابیوں اور فلاکت زدہ سماج کی زندہ تصویریں دیکھی جا سکتی ہیں۔ ۱۵۰ صفحات قیمت مجلد ایک روپیہ۔

محبت کا فسانہ:۔ یہ ایک طویل فسانہ ہے جس میں ل۔ احمد صاحب نے مسرت ازدواج سے بحث کی ہے لیکن اس غایت تصنیف کے ساتھ ساتھ اس کا ہر باب ایک مستقل فسانہ ہے اور ہر باب میں معاشرتی و اخلاقی مسایل پر حکیمانہ نظر ڈالی گئی ہے۔ ساڑھے تین سو صفحات قیمت مجلد دو روپیہ۔

منیجر نگار۔ لکھنؤ

بڑا گھر

سب کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ باپ، چچا، بھائی اور سب رشتہ دار رو رہے تھے، کیونکہ آج بالیش کی رخصتی ہو رہی تھی مگر سب کے دلوں میں تسلی سی تھی، کیونکہ اُن کو یقین تھا کہ اپنے خاوند کے گھر جا کر اس کو ضرور سکھ ملے گا جو اس کو اپنے باپ کے گھر میں نہ مل سکا تھا۔ ماں نہ ہونے سے کسی کو بہت کم سکھ مل سکتا ہے۔ سب بالیش کو گھیرے ہوئے تھے اور آنکھوں میں آنسو لیکن دلوں میں خوشی لے کر بالیش سے مل رہے تھے۔ مگر بالیش، ان سبھوں سے آنکھوں میں آنسو ہی لئے ہوئے مل رہی تھی۔ اُس نے اپنے دل میں خوشی کو ٹٹولا۔ تو اس کا نام و نشان کہیں نہیں ملا۔ آنے والے زمانہ میں بھی دور تک اُس کی نظر گئی۔ مگر وہاں بھی اس کی خوشی کا پتہ نہ چلا۔

بہت دنوں سے بالیش اور روپ ایک ہی مقام کی طرف منزلیں طے کرتے چلے آ رہے تھے جہاں وہ دونوں ایک ہو جاویں گے۔ آخر کو دونوں نے پہلی منزل پار بھی کر لی تھی اور اس مقام کا نظارہ بھی وہ کرنے لگے تھے۔ ہماری زندگی میں پہلی منزل ہوتی ہی ایسی ہے کہ جب ہم کسی سے قول قرار کرتے ہیں تو اس کو پورا کرنے کا ارادہ ہمارے دلوں میں ایسا سما جاتا ہے، جیسے کہ پیپل کی جڑ زمین میں۔ اور یہی محبت کی پہلی منزل ہے۔ اس منزل کو پار کر کے دونوں کبھی پیچھے لوٹنے کا خیال نہیں کرتے چاہے آگے کتنی تباہیوں کے منظر ہوں۔ بلکہ تباہیوں کے منظر تو ان کو اور آگے بڑھنے پر آمادہ کر دیتے ہیں تا کہ اگر ان کے ایک ہو جانے کا مقام ان کی پہونچ سے باہر ہو تو وہ بھی ان تباہیوں میں فنا ہو جاویں پہلی منزل ان دونوں نے پار کر لی تھی۔

ان دونوں کی نظروں کے سامنے پہلی منزل کے آگے کوئی مشکل نظر نہ آ رہی تھی! ایک دوسرے کا مل جانا دونوں کو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا جنت مل گئی۔ روپ دولتمند نہ تھا۔ مگر فقیر بھی نہ تھا۔ اس کے پاس جائداد بھی تھی اور وہ سو روپیہ کا نوکر بھی تھا۔ مگر وہ اتنا دولتمند نہ تھا جتنا اس کے چچا اور اُس کے باپ چاہتے تھے۔ مگر بالیش کو تو یہ دیکھنا تھا کہ اُسکے ارمان روپ پورے کر سکتا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور دولت!۔ دولت نہ سہی، روپ کے پاس محبت کا تو ذخیرہ تھا۔ بالیش اپنے دل میں محبت چھپائے بیٹھی تھی۔ ماں کے مرنے کے بعد محبت مشکل سے ہی ملتی ہے اور بالیش محبت چاہتی تھی۔ دولت نہیں۔ اس لئے ان دونوں کے ملنے میں مشکلیں کیونکر حائل ہو سکتی تھیں۔ مگر اُس کے والدین

کی خواہش کو کیا کیا جائے۔ وہ چاہتے تھے کہ اس کی شادی کسی بڑے گھر میں ہو اور ان کے ساتھ ساتھ دنیا کی رکاوٹوں کو کیسے پار کیا جاوے!

دنیا ایک دوسرے کو مشکل سے سکھی دیکھ سکتی ہے۔ دونوں کو پہلی منزل سے پار ہوتے دیکھ کر دنیا والے آنکھ پھاڑتے ہوئے بالیش کے پتا کے پاس آئے اور بولے "ارے یہ کیا کیا۔ تمہاری سمجھ کہاں چلی گئی۔ اپنی لڑکی کو کہاں جھونکنے کا ارادہ کر لیا ہے"۔ ان طعنوں کے آگے ایک انسان کہاں تک کھڑا رہ سکتا ہے! بالیش کے پتا کو ان طعنوں کے سامنے اپنا سر جھکانا پڑا۔ بالیش کے کانوں میں بھی ان باتوں کی بھنک پڑی اور روپ کے ساتھ اس کی شادی نہ ہو سکی۔

بالیش نے اپنے خاوند کے ساتھ بڑے گھر میں قدم رکھا۔ اُسے ایسا معلوم ہوا گویا ایک سنسان جنگل میں ڈال دیا ہے جہاں اس کو کوئی پھول نظر نہیں آتا۔ اپنے دل کے پھول کو۔ ٹوٹے ہوئے۔ مرجھائے ہوئے پھول کی پنکھڑیوں کو۔ وہ راستے میں بکھیرتی چلی آرہی تھی اور یہاں پہونچی تو اس کے دل میں مہک کا پتہ نہ تھا۔ بادِ خزاں آئی اور باغ کو اُجاڑ کر گئی۔

بڑا گھر۔ ہاں بالیش نے دیکھا کہ گھر تو لمبائی چوڑائی میں بہت بڑا ہے۔ تین منزلہ مکان آسمان سے باتیں کر رہا ہے۔ صحن اتنا بڑا کہ ہزاروں آدمی اُس میں بیٹھ سکتے ہیں! کمرے بھی کافی بڑے تھے اتنے بڑے کہ ان میں بالیش کی نظر بھی کھو جاتی تھی۔ غرض یہ کہ گھر تو واقعی بہت بڑا تھا۔!!

بڑے گھر کی سی کیفیتیں بھی بالیش کو ملیں

اس کے کانوں میں قہقہوں کی آواز بھی آتی تھی اور ان قہقہوں سے بلند ایک سریلی آواز بالیش کے سینے کو چیرتی پھاڑتی نکل جاتی تھی! ایسا تو بڑے گھروں کا قاعدہ ہی ہے نہیں تو بڑا گھر کیسے معلوم ہو!

"ساری بہت اچھی ہے" بالیش کہتی

"مگر آج کیسے خریدی جا سکتی ہے؟ دوستوں نے مجھے پارٹی پر مجبور کر لیا ہے اس میں بھی تو روپیہ خرچ ہوگا پارٹی کے لئے روپیہ نہیں۔ مگر پارٹی نہ کریں تو ناک جو کٹ جاوے گی۔ بڑا گھر پھر کیسے رہے گا۔ دولت کو دونوں ہاتھوں سے صرف کرنا ہی تو بڑے گھر کی نشانی ہے۔ پارٹی کے لئے تو۔ روپیہ کہیں سے لانا ہی پڑے گا—— ساری کے لئے نہیں۔ چاہے وہ کتنی ہی اچھی ہو!

"گھر میں بارہ بجے کیوں آئے"،

"ارے راستہ میں دوست روک لیا کریں تو کیا اُن سے ہاتھ چھڑا کر بھاگ آیا کروں ------ ادھر "ایسا قاعدہ ہمارے گھر کا نہیں ہے۔ بڑے گھروں کے قاعدوں سے چلنا ہوگا۔ ہمارے گھر کو نہ ڈبوؤ! اسکی ساس کہتی

"ارے آج پیالے کس نے توڑ دئے" اور بالیش کی طرف نگاہ کرکے کہنے لگی - "یہی ہوگی" پیالہ بالیش کے سامنے آکر گرا اور ایک ٹکڑا بالیش کے ماتھے سے لگا!

"پیالے روزانہ ٹوٹیں گے تو کہاں سے آویں گے"

"آج ہی تو پیالہ ٹوٹا ہے" اس کے بعد دو آنسو ٹپ ٹپ زمین پر گر گئے -

"بس چپ رہ! میرے اوپر شیر ہوکر چڑھتی ہے! آج تک تیرے سسر بھی میرے اوپر شیر ہوکر نہ چڑھے! یہ بڑے گھر کی بہوؤں کا کام نہیں کہ پلٹ کر جواب دیں"

"ہاں بڑے گھر میں اتنے نوکر ہوتے ہیں وہ بھی تو جواب اُلٹ کر نہیں دیتے"

بالیش کا سینہ چیرتی ہوئیں یہ آوازیں نکل جاتیں اور وہ سرد آہیں بھر کر رہ جاتی - ان سرد آہوں کا خیال اُسکے پتا نے کبھی نہیں کیا تھا - اتنا بڑا گھر ہے جہاں دولت کی بوچھار ہوگی - اتنے آدمی ہیں - لڑکی کے لئے ان کو سکھ ہی سکھ نظر آرہا تھا - مگر بالیش کا دل جانتا تھا کہ کتنا سکھ اُس کے پاس ہے -

ایک لق و دق میدان جس میں ایک تھکے مسافر کی نگاہ کھو جاتی ہے - ایسا ہی وہ بڑا گھر تھا آدمیوں کی بھی اُس میں بھیڑ تھی - مگر وہ اپنے کمرہ میں اپنے آپ کو اتنا اکیلا محسوس نہ کرتی جتنا وہ اس بھیڑ میں محسوس کرتی! دیکھنے کو تو وہ گھر کھچا کھچ نوکروں، رشتہ داروں سے ہر وقت بھرا رہتا تھا - مگر بالیش کے لئے وہ ایک ریگستان سے بھی زیادہ سنسان تھا اس گھر میں خلوص و محبت کا تو گزر تھا ہی نہیں، ہمدردی تو کوئی جانتا ہی نہ تھا! نوکروں کا قافلہ اِدھر سے اُدھر حکم بجاتا ہوا نکل جاتا تھا - بالیش کو بھی اپنی ساس کا حکم بجالاتے سارا دن نکل جاتا تھا - حکم بجالانے میں پیار و محبت کہاں بالیش گم رہا کرتی! کچھ تکلیف ہوتی تو شکوہ شکایت کی بجائے دو آنسو آنکھوں سے ٹپکا دیتی - روتا دیکھ کر اس کی ساس اُس سے کہتی "کیسی مکار ہے آنسوؤں سے کام لینا چاہتی ہے!" نہ تو بالیش کو روتے ہی بنتا تھا نہ ہنستے ہی! اگر کبھی اکیلی کسی کونہ میں بیٹھنے کا موقع مل جاتا تو بیشک وہ دل کھولکر رو لیا کرتی -

اگر دل ایک ہی طرف جما ہو تو تکلیف تکلیف محسوس نہیں ہوتی! اگر ایک بہو کو ایک ہی گھر کا خیال ہو تو وہ سوچ لیتی ہے کہ یہی میرا گھر ہے - چاہے دوزخ ہو چاہے جنت - اس میں کسی نہ کسی طرح سے اپنی زندگی گزارنی ہے ایسی حالت میں تکلیف بھی سہی جا سکتی ہے مگر جب تکلیف دیکھ کر اس کا دل کسی اور کا خیال کھینچ لاتا ہو تو تکلیف دونا دکھ معلوم ہوتا ہے! رات دن بالیش کو یہ خیال ستاتا کہ اگر وہ وہاں جاتی تو ایسا کیوں دیکھنا پڑتا - بالیش نے کبھی سوچا تھا "میں روپ سے سب حال کہہ دیا کروں گی - ارے - وہ تو پہلے ہی میرا سب حال جانتے ہیں" اُس کے منہ پر شرم کی لال جھلک دوڑ آتی! کبھی اُس نے انگلیوں پر مہینے شمار کئے تھے ہفتے شمار کئے تھے - دن گنے تھے کبھی وہ یہ خیال کرکے اُچھل پڑتی تھی کہ اب تو روپ سے ملنے کے تھوڑے ہی دن باقی ہیں - دن ہی کہاں ہیں - آہی گئے -

کبھی اُس نے یہ نہ جانا تھا کہ روپ بھی اُسے اتنا ہی چاہتا ہے جتنا وہ اسے! "اوہ میری دلی مراد بن مانگے ہی مل!"
وہ خوشی کے مارے اُچھل پڑتی تھی! مگر کیا معلوم تھا کہ اس کی خوشی کبھی تکمیل تک نہ پہونچے گی اور دنیا میں ایسے بہت
سے آدمی ہیں جو دوسروں کی خوشی سے حسد بھی کرتے ہیں - جب ٹیکے کی رسم ہوئی تو اس نے سوچا - چلو چھٹی ہوئی - اب
ہمیں کون ایک دوسرے سے جدا کر سکتا ہے - مگر لڑکیوں کو اپنے اوپر حق تھوڑے ہی ہوتا ہے - خواہش پیدا ہوتی ہے ایکے
دلوں میں اور پورا کرنے نہ کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے دوسروں کو - ان کو آنکھیں بند کرکے - ہونٹ دبا کر - بے زبان
گائے کی طرح جس کے ساتھ باندھ دیا جاوے - چلا جانا چاہئے -

رات کے بارہ بج گئے تھے - اور وہ بالکل تنہا تھی! غمگین انسان اپنے آپ کو تنہائی میں بھول جاتا ہے - بالیش نے
بھی اپنے آپ کو کہیں کھو دیا تھا - اس کا خاوند اندر آیا - ٹیڑھی نگاہوں سے اس نے بالیش کی طرف دیکھا اس کے
ماتھے پر جھریاں پڑ گئیں -

"بالیش!" اس نے پکارا

بالیش نے آواز نہیں سنی - اس کے سامنے تو پیالہ پھینکنے کا منظر تھا -

"بالیش، یہاں تو آ"

"آخر بات کیا ہے" اُس نے ہاتھ پکڑ کر اُٹھانا چاہا - بالیش چونک پڑی!

"مجھے یہیں بیٹھا رہنے دو"

"آخر تو رات بھر کیوں رویا کرتی ہے"

بالیش چپ تھی -

"میں جو ڈرتا تھا - وہی ہوا - میں پہلے سے جانتا تھا کہ تمھاری سگائی دوسری جگہ ہو گئی تھی"!

تھوڑی دیر سناٹا اور پھر گہری سانس اور پھر -!

"ہاں" بالیش کے منہ سے نکل پڑا -

"ماں ناراض ہو رہی ہیں"

"نہیں آؤں گی"

کمرہ میں اندھیرا ہو گیا ——— اُس کے بعد وہی ہوا جو تمام بڑے گھروں میں غریب بہو کے ساتھ ہوا کرتا ہے
وہی تاریک رات! چاروں طرف اندھیرا - مگر اندھیری گلیوں کو پار کرتی ہوئی بالیش کہاں جا رہی تھی!

دوسرے دن - بالیش کے پتا کھانا کھا رہے تھے - تھالی چھوڑ کر ایک دم کھڑے ہو گئے -

"ہائیں، بالیش تو یہاں کہاں!"

بالیش کے منہ میں زبان ہو تو بولے!

"نہ سر پر چادر، نہ پاؤں میں جوتا! یہ کیا ہے! بول تو سہی"

بالیش اپنے پاؤں کے انگوٹھے سے زمین کریدنے لگی۔

"اور یہ تیرے منہ پر لال لال نشان کیسے ہیں۔ یہ تیرا منہ کس نے نوچ ڈالا ہے" بالیش کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔

"انھیں نے" اس سے آگے کچھ نہ کہا گیا۔ وہ رو پڑی اور اپنے کمرہ میں کھاٹ پر جا گری۔ پتا دوڑتے ہوئے اس کے پیچھے آئے۔ پیٹھ پہ ہاتھ رکھا۔ بالیش چلا اٹھی۔

"پیٹھ میں کیا ہوا"

دیکھا تو وہاں نیل پڑے تھے!

پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔

اس کے چچا۔ بھائی۔ پتا اور محلہ کے پڑوسی سب بالیش کے چاروں طرف تھے! ابھی انھوں نے گلے لگا کر بالیش کو رخصت کیا تھا اور آشیرباد دیا تھا کہ سدا خوش رہے! اس وقت ان کے دلوں میں تسلی تھی کیونکہ بالیش بڑے گھر جا رہی تھی۔ لیکن اب وہ یہ سوچ رہے تھے کہ بڑے گھر کے لئے کتنی بڑی قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔

بالیش چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی اور سب چاروں طرف خاموش کھڑے تھے۔

شنکر سروپ بھٹناگر

نگار کے پرانے پرچے

نگار کے مندرجہ ذیل پرچے دفتر میں موجود ہیں جن کی دو دو تین تین کاپیاں دفتر میں رہ گئی ہیں جن اصحاب کو ضرورت ہو طلب کرلیں۔ قیمتیں وہی ہیں جو سامنے درج ہیں:۔

(سنہ ۲۶ء) جنوری ۵ر — (سنہ ۳۰ء) مئی ۴ر — (سنہ ۳۱ء) جولائی تا دسمبر ۴ر فی پرچہ۔ (سنہ ۳۲ء) جنوری ۱۱ر — فروری تا دسمبر (علاوہ اپریل، اگست و اکتوبر) ۴ر فی پرچہ — (سنہ ۳۳ء) فروری و جولائی ۴ر فی پرچہ۔ اکتوبر ۵ر — (سنہ ۳۴ء) جنوری ۱۰ر۔ فروری تا دسمبر (علاوہ مئی تا اکتوبر) ۵ر فی پرچہ — (سنہ ۳۵ء) جنوری ۱۰ر مارچ تا اگست ۶ر فی پرچہ۔ (سنہ ۳۶ء) پورا فائل عہ ر۔

مینجر نگار لکھنؤ

مخدوم کی شاعری

جب کسی قوم کی حالت تباہی اور بربادی کے عبرت انگیز انجام کو پہونچ جاتی ہے پستی اور تنزل کے احساسات اسکا مقدر بن جاتے ہیں۔ اس وقت نظام طبعی کو برقرار رکھنے کے لئے زمانہ کروٹیں بدلتا ہوا ایسے ایسے پیغمبران سخن اُٹھاتا ہے جن کا پیام احساسات کو جگاتا اور ذہنی انقلاب برپا کرتا ہے۔ ہمیشہ سے یہی ہوتا چلا آیا ہے اور آئندہ بھی یونہی رہے گا۔

ادب جدید کے پیغمبر میکسم گورکی نے ادب کے دھارے کو انسان کی بیچارگی اور زندگی کی نوحہ خوانیوں سے روک کر یہ کہنے کے لئے مجبور کیا کہ "زندگی ابدالآباد تک رہے گی ہم اس کے کارساز حقیقی ہیں قیامت یہی ہوگی کہ روح الاجتماع داور محشر بن کر استبداد کو ہمیشہ کے لئے جہنم رسید کردے"۔ گورکی سماج اور انسانیت کی تباہ کاریوں سے نفرت کرتا ہوا ایک پیام دے گیا کہ ستم رسیدہ انسانیت۔ انسانیت کے حقوق پر غاصبانہ قبضہ اور ایسی تمام پابندیوں کو فنا کردیا جائے۔ اور ایسا نظام بنایا جائے جو انسانیت کے مقاصد کی ترجمانی کرے نہ صرف ترجمانی بلکہ اپنے جہد و عمل کے لئے راہیں بھی تلاش کرے۔ اس کا یہ پیام زمانہ کے معاشرتی حالات سیاسی عقائد اور اخلاقی رجحانات کا آئینہ دار تھا اسی لئے، اس کے پیام میں زندگی ہے۔ اس کے تاثرات میں نہ صرف اس کا وطن بلکہ ساری دنیا بھی گردشیں لگا رہی ہے اس پیام کو سمجھنے والوں نے تنزل و انحطاط کو فنا کی گود میں سلانے کے لئے انقلاب کے ساتھ پیمانِ وفا باندھا۔ احساسات کی ان بیداریوں نے ہندوستان میں قاضی نذرالاسلام کو پیدا کیا جو برائیوں کے اندھیرے۔ خوفناک انشا اور آتشکدہ استبداد کے جہنم کو سرد کرنے کے لئے آہنی عزم سے میدان میں چلے آئے۔ قاضی کی آتشیں گیتوں نے ادب کے دھارے کا رخ بدل دیا۔ ملک کے سنجیدہ ادیبوں اور شاعروں نے قاضی کے دبستان میں اپنے لئے جگہ کرلی اور اپنی استعداد سے جدید ادب کو عبارت بنایا۔ مخدوم بھی ان کے مقلدین میں سے ایک ہیں اور اپنے لئے ایک رفیع مقام رکھتے ہیں۔

مخدوم حیدر آباد کے باشندے اور جامعہ عثمانیہ کے ایم۔ اے ہیں اور جدید ادب کے علم برداروں میں یا ترقی پسند شعرا میں حیدر آباد کی واحد نمایندگی کر رہے ہیں ان کی شاعری کا آغاز سنہ ۱۹۳۳ء سے ہوا جبکہ یہ بی۔ اے میں تھے۔ کالج کی آزاد اور رنگین زندگی میں انھوں نے جو کچھ لکھا وہ اس بات کی تصدیق کردیتا ہے کہ ادیب یا شاعر

جو کچھ لکھتا ہے وہ زمانہ کے رجحان سے متاثر ہو کر لکھتا ہے۔ مخدوم پر بھی یہی بنی۔ مزاحیہ نظموں اور رومانی شاعری سے اس عرصہ میں مشق ہوتی رہی ــــ "بیلا دوشالہ" مخدوم کی پہلی شاہکار طنزیہ نظم ہے۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ ادبی لطافتوں سے مملو یہ ایک بہترین طنزیہ نظم ہے اور ادب میں اپنے لئے ایک رفیع مقام رکھتی ہے۔ اس کے بعد مخدوم رومانی شاعری کے میدان میں گھومتے رہے۔ مخدوم بہت کم کہنے والوں میں سے ایک ہیں اور اُسی وقت کہتے ہیں جبکہ زندگی ان سے تقاضا کرتی ہے اور حیات انھیں اکساتی ہے۔ وہ اُسی وقت کہتے ہیں جب کہنے کے عالم میں ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مخدوم کی شاعری میں ایک خاص اثر اور خاص جوش ہے ان کے رومان کا آغاز کھیتوں میں پانی کے کنارے ہوتا ہے۔ یہیں اظہارِ حرفِ مدعا کی جرأت کرتے ہیں ــــ سرور سرمدی سے معمور زندگی میں مے دو آتشہ کے مزے لیتے ہوئے خلوتِ معصوم کو رشکِ طور بناتے ہیں۔ وہ اسی پریم سنسار میں

بہے جاتے تھے بیٹھے عشق کے زریں سفینے میں　　تمناؤں کا طوفاں کروٹیں لیتا تھا سینے میں
جو چھو لیتا میں اُس کو وہ نہا جاتا پسینے میں　　مے دو آتشہ کے مزے آتے تھے جینے میں
یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی

شاعر کو رنگینیوں میں رنگنے وہ رنگین سحاب جب آتا دیکھتے تو کہہ دیتے کہ:-

وہ کیا آتا کہ گویا دور میں جامِ شراب آتا
وہ کیا آتا رنگیلی راگنی رنگیں سحاب آتا
لبوں کی مئے پلانے جھومتا مستِ شباب آتا

جب وہ آتا اور حیا کے بوجھ سے ہر قدم پر لغزشیں ہوتیں تو فضا میں اس رنگین بدن کی لرزشیں منتشر ہو جاتیں جس سے شاعر کے ربابِ دل کے تاروں میں مسلسل جنبشوں کا آغاز ہو جاتا۔ مخدوم اسی پریم سنسار میں کبھی کسی کے انتظار میں وہ گداز بھری تانیں الاپتے ہیں کہ سارا ماحول بھی انتظار میں محو ایک بے کلی سی محسوس کرتا ہے۔ جاگے ہوئے تارے بھی نیند کی مستی میں غرق ہو جاتے ہیں لیکن مخدوم چشم براہ اور نقشِ حیرت بنے ہوئے گداز کے عالم میں کہہ دیتے ہیں کہ:-

صبح نے سیج سے اُٹھتے ہوئے انگڑائی لی
او صبا تو بھی جو آئی تو اکیلی آئی
میرے محبوب مری نیند اُڑانے والے
میرے مسجود مری روح پہ چھانے والے
اب بھی آجا کہ مرے سجدوں کا ارماں نکلے
تیرے قدموں پہ مری جان مری جاں نکلے

ان کی اس رومانی شاعری میں مینے ایسا محسوس کیا ہے کہ ہر شخص کے دل کی دھڑکنیں پنہاں ہیں۔

کالج کی زندگی بھر یہ اسی ماحول میں رہے۔ کالج کے آخری ایام میں جب مستقبل سے قریب ہو رہے تھے اور جدید ادب انھیں متاثر کر رہا تھا ان کے تصور حیات میں ایک تبدیلی پیدا ہوئی انسانیت کا انحطاط، روحانی اضطراب مسلسل غلامی ذہنی بربادی بھوک، غریبی، بے روزگاری، ظلم و استبداد زندگی کی قدامت اور بچھا ہوا پن یہ سب اپنی بپتا سنانے لگے۔ سارے ہندوستان میں ہر طرف یہی بربادیاں نظر آنے لگیں۔ مخدوم نے دیکھا کہ ان کا وطن جہل، فاقہ، بھیک، بیماری اور نجاست کا مکان ہے۔ عقل و فراست کا مسان ہے جو روایتوں کا غلام ہے اور جسم میں صدیوں کا جذام پرورش پا رہا ہے۔ مخدوم کی بصیرت نے دیکھا کہ ایک بے گور و کفن ٹھٹھری ہوئی نعش ہے ایک خون میں لتھڑا ہوا لقمہ ہے۔

ایک قبرستان جس میں ہوں نہ ہاں۔ کچھ بھی نہیں۔ ایک بھٹکی روح ہے جس کا مکان کوئی نہیں۔ یہاں ایک ایسی مسلسل رات ہے جس کی صبح ہی نہیں ہوتی۔ اس لئے وہ چاہتے ہیں کہ

اس زمین موت پرور کو ڈھایا جائے گا
اک نئی دنیا نیا آدم بنایا جائے گا

وہ اس دنیا کو ڈھا دینا چاہتے ہیں وہ یہاں کی فرسودہ زندگی کے نظام سے باغی ہو جاتے ہیں۔ ان کا وطن جس کی بے کاریوں سے وہ کبھی نہیں تھکے وہی وطن جہاں کبھی

عشرت و عیش کی جس جا کہ فراوانی تھی
جس جگہ جلوہ فگن روح جہاں بانی تھی

ہاں اسی جگہ مخدوم کے دل زار نے یہ دیکھا کہ:-

خونِ دہقاں میں امارت کے سفینے تھے رواں
ہر طرف عدل کی جلتی ہوئی میت کا دھواں

یہ وہ بدنصیب واقعہ تھا جس نے مخدوم کو للکار کر کہا کہ وہ اس نظام کی دھجیاں اُڑا دے اصلاح مرض کا صحیح علاج نہیں بلکہ انقلابی درد کا صحیح درمان ہے۔

مخدوم نے محسوس کر لیا کہ ظلمت کفر کو ایمان۔ سگ خونخوار کو انسان اور دشمنِ جاں کو نگہبان نہیں کہا جا سکتا وہ کہہ اُٹھے کہ

عرش کی آڑ میں انسان بہت کھیل چکا
خون انسان سے حیوان بہت کھیل چکا
حور بے جاں سے سلیمان بہت کھیل چکا

اب یہ کھیل نہیں ہوسکیں گے چونکہ یہ بہت کھیلے جاچکے وہ انقلابی اپنا مدعا بنا لیتے ہیں کہ :-

وقت ہے آؤ دو عالم کو دگرگوں کر دیں
قلب گیتی میں تباہی کے شرارے بھر دیں

مخدوم ایسے سماج کے فرد ہیں جو نزع کے عالم میں ہے۔ جس کے مکین۔ مہاجن۔ امیر۔ کاشی کے برہمن اور کعبہ کے فقیر ہیں۔ جن کے ناخن کی خلش سے اقوام عالم واقف ہیں۔ انگلی رکھنے کا کیا ذکر —— یہی خندہ و تبسم ہیں ان کی حویلیاں

رہزنوں کا قصر شوری قاتلوں کی خوابگاہ
کھلکھلاتے ہیں جرائم جگمگاتے ہیں گناہ،

انھیں حویلیوں میں روز و شب انسانیت کو نیلام ہوتا ہوا دیکھتے ہیں اور بے نان و بے پوشش گداؤں کا ایسا گروہ نظر میں آتا ہے :-

جن کے دل کچلے ہوئے جن کی تمنا پائمال
جھانکتا ہے جن کی آنکھوں سے جہنم کا جلال

ان کی خانماں برباد اور المناک زندگی سے شاعر کو یقین کرنے میں کوئی تامل نہیں ہوتا کہ ان کے

کوڑھ کے دھبے چھپا سکتا نہیں ملبوس ریں
بھوک کے شعلے بجھا سکتا نہیں روح الامیں

اس بربادی پر وہ کڑھ کر نہیں رہ جاتے۔ وہ انقلابی ہیں۔ وہ ایمان کے قایل نہیں۔ وہ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ بنی نوع انسان کے ہر مسئلہ کو تاریخ نے استبداد سے طے کرایا ہے اس لئے ان کی حیات کا مدعا یہ ہے کہ

وقت ہے آؤ دو عالم کو دگرگوں کر دیں
قلب گیتی میں تباہی کے شرارے بھر دیں

وہ کاسۂ دہر کو معمور کرم کرکے اور قلب گیتی میں تباہی کے شرارے بھر کے ختم ہونا نہیں چاہتے وہ رجائی ہیں تباہیوں اور بربادیوں میں بھی مسکراتے ہیں۔ ثبات قدمی سے دلیرانہ میدان میں آکر اپنا مدعا سناتے ہیں کہ

دور ناشاد کو اب شاد کیا جائے گا
روح انسان کو آزاد کیا جائے گا

وہ اس نئی دنیا اور نئے آدم کے لئے اور ان کھنڈروں پر آزادی کے پرچم کھیدنے کے لئے علمبرداران آزادی یعنے ہندی نوجوانوں سے عقیدت رکھتے ہیں۔ چونکہ انہی کی نظر اور ذوق یقین سے زنداں کی زنجیریں کٹ جائینگی۔

ان کا نوجوان آندھیوں میں پلا اور طوفانوں میں پروان چڑھا۔ وہ مرد مجاہد ہے اس کی ٹھوکر سے گیتی لرزہ براندام ہوتی ہے ان کا نوجوان اس سارے فرسودہ نظام کی دھجیاں اڑا دے گا اور ناپاکیوں کا جنازہ نکال دے گا۔

مخدوم نشاۃ ثانیہ کے لئے سرمایہ داری کو ام الخبائث اور گرسنگی کو ایک بدترین لعنت سمجھتے ہیں وہ غداران وطن اور ان کی نعشوں کے جہنم کو سرد کرنے کے لئے قیامت کا جوش لئے ہوئے آتے ہیں :-

خدا نے فرشتوں کے نام کہیں فرمان دیا ہے کہ

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی

اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

داور محشر اس کھیت کے خوشۂ گندم ہی کو جلائے گا۔ حکم کیوں دیتا ہے کہ کھیت کے اس مالک کو فنا کر دیا جائے جس نے دہقان کو روزی میسر ہونے نہیں دی۔ شاید وہ اپنی شیریں سخنی سے ایک دور دراز عرصہ تک ہمیں فریب دیتا رہے گا لیکن اب ہمارا فریب کھانا مشکل ہے۔ دُنیا کی عمر کافی دراز ہو چکی۔ ہمارے تجربہ پختہ ہو چکے اور سچ پوچھئے تو اب جبر و استبداد کی انتہا ہو چکی۔ اب یہ وعدہ اور سارے فرمان طاقِ نسیاں ہو جائینگے۔ اب یہ جہاں

قصرِ شداد کے در بند ہیں بھوکوں کے لئے

وہیں ---- اسی دنیا میں احساسات کی بیداریاں جہد و عمل کے لئے آئیں گی اور کہیں گی کہ

پھونک دو قصر کو گر کن کا تماشا ہے یہی

زندگی چھین لو دنیا سے جو دنیا ہے یہی

اب نہ بانس رہے گا کہ بنسیا بجے گی ---- استبداد کا وہ دیوتا خوشۂ گندم کے ساتھ فنا ہو جائے گا اور نئی دنیا اور نئے آدم پیدا ہوں گے جو دنیا کو حیات افروز حالت میں رکھیں گے۔

مخدوم اس بربادی اور فنائیت میں اس نظام کی اینٹ سے اینٹ بجانے میں زلزلوں، آندھیوں، گرجدار گھٹاؤں اور جہنم کی ہواؤں کے شورِ محشر سے مددگیر سرمایہ اور استبداد کے ناپاک جنازے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دفن کر دینا چاہتے ہیں، تاکہ یہ پھر کبھی نہ اُبھر سکے ان کا انقلاب ایک قیامت صغرا کا نمونہ ہوگا۔ جس کا نتیجہ کائنات کے لئے ایک متوازن نظام ہوگا۔

یہ کہتے ہوئے میں ذرہ بھر بھی نہیں ڈرتا کہ مخدوم اپنے Theme (مرکزی تخیل) کے جوش اور تر کی وجہ سے اپنے ہمعصروں سے بہت بڑھ جاتے ہیں۔ چونکہ وہ خود ایک ایسے شعر مجسم ہیں، جس میں جل کے نغمے اور زلزلوں کی گڑگڑاہٹ ہے ---- وہ زندگی کی آگ میں تپتے ہیں، وہ ساحل پر ٹھہر کر دریا کی گہرائیوں کا اندازہ نہیں لگاتے۔ بلکہ تہ کی ساری ترکیبوں سے بطور خود واقف ہیں اس لئے ان کے کلام میں بلا کا جوش ہے

مخدوم کے راسخ عقیدے اور اعجاز بیانی نے قوم کے جذبۂ عمل کو متحرک کر دیا ہے۔ ان کے پیام میں عظمت ہے چونکہ وہ زندگی کے عمیق مسایل بیان کرتے ہیں، تخیلات کے اسی اعجاز میں انسانیت اپنے لئے راہ عمل ڈھونڈھ لیتی ہے۔

مخدوم نے کہنے کی باتیں صاف صاف کہی ہیں ان کے پاس ادب اور زندگی دونوں میں ہم آہنگی ہے۔ وہ ابھی نوخیز ہیں ان کی اس انقلابی شاعری کو جنم لئے ہوئے تین چار سال ہوئے ہوں گے۔ مخدوم کے پاس ان ہیجانی و انقلابی احساسات کے باوجود فن کارانہ ضبط ہے جو ان کی کامیابی کا ایک بڑا سبب ہے۔ اسی وجہ سے ان کا کلام اوروں کے لئے اثر پذیر بھی ہے وہ انقلاب کے بہت بڑے نقیب ہیں۔ مخدوم کی پختہ مشقی انھیں بہت بلند بنا دے گی ــ وہ دن دور نہیں جب کہ مخدوم اپنے اس پیام میں اس مہم میں رہبری کے لئے سب سے ممتاز رہیں گے۔

محبوب حسین (عثمانیہ)

آپ کے فایدہ کی بات

اگر حسب ذیل کتابیں آپ علٰحدہ علٰحدہ خرید فرمایئں گے تو حسب ذیل قیمت ادا کرنا پڑے گی اور محصول علاوہ بریں:۔

نگارستان	جمالستان	ترغیبات جنسی	شہاب کی سرگزشت	استفسار و جواب ہر سہ جلد
دو روپیہ	چار روپیہ	تین روپیہ	ایک روپیہ	نو روپیہ
معرکۂ سخن	مکتوبات نیاز	اردو شاعری	ہندی شاعری	میزان کل
ڈھائی روپیہ	ڈھائی روپیہ	دو روپیہ	ڈیڑھ روپیہ	ستائیس روپیہ آٹھ آنے

لیکن

اگر یہ تمام کتابیں ایک ساتھ طلب فرمایئں تو صرف بیس روپیہ میں مل جایئں گی اور محصول بھی ہمیں ادا کریں گے۔

منیجر "نگار" لکھنؤ

قصاص کی کرسی

امریکہ میں قاتل کا قصاص یوں ہوتا ہے کہ اُسے ایک کرسی پر بٹھا دیا جاتا ہے اور پھر برقی رو دوڑا کر اسے ہلاک کر دیتے ہیں۔ عام طور پر یہ خیال قایم کیا گیا ہے کہ ہلاکت کا یہ طریقہ نہایت اچھا ہے اور انسان کو بہت کم تکلیف ہوتی ہے۔ لیکن اس باب میں ایک افسانہ نویس، چارلس فرانسس پاٹر کا بیان پڑھئے، جس نے ایکبار خود اس منظر کو دیکھا تھا۔

مجھ سے ایک اخبار کے نمایندہ نے کہا کہ "آج گیارہ بجے کراؤلی کا قصاص ہونے والا ہے، چلو، تمھیں نفسیات انسانی کے ایک خاص پہلو کے مطالعہ کا موقعہ ملیگا اور ممکن ہے کسی افسانہ میں تم اس سے کام لے سکو۔ لیکن ہمیں قید خانہ میں ٹھیک نو بجے پہونچ جانا چاہئے"

ہم لوگ ٹھیک نو بجے قید خانہ کے دروازہ پر پہونچ گئے۔ وہاں پچاس تماشائی اور موجود تھے، لیکن ان میں سے اکثر اخباروں کے نمایندے تھے۔ چونکہ دو گھنٹے باقی تھے، اس لئے یہ وقت باہمدگر اسی گفتگو میں بسر ہوا کہ قصاص کا بہترین طریقہ کیا ہو سکتا ہے۔ کوئی پھانسی کو بہتر سمجھتا تھا، کوئی زہریلی گیس کی رائے دیتا تھا اور کوئی بندوق کی۔ میرے لئے چونکہ یہ بالکل پہلا اتفاق ایسی صحبت میں شریک ہونے کا تھا، اس لئے خاموشی سے سن رہا تھا اور حیرت کر رہا تھا کہ ایسے دردناک موضوع پر یہ لوگ کیسے ٹھنڈے دل سے گفتگو کر رہے ہیں۔

جب وقت قریب آیا تو نمایندۂ اخبار نے جو میرے ساتھ آیا تھا کہا کہ "آؤ قریب کے کمرہ میں چلیں" چنانچہ میں بھی سب کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ یہاں پہونچکر سب نے اپنی اپنی جیب سے وھسکی کی بوتل نکالی اور مجھ سے بھی کہا کہ اس صحبت میں ان کا شریک ہوں۔ میں نے کہا کہ "میں شراب نہیں پیتا"۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ "اگر تم نہ پیوگے تو اپنے آپ کو قابو میں نہ رکھ سکوگے۔ ہم سب لوگ کیا احمق ہیں، جو شراب پی پیکر قصاص دیکھنے جا رہے ہیں۔ وہاں کا منظر ہی ایسا ہوتا ہے کہ جب تک احساس کو کُند نہ بنا دیا جائے، برداشت مشکل ہے۔

میں نے کہا کہ "میں پورے حواس کے ساتھ اس کو دیکھنا چاہتا ہوں، میں نہ پیوں گا"

تھوڑی دیر میں سپاہیوں کا ایک دستہ آیا اور ہم کو ایک قطار میں کھڑے ہو جانے کا حکم دیا تاکہ ہماری جامہ تلاشی لی جائے۔ اس سے قبل کسی قصاص کے وقت کوئی نمایندۂ اخبار چھوٹا سا کیمرا چھپا کر لے گیا تھا اور اس نے تصویر لے لی تھی اس لئے اب یہ احتیاط کی جاتی ہے کہ اندر جانے سے پہلے ہر شخص کے کپڑے دیکھ لئے جاتے ہیں۔

ہر چند یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ جب قصاص کا پورا حال اخبارات میں لکھ کر شایع کیا جاتا ہے تو اسکی تصویر کی اشاعت میں کیا حرج ہے۔ تصویر دیکھ کر قدرتاً لوگوں کو اور عبرت حاصل ہونا چاہئے۔ بہر حال یہ موقعہ اس بحث و گفتگو کا نہ تھا۔ میں بھی سب کے ساتھ ایک قطار میں کھڑا ہو گیا اور جب سب کی جامہ تلاشی ہو چکی تو ہم لوگ یکے بعد دیگرے قصاص کے کمرے میں پہونچے۔ لیکن ایک رپورٹر کا رنگ سفید پڑ گیا اور وہ یہ کہکر واپس آیا کہ پچھلے قصاص میں میری حالت خراب ہو گئی تھی، میں باہر جاتا ہوں، تم جو کچھ دیکھنا، مجھ سے زبانی کہدینا۔

اس کے بعد جو کچھ میں نے دیکھا، نہ اسے حقیقتاً اپنے تاثرات کے لحاظ سے بیان کر سکتا ہوں اور نہ کبھی بھول سکتا ہوں۔ میں سمجھتا تھا کہ اندر صرف ایک کرسی ہوگی جس پر قاتل کو بٹھا دیا جائے گا اور آناً فاناً برقی رو سے اسے ہلاک کر دیں گے۔ لیکن اندر پہونچکر دیکھا کہ چاروں طرف پچاس کرسیاں بچھی ہوئی ہیں اور سامنے درمیان میں ایک بڑی کرسی مضبوط لکڑی کی رکھی ہوئی ہے اور کئی ایک تسمے چمڑے کے اس میں لٹک رہے ہیں۔

جب ہم لوگ بیٹھ گئے تو ایسا گہرا سکوت دفعتاً چھا گیا کہ میں نے اپنی عمر میں کبھی نہ دیکھا تھا۔ چند سکنڈ کے بعد پہلو کے کمرہ سے گارد کی حفاظت میں مجرم نمودار ہوا اور آہستہ آہستہ کرسی کی طرف بڑھا۔ میں اسوقت ایسا محسوس کر رہا تھا، گویا خود موت آہستہ آہستہ قریب تر آتی جا رہی ہے۔ ایک پادری بھی ساتھ تھا۔

مجرم کرسی کی طرف بڑھا اور از خود بغیر کسی حکم یا ہدایت کے کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے زندگی کے ایسے نازک موقعوں پر بہت سے لوگوں کو حد درجہ مضطرب دیکھا ہے، لیکن اس شخص کے سکون کا عالم نہایت حیرتناک تھا، یہ معلوم ہوتا تھا کہ اپنے کسی فریضۂ زندگی کو ادا کر رہا ہے۔

اس نے کرسی پر بیٹھتے ہی ہاتھ اُٹھا کر گارد کے سپاہیوں سے کہا کہ "خدا حافظ" اور اس کے بعد ہی نہایت تیزی سے اس کے ہاتھ پاؤں تسموں سے باندھے جانے لگے۔ اس کا جسم کسا جا رہا تھا اور وہ خاموش نگاہیں نیچی کئے ہوئے بیٹھا ہوا تھا۔ جب یہ سب کچھ ہو چکا تو اس نے جیلر سے کہا کہ "میں آپ کا بہت شکرگزار ہوں کہ آپ نے میرے ساتھ بہت اچھا برتاؤ کیا۔ میری ماں کو میرا آخری سلام پہونچا دیا جائے"۔

اس کے بعد قصاص ہونے ہی والا تھا کہ اس نے جیلر سے کہا کہ داہنے پاؤں کا تسمہ ذرا ڈھیلا ہے، اسے کس دیا جائے۔ چنانچہ تسمہ کس دیا گیا اور اس کے بعد ہی فوراً سگنل دیدیا گیا۔

میں نے یہ تو دیکھا کہ کرسی کو غیر معمولی جھٹکا لگا، لیکن اس کے بعد جو کچھ نظر آیا وہ ناقابل بیان ہے۔ بجلی کی رَو اس کے

ایک ایک ریشہ میں دوڑ گئی اور جسم کی اینٹھن کا یہ عالم ہوا گویا کوئی بڑا قوی جانور ہے جو چمڑے کے تسموں سے کس دیا گیا ہے اور وہ انھیں توڑ کر نکل جانا چاہتا ہے۔ تسمے چرچرا رہے تھے، کرسی جھٹکے کھا رہی تھی اور ہم لوگ ایسا محسوس کر رہے تھے کہ تسمے ٹوٹ کر یہ ہم پر جھپٹنے ہی والا ہے۔

برقی رو یکے بعد دیگرے برابر دوڑائی جا رہی تھی اور ہم لوگ ہر دفعہ اپنی کرسیوں پر پیچھے کی طرف ہٹ ہٹ جاتے تھے کہ کہیں یہ ہم پر نہ آ گرے۔

ہم نے سنا تھا کہ اس طرح انسان کو کوئی تکلیف نہیں پہونچتی اور فوراً ہلاک ہو جاتا ہے، لیکن اس قصاص کو دیکھ کر معلوم ہوا کہ یہ سب غلط تھا۔ اس کی تکلیف کا یہ عالم تھا گویا اس کا ایک ایک ریشہ موت کا مقابلہ کر رہا ہے اور موت ہر مرتبہ اپنی گرفت میں لا کر جھٹکے پر جھٹکے دے رہی ہے، جھنجھوڑ رہی ہے اس کے ساتھ ہی میں نے اس کے جسم سے پسینہ ٹپکتے دیکھا۔ گویا بجلی کے چولھے پر کسی انسان کو بھونا جا رہا تھا اور اس کے جسم کا عرق نکل نکل کر لباس میں جذب ہو رہا تھا اس کے بعد وہ ناقابل برداشت منظر سامنے آیا جس کے ڈر کی وجہ سے لوگ شرابیں پی پی کر یہاں آتے ہیں۔ یعنی ایسی بو محسوس ہونے لگی جو گوشت جلنے کے بعد پیدا ہوتی ہے اور یہ چراہند ایسی تیز، ایسی متعفن اور اس قدر امتلا پیدا کرنے والی تھی کہ معاذ اللہ!

ہر چند یہ منظر صرف پانچ منٹ سامنے رہا، لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گھنٹوں گزر گئے۔ جب قصاص کے بعد اسکے جسم کو لاش کی گاڑی میں ڈالکر اسپتال پہونچایا جانے لگا، تو میں نے اسے پھر دیکھا۔ وہ بالکل پھول گیا تھا اور ایسا سرخ تھا گویا جسم کی کھال نکال لی گئی ہے۔

نگار کے خاص نمبر

جنوری سنہ ۳۲ء (غالب نمبر)۔ غالب شوخ نگار، (نثر و نظم کی حیثیت سے صفحات ۱۵۰ مع تصویر غالب (رنگین) قیمت عہ علاوہ محصول

جنوری سنہ ۳۵ء (اردو شاعری نمبر)۔ اردو شاعری کی تاریخ اور ہر زمانہ کے شعراء پر نقد و تبصرہ اور انتخاب کلام جو ہر حیثیت سے مکمل ہے۔ صفحات ۲۳۶ مع بعض صاحب قلم کی تصاویر کے جس میں جناب نیاز صاحب کی قلمی تصویر بھی شامل ہے۔ قیمت عام علاوہ محصول

جنوری سنہ ۳۶ء (ہندی شاعری نمبر) ہندی شاعری کی تاریخ اور مستند شعراء کے کلام پر تبصرہ اور انتخاب کلام۔ صفحات ۱۶۸ قیمت عہ علاوہ محصول۔

جنوری سنہ ۳۷ء :- ڈرامہ اصحاب کہف۔ خطوط آسکر وائلڈ بنام سارہ برنہارٹ اور مسئلہ خلافت و امامت پر پانچواں مقالہ ایک آزاد خیال شیعہ کے قلم سے صفحات ۱۴۴۔ قیمت عہ علاوہ محصول

جنوری سنہ ۳۸ء :- تاریخ اسلامی ہند۔ یہ تاریخ جس وقت نظر اور کاوش تحقیق کے بعد مرتب کی گئی ہے اسکا اندازہ آپ کو مطالعہ کے بعد معلوم ہوگا۔ صفحات ۱۵۲ قیمت عام

جنوری سنہ ۳۹ء (مصحفی نمبر) اسکے بعض عنوان حیات مصحفی۔ ہمدو غزل گوئی میں مصحفی کا مرتبہ مصحفی کی غیر مطبوعہ مثنویاں۔ انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ صفحات ۱۲۲ قیمت عہ

جنوری سنہ ۴۰ء :- (نظیر نمبر) بعض عنوانات۔ نظیر کا مسلک۔ شاعری پر تبصرہ۔ نظیر اور عوام۔ انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ۔ صفحات ۱۲۸ قیمت عہ علاوہ محصول

منیجر نگار لکھنؤ

علم کی طیار کی ہوئی دوزخ

حال کی جنگ ہسپانیہ میں جب بارسلونا فتح ہوا اور جنرل فرانکو وہاں پہونچا تو اسے بعض تہ خانے ایسے نظر آئے جن سے تعزیر گاہ یا تعذیب گاہ کا کام لیا جاتا تھا اور جنرل فرانکو کے وہ سپاہی جو گرفتار ہو جاتے تھے ان میں سے بعض کو ان تہ خانوں میں رکھا جاتا تھا۔

ان تہ خانوں میں نہ کوئی شکنجہ ہے، نہ زنجیر، نہ کوئی درّہ ہے اور نہ کوئی آلۂ تعزیر، لیکن پھر بھی وہ اتنی سخت تعذیب گاہیں ہیں کہ شاید ہی ذہن انسانی نے ان سے زیادہ ظالمانہ طریقے انسان کو تکلیف پہونچانے کے کوئی اور وضع کئے ہوں۔

نفسیات کا مسلّم مسئلہ ہے اور اس سے پہلے بھی لوگوں کو معلوم تھا کہ ایک خاص حد تک پہونچکر جسمانی تکلیف کا بڑھنا رُک جاتا ہے بلکہ شاید اس میں کمی ہونے لگتی ہے۔ مثلاً آپ ایک شخص کے ناخنوں میں کیلیں ٹھونکیں تو اول اول یقیناً اسے بہت اذیت ہوگی، لیکن وہ اذیت ایک خاص حد تک پہونچنے کے بعد رُک جائے گی اور شاید اسی حقیقت کو سامنے رکھ کر کہا گیا ہے کہ درد کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج - بہرحال جسمانی اذیت کی ایک انتہا ہے، لیکن انسان کے حواس اور نفس کے ذریعہ سے جو تکلیف اس کو پہونچتی ہے اس کی کوئی حد و انتہا نہیں اور یہ تہ خانے اسی علمی اُصول پر طیار کئے گئے تھے۔

یہاں نہ قیدیوں کو شکنجہ میں کسا جاتا تھا، نہ گرم لوہے سے داغا جاتا تھا، نہ ان کی آنکھیں نکالی جاتی تھیں، نہ ٹکٹکی میں باندھ کر دُرّوں سے جسم کی کھال اُڑائی جاتی تھی۔ لیکن جس عذاب میں وہ مبتلا کئے جاتے تھے وہ ان سب سے زیادہ سخت تھا۔

تہ خانوں کی دیواروں پر مختلف قسم کے رنگین دائرے اور دوسری ہندسی شکلیں بنائی گئی تھیں، مختلف رنگ کی تیز روشنیاں ڈالنے کا انتظام تھا، ایک ہی قسم کی آوازیں مسلسل پیدا کی جاتی تھیں اور یہی وہ عذاب تھا جس میں قیدی مبتلا کئے جاتے تھے، اور جس کا برداشت کرنا انسانی قوت سے باہر ہے۔

بارسلونا کے تہ خانوں کی یہ تعمیر اور اس کی نقاشی ایک شخص الفانسو لارنٹ سک (Alfanso Laurent Cik)

نے کی تھی جو یوگوسلوویا کا ایک نہایت ذہین انجنیر و نقاش تھا اور اس کا بیان ہے کہ حکومت اسپین کی خفیہ پولیس نے بہ جبر اس سے یہ سب کچھ طیار کرایا تھا۔

دیواروں پر جو نقوش، دایرے، سیدھے ٹیڑھے خطوط اور دوسری ہندسی شکلیں نظر آتی ہیں یہ سب حال ہی کے طیار شدہ ہیں اور تعذیب و تعزیر کی دنیا میں بالکل نئی چیزیں ہیں۔

ان نقوش کے ذریعہ سے تکلیف پہونچانے کا خیال اس اُصول پر قایم ہے کہ اگر خاص قسم کے دایرے یا نقوش مختلف روشنیوں میں نگاہ کے سامنے ہر وقت رہیں تو رفتہ رفتہ تکلیف برابر بڑھتی جاتی ہے حتےٰ کہ انسان پاگل ہو جاتا ہے۔ بظاہر یہ بات نہایت لغو و مہمل معلوم ہوتی ہے، لیکن اس کا تجربہ یوں ہو سکتا ہے کہ اس صفحہ پر جو دایرے بنائے گئے ہیں ان میں سے کسی ایک کو آنکھ کے پاس لیجائیے اور جلد جلد ہی نصف انچہ کے دایرہ میں ان کو برابر گردش دیتے رہئے شاید چند سکنڈ بھی آپ اسے برداشت نہ کر سکیں گے اور اسی پر قیاس کیجئے کہ اگر اس قسم کی تکلیف مسلسل پہونچتی رہے تو آپ کا کیا حال ہو گا۔

ان بصارت آزار تہ خانوں میں علاوہ دایروں کے کچھ نقوش مکعب قسم کے بھی بنے ہوئے تھے جن کو غور سے دیکھنے کے بعد کبھی یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ خالی صندوقوں کے نقشے ہیں اور کبھی ٹھوس مکعب نظر آتے تھے۔ مثلاً:-

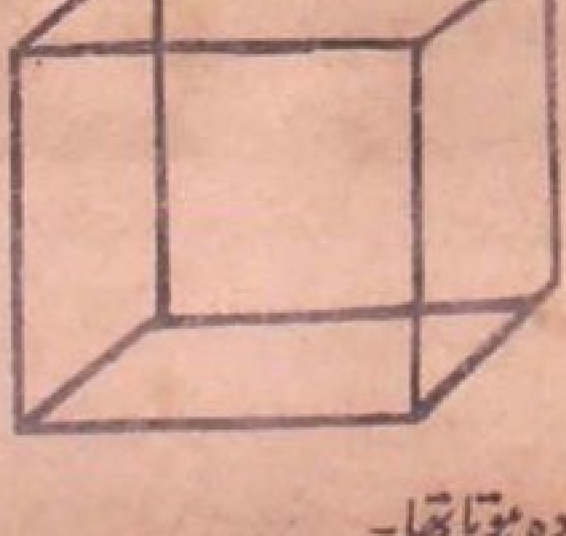

اور ان کا اثر بھی بصارت پر نہایت تکلیف دہ ہوتا تھا۔

یوں تو آپ کو یہ کھیل نظر آئے گا، کیونکہ آپ کے اختیار میں ہے جب تک آپ چاہیں دیکھتے رہیں، ورنہ پھر آنکھیں بند کریں لیکن ان تہ خانوں کے قیدیوں کو یہ اختیار حاصل نہ تھا۔ قدیم زمانہ میں آنکھیں کھلی رکھنے کے لئے پپوٹے کاٹ دئے جاتے تھے، لیکن یہاں پپوٹے کے اوپر آہنی چھلے چڑھا دئے جاتے تھے تاکہ وہ بند نہ ہو سکیں اور چونکہ ہاتھ پاؤں قیدیوں کے باندھ دئے جاتے تھے اس لئے وہ ان کمانیوں کو ہٹا بھی نہ سکتے تھے۔ جس طرف دیکھتے تھے یہی دایرے اور نقشے انھیں نظر آتے تھے اور اگر اس طرف سے نگاہ ہٹتی تھی تو پھر نہایت تیز روشنیوں پر پڑتی تھی جو اور زیادہ تکلیف دہ ثابت ہوتی تھیں۔

رنگوں کے ذریعہ سے بھی عذاب پہونچانے کا یہاں انتظام تھا۔ صرف سیاہ و سفید دایروں سے بھی نگاہ کو تکلیف پہونچتی ہے، لیکن اگر ان کو مختلف رنگوں سے رنگ دیا جائے اور بہت سی ٹیڑھی ٹیڑھی لکیریں بھی مختلف رنگ کی نگاہ کے سامنے رہیں تو یہ تکلیف دوچند ہو جاتی ہے، چنانچہ ان تہ خانوں میں یہ بھی انتظام تھا کہ نہایت تیز روشنیاں مختلف رنگوں کی بدلتی رہتی تھیں اور اس کا اثر یہ ہوتا تھا کہ دیواروں کے دایرے اور نقشے عجیب و غریب صورتیں اختیار کر کے سامنے آتے تھے اور قیدیوں کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ بھوتوں کی دنیا میں آگئے ہیں۔

اگر آپ سورج کی طرف تھوڑی دیر تک دیکھتے رہئے اور پھر اُدھر سے نگاہ ہٹا لیجئے تو آپ کو نگاہوں کے سامنے روشن دھبے ناچتے ہوئے نظر آئیں گے کیونکہ قرص آفتاب کی تصویر پردہ چشم پر مرتسم ہو جاتی ہے۔ بالکل یہی حال رنگ کا بھی ہے آپ غور سے دیر تک کسی ایسی تصویر کو دیکھئے جو نہایت سُرخ رنگ میں بنائی گئی ہو اور پھر نگاہ ہٹا لیجئے تو آپ کو دیوار پر وہی تصویر سبز رنگ کی نظر آئے گی کیونکہ سبز رنگ سُرخ رنگ کا معاون ہے۔۔ اب آپ خیال کیجئے کہ ان تہ خانوں کے قیدیوں کا جو تیز روشنی میں ان تیز رنگوں کے نقوش کو مسلسل دیکھنے پر مجبور تھے، کیا حال ہوتا ہوگا اور اُن کی چکاچوند کتنی تکلیف کا باعث ہوتی ہوگی۔۔ رنگوں کا انسانی دماغ کو متاثر کرنا یقینی ہے لیکن مختلف لوگوں کی دماغی حالت پر مختلف رنگوں کا کیا اثر پڑتا ہے۔ اس کا پورا حال ماہر نفسیات کو ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا، لیکن سُرخ اور بنفشی رنگ کا ہیجان انگیز ہونا ثابت ہو چکا ہے اور شاید سرخ رنگ کو خطرہ اور جنگ کا رنگ قرار دینا اسی لئے ہے۔۔ جس طرح رنگ اور روشنی کے ذریعہ سے انسانی دماغ کو تکلیف پہونچ سکتی ہے، اسی طرح آواز سے بھی پہونچائی جا سکتی ہے اور ان تہ خانوں میں ایک خاص حصہ ایسا بھی تھا جہاں سامعہ کے ذریعہ سے قیدیوں کو عذاب میں مبتلا کیا جاتا تھا۔ کئی ایک پنڈولم لٹکائے گئے تھے جن سے ٹک ٹک کی آواز ہر وقت پیدا ہوتی رہتی تھی، لیکن یہ قیدیوں کے کان میں اتنی اونچی ہو کر پہونچتی تھی گویا بہت بڑا ڈھول کان کے پاس بجایا جا رہا ہے۔ اور وہ رات دن ہر لمحہ ان آوازوں کو سننے پر مجبور تھے۔

ایک حصہ اس قید خانہ کا ایسا بھی تھا جہاں قیدیوں کو برابر سنگین فرش پر چلنا پڑتا تھا اور ان کے قدموں سے جو آواز پیدا ہوتی تھی وہ بعض آلات کے ذریعہ سے اتنی بلند و کرخت ہو کر ان کے کانوں میں پہونچتی تھی کہ وہ دیوانے ہو ہو جاتے تھے ان قیدیوں کو ایک جگہ ٹھہرنا ممنوع تھا اور جو کوئی ایسا کرتا تھا اسے کوڑے مار مار کر آگے بڑھایا جاتا تھا۔

مکتوبات نیاز

خط پہونچا، اب کیا پوچھتے ہو کہ کس ادھیڑ بن میں لگا ہوا ہوں۔

"تم کیا بدل گئے کہ زمانہ بدل گیا" — صرف شاعری ہے، حقیقت نہیں — حقیقت یہ ہے:

ہم کیا بدل گئے کہ زمانہ بدل گیا

سو، اب یہ دیکھو کہ "ہم" کیا ہیں؟ کچھ نہیں! — میر علیہ الرحمۃ نے شاید اسی منزل کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے کہ

القصہ، نہ درپے ہو ہمارے کہ نہیں ہم،

سو، بھئی اب تو معاملہ اسی "نہیں ہم" کا ہے۔

وہ گلیاں، جن میں ہم تم خاک چھانا کرتے تھے اب بھی وہی ہیں۔ لیکن جن ذروں کی طرف پہلے دل کھنچتا تھا، آج وہی آنکھیں دکھا رہے ہیں، آفتاب کا طلوع و غروب وہی ہے، لیکن پہلے غروب کی خوشی اس لئے ہوتی تھی کہ اسکے بعد طلوع ہوگا، اب طلوع سے بھی رنج پہونچتا ہے کہ اس کے بعد غروب ہے۔ پہلے کائنات کو اس طرح دیکھتے تھے جیسے چڑھتی ہوئی "ہوائی" کو دیکھتے ہیں، آج اس کا مطالعہ اس طرح کرتے ہیں جیسے وہ "ہوائی" زمین کی طرف آرہی ہو — بے نور، بے رنگ!

لوگ کہتے ہیں، سمجھ چالیس کے بعد آتی ہے۔ لیکن اگر سمجھ اسی کا نام ہے تو شاید موت دنیا کی سب سے بڑی "سمجھ" ہے — جوان جینا اور جوان مرجانا بھی کتنی بڑی نعمت ہے — پھول وہی ہے جو کھلتے ہی ٹہنی سے چن لیا جائے، خشک ہونے پر زمین سے اس کی پنکھڑیاں کوئی چنتا بھی ہے تو پھول سمجھ کر نہیں بلکہ کیاری صاف کرنے کے لئے!

ابھی نہیں، کچھ دن اور گزر جانے دو، اس وقت تم اس کو بہتر سمجھ سکوگے — میں پاؤں توڑ کر بیٹھ جانے کا قایل نہیں، لیکن ہرزہ گردی کو بھی جی نہیں چاہتا۔ میں تمہارا ساتھ کیونکر دے سکتا ہوں۔

حضرت، آپ کے شکوۂ محبت کی قدر کرتا ہوں اور معذرت خواہ ہوں کہ واقعی مجھ سے سخت کوتاہی ہوئی۔ لیکن ڈرتا ہوں کہ میری یہ سادگیٔ بیان آپ کو اور زیادہ برہم نہ کردے۔

میں نہیں تھا، لیکن سچ پوچھیے تو نہیں تھا۔ ایک عزیز دوست کی علالت نے اس قدر سراسیمہ رکھا کہ دنیا کا کوئی کام سوائے ان کی تیمارداری کے کر ہی نہ سکا۔ گو، اب خطرہ باقی نہیں، لیکن میری فکر اب بھی وہی ہے، بیماری کی وجہ سے نہیں، بلکہ اُن کی ضد کی وجہ سے!

بہرحال اگر اب بھی وقت ہو تو لکھیے، تعمیل ارشاد کے لئے آمادہ ہوں۔ وہ خود یہیں آتے رہتے ہیں، میرے جانے کی ضرورت نہیں۔ اگر انھیں ماننا ہے تو یوں بھی مان لیں گے، میری نقل و حرکت سے کیا ہوتا ہے۔

یہ آپ نے خوب کہا کہ جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔ آپ کو کیا خبر کہ ابھی دل میں کیا کیا ہے!

نالہ بسیار و آہ بسیار ست

درد را دستگاہ بسیار ست!

نہ قسمت کا قایل ہوں نہ اس بات کا کہ "ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے"۔ آپ نے نہ دیکھا ہو لیکن مینے تو بارہا تدبیروں سے قسمت کو اُلٹ جاتے دیکھا ہے۔

آپ پوچھیں گے کہ اب میں کیا کرنے والا ہوں۔ لیکن ابھی تک مجھے خود نہیں معلوم۔ ہاں مایوس نہیں ہوں اور جانتا ہوں کہ آج نہیں تو کل نئی راہیں پیدا ہوں گی۔ ارادہ ہے کہ آخر جنوری میں یہاں سے روانہ ہوں اور اسوقت تک واپس نہ ہوں، جب تک اُدھر یا ادھر آخری فیصلہ نہ ہو جائے۔ آپ کو البتہ تھوڑی سی مدد کرنا پڑے گی لیکن ابھی نہیں، عین وقت پر بتاؤں گا، تاکہ آپ کو بہانہ تلاش کرنے کی فرصت کم مل سکے۔

زندگی کے کھیل میں دلچسپی پیدا کرنا ہو تو پیچھے مڑ کر کبھی نہ دیکھیے، ٹھوکریں کھائیے اور قدم آگے بڑھائیے، منزلِ تک پہونچ جانا، شاید اس قدر دلچسپ نہیں، جتنا منزل تک پہونچنے کا خیال۔ بہرحال دیکھتے جائیے کیا ہوتا ہے۔ ابھی آپ کی قیاس آرائیاں قبل از وقت ہیں۔

نیاز نوازیوں کا شکریہ، لیکن یہ آپ نے کیا فرمایا کہ آپ سے دور ہو کر میں نے آپ کو بھلا دیا ہے۔ شاید آپ کو معلوم نہیں کہ

مانند شعلہ حسن ترا از پشت در دیدہ ست

آپ سامنے ہوں یا نہ ہوں — "عالم ہے وہی جلوہ گری کا!"

قدرت کی طرف سے جن کے لئے زخم کھانا اور تڑپنا مقسوم ہو چکا ہے۔ ان کے لئے آپ کو کیوں اتنی فکر رہتی ہے نگاہوں کے نشتر نہ سہی، جنگل کے کانٹے سہی۔ آپ نہیں آپ کی یاد تو ہے،

دل و صد آرزوئے خام، بدل

یار و چندیں فریب، و من تنہا!

یقیناً پچھلی بار آپ سے بہت رواروی میں ملنا ہوا۔ مجھے خدا جانے کیا کیا کہنا تھا، لیکن نہ کہہ سکا، اور آپ نے بہت سی وہ باتیں بھی کہہ ڈالیں جو نہ کہنا چاہیئے تھیں۔ چنانچہ آپ نے نئے پیدا ہونے والے تعلق کا بھی ذکر مجھ سے کیا تھا، کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ وہ تکمیل کو پہونچا یا نہیں؟ تحریر کے سرورق پر جو پتہ درج ہے اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک نہیں ہوا، لیکن ہو سکتا ہے کہ "اُدھر" ہو" اور اِدھر اس کا اظہار نہ ہو۔ دو دھاری تلوار کا کیا کہنا!

آپ میرے اس استفسار سے بدگمان نہ ہوں۔ لیکن یہ بھی نہ پوچھیں کہ میں یہ کیوں پوچھتا ہوں۔ بس پوچھتا ہوں، یونہی پوچھتا ہوں — "چہ تواں کرد، مرا باتو سرے اُفتادست"

اگر فرصت ہو تو کبھی کبھی یاد کر لیا کیجیئے۔ اور میری اس حسرت کو کبھی نہ بھولئے کہ

نہ باتو رفتم دنے بیتو در غمت مُردم
یکے ز دست نیامد ازیں دو کار مرا

آپ کا خط، جسے "شہر آشوب" کہنا زیادہ موزوں ہے، پہونچا۔ یوں کہئے آپ کی جوانمردی کی تعریف کر دوں، لیکن "جوانمرگی" کی بات ہی اور ہے۔ آپ لطف و مسرت کی جستجو کرتے ہیں اور یہاں یہ عالم ہے کہ

باز می جویم دلِ افسردہ را
آں دل و آں خاطرِ آزردہ را

آپ کو کیا خبر کہ "تنہا ملول بودن و تنہا گریستن" بھی ایک عالم ہے۔

انسان پر بعض اوقات دو حالتیں نہایت عجیب گزرتی ہیں، ایک بغیر سوچے کام کرنے کی اور دوسری بغیر کچھ کئے ہوئے سوچتے رہنے کی۔ آپ اُس عالم سے گزر رہے ہیں اور میں اس عالم سے۔ نتیجہ دونوں کا ایک ہے۔ یعنی نہ آپ کو اپنی سرگردانی سے کچھ ملتا ہے اور نہ مجھے اپنی حیرانی سے!

زخمہا دارد تفاوت درمیاں
ورنہ خار و نشتر و مژگاں یکے ست

مجھے وعدہ یاد ہے اور اس کے ایفار کا بھی ارادہ رکھتا ہوں۔ لیکن آپ کے تقاضہ سے نہیں، اپنی خوشی سے۔ پھر ایسی جلدی کیا ہے۔ وقت آنے دیجئے، میں اور میری تمام "نارسائیاں" آپ کے لئے وقف ہیں۔

تم کو معلوم ہونا چاہئے کہ میں تم سے خفا ہوں اور اس قدر خفا ہوں کہ بات کرنا پسند نہیں کرتا، پھر کس اُمید پر مجھ سے خط و کتابت کی جرأت کرتے ہو۔ تم نے جو صدمہ مجھ کو پہونچایا ہے وہ ایسا نہیں جسے میں آسانی سے بھول

جاؤں۔ میں جانتا ہوں کہ تمھارے پاس "عذر ہائے لنگ" کی کمی نہیں اور شاید اسی اعتماد پر تم نے یہ سب کچھ کیا ہے لیکن میں بھی اتنا احمق نہیں کہ آنکھ بند کر کے تمھاری ہر بات کو مان لوں!

"درِ توبہ" کبھی بند نہیں ہوتا یہ ان لوگوں کا عقیدہ ہے جو ہمیشہ گناہ کرنے کے لئے طیار رہتے ہیں۔ اس لئے تمھارے "اعتراف" کی قیمت مجھے معلوم ہے۔ "بت شکنی" کا کفارہ "تعمیرِ کعبہ" سے بھی نہیں ہو سکتا، تمھاری جھوٹی باتوں کی کیا حقیقت ہے!

قبلۂ محترم

آپ کا ادنیٰ اشارہ میرے لئے "فرمانِ خداوندی" ہے، چہ جائیکہ آپ کسی بات پر اتنا اصرار فرمائیں۔ مجھے حیرت ہے کہ آپ نے مجھ سے پوچھا کیوں۔ مجھے کس قدر مسرت ہوتی اگر بغیر مجھ سے پوچھے ہوئے، آپ میری طرف سے انھیں مطمئن کر دیتے۔

انھیں بھیجئے، میری ہر امکانی کوشش ان کے لئے وقف ہے، لیکن کامیابی کے لئے غالباً آپ کے روحانی تصرف کی بھی ضرورت ہوگی۔

کعبۂ مستمنداں، ایک زمانہ ہو گیا کہ آپ مجھ سے بےخبر ہیں۔ ڈر رہا ہوں کہ اس کا سبب ناخوشی تو نہیں —— درگاہِ گرامی کے ساتھ مجھے لاکھ عقیدتمندیاں سہی۔ لیکن "ردو قبول" کا اختیار تو حضرت ہی کو حاصل ہے۔ اور میں شاید اس منزل سے ابھی دور ہوں جب "سجدہ" بے نیازِ "مسجود" ہو جاتا ہے۔

میری آشفتہ خیالیاں بدستور اپنی جگہ قایم ہیں اور اگر ان میں کوئی تغیر ہوا بھی تو یہ کہ اب نہ "نالۂ نیم شبی" میں کوئی لطف باقی رہا نہ "دعائے صبحگاہی" میں —— حاضری کا ارادہ کر رہا ہوں، لیکن اس کی تکمیل میرے اختیار میں نہیں۔ ہاں، اگر لطفِ شما پیش نہد گامے چند!

سید صاحب قبلہ آج کل کہاں ہیں؟ اگر وہاں ہوں تو میرا سلام قبول فرمائیں۔

شادی مبارک! عدم شرکت کا مجھے واقعی سخت افسوس ہے، لیکن تمھارا اصرار بھی کچھ یونہی سا تھا، نہایت کمزور قسم کا —— ورنہ میرا نہ پہونچنا کیا معنی؟

"ہنی مون" کا زمانہ کہاں بسر کیا جائیگا، بنگلور میں؟ یہ میں تم سے نہیں پوچھ رہا، بلکہ کسی اور سے پوچھ رہا ہوں —— جواب تمھیں دوگے لیکن وہ تمھارا نہ ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ آیندہ ماہ کی کسی تاریخ میں بمبئی جانا پڑے۔ اسلئے میری جو رائے ہو سکتی ہے وہ ظاہر ہے۔

سچ کہتا ہوں میں نے پکا ارادہ کر لیا تھا کہ تم کو خط نہ لکھوں گا
پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم

تمھاری علالت کا حال سنکر دل بےچین ہو گیا۔ خدا کے لئے لکھو کہ معالجہ و مداوا کی کیا صورت اختیار کی ہے، وہ حرارت جگر ہو یا التہاب خون، ان میں سے کسی کا علاج ڈاکٹروں کے پاس نہیں ہے۔ سب سے پہلے تو تمھیں جگہ بدلنا چاہئے اور گوشت یک لخت ترک۔

قدرت اگر بیمار ڈالتی ہے تو علاج بھی کرتی ہے۔ کھلی ہوئی صاف و خشک ہوا، پھلوں کا استعمال، مقررہ اوقات پر مقررہ ہلکی غذا اور دماغی سکون ۔۔۔ سب سے زیادہ ضرورت ان چیزوں کی ہے اور یہ تمھیں وہاں میسر نہیں آسکتیں۔ پہاڑوں پر جانے کا موسم نہیں ہے اس لئے کم مرتفع مقامات کا انتخاب مناسب ہوگا۔ اس صوبہ میں دیرہ دون، اور پنجاب میں کیمبل پور بہترین مقامات ہیں۔

اگر واقعی تم اس کے لئے طیار ہو (اور طیار نہ ہونا کیا معنی، ہونا پڑے گا) تو مجھے لکھو، میں خود تمھارے ساتھ چلوں گا۔ مرض چھوٹا ہو یا بڑا، ابتدا ہی میں اس کی روک تھام ہونی چاہئے۔ مجھے یقین ہے کہ تم اس باب میں ضد سے کام نہ لوگے اور بواپسی ڈاک مجھے اطلاع دوگے کہ کس تاریخ تک جانے کا ارادہ ہے، اس کی ضرورت نہیں ہے کہ پہلے سے انتظام کیا جائے۔ میں تو تمھارے ساتھ ہوں، سب ہو جائے گا۔

یہ بالکل صحیح ہے موت کا ایک وقت مقرر ہے، لیکن وقت قدرت کا مقرر کیا ہوا نہیں ہے بلکہ خود انسان اُسے مقرر کرتا ہے اور ٹال بھی سکتا ہے اگر وہ چاہے۔ صحت کی حالت میں وہ طنطنہ اور ذرا سی بیماری میں یہ کم ہمتی! کس قدر شیوۂ مردانہ کے خلاف ہے۔ عزم انسانی کے معجزے تم نے ابھی دیکھے ہی نہیں۔ ٹھہرو، میں آتا ہوں۔ تمھیں کافر بنا کے نہ چھوڑا ہو تو بات نہیں!

تم نے بالکل صحیح سنا ہے۔ واقعی ایک زمانہ سے میرے ان کے درمیان سلسلۂ مراسلت بند ہے، لیکن اسکا سبب وہ نہیں ہے جو تم سمجھے ہو۔ آخری بار ان سے دہلی میں ملنا ہوا تھا اور ایک ہفتہ تک برابر ساتھ رہا ۔۔۔ شاید تین چار سال کی بات ہے ۔۔۔ اس کے بعد وہ ایران چلے گئے اور وہاں سے عراق وغیرہ ہوتے ہوئے چھ مہینے کے بعد واپس آئے۔ ان کے خطوط برابر آتے تھے ۔۔۔ واپسی پر انھوں نے ایک خاص معاملہ میں مجھ سے مشورہ چاہا تھا اور وہ میں ان کی خواہش کے مطابق نہ دے سکا۔ اس کے بعد پھر انھوں نے کوئی خط نہیں لکھا۔ اور مجھے بھی کوئی موقعہ یہ سوچنے کا نہ ملا کہ وہ کیوں خاموش ہیں۔

بعد کو مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ انھوں نے میرے مشورہ پر عمل نہیں کیا اور کافی نقصان اٹھایا۔ ہو سکتا ہے

کہ یہ حجاب اسی لئے ہو۔ بہرحال، میں انھیں لکھتا ہوں۔ اگر مان گئے تو خیر، ورنہ اس میں نقصان ہی کیا ہے۔

ابھی ابھی تمہارا کارڈ ملا، میں تمہاری محبتوں کا معترف ہوں اور اسی اعتماد کی بنا پر تم کو کبھی خط بھی نہیں لکھتا۔ تم نے خواب بالکل غلط دیکھا۔ میں بالکل اچھا ہوں اور فی الحال پندرہ بیس سال تک بیمار پڑنے کا ارادہ بھی نہیں۔ تقدیروں کو پلٹ دینے والا انسان ہوں، تمہیں معلوم نہیں؟
یہ مدرسۂ عالیہ کے پرنسپل کی خبرِ مرگ مجھے کیوں سنائی۔ کیا کوئی بڑے مردِ معقول تھے؟ میں تو اُن سے واقف نہ تھا۔ امسال عرس میں ضرور شریک ہوں گا۔ مولانا مرحوم کی خصوصیات جس وقت یاد آجاتی ہیں تو دل تڑپ اُٹھتا ہے۔ سرزمین رامپور کا سب سے پہلا اور آخری انسان تھا۔
عرشی صاحب سے میرا سلام کہدو۔ مجھے اُن سے باوجود اُن کے مولوی ہونے کے بڑی محبت ہے۔
چند دن ہوئے اتفاق سے اسماعیل (ذبیح) ملنے آگئے۔ بڑی مشکل سے میں نے انھیں پہچانا، اب تو بھئی، وہ مکہ میں رہتے ہیں۔ کیا کہہ سکتا ہوں۔ دُہائی ہے کعبہ والوں کی!

مکرمی۔ آپ نے جو تجویزیں نگار کی ترتیب کے متعلق سوچی ہیں وہ یقیناً ملک کے لئے بہت مفید ہیں، لیکن کوئی ایسی تجویز بھی تو سوچئے کہ ملک، نگار کے لئے مفید ثابت ہو۔ خشک داد سے کب تک کام چلے گا۔ اٹھارہ سال کی جانکاہی کا صرف یہ نتیجہ کہ آپ "سبحان اللہ" کہکر خاموش ہو رہیں، اور میں خون کا سا گھونٹ پیکر رہ جاؤں کم از کم میری سمجھ میں تو آتا نہیں۔

بزمِ جم آخر شد و وقتِ صبوحِ ما رسید
طرحِ دیگر می تواں انداخت دورِ جام را

لیکن یہ "طرحِ دیگر" کیا ہو سکتی ہے؟ سوائے اس کے کہ جام و مینا کو چور چور کر دیا جائے اور بساط کو ہمیشہ کے لئے اُلٹ دیا جائے۔ اب تو یہی سوچ رہا ہوں۔

ایک غلطی کی تصحیح

جناب حمید سکریٹری بزمِ نظیر آگرہ کی تحریر سے معلوم ہوا کہ نظیر کی قلمی تحریر جس کا عکس نگار کی گزشتہ اشاعت میں شائع ہوا ہے، انھوں نے بھیجی تھی۔ افسوس ہے کہ مجھے یاد نہیں رہا اور ایک دوسرے صاحب کا نام درج ہو گیا۔ جناب حمید امید ہے معاف فرمائیں گے۔

نیاز

جامعہ میں ایک مہمان کے ساتھ

"— اور سب سے بڑی بات جس میں سمجھنے کو جامعہ کے وجود کا راز بھی پوشیدہ ہے، یہ ہے کہ ہم اپنے کاموں کے ساتھ خود بھی بنتے رہے۔ جامعہ کی کارگزاری، ہمارے دلوں کی کیفیت ہماری واردات قلبی سے جدا نہیں کیجا سکتی۔ جامعہ کوئی ادارہ یا اداروں کا مجموعہ نہیں ہے، ہمارے دلوں کی کہانی بھی ہے۔ کوئی عمارت یا عمارتوں کا مجموعہ نہیں ہے بہتے چشموں کا ایک جال سا ہے کہ جس سے زمین سیراب اور بستی شاداب ہوتی ہے۔"

پروفیسر محمد مجیب بی۔ اے (آکسن)

جامعہ ملک کا وہ واحد تعلیمی ادارہ ہے جہاں تعلیم ایک مخصوص نصب العین کے ماتحت دیجاتی ہے۔ چنانچہ دوسرے تعلیمی اداروں کے مقابلہ میں ملک کے بچوں اور نوجوانوں کے ساتھ جامعہ کا سلوک بالکل مختلف ہے۔ عموماً ہمارے تعلیمی ادارے یہی اپنے فرض کی انتہا سمجھتے ہیں کہ سال بعد سال اپنے طلبہ کو کتابیں پڑھا کر ان میں بعض مہارتیں پیدا کرنے کی کوشش کریں اور آخری درجوں میں اپنے طلبہ کو کسی پبلک امتحان میں شریک کراکے ان کے اہل یا نا اہل ہونے کا فیصلہ کرا دیں۔ گویا ان اداروں کا سلوک اپنے طلبہ کے ساتھ اس سوتیلی ماں کا سا ہے جو اگر بچوں سے پیار بھی کرتی ہے تو اس نیت کے ساتھ کہ وہ بد سے بدتر اور ناکارہ سے ناکارہ تر بنجائیں۔ نتیجہ وہی ہوتا ہے جو ہونا چاہئے یعنی جس وقت ہمارا طالبعلم فارغ التحصیل ہو کر دنیا میں قدم رکھتا ہے تو اپنے کو ایک اجنبی کی حیثیت میں پاتا ہے اور اپنے آپ کو اجنبی کیوں نہ سمجھے، مدرسہ اور سماج کے درمیان اسے ایک ایسی خلیج نظر آتی ہے جس کا کبھی اسے تصور بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی باعث ہمارے طالبعلم کے دماغ میں ایک نہایت تکلیف دہ کشمکش پیدا ہو جاتی ہے اور بالآخر یا تو وہ اپنی تعلیم کو کیسر فریب اور اُستادوں کو فریب کار سمجھنے لگتا ہے یا پھر دنیا کے ہر مطالبہ کو ہیچ اور مہمل سمجھکر اسے ٹھکرا دینے کا فیصلہ کر لیتا ہے۔ لیکن اس فیصلہ کا نتیجہ اکثر یہی نکلتا ہے کہ دنیا کا تو کچھ نہیں بگڑتا البتہ ہمارا طالبعلم ہی خودکشی میں پناہ ڈھونڈھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ وہ تعلیم جو ان نتائج کی حامل ہو دنیا کے کسی ملک کے لئے سازگار ثابت نہیں ہو سکتی اور بالخصوص اس ہندوستان کے حق میں جس کی آزادی ہنوز ایک خواب بے تعبیر کی حیثیت رکھتی ہو، جس کی معاشرت تباہ، اور جس کا تمدن برباد کیا جا چکا ہو یہ تعلیم پوری لعنت ہے۔ مروجہ تعلیم کے بانی نے چاہا تھا کہ اس تعلیم کے ذریعے غلام پیدا ہوں۔ چنانچہ غلام پیدا ہوئے اور پیدا ہو رہے ہیں۔ آج میکالے کی روح اور سیاست کی روٹی کھانے والے انگریز کا دل اپنی کامیابی پر کسقدر نازاں د

فرحاں ہوگا!

ملک پر جامعہ کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے اس تعلیمی گرم گھر کے جس میں ہماری قوم کے دل و دماغ کو مفلوج دماؤف بنایا جاتا تھا کچھ شیشے توڑ کر اس میں تازہ ہوا کے داخل ہونے کا راستہ بنا دیا ہے اور یہی نہیں بلکہ خود اپنی جگہ تعلیم کے جھوٹے طلسم کے جواب میں ملک کے سامنے سچی تعلیم اور اس کی کامیابی کی وہ مثال پیش کی ہے جو معجزہ کا درجہ رکھتی ہے۔ اسی حقیقت کی بنا پر مسٹر ای سالٹر ڈیویز (ڈائرکٹر تعلیم، کینٹ، انگلینڈ) نے جامعہ پر اپنی رائے کے دوران میں کہا ہے "۔۔۔۔ آپ سخت مشکلات کے باوجود ان اصولوں پر عمل کر رہے ہیں جنھیں نظری طور پر سب نے تسلیم کر لیا ہے مگر عملاً ہمارے مدارس بہت ہی آہستہ آہستہ اختیار کر رہے ہیں۔ سچ پوچھئے تو آپ وہ کر رہے ہیں جو میں انگلستان میں کرنا چاہتا ہوں۔۔۔۔" کچھ دن ادھر کی بات ہے کہ نیو ایجوکیشن فیلوشپ ڈیلیگیشن ہندوستان آیا تھا اس ڈیلیگیشن کے صدر مسٹر ایل زلیاکس کا بیان ہے کہ "جو اصول اس جامعہ کے پیش نظر ہے اور عمل کی صورت میں ظاہر ہو رہا ہے اس کی بدولت یہ دنیا کی بہترین تعلیم گاہوں میں جو میں نے آج تک دیکھی یا سنی ہیں جگہ پانے کی مستحق ہے"

جامعہ میں "نصاب بنانے والوں کا ابتدائی تعلیم کے متعلق یہ بنیادی عقیدہ ہے کہ اس کا مقصد محض بچہ کی معلومات میں اضافہ کرنا نہیں ہے، بلکہ اس کی زندگی کو سنوارنا ہے۔ اس کا مقصد ہے کہ بچہ کی خداداد قوتوں میں نشوونما کا سامان کرے، اور اس میں متمدن زندگی کے فرائض اور مقاصد سے لگاؤ پیدا کر دے۔ جہاں تک کہ ۵ سے ۱۲ سال تک کی عمر میں اس کا امکان ہے۔ اسے اپنی قوتوں پر، محرکات عمل پر، جذبات پر رفتہ رفتہ قابو حاصل ہونے لگے کہ اخلاقی اور ذہنی ضبط کی بنیاد اس سے پڑتی ہے اس میں اپنے فرض کا احساس پیدا ہو چلے، اور اس کو پورا کرنے کا ولولہ، اس کا تخیل اور اس کی ہمدردیاں اس طرح وسعت پذیر ہوں کہ وہ اپنے فطری اور معاشرتی ماحول میں اجنبی نہ رہے بلکہ اسے سمجھے اور ان سے لطف اندوز ہو سکے۔ نصاب بنانے والوں کی آرزو ہے کہ جن بچوں کی تعلیم اس نصاب کے ماتحت ہو وہ تندرست ہوں اور ان کی چال ڈھال اچھی ہو۔ وہ لوگوں سے اچھی طرح صفائی اور فصاحت کے ساتھ بات چیت کر سکیں۔ ان کی گفتار میں حسن اور وقار ہو۔ وہ صاف ستھرے رہتے ہوں، سچ بولتے ہوں، آپس میں مل جل کر کام کر سکتے ہوں، کام کا جو منصوبہ بنائیں اسے ختم کو پہونچاتے ہوں اپنے ماحول کی حسن و خوبی سے لطف اندوز ہو سکتے ہوں اور اسے حسین اور خوب تر بنانے کی آرزو رکھتے ہوں۔ ہمدردی اور اخلاق کی بنیادیں ان کی ابتدائی زندگی میں ایسی استوار رکھی گئی ہوں کہ بڑے ہو کر یہ اچھے ہندوستانی اور سچے مسلمان یعنی پورے انسان ہوں"

میں تو سوقت پانچ چھ سال کا بچہ تھا لیکن آپ میں سے اکثر نے وہ منظر دیکھا ہوگا یا اس کے حالات سنے ہوں گے جب چند "سرپھرے" نوجوانوں نے علیگڈھ میں چار قطاروں میں بیس خیمے لگا کر یہ اعلان کیا تھا کہ یہ "جامعہ ملیہ اسلامیہ" ہے اور اس کا کام مسلمان کو مسلمان اور انسان بنانا ہوگا، بعض لوگ ہنسے ہوں گے اور بعض خاموش رہے ہوں گے

لیکن اس قلیل عرصے میں جامعہ اپنے نصب العین سے عملاً کس قدر معروف ہو چکی ہے۔

یہ کوئی راز کی بات نہیں۔ قرول باغ میں گردوارہ روڈ پر شام کے وقت اکثر آپ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں کچھ بچے دیکھیں گے یہ بچے صاف ستھرے پن اور بھولے بھالے پن میں اس ماحول کے تمام بچوں سے مختلف ہوں گے۔ انھیں ذرا قریب سے دیکھئے ان میں سے ہر بچے کے دانت موتی کی طرح صاف ہوں گے، اس کے ناخون ترشے ہوئے ہوں گے اور گرد و غبار سے بچنے کے لئے اسکی جیب میں رومال ہوگا۔ آپ ان میں کسی بچے کو روکئے۔ بچہ بے خوف ہو کر رکیگا اور آپ سے کہیگا "فرمایئے" آپ اس سے کسی کا پتہ پوچھئے۔ وہ بہت احتیاط اور تفصیل کے ساتھ آپ کو پتہ بتادیگا اور اگر آپ نے ذرا پریشانی ظاہر کی تو یہ بچہ خود آپ کا راہبر بنجائیگا۔ آپ کو منزل تک پہونچائے گا، شگفتگی کے ساتھ "آداب عرض" کرے گا اور رخصت ہو جائے گا۔

——— یہ جامعہ کا بچہ ہے۔

جامعہ کے بچے سے اس سطحی تعارف کے بعد آیئے میں آپ کو اس کی زندگی سے اور زیادہ قریب لئے چلتا ہوں۔ شہر کی زہریلی ہوا سے دور، شہری زندگی کی ضامکاریوں سے الگ اور مصنوعی تہذیب کی حدود سے باہر —— اوکھلا میں جس جگہ ہماری موٹر رکتی ہے وہاں بائیں جانب ایک عالیشان دو منزلہ جرمن طرز کی سرخ عمارت نظر آئے گی۔ دور سے یہ عمارت قرب جوار کی ناہموار زمین پر ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے الٰہ دین کے چراغ والے جن نے کہیں سے اٹھا کر اسے یہاں لا رکھا ہے۔ لیکن یہ کسی ہندوستانی "چراغ الٰہ دین" کا محل نہیں ہے۔ یہ جامعہ کے بچوں کا گھر ہے۔ وہ گھر جہاں ہندوستان کے سوا دو سو بچے ہندوستان کی زندگی میں، مردانہ وار حصہ لینے کے لئے تیار کئے جا رہے ہیں وہ گھر، جہاں کے بچے پروان چڑھکر استبداد کی گردن پر پاؤں رکھیں گے وہ گھر جہاں کے رہنے والے دولت کی لعنت اور وراثتی کبر و نخوت کے گلے پر چھری چلائیں گے — کیونکہ ان کا مشرب ہے "جاگو اور جگاؤ"

جوہر منزل، حالی منزل، اقبال منزل، انصاری منزل، محمود منزل اور اجمل منزل —— اس عمارت میں چھ اقامت گاہیں ہیں۔ آپ ان ناموں سے سمجھ سکتے ہیں کہ جامعہ ابتدا ہی سے بچے میں کس حد تک اپنے قومی ورثے کو صحیح زاویۂ نگاہ سے دیکھنے کی عادت ڈالتی ہے۔ آیئے اب ذرا ایک اقامت گاہ میں چلیں۔ دیکھئے ان بچوں کے بستر کس سلیقے سے لگے ہوئے ہیں۔ بستروں کے درمیان ہر جگہ ایک سا فاصلہ ہے۔ گویا کل کمرے کی پیمائش کر کے بستروں کی جگہ قائم کی ہے۔ یہ کمرے کے پیچھے دیکھئے انکے استعمال کے کپڑے ٹنگے ہوئے ہیں اور یہیں ایک قطار میں سب کے جوتے رکھے ہوئے ہیں کونے میں دیکھئے پینے کا پانی ایک گھڑے میں رکھا ہے۔ صفائی کے لئے گھڑے میں permanganate لگا ہوا ہے۔ کمرے کی دیواروں پر جو تصویریں لگی ہوئی ہیں وہ اسی کمرے کے رہنے والوں کی تخیل کی ترجمان ہیں۔ یہاں بھی آپ دیکھ سکتے ہیں کہ بچے کے فطری رجحانات اور ذوق و شوق کی پذیرائی کے کیا مواقع ہیں۔ یہ بچے منھ اندھیرے اٹھتے ہیں۔ ضروریات سے فارغ ہو کر ایک گھنٹہ کھلی ہوا میں ورزش کرتے ہیں اور اس کے بعد ایک بڑے خاندان کی طرح ایک ساتھ بیٹھکر ڈائننگ ہال میں ناشتہ کرتے ہیں۔ جس نفاست کے ساتھ یہ بچے ناشتہ کرتے ہیں وہ آپ کو

دوسری جگہ کے بڑے طلبہ میں بھی کم نظر آئے گی۔ ڈائننگ ہال میں انتظام کرنے کے لئے ہر ماہ ہر جماعت اپنے دو نمائندے منتخب کرکے بھیجتی ہے جو ڈائننگ ہال میں کھانے کے وقت اپنی اپنی جماعت کی ضروریات پورا کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ ناشتے کے بعد سب بچے ترانے کے لئے جمع ہوتے ہیں اور اُس وقت جب اس عمارت کے ایک گوشے سے دو سو معصوم آوازیں

ہاتھ اُٹھائے، سر کو جھکائے

رحم پہ تیرے آس لگائے

گاتی ہوئی اُٹھتی ہیں تو دل کی رگ رگ میں ایک گونج پیدا ہوجاتی ہے اور چند لمحوں کے لئے تو یقیناً انسان اور خدا کے درمیان کوئی پردہ نہیں رہتا۔ "ترانے" کے بعد دن کے ضروری اعلانات ہوتے ہیں پھر کل کی کھوئی ہوئی چیزیں جن میں جوتے، ٹوپیاں تولیاں، چاقو، ربر، پنسلیں سب ہی کچھ ہوتا ہے بچوں کو واپس کردی جاتی ہیں اور پھر مدرسہ شروع ہوتا ہے۔

درجے میں بھی یہ بچے اپنے بچپن سے دور اور زندگی سے الگ نہیں ہونے پاتے بلکہ یوں کہئے کہ زندگی ہی ان کے لئے ذریعۂ تعلیم ہے۔ چنانچہ جامعہ کا بچہ زبان سیکھتا ہے، اس لئے نہیں کہ اسے زبان کا امتحان دینا ہے بلکہ اس لئے کہ اسے اپنے عزیزوں اور دوستوں کو خط لکھنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ وہ حساب سیکھتا ہے اس لئے نہیں کہ حساب اسکے نصاب میں شامل ہے بلکہ اس لئے کہ اسے اپنے چڑیا خانہ، بچوں کی دوکان اور بینک کا حساب رکھنا پڑتا ہے۔ وہ سائنس پڑھتا ہے اس لئے نہیں کہ وہ سائنس کے کچھ اُصول رٹ کر اچھے نمبر حاصل کرسکتا ہے بلکہ اس لئے کہ اگر اس سے کبھی (Swan ink) کی شیشی نہ کھلے تو وہ ایک دیاسلائی سے اس کا ڈھکن گرم کرکے اسے کھول سکے۔ وہ سماجی علم پڑھتا ہے اس لئے نہیں کہ وہ ریل کی کھڑکی میں کھڑا ہوکر دوسرے مسافروں کو دھکا دے بلکہ اس لئے کہ خود بھی آرام سے سفر کرے اور دوسروں کو بھی آرام سے سفر کرنے دے۔ وہ مذہبی تعلیم بھی حاصل کرتا ہے لیکن اس لئے نہیں کہ وہ افیونی بن کر جنت و جہنم کے خواب دیکھنے میں اپنا وقت ضایع کرے بلکہ اس لئے کہ وہ دوسروں کی مصیبت میں خدا کا ہاتھ بن کر کام آئے۔ یہی وجہ ہے کہ جامعہ کا بچہ زندگی اور دنیا سے کبھی نہیں گھبراتا۔ وہ سماج میں اپنی جگہ پہچانتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس کا سماج پر اور سماج کا اس پر کیا حق ہے۔

دوپہر کو کھانے بعد یہ بچے کچھ آرام کرتے ہیں۔ شام کو ان کے لئے ہر قسم کے کھیل کا انتظام ہے۔ زیادہ چھوٹے بچوں کے لئے جھولے اور سلائڈ موجود ہیں۔ رات کے کھانے کے بعد ریڈیو پر کچھ دیر گانا اور خبریں سنتے ہیں۔ پھر وقت پر سو جاتے ہیں۔

ان کھیلوں اور دلچسپیوں کے علاوہ جن کا مدرسے کی طرف سے انتظام ہے بچوں کی اپنی نجی دلچسپیاں بھی ہیں جیسے پھلوں کی دوکان، کتابوں کی دوکان اور چڑیا گھر کے انتظامات کے علاوہ ایک "پندرہ روزہ" بچوں کا اخبار" بھی ان کا نجی معاملہ ہے۔ اس اخبار کے "عید نمبر" اور "دیوالی نمبر" بہت دلچسپ تھے اور اشتہاروں کے ذریعے باضابطہ طور پر ان نمبروں کا پروپاگنڈا کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ مختلف بچے اپنے لئے ایک موضوع سے متعلق زیادہ سے زیادہ تصاویر اور معلومات البم کی صورت میں جمع کرتے ہیں۔ ایک بچے نے، جس کا نام مجھے اسوقت یاد نہیں آرہا ہے، پھولوں ہی کی تصاویر کا ایک البم

مجھے یہ البم سب سے زیادہ پسند ہے۔ دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ اس بچے کو اپنا بچپن کس قدر عزیز ہے! پتیاں، کیڑے مکوڑے، ٹکٹ اور سکے جمع کرنے کا شوق تو عام ہے۔ ان دلچسپیوں کے علاوہ ہر جماعت کی ایک یونین ہے جس میں باقاعدہ مختلف کاموں کے لئے وزیروں کا انتخاب ہوتا ہے۔ ہر ہفتے یونین کا ایک جلسہ ہوتا ہے جس میں بعض مفید باتوں پر تبادلۂ خیال ہوتا ہے۔

آیئے، اب میں اپنے چند دوستوں سے آپ کی ملاقات کراؤں۔ دیکھئے یہ ایک چھوٹا سا بچہ جو اپنی اونی ٹوپی اور گرم کوٹ میں اسکیمو معلوم ہو رہا ہے درجہ دوم کا طالبعلم ہے۔ اس کی عمر سات آٹھ سال کی ہوگی اور اس کا نام قاضی اسرار ہے۔ جامعہ میں میری دوستی سب سے پہلے اسی بچے سے ہوئی تھی۔ اسے کہانیوں کا بیحد شوق ہے۔ ایک دن سیر گشت کے سلسلہ میں اس نے مجھے یہاں سے نہر تک چار کہانیاں سنا ڈالیں۔ اس کا ہمیشہ تقاضا ہوتا ہے کہ میں اس کے ساتھ ساتھ چلوں۔ میری انگلی پکڑ لیتا ہے اور ساتھ رہنے کے شوق میں تھوڑی دیر بعد بھاگتا ہے حتیٰ کہ اس کی سانس پھول جاتی ہے۔ پھر میں اسے گود میں اٹھا لیتا ہوں ایک اور بچہ دیکھئے۔ اس کا نام رضوان ہے۔ چہرہ کیسا گول گول ہے، آنکھیں کسقدر روشن۔ ہر بات سے بھولا پن برستا ہے گویا معصومیت کا دیوتا ہے۔ ورڈسورتھ نے ایسے ہی کسی بچے کے قدموں میں آسمان دیکھا ہوگا۔ اسے بھی میری گود میں چڑھکر مجھ سے باتیں کرنے کا اور میری انگلی پکڑ کر چلنے کا بہت شوق ہے۔ اور ہاں وہ ایک بچہ بھی جس نے ہمیں دور سے سلام کیا، عجیب بچہ ہے۔ ذہانت اسکے چہرہ سے برستی ہے، گو لکھنے پڑھنے میں زیادہ تیز نہیں ہے۔ جب میں سب سے پہلی مرتبہ ڈائننگ ہال آیا تو انھوں ہی نے "السلام علیکم" کے ساتھ میرا استقبال کیا تھا۔ لیکن جب انھوں نے مجھ سے یہ سوال کیا کہ "آپ کس سیاسی ادارے سے تعلق رکھتے ہیں؟" تو میں، کہ سیاست کو سیاست کی طرح سمجھنے کا عادی ہی نہیں، ذرا گھبرا سا گیا۔ اپنی ندامت چھپانی تھی اس لئے خاموش رہا۔ لیکن انھوں نے پھر نئے شوق کے ساتھ مجھ سے کہا "آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا" "میں کسی سیاسی ادارے سے تعلق نہیں رکھتا" میرا جواب تھا۔ اس پر اس بچہ نے تیور بگاڑ کر مجھ سے کہا "واہ یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ میں سیاسی ادارے سے تعلق نہیں رکھتا، ہمیں زندگی کے ہر شعبے میں مختلف چیزیں انتخاب کرنی ہوتی ہیں۔ اسلئے کوئی سیاسی ادارہ بھی آپ کا پسندیدہ ضرور ہونا چاہئے" جامعہ میں یہ میرا پہلا سبق تھا جو ایک بچہ سے مجھے ملا۔ یہ ملاقات تو یہیں ختم ہو گئی لیکن اپنی اولین فرصت میں ہم دونوں نے ساتھ بیٹھ کر گفتگو کی، چائے پی پھل کھائے اور ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے کے بھائی بن گئے۔ ان کا نام مصطفےٰ رشید صدیقی ہے۔ درجہ ششم میں تعلیم پاتے ہیں اور چڑیا گھر کے ناظم ہیں۔ — وہ ایک صاحب جو ابھی ابھی نظر بچا کر ادھر سے نکل گئے منیر الدین قادری ہیں خدا نے ذوق اور ذہن دونوں دئے ہیں مدرسہ کے بہترین مصور ہیں۔ ہم دونوں کو ایک تعلیمی سفر کے سلسلہ میں قریب دو ہفتے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا۔ دیکھنے کی بات یہ تھی کہ کس حد تک جامعہ اپنی تربیت کے اثرات بچوں کے ذہن میں مستقل طور پر قائم کرنے میں کامیاب ہوتی ہے۔ میں روز اس بات کی تلاش میں رہتا تھا کہ دیکھوں منیر جامعہ کے اصولوں سے کس جگہ الگ ہوتے ہیں۔ لیکن میری جستجو فضول تھی۔ معلوم یہ ہوا کہ جامعہ کا بچہ ہر جگہ اپنی جامعہ بنا لیتا ہے۔ منیر کو اس کمسنی میں زبان پر متحیر کن قابو اور قدرت حاصل ہے سفر میں

میرے سامنے بیٹھ کر اپنی ڈائری کے صفحے کے صفحے بغیر تکان لکھے چلے جاتے تھے اور مضمون کے تسلسل میں سرِ مو فرق نہیں آتا تھا۔ "بچوا" کا اخبار "انھیں کی زیر ادارت نکلتا ہے۔ عبداللہ، نعیم اور محمود سے آپ کی ملاقات اور کراتا لیکن وہ اسوقت کہیں نظر نہیں آرہے ہیں۔ جامعی بھائیوں میں یہ بھی مجھے بہت عزیز ہیں۔

یہ تو چند وہ ستارے تھے جن سے میں نے اپنا آفتاب بنانے کی کوشش کی تھی۔ اب آپ پھر ایکبار مجموعی حیثیت سے جامعہ کے بچوں کو دیکھئے اور غور کیجئے کہ دوسرے مدرسوں میں تعلیم پائے ہوئے بچوں سے کس قدر مختلف ہیں۔ سب سے بڑی بات جامعہ کے بچہ میں یہ ہے کہ وہ اپنی ذمہ داری کو سمجھتا ہے۔ چنانچہ اُستاد موجود ہو یا نہ ہو لیکن اسے اپنے کام میں لگے رہنا۔ اسکے علاوہ جامعہ کا بچہ آزاد ہندوستانی کی حیثیت سے رہنا پسند کرتا ہے اسلئے اسکے نزدیک سماجی امتیازات اور پابندیاں لایعنی سی چیزیں ہیں اور وہ آن بان جسے کرائے کی آن بان کہئے اسکے یہاں حرام ہے۔ یہ بچہ غریب گھر کا ہو یا امیر لیکن صاف رہنے کے لئے خود ہی اپنے جوتے پر پالش کرلیتا ہے اور خود ہی کپڑے بھی دھولیتا ہے۔ جامعہ کا بچہ وقت کی پوری قدر کرتا ہے۔ چنانچہ جب اس کا کسی کام میں جی نہیں لگتا تو وہ دوسروں کے پاس جاکر ان کا وقت برباد نہیں کرتا۔ لیکن اس گفتگو کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ جامعہ کا بچہ عمر سے پہلے بوڑھا ہو جاتا ہے۔ ہرگز نہیں۔ جب موقع ہوتا ہے تو یہ شور کرتا ہے اور خوب شور کرتا ہے۔ اپنے ساتھیوں سے لڑ بھی لیتا ہے اور پھر جواب میں پٹ لینے پر روتا بھی ہے — ملک اور قوم کے بچوں کی اس خدمت کے باوجود کچھ لوگ جامعہ سے خفا ہیں اور وہ اس لئے کہ جامعہ انکے بچوں کی تربیت کا ذمہ نہ لے سکی۔ ہمارے ان بزرگوں کو چاہئے کہ اپنے بچوں کو جامعہ بھیجنے کے شوق کے ساتھ ساتھ جامعہ کی مجبوریوں کو بھی مدنظر رکھیں۔ جامعہ ایک اقامتی درسگاہ ہے اور اسے اپنا طریقۂ تعلیم کامیاب بنانے کے لئے دیکھنا پڑتا ہے کہ وہ جسمانی طور پر ضرورت سے زیادہ کمزور کسی بچے کو یا کسی ایسے بچے کو جو بلحاظ عمر صحیح ذہنی استعداد حاصل نہیں کرسکا ہے داخل نہ کرے۔ جامعہ کا یہ رویہ والدین کے لئے ناگوار ہو تو ہو لیکن جامعہ والدین کو خوش کرنے کے لئے بچہ کو دھوکا نہیں دے سکتی۔ کچھ اسی قسم کی غلط فہمیوں سے متاثر ہو کر بعض احباب نے جامعہ کے خلاف پروپیگنڈا کرنا اپنا "شغل فرصت" بنا رکھا ہے۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب ۳ نومبر سنہ ۳۹ء کو میں نے بمبئی میں مکتبۂ جامعہ کی شاخ کے قریب دیوار پر یہ اشتہار لگا دیکھا "جامعہ کی کتب بائیکاٹ کرو۔ جامعہ بچوں کو مدینہ کی بجائے کاشی کا راستہ دکھاتی ہے۔ نیا قاعدہ صفحہ ۲۹" یہ اشتہار دیکھ چکنے کے بعد میں نے اپنی سب سے پہلی فرصت میں نیا قاعدہ دیکھا۔ صفحہ ۲۹ پر کچھ یہ جملے تھے، یادداشت سے نقل کرتا ہوں — "ریل میں بیٹھ، سفر کر، متھرا جا، پیڑے لا" آپ خود سوچئے کہ کیا یہی کاشی کی راہ دکھانا ہے؟ پھر ان معترضین کو اگر تعلیم سے ذرا بھی لگاؤ ہوتا تو جانتے کہ ہندوستانی بچے کے لئے متھرا اور متھرا کے پیڑے زیادہ قریب کی چیزیں ہیں نہ کہ مکۂ معظمہ اور مدینۂ منورہ۔ یہ اصول کہ بچے کے لئے تعلیمی مواد بچے ہی کے ماحول سے لینا چاہئے اب اتنا نیا بھی نہیں ہے کہ بمبئی کے مسلمان اسے نہ جانتے ہوں۔ لیکن جس قوم کے متعلق قدرت یہ فیصلہ کرچکی ہو کہ اسے فنا ہے اس کے لئے کوئی انسان کر بھی کیا سکتا ہے۔ جامعہ کا اگر کوئی قصور اور کفر ہے تو صرف اتنا کہ وہ ہندوستان کے مسلمانوں کو ایک بیدار قوم بنا کر ہندوستان میں امن و سکون کے ساتھ رہنا سکھاتی ہے۔ لیکن ہندوستان کے مسلمان کو ہندوستان میں رہنا ہی کب ہے۔ اسے تو افغانستان، ایران، عرب، فلسطین ترکستان اور مصر میں جاکر ان آزاد مسلمانوں کی حمایت میں کٹ مرنا ہے جنھیں اس غلام مسلمان کی ضرورت نہیں یا ہندوستان میں سر لٹکائے ایک مسافر کی طرح زندگی کے دن پورے کرکے آسمان کا رخ کرنا ہے — جامعہ آپ کو تعجب ہوگا روپے سے نہیں بنی ہے۔ اسکی بنیادیں ایثار اور خلوص پر رکھی گئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود ان بے شمار دشواریوں کے جو اس قسم کے اداروں کے سامنے آتی ہیں جامعہ روز بروز اپنے نصب العین سے قریب تر ہوتی جارہی ہے۔ جامعہ کی مسلسل ترقی کا ایک ثبوت "اُستادوں کا مدرسہ" بھی ہے۔ "اُستادوں کا مدرسہ" امسال اپنی زندگی کا دوسرا سال پورا کر رہا ہے۔ آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ جس اُستادوں کے مدرسے کے ساتھ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب، پروفیسر محمد مجیب صاحب اور پروفیسر سعید انصاری صاحب جیسے اُستادوں کی سعی و کاوش وابستہ ہو اسے جدید تعلیمی مطالبات کو پورا کرنے کے لئے کس معیار کے اُستاد تیار کرنے چاہئیں۔ یہ ضرور ہے کہ اس ادارے کو بھی اپنی نوخیزی کے باعث بعض سخت دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ تاہم جامعہ کا یہ ادارہ بھی اپنے ہمشیر اداروں کی طرح ہندوستان کے چوٹی کے ماہرین تعلیم سے خراج تحسین حاصل کر چکا ہے — اور یہ سب خلوص کا کرشمہ اور ایثار کا معجزہ ہے۔ اسی بھروسہ پر جامعہ کا کام چلا ہے اور چلیگا۔

فضل الدین اختر ایم۔ اے

باب الاستفسار

موجودہ جنگ کا نتیجہ

(جناب سید اسماعیل حسن صاحب - ناگپور)

آپ کے جو مقالے جنگ کے متعلق نگار میں شایع ہوتے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے سیاسیات عالم کا نہایت گہرا مطالعہ کیا ہے، لیکن ہمیں تو آپ صاف صاف الفاظ میں یہ بتایئے کہ موجودہ جنگ کا کیا نتیجہ ہوگا، آیندہ یہ کیا صورت اختیار کرنے والی ہے اور ہم لوگ کب تک اس مصیبت میں مبتلا رہیں گے۔

(نگار) آپ ایسے مسئلہ میں مجھ سے پیشین گوئی کی درخواست کرتے ہیں کہ اگر آج کوئی نبی ہوتا، تو شاید وہ بھی اسکی جرأت نہ کر سکتا۔ بڑے بڑے انبیا نے متعدد لڑائیاں لڑی ہیں، لیکن کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ فیصلہ ہمیشہ ان کے موافق ہوا ہے، اگر انھیں نتیجہ کا علم ہوتا تو وہ کیوں لڑتے اور کیوں انھیں شکست ہوتی۔

تاہم حالات کی بناء پر یہ ضرور قیاس کیا جا سکتا ہے کہ دنیا کی موجودہ حکومتوں کے نظام پر اس کا بڑا زبردست اثر پڑے گا اور ہو سکتا ہے کہ یا تو عالم میں ایک مستقل امن و سکون کی صورت پیدا ہو جائے، یا اس سے بھی زیادہ ہولناک جنگ کے اسباب رونما ہو جائیں۔

اس میں شک نہیں کہ فرانس و برطانیہ کا عملی اتحاد اور امریکہ وغیرہ دوسری جمہوری حکومتوں کی اخلاقی ہمدردی۔ یہ اتنا زبردست محاذ ہے کہ جرمنی و روس کا باہمی تعاون اس کے مقابلہ میں کامیاب نہیں ہو سکتا، لیکن میں یہ ماننے کے لئے طیار نہیں کہ آگے چل کر جمہوری حکومتوں کے مقابلہ میں لڑائی کا سارا بوجھ انھیں دو کے سر پڑ جائے گا اور یورپ و ایشیا کی کوئی اور حکومت ان کا ساتھ نہ دے گی۔ کہا جاتا ہے کہ برطانیہ نے تین سال تک لڑنے کا ارادہ تو کر ہی لیا ہے۔ لیکن برنارڈ شا کے خیال کے مطابق اس میں ایک صفر اور بڑھانا چاہئے۔ جرمنی کی طیاریوں کا صحیح علم ہمیں حاصل نہیں، لیکن اگر

اس کے بیانات سے مبالغہ کا حصہ علیحدہ کر دیا جائے تو بھی وہ کم از کم ایک سال تو آسانی سے مقابلہ کر ہی سکتا ہے اور یہ ممکن نہیں کہ اس دوران میں بعض گتھیاں ایسی نہ پڑیں کہ ان سے وہ جائز یا ناجائز فایدہ اُٹھا کر اور کئی سال تک اس آگ کو مشتعل نہ رکھ سکے۔

میں نے اس اشاعت کے ملاحظات میں زیادہ تفصیل کے ساتھ جنگ کے مستقبل پر بحث کی ہے، آپ اسے پڑھئے اور پھر بھی اگر کوئی بات آپ کو تشنہ نظر آئے تو مجھ سے دریافت فرمائیے۔ بہر حال آپ اور ہم سب کو نہایت سخت مصائب کا مقابلہ کرنے کے لئے طیار رہنا چاہئے اور یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اگر ہم نے اس موقعہ کو محض توکل بخدا ایک بیکسانہ خاموشی کے ساتھ گزر جانے دیا تو پھر اس کے بعد جو دور ہندوستان پر آئے گا وہ ایک لازوال غلامی کا ہوگا اور اس سے صدیوں تک نجات ملنا مشکل ہے۔

مومن کے بعض حل طلب اشعار

(جناب تفضل حسین صاحب۔ رانچی)

معلوم نہیں اس سے پہلے جن حضرات نے استفسار کا یہ سلسلہ شروع کیا تھا، وہ آیندہ اس کو جاری رکھیں گے یا نہیں، لیکن اس خیال سے کہ مبادا وہ خاموش ہو گئے ہوں اور یہ سلسلہ منقطع ہو جائے، میں ذیل کے اشعار کا مفہوم دریافت کرنا چاہتا ہوں۔

۱۔ غیر کو سینہ کہے سے سیمبر دکھلا دیا ۔۔۔ تم نے کیا کچھ کس کو اتنی بات پر دکھلا دیا

پہلا مصرعہ بہت اُلجھا ہوا ہے ۔ کیا سیمبر اس جگہ منادیٰ ہے۔ دکھلا دیا کا فاعل کیا ہے

۲۔ دیکھیں گے مومن یہ ہم ایمان بالغیب آپ کا ۔۔۔ اس بت پردہ نشیں نے جلوہ گر دکھلا دیا

ایمان بالغیب سے کیا مراد ہے اور اس کا تعلق کس سے ہے؟

۳۔ دیکھ اپنا حالِ زار منجم ہوا رقیب، ۔۔۔ تھا سازگار طالع ناساز دیکھنا

طالع ناساز اگر خود مومن کا تھا تو وہ اس کے حق میں سازگار کیونکر ہو گیا۔

۴۔ مت رکھیو گردِ تارکِ عشاق پر قدم ۔۔۔ پامال ہو نہ جائے سر افراز دیکھنا

۵۔ گور میں بھی جوشِ غم دل سے نکلا ہائے ہائے ۔۔۔ آپ ہی میں ہم نہیں جب کنج تنہائی ملا

۶۔ ہم بھی تو ناداں ہیں آخر یاس طلب کس لئے ۔۔۔ خضر، موسیٰ کو پئے تعلیم دانائی ملا

۷۔ جستجوے وصلِ دلبر کی تمنا کس لئے ۔۔۔ کیا دلِ گم گشتہ اے ہنگام آرائی ملا

۸۔ واعظ بتوں کو خلد میں لیجائیں گے کہیں ۔۔۔ ہے وعدہ کا فردوں سے عذاب الیم کا

۹۔	ہے ظلم کرم جتنا تھا فرق پڑا کتنا	مشکل ہے مزاج اتنا اک بار بدل جانا
۱۰۔	کیا باتیں بناتا ہے وہ جان جلاتا ہے	پانی میں دکھاتا ہے کافور کا جل جانا
۱۱۔	مطلب ہے کہ وصلت میں ہو بوالہوس آفت میں	اس گرمیِ صحبت میں اے دل نہ پگھل جانا
۱۲۔	محوِ جفا ستم کشِ الطاف کب ہوا	رحم اُس کو میرے حال پہ آیا غضب ہوا
۱۳۔	کس دن بھی اسکے دل میں محبت جواب نہیں	سچ ہے کہ تو عدو سے خفا بے سبب ہوا
۱۴۔	بی طعنِ وصلِ حور سے کیسا جلا دیا	روزِ جزا کا ذکر جو محفل میں شب ہوا
۱۵۔	از بس کہ تھی وصال میں غیروں سے ہمسری	عیش و سرور باعثِ رنج و تعب ہوا
۱۶۔	تاثیرِ بیقراریِ ناکام آفریں	ہے کام ان سے شوخ شمایل کو تھامنا
۱۷۔	دیکھے ہے چاندنی وہ زمیں پر نہ گر پڑے	اے چرخ اپنے تو مہ کامل کو تھامنا
۱۸۔	مضطر ہوں کس کا طرزِ سخن سے سمجھ گیا	اب ذکر کیا ہے سامعِ عاقل کو تھامنا
۱۹۔	سیکھے ہیں مجھ سے نالہ نہ آسمان شکن	صیاد اب قفس میں عنادل کو تھامنا
۲۰۔	یہ زلف خم بخم نہ ہو، کیا تاب غیر ہے	تیرے جنوں زدہ کی سلاسل کو تھامنا
۲۱۔	مت مانگیو امان بتوں سے کہ ہے حرام	مومن، زبانِ بیہدہ سائل کو تھامنا
۲۲۔	تھی کمیں میں غارتِ بوسِ دہن ہنگام خواب	شب کی بیداری سحر کا خواب رہزن ہو گیا
۲۳۔	زخم تو بھی مراہم زخم کہن ہے چارہ گر	بند تیر یار سے سینہ کا روزن ہو گیا
۲۴۔	رازِ نہاں زبانِ اغیار تک نہ پہونچا	کیا ایک بھی ہمارا خط یار تک نہ پہونچا

(نگار) مومن کے اشعار سمجھنے کے لئے سب سے پہلے آپ ان کی نثر کرلیا کیجئے، بہت سے اشعار تو اسی طرح حل ہو جائیں گے۔ لیکن اگر اس میں کامیابی نہ ہو، تو پھر یہ غور کیا کیجئے کہ شعر میں محذوفات کیا کیا ہیں اور اگر کوئی خاص فارسی ترکیب ہو تو اس کے مفہوم اور محل استعمال کو بھی دیکھئے۔ آپ نے جتنے اشعار درج کئے ہیں، ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو نثر کرنے کے بعد سمجھ میں آسکتے ہیں۔ بعض البتہ زیادہ دقیق ہیں۔ بہر حال اب سلسلہ وار انکا مطلب سنئے:۔

۱۔ پہلے مصرعہ کی نثر یوں ہوئی :۔ سیمبر کہے سے غیر کو سینہ دکھلا دیا۔ یعنی غیر نے جو تمہیں سیمبر کہا تو فوراً فخر و غرور سے سینہ دکھا دیا۔ دوسرا مصرعہ صاف ہے۔ سیمبر یہاں منادیٰ نہیں ہے، دونوں مصرعوں میں دکھلا دیا کا فاعل تمنے ہے جس سے دوسرا مصرعہ شروع ہوتا ہے۔

۲۔ ایمان بالغیب سے مراد خدا پر بے دیکھے ایمان لانا ہے، جو مومن کی صفت ہے۔ مدعا یہ کہنا ہے کہ اسے مومن

یہ تمھارا ایمان بالغیب اسی وقت تک ہے جب تک اس بت پردہ نشیں نے جلوہ نہیں دکھایا۔ یعنی اس کا جلوہ دیکھتے ہی خدا کو نہ بھول جاؤ تو سہی!

۳۔ دوسرے مصرعہ کی نثر محذوفات پر کرنے کے بعد یوں ہوگی:۔

منجم کے لئے میرا طالع ناساز دیکھنا، اس کے لئے سازگار تھا۔ مطلب یہ ہے کہ جب منجم نے میرے حال زار کو دیکھا تو اُسے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ جس پر یہ جان دیتا ہے وہ واقعی بہت جمیل ہے اور اس طرح وہ میرا رقیب بن گیا۔ گویا میرا طالع ناساز دیکھنا ہی اسے سازگار ہوگیا۔

۴۔ عاشقوں کی سروں کی خاک پر قدم نہ رکھنا ورنہ ان کے لئے یہ بات سرافرازی کا باعث ہوجائے گی اور یہ تم چاہتے نہیں کہ جو تمھارا پامال ہو وہ سرافراز ہوجائے۔

۵۔ جب تک زندہ رہے دنیا کے ہنگامہ کی وجہ سے دل کی بھڑاس نہ نکلی۔ گور میں بیشک تنہائی ملی تھی اور موقعہ تھا کہ خوب دل بھر کر رو لیتے، لیکن افسوس ہے کہ یہاں خود ہمیں اپنا ہوش نہیں۔

۶۔ اس شعر میں تلمیح ہے موسیٰ وخضر کے ملاقات کی۔ مشہور روایت ہے کہ موسیٰ کو بعض باتیں معلوم نہ تھیں اور ان کو ہدایت ہوئی تھی کہ وہ خضر سے ملکر دریافت کریں۔ اسی پر قیاس کر کے شاعر کہتا ہے کہ میں بھی تو موسیٰ کیطرح نادان ہوں اس لئے مطلب کی طرف سے مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ ممکن ہے مجھے بھی میرا خضر (محبوب) مل جائے۔

۷۔ اے ہنگامہ آرائی، کیا دل گم گشتہ تجھے مل گیا تھا جو اب ہنگامۂ جستجو سے وصل دلبر کی تمنا کرتی ہے؟ یعنی جس طرح ہنگامہ آرائی سے دلِ گم گشتہ نہیں مل سکا، اسی طرح وصلِ دلبر بھی میسر نہیں آسکتا، مدعا یہ کہ سب مقدر پر منحصر ہے، کوشش سے کچھ نہیں ہوسکتا۔

۸۔ یہ شعر نازک ہے۔ واعظ پر طعن کرتا ہے کہ اگر تیرے کہنے کے مطابق کافروں کو عذاب جہنم میں مبتلا کیا جائے گا، تو اس کے معنے یہ ہوئے کہ بتوں کو جہنم سے نکال کر خلد میں لیجائیں گے۔ ورنہ اگر بت بھی جہنم میں رہے تو کافروں کیلئے جہنم بھی بہشت ہوجائے گا۔

۹۔ کتنا فرق پڑگیا کہ پہلے جتنا کرم تھا اتنا ہی ظلم ہے۔ دفعتاً کسی کا مزاج اتنا بدل جانا بہت مشکل ہے۔

۱۰-۱۱۔ یہ دونوں شعر قطعہ بند ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب میں اُس سے سوالِ وصل کرتا ہوں تو وہ پانی پر کافور جلاکر دکھاتا ہے یعنی دیکھو بوالہوس یا غیر کا حال وصل میں اسی کافور کی طرح ہوتا ہے، سوائے دل تو ان باتوں میں آکر سوالِ وصل سے ہٹ نہ جانا، وہ تو یونہی باتیں بنایا کرتا ہے۔

۱۲۔ محو جفا (یعنی میں) کب اس کے الطاف کا ستمکش ہوا تھا یعنی میں اس سے واقف ہی نہیں کہ اسکی عنایتیں کتنا بڑا ظلم ہیں، اس لئے اس کا اب میرے حال پر رحم کرنا قیامت ہے۔ کیونکہ اس نوع کی ستمرانیوں سے تحمل ہونیکا

موقعہ مجھے کبھی ملا ہی نہیں، اور ہو سکتا ہے کہ میں انھیں برداشت نہ کر سکوں۔

۱۳- یہ شعر خاص مومنؔ کے رنگ کا ہے۔ محبوب، عدو سے اس لئے خفا ہے کہ اس کی محبت کا یقین نہیں رہا۔ مومنؔ یہ رنگ دیکھ کر محبوب سے کہتا ہے کہ عدو کو تم سے پہلے ہی کب محبت تھی جواب نہیں رہی۔ اس لئے تمھارا اُس سے ناخوش ہونا بے سبب ہے۔

۱۴- روزِ جزا کے ذکر پر محبوب نے طعن کیا کہ تمھیں تو وہاں حوریں ملیں گی، پھر کیا فکر ہے۔ اس طعن کو سن کر مومن کہتا ہے کہ میرا جی لیا گیا جلا ہے۔

۱۵- مجھے وصل تو نصیب ہوا لیکن اس خیال سے کہ یہ تو صرف غیروں کی برابری ہوئی، سارا عیش خاک میں ملگیا۔

۱۶- اس شعر میں آفریں کا لفظ دھوکا دیتا ہے اور لوگ اسے ناکام کے ساتھ متعلق سمجھکر کوئی فارسی ترکیب قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ آفریں یہاں بالکل علحدہ ہے اور شاباش کے معنے میں استعمال ہوا ہے۔ اپنی بیقراری ناکام سے طنزیہ لہجہ میں مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ شاباش، تونے خوب اپنا اثر دکھایا یعنی بجائے اس کے کہ تو اس کو بیقرار کر دیتی، تو نے اس میں اور سکون پیدا کر دیا، سچ ہے ایسے شوخ شمایل کو تھامنا بھی آسان کام نہ تھا۔

۱۷- وہ (محبوب) چاندنی کی طرف دیکھ رہا ہے، اس لئے اے آسمان اپنے مہرِ کامل کو سنبھالنا کہیں ایسا نہ ہو کہ زمین پر آ پڑے۔

۱۸- سامعِ عاقل میری باتوں سے سمجھ گیا کہ میں کس کے لئے بیتاب ہوں، اسلئے اب اس کو سنبھالنا مشکل ہے۔

۱۹- "نالۂ نُہ آسماں شکن" - یعنی وہ نالہ جو نو آسمانوں کو توڑ کر نکل جائے۔

۲۰- یہ محبوب کی زلفِ خم بہ خم نہیں کہ غیر سنبھال لے، بلکہ تیرے دیوانوں کی زنجیر ہے۔

۲۱- "زبانِ بیہدہ سائل" یعنی وہ زبان جو بے معنی سوال کرے۔ اے مومنؔ اپنی بے معنی سوال کرنے والی زبان کو تھام۔ بتوں سے پناہ مانگنا حرام ہے۔

۲۲- یہ شعر مومنؔ کا بہت اُلجھا ہوا ہے اور وہ معنے جو اس کے بیان کئے جاتے ہیں سمجھ میں نہیں آتے۔ اگر پہلے مصرعہ میں خواب کو وصل کے معنے میں لیا جائے اور دوسرے مصرعہ میں "شب کی بیداری" کے آگے "کے بعد" محذوف مانا جائے تو یہ معنے پیدا ہو سکتے ہیں کہ وصل کی شب بوسۂ دہن لینے کی خواہش گھات میں تھی لیکن یہ رہزنی اس وقت پوری ہوئی جب رات بھر جاگنے کے بعد صبح کے وقت معشوق سو گیا۔

۲۳- پہلے یار نے تیر چلایا تو زخم ہو گیا لیکن جب دوبارہ چلایا تو تیر اس زخم میں رہگیا اور اس کا روزن بند ہو گیا اسکو وہ مرہمِ زخم سے تعبیر کرتا ہے۔

۲۴- محبوب کی عادت ہے کہ وہ ہر بات غیروں سے کہدیتا ہے۔ اس لئے اگر میرا رازِ نہاں آشکارا نہیں ہوا تو شاید اس کا سبب یہ ہے کہ ہمارا کوئی خط محبوب تک نہیں پہونچا، ورنہ وہ یقیناً غیروں سے ذکر کرتا۔

تنوعات

کرسیوں وغیرہ پر جس چیز سے وارنش کی جاتی ہے اسے لاکھ کہتے ہیں لاکھ میں ایک کیڑا ہے جو درختوں کی شاخوں میں لگ جاتا ہے اور اسی کو ہلاک کرکے وارنش طیار کی جاتی ہے، لیکن شاید آپ کو یہ نہ معلوم ہوگا کہ جب ۵۰۰۰۰ کیڑوں کا خون ہوتا ہے جب کہیں جاکر ایک پونڈ لاکھ ہاتھ آتی ہے ــــــ چیونٹی کی ایک قسم ہے جو بارش کے وقت پنکھڑیوں یا پتیوں کی چھتری اپنے سر پر لیکر چلتی ہے ــــــ سمندر میں آپ ایک جہاز سے زیادہ از زیادہ دس میل دور کی چیز دیکھ سکتے ہیں۔ ــــــ ہر درجۂ حرارت کے اضافہ کے ساتھ آواز کی رفتار فی سکنڈ ایک فٹ بڑھجاتی ہے ــــــ چونکہ جاپانی موٹے آدمیوں کو پسند نہیں کرتے اس لئے وہاں دوسرے ملکوں کے جتنے سفیر بھیجے جاتے ہیں وہ سب دبلے پتلے ہوتے ہیں ــــــ روم کے پاپائے اعظم کی ڈاک کا جواب دینے کے لئے ۳۵ سکرٹری مقرر ہیں ــــــ کلیفورنیا کی ایک بستی میں جہاں زیادہ تر معدنوں میں کام کرنے والے رہتے ہیں ایک ہوٹل کے دروازہ پر یہ نوٹس لگا ہوا ہے کہ "اگر تمھیں ہمارے یہاں کا بھنا ہوا گوشت سخت معلوم ہوتا ہے تو ہوٹل سے نکل جاؤ، یہ کمزور آدمیوں کی جگہ نہیں ہے" ــــــ یوگوسلیویا میں ایک مقام ہے جس کا نام ورونکا ہے، یہاں کی مقامی حکومت نے قسم کھانا ممنوع قرار دیدیا ہے۔ جو شخص پہلی مرتبہ اس جرم کا مرتکب ہوتا ہے اسے تنبیہہ کردیجاتی ہے، لیکن دوسری بار اس جرم کے ارتکاب میں اسکو جھاڑو لیکر سڑکیں صاف کرنے کی سزا دیجاتی ہے ــــــ دنیا میں کوئی دو تیتریاں ایک دوسرے سے نہیں ملتیں ــــــ انسان کے اعصاب بالائی حصۂ جسم پر ہوتے ہیں اور کیڑوں کے اعصاب اندر ہوتے ہیں ــــــ انگریزی زبان میں ۵ لاکھ لفظ پائے جاتے ہیں جن میں سے شکسپیر نے ۲۴ ہزار استعمال کئے اور ۵ ہزار ایسے جنھیں مکرر استعمال نہیں کیا۔ ملٹن نے ۱۷ ہزار الفاظ استعمال کئے اور انجیل میں صرف ۶۰۰۰ الفاظ استعمال ہوئے ہیں ــــــ ستر سال کی عمر میں ساڑھے چار سال انتظار میں ختم ہوتے ہیں اور تین سال نہانے دھونے میں ــــــ اسوقت دنیا میں ۷ لاکھ ۵۰ ہزار کیڑے دریافت ہوئے ہیں جو انسان کی غذائی پیداوار کا دسواں حصہ ہضم کر جاتے ہیں ــــــ جرمنی میں اب ایک دایرہ بجائے ۳۶۰ ڈگری کے ۴۰۰ ڈگریوں میں تقسیم کیا جاتا ہے اس لئے وہاں کا زاویۂ قائمہ بجائے ۹۰ ڈگری کے ۱۰۰ ڈگری کا ہے ــــــ دودھ پلانے والے جانوروں میں سب سے کم عمر چوہے کی ہے یعنی دو یا تین سال ــــــ یوروپ میں سب سے زیادہ اوسط پیدایش روم کا ہے یعنی ۴ و ۲۲ فی ہزار ــــــ جلی فش (ایک قسم کی مچھلی) کی ساخت میں ۹۰ فی صدی حصہ پانی کا ہے ــــــ بارش کے قطروں کو کبھی کبھی ایک گھنٹہ زمین تک پہونچنے کے لئے درکار ہوتا ہے ــــــ سیام کے امراء کی نہایت مرغوب غذا سانپ کا اچار ہے جو سرکہ سے بنایا جاتا ہے ــــــ انسانی زبان میں ذائقہ کے ۳۰۰۰ ہزار خلایا پائے جاتے ہیں، گائے کی زبان میں پندرہ ہزار اور ہرن کی زبان میں ۵۰ ہزار۔

معراجِ محبت

(سرمست تمکین حیدر آبادی)

تمناؤں سے حسن و عشق کی گودوں میں پلتے تھے
رہِ ہستی کی ہر منزل میں جادو بن کے چلتے تھے

نگاہوں کی طلب دل کا تقاضا بنکے رہتے تھے
نہ جانے اور ہم آپس میں کیا کیا بنکے رہتے تھے

ہمیں امکان کی حد سے گزر جانا بھی آتا تھا
سما کر آنکھوں میں دل میں اُتر جانا بھی آتا تھا

تمناؤں کا ہو جاتا تھا سودا آنکھوں آنکھوں میں
اکیلے ہی ہوا کرتے تھے ہم رہکر بھی لاکھوں میں

نظر بنکر مرے ارماں اُنھیں جب گدگداتے تھے
تو حوریں جھینپ جاتی تھیں ملائک مسکراتے تھے

حیاتِ شوق کی ہر سانس بس جاتی تھی خوشبو میں
خوشی سے جب دھڑکتا تھا مرا دل اُنکے پہلو میں

وہ میرا مست ہو جانا وہ اُن کا جھینپ سے جانا
وہ کھو جانا مرا وہ ہنس کے اُن کا مجھکو پا جانا

شگوفے سے چٹکتے تھے جوانی کی ترنگوں میں
رچا کرتی تھی ہولی رات دن دل کی اُمنگوں میں

متاعِ زندگانی بیخودی کی جان ہوتی تھی
گناہوں میں بھی اک معصومیت کی شان ہوتی تھی

اگر فکرِ غمِ فردا اُڑا دیتی تھی دونوں کو
محبت لوریاں دیکر سلا دیتی تھی دونوں کو

نشہ میں چور رہتے تھے اپنے سے باہر ہو کے جیتے تھے
محبت کے سوا ہم اپنا سب کچھ کھو کے جیتے تھے

خدائی اسی کیا کرتے تھے جانِ بندگی بنکر
سما جاتے تھے ہم اک دوسرے میں زندگی بنکر

وفورِ بیخودی میں ایک ہو جاتے تھے ہم دونوں
محبت لوریاں دیتی تھی کھو جاتے تھے ہم دونوں

شباب و شعر کا مفہوم جب ہم سے عبارت تھا
اسے کیا ہو گیا وہ دور معراجِ محبت کا

غزل:

فراقؔ گورکھپوری

راز کو راز ہی رکھا ہوتا
کیا کہنا گر ایسا ہوتا

لیکن کب تک پردہ کرتے
یعنی کب تک پردا ہوتا

آج تو دردِ ہجر بھی کم ہے
آج تو کوئی آیا ہوتا

کم کم اُٹھتیں تیری نگاہیں
اکثر خونِ تمنا ہوتا

گھٹتے گھٹتے کٹتیں راتیں
ہوتے ہوتے سویرا ہوتا

رات کی رات دیارِ محبت
تیرا رین بسیرا ہوتا

میں ہوں، دل ہے، تنہائی ہے
تم بھی جو ہوتے اچھا ہوتا،

عشق نے مجھے کمی کی ورنہ
مجھ پر تیرا دھوکا ہوتا،

پردہ داریٔ غم بھی ہے شاکی
تو نے حال تو پوچھا ہوتا

آہ یہ درد یہ بیکس حالت
آج تو اُس کو پکارا ہوتا

ہم جو تجھے کچھ بھول سا جاتے
دردِ محبت دونا ہوتا

جان گنوا کر آنکھ اُٹھا کر
حُسن کا عالم دیکھا ہوتا

یہ مایوسی یہ بیزاری
عشق کو آج تو چھیڑا ہوتا

کچھ دلِ غمگیں کر کے دکھاتا
کچھ تو زمانہ بدلا ہوتا

منزل منزل دل بھٹکیگا"
آج تمھیں نے روکا ہوتا

دنیا دنیا عالم عالم،
ہوتا عشق اور تنہا ہوتا

ہم بھی فراقؔ انساں تھے آخر
ترکِ محبت سے کیا ہوتا

فکر و نظر

(نجم آفندی اکبرآبادی)

پھر سانس کو آس اے دلِ ناکام ہوئی
پھر فطرتِ غم تشنۂ پیغام ہوئی
اک شمع جلا کہ جھٹ پٹا وقت ہوا
نغمہ کو ذرا بلند کر شام ہوئی

کس سمت چلے دردِ طلب کے مارے
قدرت سے بے انتہا بہت شہ پارے
بس ہیں فکر و نظر کی تسکیں کے لئے
مٹھی بھر پھول آسماں بھر تارے

دونوں جانب سے شمع جلتی ہے مری
اک رات سے کم بھی زندگی اچھی ہے
تشویش بجا کہ مختصر ہے صحبت
تسکین یہ ہے کہ روشنی اچھی ہے

دل کو ہمہ تن شمعِ فروزاں کردے
آنکھ ملا کے نگاہ احساں کردے
یہ بھی کوئی روشنی ہے اے برقِ جمال
ظلمت کو جو کچھ اور نمایاں کردے

غزل:-

آبد سرہندی

ترے حریمِ تجلی میں بار پا نہ سکا
میں چشمِ شوق کو جلووں سے جگمگا نہ سکا

میں کس طرح اُسے کہہ دوں خدائے عالمِ عشق؟
اُجاڑ کر مرے دل کو جو پھر بسا نہ سکا

مٹی نہ شورشِ تمیزِ کفر و ایماں کی
چراغ دیر و حرم کے کوئی بجھا نہ سکا

تو بھول کر بھی مجھے یاد کر سکا نہ کبھی
میں بھول کر بھی تری یاد کو بھلا نہ سکا

سیاہ تر تھیں مرے عہدِ ہجر کی راتیں
کہ چاند کیا کوئی تارا بھی مسکرا نہ سکا

نہ دی خودیٔ محبت نے رخصتِ سجدہ
میں آستاں پہ تمھارے جبیں جھکا نہ سکا

میں اپنے آپ کو خود بھی سمجھ سکا نہ کبھی
عجب نہیں جو کسی کی سمجھ میں آ نہ سکا

غزل : جگر بریلوی

ابھی دیوانگی میں کچھ کمی محسوس ہوتی ہے
ابھی اے شدتِ غم زندگی محسوس ہوتی ہے

نہ جانے زخمِ دل کی آج گہرائی کہاں پہونچی
پھٹا جاتا ہے سینہ وہ خوشی محسوس ہوتی ہے

سمایا جاتا ہو جیسے کوئی رگ رگ میں دل بنکر
یونہی غم میں کوئی شے اور بھی محسوس ہوتی ہے

شبِ تاریک ہے ویرانہ ہے محویتِ غم ہے
عجب عالم میں قربت آپ کی محسوس ہوتی ہے

ازل سے موت نے ابتک کئی قالب بدلوائے
مگر جو چوٹ تھی دل میں وہی محسوس ہوتی ہے

جہاں وہ بیٹھ جائے گر کے منزل ہے وہی اسکی
جسے ہر گام پر واماندگی محسوس ہوتی ہے

کسی کی یاد کو ہر دم بھلائے جاتا ہوں پھر بھی
کھٹکتی دل میں نوکِ خار سی محسوس ہوتی ہے

بیاباں کی کشش اب لے اڑیگی دل کے ذروں کو
کہ ہر ہر سانس پر وارفتگی محسوس ہوتی ہے

جہاں دل ضبطِ غم سے خون ہو جاتا ہے سینے میں
وہیں کچھ روح کو بالیدگی محسوس ہوتی ہے

اگر سینے میں دل رکھتے ہو تم تو آج بتلا دو
تمہیں بھی میری بیتابی کبھی محسوس ہوتی ہے

ہجومِ نامرادی سے یہ عقدہ کھل گیا آخر
جو ہوتی ہے تو غم میں زندگی محسوس ہوتی ہے

کوئی جینے کو سمجھے مایۂ عشرت برا کیا ہے
مجھے تو اک عبادت زندگی محسوس ہوتی ہے

غزل سے اے جگر اندازہ کر میری حقیقت کا
غزل میں کیفیت کچھ روح کی محسوس ہوتی ہے

طلوعِ ماہتاب

(انجم رضوانی)

وہ ہلکے ہلکے ابر میں
وہ سامنے پہاڑ پر
تجلّیاتِ حسن ہیں کہ بارشیں ہیں نور کی
کہ اطلاع ہیں کسی حسین کے ظہور کی
کہ ہو رہی ہیں جلوہ پاشیاں چراغِ طور کی
وہ سامنے پہاڑ پر
وہ ہلکے ہلکے ابر میں
وہی وہ میرے روبرو
وہ ہولناک دشت میں
پہاڑ ہے کھڑا ہوا کہ نور کا مجسّمہ
دلِ حزیں کے واسطے سرور کا مجسّمہ
کہ سامنے نگاہ کے ہے طور کا مجسمہ
وہ ہولناک دشت میں
وہی وہ میرے روبرو

طلوعِ ماہتاب کا
سماں بھی کیا عجیب ہے
نظر فریب کس قدر ہے اُف کُرہ یہ نور کا
نظارہ سامنے کھنچا ہوا ہے کتنی دور کا
ہے خود پر اور کوہ پر گماں کلیم و طور کا
سماں بھی کیا عجیب ہے
طلوعِ ماہتاب کا

صلاحِ کار

(خلیل اللہ قریشی)

یہ کیسی بے حسی چھائی ہوئی ہے آج محفل پر!!؟
یہ رندانِ بلاکش کس لئے خاموش ہیں ساقی!؟
سکوں کا دور ہے بےکیفیوں کی حکمرانی ہے
کہاں تک انتظارِ گردشِ مینا کریں ساقی؟
فضائیں مست۔ کہساروں پہ نشّہ سا۔ جہاں بیخود
اور ایسے میں، اے تیرے میخوار!! جورِ سہیں ساقی؟
نہ ہم بزدل سے بڑھتے حوصلوں کو پست ہونے دیں
نہ دیوانے کے "ضبطِ شوق" کا دعویٰ کریں ساقی
"سزا!" "عقبیٰ!" یہ سب اوہامِ باطل ہیں میرا ذمّہ
یہ دور از کار اندیشے تیرے دشمن کریں ساقی
کہاں کی آبرو؟ کیسی خرد؟ سب غرقِ مے کر دیں
اُٹھیں۔ اُٹھ کر پئیں۔ پی کر گریں۔ گر کر پئیں ساقی
"شعوری کیفیت" ہم جنے سیکھی خود فراموشی
میری جانب وہی بہکی ہوئی نظریں اُٹھیں ساقی
زمانہ بھر میں لہرائیں علم جوش و مسرت کے
زمانہ بھر میں نائے و نوش کی دھومیں مچیں ساقی

اسرار

(نبی احمد بریلوی)

اعتبارِ محض یہ سارا جہاں پاتا ہوں میں
اک فریبِ مستقل کون و مکاں پاتا ہوں میں

دہر کی ہر چیز کو وہم و گماں پاتا ہوں میں
ذہنِ انسانی کو خلاقِ جہاں پاتا ہوں میں

جو ودیعت کی گئی ہے سینۂ احساس میں
وہ امانت اپنے سینے میں نہاں پاتا ہوں میں

کچھ خموشیہائے اُلفت کی نہ پوچھو لذتیں
دل ہی دل میں دل کو سرگرمِ فغاں پاتا ہوں میں

رہنے دو غرقِ مئے و مینا نہ چھیڑو دوستو
اپنے کو کچھ برتر از سود و زیاں پاتا ہوں میں

سائے میں تاروں کے جب ہوتا ہوں پیمانہ بکف
اس جہاں کے ذرے ذرے کو جواں پاتا ہوں میں

ہے خدا جانے کہاں تک اس تسلسل کا عمل،
سارا عالم کارواں در کارواں پاتا ہوں میں

علم و دانش سے کہیں کھلتے ہیں اسرارِ حیات
ایک ذرے کی حقیقت بھی کہاں پاتا ہوں میں،

مے پلا ساقی کہ ہیں عقل و خرد کی یورشیں
اپنے کو پھر مبتلائے این و آں پاتا ہوں میں

یہ تصور ہے کسی کا یا وہ خود ہے، کیا خبر
قلب کی گہرائیوں میں کچھ نہاں پاتا ہوں میں

ترش روئی سے کسی سے جب کوئی کرتا ہے بات
اپنے دل پر اک عجب بارِ گراں پاتا ہوں میں

غزل: بہار کوٹی

بن گئی کافرِ نظر جزوِ رگِ جاں دیکھئے
ٹوٹ ہی کر رہ گیا دل میں یہ پیکاں دیکھئے

ہر کلی شیشہ بکف ہر گل خمستاں در کنار
پچھلی راتوں میں جمالِ شبنمستاں دیکھئے

اک نگاہِ فتنہ پرور اک ادائے برقپاش،
مٹ نہ جائے کاہشِ زخمِ رگِ جاں دیکھئے

جاگ اُٹھا پھر درد پھر انگڑائیاں لیں شوق نے
پھر پڑی دل پر نگاہِ فتنہ ساماں دیکھئے

دیکھنا ہی ہے اگر اندازِ استغنائے حسن
اپنا دامن دیکھئے میرا گریباں دیکھئے

چن رہے ہیں دھجیاں وہ میرے دامن کی بہار
رنگ لایا ہے جنونِ فتنہ ساماں دیکھئے

حادثہ

(انجم رضوانی)

بندی نہ تھی پیشانیِ پر نور حسیں پر
تارا مری قسمت کا چمکتا تھا جبیں پر

بکھرا ہوا ہونٹوں پہ وہ ہلکا سا تبسم،
نکھرا ہوا سلجھا ہوا اندازِ تکلم،

اُٹھتی ہوئی چڑھتی ہوئی بھرپور جوانی
نشے میں جوانی کے وہ کچھ چور جوانی

رنگینیِ گلزار وہ گالوں میں سمیٹے
تاریکیِ شب زلف کے بالوں میں پلیٹے

آنچل کو سنبھالے ہوئے شرماتی لجاتی
ہر گام پہ سوتے ہوئے فتنوں کو جگاتی

دنیا کی تمنائیں کچلتی ہوئی گذری
تقدیر زمانے کی بدلتی ہوئی گذری

آنکھیں تھیں کہ تابندہ سرِ عرش کے تارے
تارے تھے کہ دو برق کے بیتاب شرارے

آنکھیں تھیں کہ دو جام مئے تند سے لبریز
پلکوں سے ٹپکتا ہوا اک کیف جنوں خیز

اللہ رے نگاہوں کا تصادم سرِ راہے
ناگاہ ہوئے ہوش و خرد گم سرِ راہے

وہ شوخ وہ گستاخ وہ بیباک نگاہیں
لبریزِ شرارت سے وہ چالاک نگاہیں

بجلی سی لرزتی ہوئی بیتاب نگاہیں
سرسبز جوانی کی وہ شاداب نگاہیں

اٹھیں بصد اندازِ تبسم سرِ راہے
اور مفت میں مارا گیا انجم سرِ راہے

اس مرگِ حسیں کی کوئی فریاد نہیں ہے
فریاد کہ بیداد بھی بیداد نہیں ہے

میں سوچ رہا ہوں اور آپ بھی سوچیئے

کہ کیا اس وقت ایک ایسے اخبار کی ضرورت نہیں ہے، جو صرف مسایل جنگ سے بحث کرے اور اعداد و شمار، نقشوں، کارٹونوں، تصویروں اور تحقیقی مقالوں کے ذریعہ سے ہر ہفتے لوگوں کو بتاتا رہے کہ جنگ کی موجودہ رفتار کیا ہے، آیندہ کیا کیا امکانات اس میں پوشیدہ ہیں اور ہم کو کیا پالیسی اختیار کرنا چاہئے

اگر آپ واقعی اس کی ضرورت سمجھتے ہیں اور کم از کم ایک روپیہ ماہوار اس پر صرف کر سکتے ہیں، تو فی الحال آپ اس تجویز کے معاونوں میں ایک کارڈ بھیجکر اپنا نام درج کرا لیجئے — (روپیہ بھیجنے کی ضرورت نہیں) جس وقت دو سو ناموں کی فہرست پوری ہو جائے گی اسی وقت یہ اخبار جس کا نام "**جنگ**" ہوگا جاری کر دیا جائیگا اور آپ کو اپنا ماہوار چندہ بھیجنے کی زحمت دیجائے گی

آپ خود بھی غور کیجئے، اپنے حلقۂ احباب میں بھی اس کا ذکر کیجئے اور مجھے بتایئے کہ آپ نے کیا فیصلہ کیا

یہ اخبار میری ہی ادارت میں شایع ہوگا اور زیادہ تر میرے ہی مقالات اس میں شایع ہوں گے۔ اس کا حجم ۱۶ صفحے اور سایز بڑا ہوگا

نیاز فتحپوری

ہندوستان کے اندر سالانہ چندہ پانچ روپیہ ششماہی تین روپیہ
ہندوستان کے باہر سالانہ چندہ آٹھ روپیہ یا بارہ شلنگ

نگار

ششماہی چندہ میں "نگار" کا جنوری نمبر [illegible]
بوجہ [illegible] ضخامت و قیمت شامل نہ ہوگا"

ہمیشہ یاد رکھئے کہ پرچہ نہ پہونچنے کی اطلاع اگر اسی مہینہ کے اندر نہ دی گئی تو آیندہ مہینہ کے اخیر تک پانچ پیسے کے ٹکٹ آنے پر دوبارہ روانہ ہوگا (کیونکہ ڈاک خانہ اب پچھلے پرچوں کا محصول پنچ گنا وصول کرتا ہے) اور اُس کے بعد قیمتاً یعنی ۸ر کے ٹکٹ وصول ہونے پر۔

منیجر "نگار"

جلد (۳۷)	فہرست مضامین مارچ سنہ ۱۹۴۰ء	شمار (۳)

ملاحظات ---------- اڈیٹر ---------- ۲
تاریخ فن تحریر و طباعت ---------- مبین احمد ---------- ۹
رضوان سے کہدو ---------- انور اعجاز قیصر ---------- ۱۶
عجائبات جسم انسانی ---------- اڈیٹر ---------- ۲۴
دو مزدور فلسفی (مختار) ---------- ل۔ احمد ---------- ۳۳
موجودہ جنگ اور جاپان ---------- اڈیٹر ---------- ۴۱
ہوسٹل کے ایک گوشہ میں بیٹھکر ---------- سید نظیر حیدر ---------- ۴۵
نذر الاسلام کی انقلابی شاعری ---------- (جدید اُردو) ---------- ۴۹
روس کے خارجی طرز عمل پر ایک نظر! ---------- طفیل احمد خاں سلطانپوری ---------- ۵۷
مکتوبات نیاز ---------- اڈیٹر ---------- ۶۳
باب الاستفسار ---------- " ---------- ۶۸
مطبوعات موصولہ ---------- " ---------- ۷۲
کلام باہر لکھنوی ---------- ع۔ن ---------- ۷۷

نگار

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

شمارہ ۳	مارچ سنہ ۴۰ء	جلد ۲۷

ملاحظات

مرغابی شو کہ کار با طوفان ست!

کہا جاتا ہے کہ دوستی، انسانیت کا معیار ہے، لیکن دوستی کی سب سے اچھی کسوٹی لڑائی ہے۔ خواہ وہ لڑائی آپس ہی میں ہو یا کسی اور سے۔ اس وقت خوش قسمتی یا بد قسمتی سے دونوں صورتیں پیدا ہیں، یعنی ہم آپس میں بھی لڑ رہے ہیں اور دونوں ملکر تیسرے سے بھی لڑنا چاہتے ہیں۔ مسلم لیگ اور کانگرس کی لڑائی یقیناً آپس ہی کی لڑائی ہے اور ان دونوں کا مطالبۂ آزادی گویا برطانیہ سے جنگ کرنا ہے۔ یہ ہے اس وقت کی ہماری سیاسیات جس پر ہندوستان کے مستقبل کا انحصار سمجھا جاتا ہے اور جس پر غور کرنا یقیناً ہم آپ سب کا فرض ہونا چاہئے

بعض کا خیال ہے کہ ہندو مسلمان کی لڑائی مذہب کی لڑائی ہے اس لئے دونوں میں مصالحت کا کوئی امکان نہیں لیکن میں اس نظریہ سے متفق نہیں کیونکہ اس سے پہلے بھی یہاں کا ہندو ہندو ہی تھا اور یہاں کا مسلمان مسلمان، لیکن نہ اذان و ناقوس پر کبھی جھگڑا ہوتا تھا اور نہ رام لیلا و محرم کے اجتماع پر اندیشۂ فساد۔ میرے نزدیک اس جنگ کا تعلق مذہب سے اتنا نہیں ہے جتنا مذہب کو آلۂ کار بنانے سے ہے، اور اسی لئے غلطی سے ہندو مسلمانوں کے اختلاف کو خالص مذہبی اختلاف سمجھا جاتا ہے

آپ اگر غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ ہندو مسلم اتحاد کا زمانہ وہ تھا جب ہندوستان کے سامنے آزادی کا کوئی سوال نہ تھا اور دونوں قومیں ایک آقا کے اُن دو غلاموں کی طرح جو ایک ہی زنجیر میں جکڑے ہوئے ہوں، صلح و آشتی کی زندگی بسر کر رہی تھیں۔ ان میں سے کسی کو اپنی ذلت کا احساس نہ تھا اور دونوں کا مقصود آقا کو کسی نہ کسی طرح خوش رکھنا تھا۔ لڑائی ہمیشہ اسی وقت ہوتی ہے جب ایک چیز کے علٰحدہ علٰحدہ دو طلبگار پیدا ہو جائیں اور یہاں کسی چیز کے طلب یا حصول کا کوئی سوال ہی نہ تھا اس لئے ان دونوں میں اختلاف کی بھی کوئی وجہ نہ تھی۔ دونوں کا کاسۂ گدائی پُر تھا اور دونوں خوش تھے۔

اس کے بعد وہ زمانہ آیا جب ان میں یہ احساس پیدا ہوا کہ آقا کو زیادہ خوش کر کے کیوں نہ زیادہ بھیک حاصل کی جائے اور غالباً حقیقت سے انکار ہوگا اگر اس احساس کا زیادہ تر ذمہ دار مسلمانوں کو نہ قرار دیا جائے۔ سرسید مرحوم اسی احساس کے نباض تھے اور ان کی تمام کوششیں اسی مقصود پر صرف ہوئیں کہ انگریز مسلمانوں کو زیادہ وفادار غلام سمجھکر زیادہ خوش رہیں اس کا ایک نفسیاتی سبب یہ بھی تھا کہ مسلمانوں کی سلطنت حال ہی میں ختم ہوئی تھی، اس لئے وہ اپنے آپ کو رعایت کا زیادہ مستحق سمجھتے تھے۔ انگریز قوم چونکہ مسلمانوں کو ایک ایسے غلام کی حیثیت سے دیکھتی تھی جس کا تن و توش تو بڑا نہیں ہے لیکن جس کے اعصاب میں ہیجان اور مزاج میں تندی زیادہ ہے، اور ہندو غلام کی فربہی میں وہ زیادہ تر حصہ آقا ہی کا پاتی تھی، اس لئے اول الذکر غلام کی التجاؤں کی طرف وہ زیادہ مایل نظر آئی اور اس طرح ہندو مسلمانوں میں اول اول وہ تخم اختلاف بویا گیا جس نے اب ایک تناور درخت کی صورت اختیار کر لی ہے۔ مسلمانوں کی اس تحریک، اور مسلمانوں کی طرف انگریزوں کے میلان نے ہندوؤں کے اندر "ذاتی تحفظ" کا جذبہ پیدا کر دیا جس کا دوسرا نام "نیشنل کانگرس" ہے۔ ہرچند اس کی بنیاد ایک اینگلو انڈین کے ہاتھوں پڑی تھی، لیکن چونکہ اس تحریک میں قومیت و وطنیت کا عنصر شامل تھا، اس لئے ہندوؤں نے اس سے فایدہ اُٹھانا چاہا، اور جس طرح مسلمانوں میں یہ احساس کام کر رہا تھا کہ وہ حکمراں قوم کے افراد ہونے کی حیثیت سے زیادہ حصہ پانے کے مستحق ہیں، اسی طرح اب ہندوؤں میں یہ جذبہ پیدا ہوا کہ ہندوستان ان کا ملک ہے اور انھیں کا اقتدار زیادہ ہونا چاہئے۔ یہ تھی اختلاف کی وہ منزل جب حقیقی معنی میں ملکی سیاست کی بنیاد ہندوستان میں پڑی اور مسلمان عرصہ تک اس سے ناواقف رہے۔

اس میں شک نہیں کہ ہندو من حیث الکل جنگجو قوم نہیں ہے اور وہ لڑائی جھگڑے کو پسند نہیں کرتی لیکن اس میں رنج و تکلیف کی برداشت کا مادہ (جو ایک نباتات خور قوم میں قدرتاً ہونا چاہئے) بہت زیادہ ہے۔ اس کی حیثیت بالکل اس بوجھ سے لدے ہوئے بیل کی سی ہے جو باوجود تھک جانے کے بھی کسی نہ کسی طرح گر پڑ کر منزل مقصود تک پہونچ جاتا ہے برخلاف اس کے مسلمان کی ذہنیت (ایک گوشت خوار قوم ہونے کی وجہ سے) ایک شیر کی سی ہے جو اشتعال کے وقت اپنے پنجوں اور دانتوں سے دوسرے کو زخمی تو کر سکتا ہے، لیکن اگر آپ اس پر گھاس کا ایک گٹھا لاد دیجئے تو شاید وہ ایک پل بھی نہ چل سکے گا اور ہانپ کر گر پڑے گا

پھر چونکہ برطانوی قوم کے ساتھ معاملہ کرنے میں شیر کی سی ذہنیت نہیں، بلکہ ایک بیل اور بھیڑیے کی سی متحمل و مستقل ذہنیت درکار تھی، اسلئے جب مسلمان اپنے مطالبات میں ناکام رہے تو ان کو غصہ آگیا اور وہ محض انتقاماً ہندوؤں کے ساتھ شریک ہو گئے، جس سے مقصود شاید ہندوؤں کو تقویت پہونچانا نہ تھا بلکہ انگریزوں کو زک دینا تھا۔ دوسری طرف ہندوؤں کی حالت یہ تھی کہ کانگرس کے قیام کے بعد انھوں نے اپنی ایک منزل متعین کرلی اور اپنی جگہ طے کرلیا کہ ہندوستان میں اہل ہند ہی کی حکومت ہونا چاہئے اور ملک کے مسئلۂ آزادی میں صرف وطنیت کو سامنے رکھکر یہاں کی تمام قوموں کو مل جانا چاہئے، ہندوؤں نے مسلمانوں کی اہمیت کو اسوقت نظرانداز نہیں کیا، کیونکہ اتنی بڑی آبادی کو علٰحدہ کرکے کامیابی کا خیال وہ اپنے دل میں نہ لاسکتے تھے، لیکن مسلمانوں نے غلطی یا حماقت سے اپنی اہمیت کا سبب صرف یہ قرار دیا کہ وہ مذہب و کلچر کے لحاظ سے بہت بلند واقع ہوئے ہیں اور یہ کبھی نہیں سوچا کہ ایک تہائی ہندوستان سے انھیں وطنیت کا تعلق بھی حاصل ہے۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ اس عہد کے سب سے بڑے مسلمان شاعر نے بھی ہمیشہ حجازیت ہی کا خواب دیکھا اور ہندوستان کا ذکر اگر کیا بھی تو صرف ضمنی حیثیت سے۔

اس بات کا ثبوت کہ مسلمانوں نے کبھی جذبۂ وطنیت لیکر ملک کی آزادی میں حصہ نہیں لیا، اس دور کے تمام لٹریچر سے ملسکتا ہے جو مسلمانوں کی طرف سے شایع ہوا ہے۔ انھوں نے ہمیشہ یہی کہا ہم پہلے مسلمان ہیں اور اس کے بعد ہندوستانی اور ہندوؤں کی سیاسی تحریک میں بھی وہ اُس وقت جاکر شریک ہوئے جب ترکی کے مسئلہ میں انگریزوں کی پالیسی نے انکو سخت برہم کردیا تھا۔ الغرض بیداری ہند کے ابتدائی دور میں مسلمانوں نے جو کچھ کیا، اس میں وطنیت کا جذبہ کبھی شامل نہیں رہا اور اسی لئے جب مصطفےٰ کمال نے خلافت کے جھگڑے کو ہمیشہ کے لئے ختم کردیا تو مسلمانوں میں ایک نہایت ذلیل قسم کا ردِّ عمل شروع ہوا اور یہ ردِّ عمل ان کی "اقلیت" کا احساس تھا

جب تک خلافت کا وجود قایم رہا اس وقت تک تو ہندوستان کے مسلمان اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھتے رہے لیکن جب خلافت ختم ہوئی اور ادھر انگریزوں نے بھی ہندوؤں کے بڑھتے ہوئے احساس آزادی سے دبنا شروع کیا تو مسلمانوں کا ضمیر چونکہ آزادی ملک کے باب میں پہلے ہی سے داغدار تھا، اس لئے ان کو اندیشہ پیدا ہوا کہ ہندو کہیں ان سے بدلہ نہ لیں اور مسٹر جینا کی قسم کے لیڈروں نے آخرکار اس اندیشہ کو انتہائی بزدلانہ خوف میں تبدیل کردیا یہاں تک کہ آج مسلم لیگ کے تمام مطالبات کا ماحصل اس سے زیادہ نہیں کہ "انگریز ہماری حفاظت کریں، ورنہ ہندو ہمیں چپ ڈالیں گے"

اب آئیے ہندوؤں کی سیاست پر غور کریں کہ انھوں نے کیا کیا۔ بظاہر ہندوؤں کے سیاسی عقاید میں ہمیں کوئی تغیر نظر نہیں آتا، لیکن یہ واقعہ ہے کہ ان کے سیاسی نصب العین میں ضرور تغیر ہوا ہے اور اس دوران میں ان کی طرف سے بعض ایسی باتیں بھی دیکھنے میں آئی ہیں جو اصول و مصلحت دونوں کے منافی ہیں۔

ہر چند مسلمانوں کی تعداد کم ہے، لیکن یہ واقعہ ہے کہ ہندوؤں کے دل میں مسلمانوں کی طرف سے ایک طرح کا خوف ضرور پایا جاتا تھا اور اس لئے انھوں نے یہ تو ہمیشہ چاہا کہ مسلمانوں کو اپنے ساتھ ملا کر انگریزوں کے خلاف محاذِ جنگ کو مضبوط بنائیں لیکن اسی کے ساتھ یہ بات ان کے دل سے نہ نکل سکی کہ مسلمان گائے کا گوشت کھاتے ہے اور محمود نے سومنات کا مندر توڑا تھا۔ اس سے دو نتیجے پیدا ہوئے ایک یہ کہ مسلمانوں کی طرف سے ہندوؤں کو مذہبی و قومی تنفر بڑھنے لگا اور دوسری طرف وہ انگریزوں کے وجود کو ہندوستان کے لئے اس لئے ضروری سمجھنے لگے کہ ممالک اسلامیہ سے مسلمانانِ ہند کا رشتۂ اخوت کسی وقت خطرناک صورت نہ اختیار کرلے۔ چنانچہ ایک طرف شدھی و سنگھٹن کی تحریک اور دوسری طرف آزادی کامل کے مطالبہ کا گھٹ کر صرف مستعمراتی آزادی رہجانا ہندوؤں کے اسی ذہنی کشمکش کا نتیجہ تھا جس کا دبے الفاظ میں بعض ہندو لیڈروں کی طرف سے بھی اظہار ہوا ہے

اس میں شک نہیں کہ ہندوؤں کو مسلمانوں کی طرف سے یہ اندیشہ پیدا ہونا چاہئے تھا، لیکن اسی کے ساتھ ہم یہ بھی کہیں گے کہ ہندوؤں نے مسلمانوں کی قومی خصوصیات سمجھنے میں بھی صحت عقل سے کام نہیں لیا۔ مسلمان میں چاہے کتنے ہی عیوب ہوں لیکن ایک صفت اس میں اتنی بڑی ہے جس کا جواب مشکل سے کسی دوسری قوم میں ملسکتا ہے، وہ یہ کہ اگر آپ واقعی خلوص کے ساتھ اس قوم سے ملیں یا تھوڑی رواداری سے کام لیں تو پھر وہ ماضی کی تمام شکایات فوراً بھلا دیتی ہے اور اس قدر گھل مل جاتی ہے گویا اس سے پہلے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ اس قوم پر کسی قسم کا احسان کرنا یا اس کے جذبات کے لئے کوئی قربانی کرنا ہمیشہ کے لئے اس کو مول لے لینا ہے۔ یہ نہ سیاست کی چالوں سے واقف ہے نہ مدبرانہ مصلحت اندیشیوں سے لیکن محبت کرنے والے کے لئے جان دیدینا اسے ضرور آتا ہے، جس سے افسوس ہے کہ ہندوؤں نے فایدہ نہ اُٹھایا اور ہندوستان کی سیاسیات کو اس قدر پیچیدہ بنا دیا

جس وقت اصلاح جدید کا نفاذ ہوا ہے اور کانگرس والوں نے عنانِ وزارت ہاتھ میں لی ہے، ہندوستان کے مسلمانوں میں شرکت کانگرس کا ولولہ بڑی قوت کے ساتھ پیدا ہو گیا تھا اور جوق درجوق وہ اس میں شامل ہونا چاہتے تھے اور ہوئے بھی، چنانچہ اسی کیفیت کو دیکھ کر پنڈت جواہر لال نہرو نے یہ طے کیا کہ مسلمانوں کو خاص طور سے شرکت کانگرس کی دعوت دیجائے، اور اس تحریک کا نام (Muslim Mass Contact) رکھا۔ ہم یہ تو نہیں کہتے پنڈت نہرو کی تجویز و تحریک محض نمایشی تھی، لیکن یہ واقعہ ہے کہ اس پر عمل نہیں کیا گیا۔ ایسا کیوں نہیں ہوا اور اس کے بعد کانگرسی وزراء کی طرف سے کیا کیا ظاہر ہوا، یہ داستان نہایت دردناک ہے

میں یہ نہیں کہتا کہ کانگرسی حکومت کے دوران میں جو کچھ ہوا خلاف انصاف ہوا، لیکن اخلاق و انسانیت مصلحت دور اندیشی کے منافی ضرور ہوا۔ اگر پنڈت نہرو عام مسلمانوں کو شرکت کانگرس کی دعوت دینے کی تحریک کو نظر انداز نہ کر دیتے اور کانگرسی وزراء، اقتدار حاصل کرنے کے بعد ایثار و رواداری سے کام لیکر واقعی کچھ بھی فراخ حوصلگی و بلند نظری سے

کام لیتے، تو نہ مُسلم لیگ دوبارہ زندہ ہوتی اور نہ لارڈ لن لتھگو کو یہ موقعہ ملتا کہ وہ گاندھی جی کو تین بار دہلی آنے کی دعوت دیں اور تینوں مرتبہ ناکام واپس لوٹا دیں

جس حد تک اعداد و شمار یا واقعات کا تعلق ہے ہم عہد کانگرس کے احکام و انتظامات میں کوئی قابلِ ذکر نقص نہیں نکال سکتے، لیکن سیاسیات میں ہمیشہ بقالانہ ذہنیت ہی سے کام نہیں چلتا۔ اس میں سود کیا کبھی اصل رقم سے بھی ہاتھ دھونا پڑتا ہے، اور یہی ہندوں سے نہ ہو سکا

سوائے صوبۂ سرحد کے، اور جتنے صوبوں میں کانگرسی حکومت قایم ہوئی، وہاں مسلمان اقلیت میں ہیں، اس لئے سیاسی مصلحت کا اقتضاء یہ تھا کہ کانگرسی وزراء سب سے پہلے ان کا دل ہاتھ میں لیتے اور اس کی ترکیب صرف یہ تھی کہ تناسب آبادی کا لحاظ نہ کرکے ان کو زیادہ جگہیں دیتے، ان کے اداروں کو کافی مالی امداد پہونچاتے، ان کے روایات و جذبات کا احترام کرنے میں خود اپنی قوم کے مطالبات کو نظر انداز کر دیتے اور ان سے گھل مل کر ان کی دردمندیوں کا مداوا کرتے۔ لیکن بجائے اسکے ہوا یہ کہ ملازمتوں میں بعض جگہ تناسب آبادی کے لحاظ سے بھی مسلمانوں کا لحاظ نہیں رکھا گیا اور ہر معاملہ میں اُسی کوڑی کوڑی کا حساب کرنے والی ذہنیت سے کام لیا گیا۔ پھر اگر یہ معاملہ اسی حد تک رہتا تو بھی غنیمت تھا، لیکن ظلم تو یہ ہوا کہ کانگرسی طبوس میں بہت سے وزراء مہاسبھائی ذہنیت کے آگئے اور انھوں نے اپنے طرزِ عمل سے مسلمانوں کو بجا طور پر یہ سمجھنے کا موقعہ دیا کہ وہ ہندوستان میں کانگرس راج نہیں بلکہ ہندو راج کا قیام چاہتے ہیں

میں پوچھتا ہوں کیا ودیا مندر اسکیم کے نفاذ کے لئے اس سے زیادہ موزوں زمانہ پھر نہ آنے والا تھا اور کیا ہندو، کانگرسی حکومت اسی لئے چاہتے تھے کہ اُردو کے مقابلہ میں انھیں ہندی کی ترویج کا موقعہ مل سکے۔ وہ یہ چاہتے ہوں یا نہ چاہتے ہوں لیکن ہوا یہی اور انھوں نے مسلمانوں کو یہی سمجھنے کا موقعہ دیا۔ آج بھی صوبۂ متحدہ کے کونسل چیمبر میں کانگرسی وزراء کی تقریروں اور تحریروں کا ریکارڈ موجود ہے اور اس وقت بھی اور ہمیشہ ان کو دیکھ کر صرف یہی ایک نتیجہ نکالا جائے گا کہ ہندوؤں نے نہ صرف یہ کہ رواداری سے کام نہیں لیا، بلکہ انھوں نے قصداً مسلمانوں کے جذبات کو صدمہ پہونچایا یہ سمجھ کر کہ مسلمان اقلیت میں ہیں اور اکثریت کو حق حاصل ہے کہ وہ اقلیت کو دبا کر رکھے

اس میں شک کی مطلق گنجایش نہیں کہ اس باب میں ہندو بہت تنگ حوصلہ نکلے اور بادۂ حکومت کے لئے انکا ظرف بہت تنگ ثابت ہوا

کانگرسی وزراء نے جس پھوہڑپن کے ساتھ حکومت کی، اُسے ہم انفرادی حیثیت نہیں دے سکتے، کیونکہ ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ باوجود ان بدتمیزیوں کا علم رکھنے کے ہائی کمانڈ نے بھی کوئی توجہ نہیں کی، جواہر لال نہرو ایسے آزاد خیال انسان نے بھی مسلمانوں سے منھ پھیر لینا ہی مناسب سمجھا اور جب مولانا آزاد نے مسلمانوں کی چیخ پکار کے بعد صوبۂ متحدہ کے وزراء کو زبان کے مسئلہ میں زیادہ دانشمندی سے کام لینے کا مشورہ دیا تو اس کو ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا گیا

بہر حال یہ واقعہ ہے کہ ہندو قوم سلیقۂ حکومت کے لحاظ سے بہت "گھٹیا" نکلی اور دو سال کے تجربہ نے یہ بات واضح کردی کہ ہندو ستیاگرہ تو کرسکتا ہے لیکن اچھی حکومت نہیں کرسکتا، وہ دفتر میں بیٹھکر سود در سود کا حساب تو خوب کرسکتا ہے، لیکن مسندِ حکومت پر بیٹھنے کی شان اس میں ابھی پیدا نہیں ہوئی۔ یعنی وہ صرف روپیہ جمع کرسکتا ہے لیکن کسی کو دے نہیں سکتا خواہ اس نہ دینے سے وہ اپنا نقصان ہی کیوں نہ کرے!

یہ ہے میری سچی رائے ہندو مسلمان دونوں کے متعلق جن کو میں برابر کا گنہگار سمجھتا ہوں، لیکن اس کے معنے یہ نہیں ہیں کہ جو گتھیاں ان دونوں کے اختلاف ذہنیت کی وجہ سے پڑگئی ہیں، وہ سلجھ نہیں سکتیں یا ان کو سلجھانے کی کوشش ہم کو نہ کرنا چاہئے

اس میں شک نہیں کہ یہ وقت ہندوستان کے لئے بڑا اہم ہے اگر ہم اس سے فایدہ اُٹھانا چاہیں اور یقیناً میں اس کو ملک کی انتہائی بدقسمتی سمجھوں گا اگر اس زریں فرصت کو ہاتھ سے جانے دیا گیا۔ میں اس باب میں ہندوؤں سے کچھ نہیں کہنا چاہتا، لیکن مسلمانوں سے ضرور کہوں گا کہ ویسرائے سے گفتگو کرنے میں انھوں نے اپنی جس ذہنیت کا ثبوت دیا ہے وہ ان کی مذہبی و قومی روایات کے سخت منافی ہے۔ مسٹر جناح کی تمام غلطیوں کو معاف کیا جاسکتا ہے، لیکن اس کو کبھی نہیں بھلایا جاسکتا کہ انھوں نے مسلمانوں میں اقلیت کا خوف پیدا کرکے اُن کو بزدل بنادیا

کس قدر حیرت کی بات ہے کہ ایک طرف مسلم لیگ آزادی کامل اپنا نصب العین قرار دیتی ہے اور دوسری طرف ہندوؤں کے مقابلہ میں وہ انگریزوں سے اقلیت کے حقوق کا تحفظ بھی چاہتی ہے۔ "مکمل آزادی اور برطانوی تسلط" ان دونوں کا اجتماع کم از کم میری سمجھ میں تو آتا نہیں، لیکن مسٹر جناح کی منطق میں اس محال کو "ممکن" کہتے ہیں

دنیا میں کوئی قوم اسوقت تک نہیں اُبھر سکتی، جب تک وہ اقلیت کے "خوف و اندیشہ" کے عذاب میں مبتلا ہے اور مسٹر جناح نے اسوقت تک سوائے اس خوف کو بڑھانے اور احساسِ ذلت (Inferiority Complex) کو شدید تر بنانے کے کچھ نہیں کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف ہندوؤں کے حوصلے بڑھے اور دوسری طرف برطانوی حکومت کے اندیشے گھٹے اور مسلمان قوم ایک کی نظر میں ذلیل ہوگئی اور دوسرے کے ہاتھ میں آلۂ کار!

یہ وقت وہ تھا کہ مسلمانوں کو متفقہ آواز سے کہدینا چاہئے تھا کہ آزادی کے مسئلہ میں وہ ہندوؤں کے ساتھ ہیں اور مطلق اس کی پرواہ نہیں کرتے کہ حصول آزادی کے بعد ہندو، ان کے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔ اگر مسلمان آٹھ کرور کی آبادی رکھنے کے بعد بھی اپنے آپ کو اقلیت میں سمجھتے ہیں، تو یقیناً ایسی اقلیت کو دنیا میں زندہ رہنے کا کوئی حق حاصل نہیں اور "انسانیت" خوش ہوگی اگر ایسی قوم اپنی بوجھ کی لعنت سے کرۂ زمین کو آزاد کردے۔

ہفتہ وار اخبار "جنگ"

کا اعلان پچھلے مہینے ہو چکا ہے اور اس مہینے کی اشاعت میں بھی کسی جگہ درج ہو گا۔ اسوقت تک جتنے خطوط موصول ہوئے ہیں ان کی تعداد نہ حوصلہ شکن ہے نہ امید افزا، اسلئے ابھی تک میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکا۔ مصارف کا جو اندازہ کیا گیا ہے، اسکی مقدار کم از کم پانسو روپیہ ماہوار ہوتی ہے اور اس لئے اگر قارئین نگار کے حلقہ سے دو سو حضرات نے بھی اسکی خریداری منظور کر لی تو اس کے معنے یہ نہیں ہیں کہ ہم مصارف کی طرف سے بالکل مطمئن ہو جائیں گے، لیکن چونکہ اخبار کی اشاعت کے بعد اس کا ایک حلقہ علٰحدہ بھی بنے گا، اس لئے خیال یہی ہے کہ زاید مصارف ہم کو دو تین ماہ سے زیادہ برداشت نہ کرنا پڑیں گے۔

میں فی الحال باہر جا رہا ہوں، وہاں سے پندرہ بیس دن کے بعد واپس آؤنگا، اس لئے ابھی وقت باقی ہے اور آپ پھر اس مسئلہ پر غور کر سکتے ہیں کہ آیا واقعی ایک ایسے اخبار کی ضرورت ہے یا نہیں، جو حقایق جنگ آپ کے سامنے پیش کرتا رہے۔ اگر ہے، تو آپ خود بھی اپنی منظوری کی اطلاع دیجئے اور اپنے حلقۂ احباب میں بھی اس کا ذکر کیجئے۔

میں سفر سے واپس آنے کے بعد دیکھوں گا کہ اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے پبلک کس حد تک آمادہ ہے اور بالکل ممکن ہے کہ اپریل کے آغاز میں اس اخبار کا پہلا پرچہ آپ کے ہاتھ میں ہو۔

ایک روپیہ ماہوار بڑے سایز کے ۴ صفحات کے لئے ایسی زیادہ رقم نہیں ہے، جسکے ادا کرنے میں آپ کو تامل ہونا چاہئے۔ آپکے بعض غیر ضروری مصارف کی مقدار ہر مہینے اس سے کہیں زیادہ بڑھ جاتی ہوگی۔ — نیاز فتحپوری

تاریخ فنِ تحریر و طباعت

دنیا کی تمام جاندار مخلوقات میں یہ شرف انسان ہی کو حاصل ہے کہ وہ آواز کو جو کان سے محسوس کی جاتی ہے آنکھ سے بھی محسوس کرا سکتا ہے، یعنی مختلف آوازوں کے لئے مختلف نشانیاں مقرر کرنا اور اُن نشانیوں کو دیکھ کر آوازوں کو جاننا صرف انسان ہی کا کام ہے

آوازوں سے اظہار مدعا کرنا فطرت نے اور جانداروں کو بھی ودیعت کیا ہے۔ بلبل چہچہاتا ہے، کتا بھونکتا ہے، گھوڑا ہنہناتا ہے، لیکن یہ فضیلت صرف انسان ہی کو حاصل ہے کہ وہ زبان سے ادا کئے ہوئے خیالات، دوسروں کے سمجھنے کے لئے تحریر میں بھی محفوظ کر سکتا ہے

انسان، جب ارتقاء کی ابتدائی منازل طے کر کے سمندروں اور درختوں سے نکل کر زمین پر آیا تو اسوقت وہ صرف آواز یا اشاروں ہی سے اپنے خیالات کو دوسروں تک پہونچا سکتا تھا۔ اس کے بہت زمانہ بعد اُس نے چٹانوں اور غاروں میں نقوش و تصاویر بنا کر اپنے خیالات ظاہر کرنے کا طریقہ سیکھا اور آخر کار اُن اشیاء پر بھی نشانات بنائے جو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کی جا سکتی تھیں۔ یہ قابلیت اس میں زیادہ سے زیادہ ساٹھ ہزار برس سے پائی جاتی ہے اور یہ وہ قابلیت ہے جس نے انسان کی ترقی و اصلاح میں تمام قابلیتوں سے زیادہ حصہ لیا ہے۔ اسی قابلیت نے ماضی میں تاریخ تمدن انسانی کی تشکیل کی ہے اور مستقبل میں بھی انسان کی مجلسی تہذیب و شائستگی کی ذمہ دار یہی ہوگی

ابتدائی عہد سے لیکر جب موگا اور لکڑی کے قلموں سے نقاشی کی جاتی تھی عہد حاضر تک کہ بجلی کے بڑے بڑے پریسوں میں کتابیں چھپتی اور ایک جگہ سے دوسری جگہ لیجائی جا سکتی ہیں۔ انسان کی اس نئی اہلیت میں جو تدریجی ارتقاء ہوا ہے، اسے "نیویارک ٹائمز" نے نہایت خوبی سے دکھایا ہے، جس کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے

"نیویارک ٹائمز" کے اس خاص نمبر میں اگر ایک طرف پرانے زمانہ کی مٹی کی تختیاں، اور قدیم مصری پیپرس کی کاغذ نما پتیاں دکھلائی گئی ہیں تو دوسری طرف ازمنۂ تاریک کے نہایت خوبصورت چرمی مخطوطات بھی دکھائے گئے ہیں۔ اگر ایک طرف قدیم چینی اور دورِ وسطیٰ کے یورپ کی بلاک والی چھپائی کے نمونے پیش کئے گئے ہیں تو دوسری طرف موجودہ زمانہ کی چھپائی کے ابوالآباء (گٹنبرگ) کے چھاپے ہوئے کتابچوں کے عکس بھی آپ دیکھ سکتے ہیں۔

فنِ تحریر کی نشو ونما کو تین زمانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا زمانہ یا دور وہ تھا جب انسان نے لکھنا سیکھا، دوسرے دور میں اُس نے انھیں لکھے ہوئے حروف کو چھاپنا سیکھا اور تیسرے دور میں اُس نے طباعت کو ترقی دی۔ انسانی تاریخ کا بیشتر حصہ اس پہلے دور میں آتا ہے۔ کیونکہ بعد کے دور کی مدت زیادہ سے زیادہ پانچ سو برس کہی جا سکتی ہے گویا یہ پہلا دور پندرھویں صدی عیسوی کے وسط تک قایم رہا

پندرھویں صدی عیسوی کے وسط میں فنِ تحریر کی ترقی کا دوسرا دور شروع ہوا جب یوروپ میں کلوں کی امداد سے تحریروں کی نقلیں حاصل کرنے کا طریقہ ایجاد ہوا۔ یہ دور پہلے دور سے زیادہ اہم تھا۔ اس دور میں چھپائی کی کلیں ہاتھ سے چلائی جاتی تھیں۔ آخرکار ۱۸۱۱ء میں یہ دور بھی ختم ہوگیا اور "قدرتی طاقت" کے ذریعہ سے چلنے والا پہلا پرس ظاہر ہوا

اس تیسرے دور نے علم کی اشاعت میں زبردست آسانیاں بہم پہونچائیں، چنانچہ گزشتہ نصف صدی ہی میں جسقدر قابل انتقال حروف سطح کاغذ پر محفوظ کئے گئے ہیں اُن کی تعداد اُن تمام الفاظ سے زائد ہوگئی جو انسان نے اس دور سے قبل کے تمام زمانوں میں کبھی بھی کسی سطح پر ثبت کئے تھے

خیالات کو گفتگو کے علاوہ دیگر ذرایع سے ادا کرنے کی خواہش انسان کی نہایت قدیم خواہش رہی ہے۔ چنانچہ بیس ہزار سال قبل کا انسان اپنی اس خواہش کو ہاتھی دانت پر جانوروں کی تصویر بنا کر پورا کرتا تھا۔ نقوش کے ذریعہ خیالات کو ادا کرنے کے سلسلہ میں جو دوسرا قدم اُٹھایا گیا اس کی وجہ سے ایسے نقوش بننے لگے جو ایک خاص آواز کی نمایندگی کرتے تھے اور تیسرا انتہائی دشوار قدم یہ تھا کہ انسان نے اپنی آوازوں کو حروف ہجا کی شکل میں ڈھال لیا۔ اس ایجاد کا سہرا فنیقی قوم کے سر ہے جنھوں نے اسے مصریوں کی "مقدس" طرز تحریر سے اخذ کیا تھا۔ لیکن اس ایجاد سے بہت عرصہ قبل ہی تحریر کے طریقوں میں بہت کافی ترقی ہو چکی تھی

چنانچہ مغربی ایشیا میں بسنے والی ایک قوم، سومیری (Sumerians) حضرت مسیح کی وفات سے ۳۲۰۰ برس قبل ہی ملایم مٹی کی مخروطی اینٹوں پر لکھنا جان چکی تھی۔ یہ لوگ ان اینٹوں کو پکا کر محفوظ کرنا بھی سیکھ چکے تھے تاکہ ان پر ثبت کردہ الفاظ جلد محو نہ ہو جائیں۔ یہ لوگ ایک طرح کا دھاردار آلہ استعمال کرتے تھے جس سے کندہ کئے ہوئے نقوش ایک شلثی شکل اختیار کر لیتے تھے۔ اس قسم کی تحریر کو "مخروطی طرز تحریر" کہتے ہیں۔ اگر ان نقوش کی زیادہ حفاظت مقصود ہوتی تو انھیں مٹی کے لفافوں میں لپیٹ کر مہر لگا دی جاتی تھی

اسی زمانہ میں مصریوں نے "پیپرس" پودے کی پتیوں پر لکھنا شروع کیا جسے لکھنے والوں نے اس قدر پسند کیا کہ ۴۰۰۰ ہزار برس تک اس کا رواج رہا۔ مصری لوگ اس پودے کی "کلک" یا "آبی ڈنٹھل" کو نکال کر چھوٹی چھوٹی پٹیوں میں کاٹ لیتے تھے اس کے بعد انھیں پٹیوں کو تہ بہ تہ پانی میں رکھکر خوب کوٹتے تھے جس کی وجہ سے وہ "پٹیاں" ایک ریشہ دار پارچہ نما شے میں تبدیل ہو جاتی تھیں۔ پھر اس کو خشک کر کے مصری لوگ مو قلم یا کلک سے تحریر کرتے تھے

چنانچہ روم اور اسکندریہ کے بڑے بڑے کتب خانوں کی کتابیں جو دراصل "تہ ہوجانے والی مخطوطات" ہوتی تھیں اسی بارچہ" پر لکھی جاتی تھیں - اس کی مقبولیت کا یہ نتیجہ ہوا کہ سن عیسوی کی ابتدا میں روم، اسکندریہ اور ایتھنز وغیرہ بڑے بڑے مراکز میں اونچے اور متوسط طبقے کے لوگوں میں پڑھنے کا عام رواج ہوگیا اور کتابوں کی نقل و اشاعت کی تجارت بہت سودمند تجارت سمجھی جانے لگی

لیکن "پیپرس" میں ایک خرابی بھی تھی اور وہ خرابی اس کا بھربھرا ہونا تھا اور لچک نہ ہونے کی وجہ سے زیادہ عرصہ تک محفوظ نہیں رہ سکتا تھا، لیکن سب سے بڑی خرابی جس نے اس کے استعمال کو ترک کرادیا وہ اس کی کمیابی تھی

دو ہزار سال کا عرصہ گزرا جب آہستہ آہستہ "پیپرس" کی جگہ چرمی کاغذ نے لیلی - چرمی کاغذ جسے انگریزی میں پارچمنٹ کہتے ہیں گھریلو جانوروں کی کھالوں سے تیار کیا جاتا تھا اور کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے چرمی کاغذ سازی کا یہ فن ایشیائے کوچک کے ایک شہر "پیرگامم" کے لوگوں نے دوسری صدی قبل مسیح میں حاصل کیا تھا اپنی پائداری کی وجہ سے اس کا استعمال آجتک صلحناموں، معاہدوں اور دیگر اہم تحریروں میں کیا جاتا ہے -

سلطنت رومہ کے زوال اور وحشی اقوام کے تسلط کے وقت جب مغربی علوم کو مسیحی خانقاہوں اور پراگندہ یہودی بستیوں میں پناہ لینا پڑی تو اسوقت کی تحریریں اسی چرمی کاغذ کی بدولت محفوظ رہ سکی تھیں - مشرقی علاقہ بحیرۂ روم اور مشرق ادنیٰ کے علما اپنے خیالات کو الفاظ کا جامہ پہنانے کے لئے اسی کاغذ کا استعمال کرتے تھے، یہاں تک کہ اس کاغذ پر دیدہ زیب خوشنویسی نے رنگ آمیزی اور گنگا جمنی سجاوٹ سے ملکر ایک فن لطیف کی حیثیت اختیار کرلی تھی - لیکن پھر بھی اپنے بیش قیمت ہونے کی وجہ سے اس زمانہ کے عامۃ الناس کو پڑھنے لکھنے کی طرف مائل کرنے میں ناکامیاب رہا

لکھائی کی ان چیزوں کے علاوہ ایک ہزار برس سے ایک اور چیز کا بھی وجود تھا جو اپنی ارزانی کی وجہ سے بہ آسانی مل سکتی تھی - یہ لبدی سے تیار ہونے والا کاغذ تھا جس نے عصر حاضر کی علمی ترقی میں غیر معمولی حصہ لیا - لیکن الفاظ کو محفوظ کرنے کی اہلیت نہایت سست تھی اور اسی لئے اہل دنیا صدہا برس تک باستثنائے اہل چین ناخواندہ بنے رہے

جب یوروپ میں نشاۃ الثانیہ کا دور شروع ہوا تو خیالات کے محفوظ رکھنے اور دوسروں تک منتقل کرنے کی ضرورت پیش آئی اور اس کے پیش آنے کے ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوا کہ تحریر کے یہ ذرایع تو پہلے ہی سے موجود تھے ضرورت صرف اُن کو محسوس کرنے کی تھی

چنانچہ کاغذ سازی کا راز جسے عربوں نے چینی غلاموں سے سیکھا تھا، عرب سیاحوں کی وساطت سے فرانس میں پہونچ گیا - اس کے علاوہ انھیں عرب سیاحوں نے عبارتوں کو تختیوں پر کندہ کرکے اُن کے متعدد عکس حاصل کرنے کے فن کو بھی اہل چین سے لیکر یوروپ میں پہونچادیا - گویا موجودہ فن طباعت کے دو بنیادی عناصر اس زمانہ میں یوروپ کے اندر جنم لے چکے تھے -

آیئے اب یہ دیکھیں کہ اس فن نے یوروپ میں کونسے مدارج طے کئے۔ چوبی کندیوں (Blocks) پہ الفاظ کو تراش کر اور ان پر سیاہی پھیر کر اُن سے متعدد نقول حاصل کرنے کا یہ فن پندرھویں صدی عیسوی کے آغاز ہی سے یوروپ میں شروع ہوگیا تھا۔ چنانچہ سینٹ کرسٹوفر کی ایک تصویر جو ۱۴۲۳ء میں اسی طریقہ سے طیار کی گئی تھی آج بھی موجود ہے۔ اس چوبی طباعت (Wooden block printing) کے بعد انھیں بلاکوں کی چھپائی سے کتابوں کا طیار کرنا بہت آسان ہوگیا لیکن ان بلاکوں کو تراشنا انتہائی دقت طلب کام تھا

لیکن سنہ ۱۴۴۰ء میں جرمنی یا ہالینڈ کے کسی شخص کے دماغ میں یہ خیال آیا کہ بجائے عبارتوں کو تراشنے کے حروف کو علٰحدہ علٰحدہ اُن کی اُلٹی شکل میں تراشنا چاہئے تاکہ انھیں حروف کو مرتب کر کے ایک عبارت چھاپی جاسکے اور اسکے بعد مزید استعمال کے لئے تختی یا فرمے سے الگ بھی کیا جاسکے۔ یہ شخص جوہان گٹنبرگ، شہر مینز کا باشندہ تھا

طباعت کی اس ایجاد کو اول اول چھپانے کی بڑی زبردست کوششیں کی گئیں۔ اس کا سبب یہ تھا کہ اس زمانہ میں علم کی اشاعت قلمی کتابوں کے ذریعہ سے ہوتی تھی۔ اور جس قدر کوئی کتاب قدیم و کمیاب ہوتی تھی، اسی قدر اسکی حیثیت بڑھتی جاتی تھی۔ لیکن طباعت کی اس نئی ایجاد نے کم وقت میں زیادہ کتابوں کی طیاری ممکن کر کے ان طبع شدہ کتب کی قیمت گرادی۔ لہٰذا اُس زمانہ کے طابعین جعلی سکہ سازوں کی طرح کتابیں چھاپتے تھے اور اس امر کا خاص خیال رکھتے تھے کہ اُن کے حروف بالکل قلمی معلوم ہوں تاکہ وہ اچھی قیمتوں پر بک سکیں

"نیویارک ٹائمز" کی اس تصویری اشاعت میں اس زمانہ کے مخطوطات کے نمونوں کے پہلو بہ پہلو ان طبع شدہ عبارتوں کے عکس بھی پیش کئے گئے ہیں جن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ کے حروف تراشنے والے اپنے اس نئے فن میں کس قدر ماہر تھے؟۔

کثیر آمدنی کے باوجود اس عہد کے طابع اس امر کا کوئی صحیح اندازہ نہیں کرسکے کہ اُن کی یہی ایجاد آگے چلکر انسانی تہذیب کی ترقی میں کتنی زبردست امداد دیگی اور یہ اچھا ہوا کہ وہ زیادہ عرصہ تک اس ایجاد کو چھپائے نہیں رکھ سکے کیونکہ اس فن کی ایجاد کو ابھی نصف صدی ہی کا زمانہ گزرا تھا کہ یوروپ میں خواندہ اشخاص کی تعداد میں کثیر اضافہ ہوا اور عام بول چال کی زبانوں کو اس قدر مقبولیت حاصل ہوئی کہ یوروپی ادبیات کی پرورش کرنے والی لاطینی زبان کا زوال شروع ہوگیا

لیکن اس امر سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ابتدائی دور کے یہ طابع اپنے کام سے حد درجہ شغف رکھتے تھے اور اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ یوروپ میں سنہ ۱۵۰۰ء تک کروروں کی تعداد میں متعدد کتابوں کے نسخے شایع ہوگئے۔

اس طباعت کا قدیم ترین نمونہ پوپ نکولا پنجم کا وہ خطبہ ہے جو اُس نے ۱۴۵۴ء میں فن طباعت کی تعریف میں دیا تھا اور جو شہر مینز میں چھپا تھا۔ اس کے دو سال بعد ۱۴۵۶ء میں گٹنبرگ نے ایک بائبل چھاپی جو آج بھی امریکہ کے کارڈنل مزارن کے پاس موجود ہے۔ اس بائبل کی طباعت کے ساتھ ہی ساتھ فن طباعت اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ یوروپ میں

جلوہ گر ہو چکا تھا

لیکن اس زمانہ میں کتابوں کی تیاری بہت دیر میں ہوتی تھی۔ کیونکہ گٹنبرگ اور اس کے ساتھی حروف کو علیحدہ علیحدہ ڈھالتے تھے۔ اُس زمانہ کے اس قسم کے بہت سے حروف آج بھی یوروپ اور امریکہ کے بڑے بڑے عجائب گھروں میں موجود ہیں۔ ان حروف کو اس کے بعد ایک بڑی تختی یا فریم پر جما لیا جاتا تھا اور فالتو حروف کی قلت کی سبب سے پہلے ایک تختی کے مطلوبہ عکس حاصل کئے جاتے تھے۔ پھر دوسرا فریم جمایا جاتا تھا اور اس کے عکس حاصل کئے جاتے تھے اور ساتھ ہی ان عکسوں کو تقسیم بھی کرتے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ چھپائی بھی بڑی دقت طلب تھی کیونکہ ان فریموں پر پہلے بیلنوں سے روشنائی پھیری جاتی تھی اور اس کے بعد کاغذ رکھکر دبایا جاتا تھا۔ اسی طرح روزانہ ۳۰۰ نقول حاصل کی جاسکتی تھیں۔ لیکن ۱۸۰۰ء کے دستی پریس ۲۰۰۰ نقول روزانہ تیار کر سکتے تھے

طباعت کے اس دور میں گو کتابوں تک بہت کم لوگوں کی دسترس تھی اور اسی لئے پڑھائی کا عام چرچا اسوقت تک نہیں ہو سکا جب تک کہ اُنیسویں صدی عیسوی میں "پبلک اسکول" یا "جمہوری مدارس" کا آغاز نہ ہو لیا تاہم اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ۱۴۵۰ء سے لیکر ۱۸۰۰ء تک چھپائی کے ان طریقوں کی وجہ سے عامۃ الناس کی خواندگی میں بہت کافی اضافہ ہوا۔ کتابوں کے ساتھ ساتھ ان مطابع سے بہت جلد اس قسم کے رسالے بھی شایع ہونے لگے جو دلچسپ عنوانات پر مختلف اشخاص کے خیالات اور مشاہدات پیش کرتے تھے دوسری طرف "اخباری مراسلات" (News Letters) اور یک ورقی پرچے بھی شایع ہونا شروع ہو گئے۔ یہ اخباری مراسلات چند مخصوص اشخاص کے لئے تیار کئے جاتے تھے اور وہ معاوضہ میں کافی رقمیں بھی ادا کرتے تھے دوسری طرف یک ورقی پرچے جو روزانہ یا ہفتہ وار کسی ایک اہم واقعہ کا تذکرہ کرتے تھے عامۃ الناس میں مقبول ہونے لگے۔ یہ کتابچے، اخباری مراسلات اور "یک ورقہ پرچے" اس زمانہ کے صحیح معنوں میں جراید تھے کیونکہ ان میں بعینہ وہی تنوع تھا جو آجکل کے اخبارات و رسایل میں ہوتا ہے

دنیا کا قدیم ترین یک ورقی پرچہ جو ۱۴۹۳ء میں شایع ہوا تھا آج بھی محفوظ ہے۔ اس پرچہ میں اس خط کی نقل شایع کی گئی ہے جو کولمبس نے پوپ کو لکھا تھا اور جس میں اس نے دریافت امریکہ کا پورا تذکرہ کیا تھا۔ اس خط کو دنیا کی متعدد زبانوں میں منتقل کیا جا چکا ہے

سترھویں صدی عیسوی کے شروع ہونے کے ساتھ ہی ساتھ مختلف چھاپہ خانوں سے باقاعدگی کے ساتھ اشتہار نما خبارات شایع ہونے لگے جس میں وقتی حوادث و واقعات کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا جاتا تھا۔ اُن کی اس باقاعدگی نے نھیں پچھلے جراید سے ممتاز کر دیا اور انھیں کے لئے "اخبار" کا لفظ بھی انسان نے وضع کیا۔ اس قسم کا اولین اخبار ۱۶۰۹ء ں جرمنی سے شایع ہوا تھا جس کے بعد ۱۶۲۲ء میں انگلستان سے ایک ہفتہ وار اخبار شایع ہوا اور آخر کار انگلستان ہی میں سب سے پہلا روزانہ اخبار "دی کورنٹ" ۱۷۰۲ء میں نکلا اور ۱۷۰۴ء میں امریکہ سے "بوسٹن نیوز لیٹر"

شایع ہوا۔ الغرض گٹنبرگ کے زمانہ ہی سے الفاظ کو محفوظ کرنے کی انسانی کوشش کامیاب ہو رہی تھی لیکن اٹھارویں صدی کے اواخر میں بھاپ کی تسخیر سے جو صنعتی انقلاب رونما ہوا اُس نے طباعت کی بھی کایا پلٹ دی۔ سنہ ۱۸۱۱ء میں فریڈرخ کینگ (Friedrich Kesnig) نے بھاپ سے چلنے والی ایک طباعت کی مشین تیار کی اور دو برس بعد اُس نے اسی طرح کی دو مشینیں اخبار "لندن ٹائمز" کے لئے تیار کیں جو ایک گھنٹہ میں ۱۱۰۰ نقول تیار کرسکتی تھیں ان مشینوں میں حروف ایک مسطح تختہ پر جمے ہوتے تھے اور وہ تختہ برابر آگے پیچھے چلا کرتا تھا۔ اس تختہ کے اوپر ایک متحرک بیلن ہوتا تھا جو حروف پر روشنائی پھیرا کرتا تھا اور دوسرا بیلن کاغذ کو حروف پر دبانے کے لئے ہوتا تھا۔ ان مشینوں میں کاغذ ہاتھ سے ڈالا جاتا تھا جو چھپ کر آگے نکل آتا تھا۔ اس قسم کی مشینوں سے آج بھی یورپ و امریکہ کے دیہاتوں میں کتابیں اور اخبارات چھاپے جاتے ہیں اور ہندوستان کی ہر ملکی زبان کی کثیر ترین کتب اسی قسم کی مشینوں پر چھپتی ہیں

طباعت میں اس پیش قدمی کا نتیجہ یہ ہوا کہ چھپائی سے متعلق تمام چیزوں میں نہایت مفید اصلاحات شروع ہو گئیں چنانچہ سیاہی پھیرنے کا مسئلہ لاکھ اور سریش کے بیلنوں سے حل ہو گیا اور کاغذ سازوں نے کاغذ کے مسلسل تختے بنا کر چھپائی کرنے والوں کا وقت بچا دیا۔ اس کے علاوہ خود کاغذ سازی کے نئے کیمیاوی طریقے نکل آئے جن کی وجہ سے کاغذ بہت فراواں ہو گیا

انیسویں صدی کی پیش گامی کے ساتھ ہی ساتھ (Stereotyping) یعنی پیچیدہ چھپائی کا طریقہ نکل آنے کی وجہ سے حروف کو مدور فرموں میں کسنا بھی ممکن ہو گیا اور اسی طرح طباعت کا فن گٹنبرگ یا کینگ کے زمانہ سے بہت آگے بڑھ گیا۔ لیکن فنِ طباعت کی اصلاحات اسی جگہ ختم نہیں ہو گئیں بلکہ اُنیسویں صدی کے اختتام تک حروف کو ڈھالکر اور انھیں ایک "ڈھانچہ" میں مرتب کر دینے والی مشین بھی تکمل ہو گئی جسے لینو ٹائپ کہتے ہیں اور جو اس لحاظ سے اور بھی حیرت انگیز ہے کہ اس سے سارا کام صرف ایک شخص لیتا ہے حالانکہ وہ اپنی رفتار کے لحاظ سے سیکڑوں آدمیوں کا کام انجام دیتی ہے۔

ان اصلاحات نے طباعت کو تعجب خیز حدود تک وسعت دی۔ چنانچہ موجودہ زمانہ کے اخباری مطابع فی گھنٹہ ۹۶ ہزار ضخیم اخبارات طبع کرسکتے ہیں۔ اور ان مطابع کی بیٹری (جو ایسے پریسوں کا مجموعہ ہوتی ہے) فی گھنٹہ ۳۲ صفحات والے اخبارات کی ۲ لاکھ کاپیاں طبع کرسکتی ہے۔ خود نیویارک ٹائمز اسی قسم کی ایک پریس بیٹری سے چھپتا ہے۔ اگر اس اخبار کی ایک شب کی کل کاپیوں کو ہاتھ سے لکھوایا جائے تو اس کے لئے ۸ لاکھ خوشنویسوں کی ضرورت پڑے گی اور اگر کاغذ کو گٹنبرگ کے زمانہ کے طریقوں سے چھاپا جائے تو اس کے لئے ۲ لاکھ پریس مینوں کی ضرورت پڑے گی

یہ ہے وہ اعجاز جو فنِ طباعت میں موجودہ صدی کے اندر رونما ہوا اور جو انسان کی ذہنی غلامی کے خاتمہ کا باعث ہو گا

طباعت کی اس تیز رفتاری کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اخبارات و رسایل کی اشاعت میں زبردست اضافہ ہوا

جس کا اندازہ صرف اسی طرح کیا جاسکتا ہے کہ اکیلے ایک ملک ریاستہائے متحدہ امریکہ کے اندر ایک سال میں ۱۲ کروڑ سے زائد کتابیں، ۱۴ کروڑ سے زائد کتابچے اور پمفلٹ، اور ۴ ارب سے زاید رسایل وجراید شایع ہوتے ہیں اور اگر ریاستہائے متحدہ امریکہ میں شایع ہونے والے اخبارات کی ایک روز کی اشاعت کو جمع کیا جائے اور ان میں جو حروف ہوں اُنکی کل تعداد کا اندازہ کیا جائے تو صرف انھیں حروف کی تعداد اُن تمام حروف کی تعداد سے زاید ہوگی جو ابتدائے فن تحریر سے لیکر ایجادِ فن طباعت تک، دنیا بھر میں تحریر کئے گئے ہیں

اس اشاعت علم کے ساتھ ساتھ انسانی جہالت میں بھی کمی ہوتی گئی۔ چنانچہ سنہ ۱۹۰۰ء میں ریاستہائے متحدہ امریکہ کے دس برس سے اونچی عمر رکھنے والے باشندوں میں سے دس فیصدی اشخاص لکھنے اور پڑھنے سے قطعاً عاری تھے، لیکن سنہ ۱۹۳۰ء میں ان لوگوں کی تعداد صرف ۴ فیصدی رہگئی۔ یہ صحیح ہے کہ اس علمی ترقی کا ایک بڑا سبب پبلک مدارس بھی تھے لیکن بنیادی سبب مطابع ہی کو ماننا پڑے گا۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلطی ہے کہ ہماری "کاغذی" تہذیب اُن تمام تہذیب سے جو اس سے بیشتر کم پڑھے لکھے انسانوں میں پائی جاتی تھی، بہتر ہے۔ لیکن جو امر اس جگہ اہمیت رکھتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ عصر حاضر کا تمدن در اصل اُس تمدن کا نام ہے جو انسانوں کے جاہل وناخواندہ رہنے کے ساتھ ساتھ قایم نہیں رہ سکتا ہے اور یہی امر ہمارے اس تمدن کا امتیازی نشان ہے۔ کیونکہ موجودہ مطابع نے ہر قسم کی انسانی سرگرمی میں ترقی کی اس قسم کی راہیں کھول دی ہیں جو دیگر ذرایع سے شاید لاکھوں برس میں بھی ممکن نہ ہوتیں۔ آج اس بیسویں صدی میں اظہار مدعا کے دیگر ذرایع بھی نکل آئے ہیں۔ مثلاً فونوگراف کی ایجاد نے آواز کو محفوظ کرنا ممکن بنا دیا ہے۔ سینماٹوگراف کی ایجاد نے انسانی حرکات اور فطری مناظر کو بھی محفوظ کر دیا ہے اور ریڈیو ٹیلی ویژن کی وساطت سے آواز وشکل کو دنیا کے ہر کونہ تک پہونچایا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ تمام ذرایع، طباعت کے معاون ہیں اور آج بھی ہم اخبارات سے جو کثیر معلومات اور تفریح نہایت آسانی سے حاصل کر سکتے ہیں وہ دیگر ذرایع سے حاصل نہیں کئے جاسکتے۔

مطابع انفرادی نشوونما کے بھی ذمہ دار ہوتے ہیں۔ ایک شخص تنہائی میں بیٹھکر جو جی چاہے پڑھ سکتا ہے، اس پر غور کر سکتا ہے اور اپنے افکار کو درست کر سکتا ہے لیکن ریڈیو، ٹیلی ویژن، سینما اور فونوگراف میں سے کوئی شئے بھی انفرادی نشوونما کے لئے کوئی آسانی نہیں بہم پہونچا سکتی ہے کیونکہ آواز وحرکات کو ادا کرنے والے یہ تمام ذرایع جب کوئی چیز پیش کرتے ہیں تو وہ زیادہ سے زیادہ انسانوں کے لئے ہوتی ہے، اُن کا نقطۂ نظر مقبولیت حاصل کرنا ہوتا ہے اور وہ اجتماعی مذاق کو مطمئن کرنا چاہتے ہیں درانحالیکہ مطابع کے ذریعہ انفرادی واجتماعی، ہر دو قسم کے مذاق کی چیزیں پیش کیجا سکتی ہیں۔ فطری قوتوں کی امداد سے چلنے والے موجودہ مطابع نے جو ہمہ گیر انقلاب انسان میں پیدا کیا ہے وہ اب شاید کبھی نہ ہو سکے اور اسی لئے عصر حاضر کے امیر، جو انفرادی آزادی کے سب سے بڑے دشمن ہیں جب بر سر اقتدار ہوتے ہیں تو وہ مطابع کی آزادی سلب کر لیتے ہیں۔ لیکن یہ زیادتیاں زیادہ دنوں تک نہیں چل سکتی ہیں کیونکہ پھر یہی "آمرین" انھیں مطابع کی طاقت سے معزول بھی ہو جاتے ہیں آج دنیا میں وہ تمام ممالک جہاں کے مطابع سچ کی اشاعت سے باز نہیں رکھے جاتے آزاد ہیں لیکن جن ممالک میں ایسا نہیں ہے وہ تو غیر ملکی حکومتوں کے غلام ہیں اور یا خود اندرونی طور پر کسی ایک "شخص" کے غلام ہیں۔

مبین احمد

رضوان سے کہدو

"تو ایک اچھا سا خط کیوں نہیں لکھ ڈالتے؟"

"خط!"

"ہاں! ہاں! خط! کسی عزیز کو، کسی دوست کو، کسی ——"

"مگر اب تو کوئی ایسا باقی نہیں رہا جس کو خط لکھ سکوں —— ابھی چند ہی روز تو ہوئے کہ میں نے ایک خط، نہایت اچھا خط، شوکت کو لکھا تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس کا ابتک جواب نہیں آیا۔ مگر آئے گا، مجھے امید ہے کہ ضرور آئے گا۔ اور پرسوں، ہاں پرسوں ایک خط، مگر شوکت والے خط جتنا اچھا نہیں، محمود کو لکھا۔ ایک خط یونس کو۔ ایک اور اسی دن شام کے وقت ڈاک نکلنے سے صرف چند منٹ قبل راجندر کو۔ کتنے ہوئے؟ ایک۔ دو۔ تین —— ٹھیک! اور کل تو ایکدم پانچ خط لکھ ڈالے۔ تمام دن خطوں ہی کے نذر کر دیا۔ ظاہر ہے کہ جب ایک نہیں، دو نہیں، بلکہ ایکدم پانچ خط لکھے جائیں تو سب کے سب اچھے نہیں ہو سکتے۔ البتہ تیسرے خط کو میں نے اچھا بنانے کی انتہائی کوشش کی۔ اس کے لئے مجھے بازار جانا، کڑکتی دھوپ میں یعنی تین میل کی مسافت اپنے ذمہ محض اس لئے لی کہ خوشنما کاغذ خریدا جائے اور جب یہ تمام مراحل طے کرکے لکھنے بیٹھا تو معمولی، روزمرہ کے استعمال میں آنے والے الفاظ سے تسلی نہ ہوئی۔ دماغ لڑانا پڑا۔ حسین، دلنشیں، موثر الفاظ دماغ کو کرید کرید کر نکالے اور نہایت اطمینان سے آہستہ آہستہ، قلم کی ہر جنبش پر نظر رکھتے ہوئے، اُن کو بالآخر صفحہ کاغذ پر منتقل کر دیا۔ گویا واقعی ایک اچھا خط لکھ ڈالا! اور اتنی کاوش کی بھی کیوں نہ جاتی! وہ خط —— تم تڑپنے کیوں لگے؟ ابھی تو میں نے اس کا نام بھی نہیں لیا! —— وہ خط راحت روح، دشمن ہوش، سکون جاں، غارتگر ایمان —— ہاں! ہاں! اُسی کے نام تو تھا جس کے تذکرے سے تم اس قدر مچل جاتے ہو، کیا اب بھی یہ بتانے کی ضرورت رہ گئی کہ باقی دونوں خط چند منٹ میں لکھ ڈالے؟ روح کا تمام اشتیاق تو تیسرے خط کی نذر ہو چکا تھا۔ اب ان آخری دو خطوں کیلئے وہ جوش کہاں سے آتا مجھے ان دونوں دوستوں سے جن کو یہ آخری خط ابتک یقیناً مل چکے ہوں گے دلی ہمدردی ہے مگر کیا کرتا۔ مجبور تھا۔"

احمریں بالوں والی شہرۂ آفاق ایکٹریس سارہ برن ہارٹ کی سوانح، وہ سارہ جس کی اداکاری نے وکٹر ہیوگو کے

دل کو اتنا موہ لیا تھا کہ ایک شب اُس کی آنکھوں سے تھیٹر ہال میں ہی آنسو بہہ نکلے تھے، میرے سامنے کی میز پر میری توجہ کی محتاج تھی۔ مگر میری آنکھیں کھڑکی سے باہر بارش کے منظر میں ڈوبی ہوئی تھیں اور میرا دماغ صدہا سال کے اوراق الٹ کر فرانس کے ایک تھیٹر ہال میں ایک عورت کے سحر کار فن پر ایک نامور فسانہ نگار کے قیمتی آنسو بہنے کی تصویر دیکھنے میں محو تھا کہ یکایک پھر اُسی آواز نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا :۔

"کیا ان قیمتی لمحات کو یونہی کاہلی میں گنوا دو گے ؟ اگر چاہو تو اب بھی ایک خط لکھ سکتے ہو، ایک اچھا خوبصورت خط!"

"مگر کس کو ؟ یہی تو میں جانتا نہیں !"

"اپنے آپ کو!"

"کیا کہا ؟" میں اپنی جگہ پر اُچھل پڑا - "پاگل تو نہیں ہو گئے ؟"

"پاگل ؟ نہیں ، میں تو نہیں - مگر تم ضرور ہو جاؤ گے اگر اسی طرح تصورات کا شکار بنے رہے"

احمریں بالوں والی ساحرہ کا گداز جسم مجھے ناچتا ہوا دکھائی دینے لگا۔ میں نے اپنے سر کو جھٹکا دیکر اس تصویر کو ذہن سے علیحدہ کر دیا اور ایک حد تک اپنے خیالات مجتمع کرنے میں کامیابی حاصل کر لی ۔ مجھے یہ کیسی عجیب و غریب ترغیب دی جا رہی تھی! اپنے آپ کو خط لکھنا ! بھلا کوئی ذی ہوش انسان اس سے زیادہ مضحکہ خیز حرکت کا بھی مرتکب ہو سکتا تھا ؟ اپنے آپ کو خط !

"کس سوچ میں ہو ؟ شاید تم سمجھتے ہو کہ میں تمہارا مذاق اڑا رہا ہوں ، مگر تم میرا مطلب ہی نہیں سمجھے - اپنے آپ کو خط لکھنے سے میری یہ مراد ہرگز نہ تھی کہ تم اپنی زندہ ذات کو مخاطب کرو - بلکہ اس کے بالکل برعکس - یعنی ۔۔۔۔"

"میں سمجھ گیا !" میں نے سناٹے میں آکر کہا - "تم چاہتے ہو کہ میں اپنے آپ کو مردہ تصور کر لوں اور اپنی روح کو یا اپنے ہمزاد کو جو ایسی حالت میں کسی اور دنیا میں جا بسا ہو گا مخاطب کروں"

میری زبان نے الفاظ ادا تو کر دئے مگر اب میرے جسم کا ریشہ ریشہ کانپنے لگا - باہر بارش کا ناچ بدستور ہو رہا تھا -

"بالکل ٹھیک سمجھے - میں نے کہا تھا نا کہ کم از کم ایک اور خط لکھ سکتے ہو! بس اب لکھ ڈالو ، ایک ایسا خط جو کبھی کسی نے نہ لکھا ہو ، جو کسی کو لکھنے کی جرأت ہی نہ ہوئی ہو ، جو اپنی نظیر آپ ہی ہو ۔۔۔"

میرا دماغ چکر کھا رہا تھا - میز پر پڑی ہوئی کتاب مجھے گھومتی ہوئی معلوم ہونے لگی - کمرے کی دیواریں میرے گرد طواف کرنے لگیں - باہر زمین اور آسمان جھولا جھولنے لگے - دائیں بائیں ، بائیں دائیں ۔۔۔ !

"ہاں ! ایک اسی قسم کا خط لکھ ڈالو" میرے کان سنتے چلے گئے - "اور اس کا مواد خود اپنی زندگی سے لو - کیونکہ اس سے بہتر مواد تمہیں اور کہاں سے دستیاب ہو گا ؟ آخر زندگی کیا ہے ؟ مرقع حوادث یا یوں کہہ لو کہ ظفر مندیوں اور ناکامیوں کا ایک مجموعہ اور کیا تمہاری زندگی میں واقعات کی کمی ہے ؟ کیا اگر تمہیں موقع دیا جائے تو تم بہت کچھ کہنے کے لئے بیتاب نہ ہو گے ؟ مجھے خوب معلوم ہے کہ ضرور ہو گے ۔

"بس! بس!" میں دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر چلا اُٹھا۔ "میں نے سب کچھ سن لیا۔ میں ایسا ہی کروں گا۔ لکھوں گا ابھی لکھوں گا! گویا کہ میرا وجود اب اس دنیا سے کسی اور جہان میں منتقل ہو گیا ہے۔ مگر میں وعدہ نہیں کر سکتا کہ میری کوشش کا نتیجہ ایک خوبصورت خط ہوگا، بہت ممکن ہے کہ جب لکھا جا چکے تو خوبصورتی کا اس میں ایک شائبہ بھی نہ پایا جائے۔ مگر اتنا وعدہ ضرور کرتا ہوں کہ جو کچھ لکھوں گا سچ لکھوں گا۔ دروغگوئی سے مجھے نفرت ہے۔"

فوراً اُٹھا شرابیوں کی طرح لڑکھڑاتا ہوا، کاغذ نکالا اور میز پر جھک گیا۔ گویا کہ دنیا میں اس وقت اس سے زیادہ اہم کام اور کوئی نہ تھا۔ میں اسوقت کارکنانِ قضا و قدر کے ساتھ پہلی بار ایک انوکھے طریقے سے بزد آزمائی کر رہا تھا!

قلم سفحۂ کاغذ کے قریب پہونچکر یکایک رُک گیا۔

اس دوسرے جہان والے اپنے آپ کو کس نام سے یاد کروں! کیا وہاں بھی وہ اختر ہی کہلاتا ہوگا۔ میں نے سر اوپر اُٹھا کر غیر ارادی طور پر کھڑکی سے باہر دیکھا۔ بارش اب بھی تیزی سے ہو رہی تھی، کچھ فاصلے پر ایک درخت کے نیچے جس کے پتے اب پانی کا بوجھ نہ سہار سکتے تھے، ایک بکری کا بچہ پناہ لینے کے لئے آکھڑا ہوا تھا۔ مگر پانی کی دھاریں بے رحمی سے اُس کے جسم پر تازیانے لگا رہی تھیں۔ وہ ٹھٹھر رہا تھا اور بار بار گردن کو دائیں بائیں موڑ کر نظر دوڑاتا تھا۔ کیا وہ راستہ بھول کر ادھر آنکلا تھا اور اس غیر مانوس ماحول سے خوف زدہ ہو کر ادھر اُدھر دیکھ رہا تھا؟ کیا اُسے کسی قسم کی مدد پہونچنے کی امید تھی؟ کیا اُس کی ماں اُس کی تلاش میں اس طرف آرہی ہوگی؟ کون کہہ سکتا تھا کہ اس وقت اس گمشدہ بچے کے دماغ میں کیسے کیسے خیالات پیدا ہو رہے تھے؟ "گمشدہ بچہ! گمشدہ! گمشدہ!" یکایک میں نے یہ الفاظ زیرِ لب دوہرائے۔ ہاں! ہاں! اسی نام سے تو مجھے اُس دوسرے جہان والے اپنے آپ کو یاد کرنا چاہئے کیونکہ وہ بھی تو ایک گمشدہ ہی ہوگا۔

قلم کی نوک اب کاغذ کی سطح سے جا ملی۔ اور میری آنکھوں کے سامنے پہلے الفاظ اور پھر رفتہ رفتہ سطور نمودار ہونے لگیں

"اے گمشدہ دوست" میں نے لکھنا شروع کیا۔ "ایک طویل عرصے سے تم اس جہان سے روپوش اور اب غالبًا ایسے جہان کے باشندے بن چکے، جس کو اس دنیا کی کسی آنکھ نے آجتک نہیں دیکھا، لیکن جس کا ایک خیالی خاکہ پھر بھی لوگوں کے دماغوں میں موجود ہے۔ مگر جو بات بعید از فہم ہے وہ یہ ہے کہ آخر تمہیں کیا سوجھی کہ عالمِ شباب ہی میں اس جہان کو چھوڑ کر چلدئے۔ شاید تم خیال کرتے ہوگے کہ تمہارا نہ ہونا اس دنیا والوں کے دلوں پر شاق گزرے گا اور تمہارے لئے لوگ صفِ ماتم بچھائیں گے۔ مگر کیا تم کو معلوم ہے کہ اب کسی کو اتنا احساس بھی نہیں کہ تم بھی اس دنیا میں کبھی کوئی ہستی رکھتے تھے۔ کیا تمہیں یہ بات عجیب و غریب نہیں معلوم ہوتی اور کیا یہ سنکر تمہارے قلب میں کوئی ہیجان پیدا نہیں ہوتا؟

"مگر بہت ممکن ہے کہ ایسا نہ ہو اور تم اس جہان والوں سے اتنے ہی بے نیاز ہو جتنے کہ یہاں والے تم سے ہیں۔ اس صورت میں صرف ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے اور وہ یہ کہ اُس نادیدہ کائنات میں تم وہاں ہو! جہاں ہر سو خوشی ہی خوشی ہے۔ جہاں ماضی کی یاد کسی کو نہیں ستاتی۔ جہاں فردا کا کوئی غم نہیں، جہاں حال ہی میں سب مست رہتے ہیں۔

"یہ درست ہے کہ اس دنیا میں تمھاری مختصر زندگی مصائب کا ایک لامتناہی سلسلہ تھی تم نے پھر بھی حتی الامکان نہ صرف اپنے ہم جنسوں بلکہ غیر جنسوں کی تکالیف کو رفع کرنے کی کوشش کی اور جبر و استقلال کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ جس کے صلے میں غالباً تمھیں اب اُس خطّے میں جگہ ملی ہے جو یہاں کے باشندوں کے خیال کے مطابق تم ایسے لوگوں کے لئے روزِ ازل سے مخصوص ہے۔ پھر بھی حیرت ہوتی ہے کہ تم نے کیونکر ایک ابدی آسایش اور مسرت کی زندگی کو یہاں کی کشمکش کی زندگی پر ترجیح دی۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم اس دنیا میں اپنی مختصر حیات کے دونوں دور بھول چکے ہو تو سنو، غور سے سنو۔ ممکن ہے کہ وہ پردہ جو اب تمھاری آنکھوں پر پڑا ہوا ہے ہٹ جائے اور تمھیں حقیقت کی ایک جھلک بیتاب کر دے۔

"تمھاری زندگی کے صرف دو دور تھے۔ بچپن کا زمانہ اور عالمِ شباب۔ بڑھاپا آنے سے پیشتر ہی تم نے اس جہان کو خیرباد کہہ دیا۔ تمھارے بچپن اور جوانی کے بیشتر واقعات ایک ہی قسم کے تھے۔ حقیقی مسرت تمھیں شاذ و نادر ہی نصیب ہوئی ہوگی مگر پریشانیاں تمھاری زندگی کا ایک جزوِ لاینفک بن گئی تھیں۔ اسی زندگی کے چند اہم واقعات کا نقشہ اب تمھاری آنکھوں کے سامنے پیش کیا جاتا ہے :-

"جب تم پانچ برس کے تھے ایک دن یکایک تمھارے دل کو یہ دیکھ کر دھکا سا لگا کہ تمھاری ماں کی انگلیاں جو اسوقت چکی پر آٹا پیسنے میں مصروف تھی سوجی ہوئی تھیں۔ تم بھاگے بھاگے اُس کے پاس گئے اور تم نے پوچھا :-

'ماں! یہ تمھاری انگلیوں کو کیا ہوا؟'

تمھاری ماں نے دوپٹہ کے آنچل سے اپنی پیشانی کا پسینہ پونچھتے ہوئے جواب دیا :

'بیٹا - چکی چلانے سے سوج گئی ہیں'

'چکی چلانے سے! بہت درد ہوتا ہوگا؟'

'ہاں بیٹا!' تمھاری ماں نے محبت بھری نظروں سے تمھاری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

تم نے ایسا محسوس کیا جیسے کسی نے تمھارے ننھے سے دل میں سوئی چبھو دی ہو۔

'ماں! تم یہ کام چھوڑ کیوں نہیں دیتیں؟' تم نے کچھ سوچ کر کہا۔

'بیٹا - پھر کھائیں گے کہاں سے؟'

'تو کیا جو لوگ کھاتے ہیں ان سب کی انگلیاں تمھاری طرح سوج جایا کرتی ہیں؟' تم نے معصومیت سے پوچھا۔

'نہیں - میرے لعل!' تمھاری ماں نے تمھیں اپنی گود میں کھینچتے ہوئے کہا۔ 'جو لوگ امیر ہیں اور جن کے پاس دھن دولت کی کمی نہیں اُن کو کھانا بہت آسانی سے مل جاتا ہے۔ اُن کو ایسے کام کبھی نہیں کرنے پڑتے۔ اسی لئے انکی انگلیاں بھی نہیں سوجتیں'

تم اسوقت دولت کا مطلب تو نہ سمجھے مگر تم وہاں رُک نہ سکے۔ ماں کی آغوش کو چھوڑ کر باہر بھاگے۔ جب باہر پہونچے تو تمھاری آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو گر رہے تھے۔

اور جب ٹوٹتی ہیں تو ایک قیامت بپا کر دیتی ہیں۔ یہی اسوقت بھی ہوا۔ کیسے ہوا؟ یہ معلوم کرنے کی تمھیں مہلت ہی نہ ملی تم صرف اتنا محسوس کر سکے کہ تمھارے شانے پر گرم گرم آنسو امڈ کر نکل رہے تھے اور تمھارے سینے پر بہے جا رہے تھے۔ اور تمھارے کانوں نے ایک عجیب و غریب التجا سنی۔ "آپ مجھے کبھی نہ جانے دیں۔ آپ میری زندگی کو پامال ہونے سے بچا لیں"۔ اسوقت تمھاری روحیں ایک دوسرے میں جذب ہو جانے کے لئے بیتاب تھیں، ہمیشہ کے لئے۔ مگر ہوا کیا؟ وہی جو اکثر ہوا کرتا ہے۔ اس کی نسبت تو تمھارے چچا چچی نے مدت ہوئی ایک نوجوان سے کر دی تھی اور آخر ایک شب وہ تم سے اور تم اُس سے ہمیشہ کے لئے جدا کر دئے گئے اور وہ بھی اس طرح کہ دونوں اس ابدی مفارقت کے موقع پر بھی لذت دید سے محروم رہے۔ تمھارے ارمان تمھارے دلوں ہی میں کچلے گئے، مگر لب پر ایک حرف نہ آیا۔ اُس شب جب برات گئی ہے تو بارش ہو رہی تھی اور جب دولھا دلہن کی پھولوں سے لدی موٹر گذری تو تم ایک درخت کے نیچے تاریکی کے پردے میں کھڑے بھیگ رہے تھے اور تمھاری آنکھیں بادلوں کی طرح برس رہی تھیں۔

"یہی وہ سانحہ تھا جسکے کچھ عرصہ بعد تم ایک دن ہماری دنیا کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر چلدئے اور آج تک لاپتہ ہو"

"اے گمشدہ دوست! اب تم ہی بتاؤ کہ ان حالات میں تمھارا اُس جہان میں دائمی جمود کی زندگی بسر کرنا کہاں تک بجا ہے؟ کیا ان تمام واقعات کی یاد تمھیں کبھی نہیں ستاتی؟ کیا تمھاری زندگی کی یہ سب تلخیاں اُس نئے جہان کے شباب کی مستیوں میں تحلیل ہو کر شیریں بن چکی ہیں حتے کہ تمھاری زندگی سراپا فراموشی ہو کر رہ گئی ہے۔

"جس جہان کے باشندوں کو جسم و جان کا باہمی ارتباط قایم رکھنے کے لئے محنت شاقہ کبھی نہ کرنی پڑے اور جو افلاس کی زد سے بالکل محفوظ ہوں۔ جہاں ادنیٰ سے ادنیٰ اور اعلیٰ سے اعلیٰ خواہش اس کا خیال ہی دل میں لانے سے چشم زدن میں پوری ہو جائے، اس طرح کہ کسی درخت پر لدے ہوئے پھل محض آنکھوں کے اشارے سے خود بخود کھنچے چلے آئیں۔

"جس دنیا میں وہ مسرت عنقا ہو جو مظلوم و بے زبان جانداروں کا پیٹ بھر کر اور خود نعمتوں سے محروم رہ کر حاصل ہوتی ہے۔ ایسے جاندار جن پر تفریح طبع کے لئے پتھر برسائے جاتے ہیں، جن کی چیخ و پکار پر خوشی کے نعرے بلند کئے جاتے ہیں مگر جن کا تمھاری دنیا میں شاید گزر بھی ممنوع ہوگا۔

"جس فضا میں آہ و بکا کی وہ روح فرسا صدائیں کبھی نہیں سنائی دیتیں جو یہاں کم عمر بچوں کے یتیم ہو جانے پر اُن کے دلوں سے نکلتی ہیں اور گنبد افلاک کو متزلزل کر دیتی ہیں۔ وہ بچے جن پر کمسنی ہی میں مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑتے ہیں جنھیں نہ معلوم کس قوت سے جھیلتے ہیں۔ جھیلتے جھیلتے ہی جوان ہو جاتے ہیں اور جن کا پیمانۂ حیات سسکتے سسکتے ہی لبریز ہو جاتا ہے۔

جس عالم بسیط میں جنس محبت اس قدر ارزاں ہے کہ نہ تو وہاں کے باشندے خون تمنا کے نام سے ہی واقف ہیں اور نہ سوز دروں ہی سے اُن کے کلیجے جل کر راکھ ہو جاتے ہیں، جہاں، جب دو دل ایک دوسرے کی محبت میں سرشار ہو جاتے ہیں اور ایک کو ہر لحظہ دوسرے کی جستجو رہتی ہے اور دونوں کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ اُن کو کبھی جدا نہ کیا جائے کہ جدائی اُن کے لئے تمام

کائنات کو تاریک کر دے گی تو ایسی حالت میں کوئی غیر مرئی طاقت انھیں داغِ مفارقت دیکر لطف اندوز نہیں ہوتی۔ اُن کے آنسو بہانا نہیں چاہتی۔ اُن کے ارمانوں کا خون نہیں ہونے دیتی۔ بلکہ اُن لمحاتِ مسرت کو جو محبت کرنے اور کئے جانے پر حاصل ہوتے ہیں اور جن کی زندگی ہماری دنیا میں آنکھ جھپکتے ہی بیت جاتی ہے، وہ ایک عمرِ جاوداں عطا کر دیتی ہے اور انھیں لازوال بنا دیتی ہے۔ ایسے جہاں میں رہنا۔ اے گمشدہ دوست! تم کیونکر برداشت کر سکتے ہو۔ مدہوشی کی اُس پٹی کو جس نے تمھاری آنکھوں کو قوتِ بصارت سے محروم کر رکھا ہے تم کیوں نہیں اُتار کر پھینکدیتے؟ کیوں نہیں رضوان سے بآوازِ بلند کہہ دیتے کہ "اے رضوان! اب حد ہو چکی۔ تم اپنے اس سرسبز و مست جزیرے کو سنبھال لو۔ مجھے اس کی ضرورت نہیں رہی۔ میں یہاں ایک پل بھی نہیں ٹھہر سکتا اس لئے کہ شعاعِ حقیقت نے اس پردے کو جس نے میری آنکھوں کو ایک مدت سے اندھا کر رکھا تھا جلا ڈالا ہے اور مجھے از سرِ نو قوتِ بینائی عطا کر دی ہے!"

کیوں نہیں تم رضوان کو اپنا آخری فیصلہ سنا دیتے اور کہتے کہ "اے رضوان! اب دیر نہ کرو۔ اس خطے کے دروازے کھول دو کیونکہ میں اپنی دنیا میں واپس جانے کے لئے بیتاب ہوں مجھے جانے دو۔ میں یہاں نہیں رہ سکتا! میں دنیا میں واپس جانا چاہتا ہوں جہاں کشمکش ہے۔ صعوبتیں ہیں۔ نالہ و فغاں ہے۔ جہاں دل کی دنیا بستی ہے، بس کر اجڑتی ہے اور پھر کبھی آباد نہیں ہوتی۔ جہاں بے زبان جانداروں کے لئے صیاد ہیں۔ جہاں آشیانوں کے لئے بجلیاں اور آندھیاں ہیں۔ یہی دنیا مجھے بلا رہی ہے۔ اسی دنیا میں میں پہونچنا چاہتا ہوں۔ مجھے اس بات کی مطلق پروا نہیں کہ اتنا عرصہ وہاں میری عدم موجودگی نے لوگوں کو میرے لئے بے قرار نہیں کیا اور کسی کو انتظار کی گھڑیاں نہیں گنوائیں میں صرف بیداری کی زندگی چاہتا ہوں۔ رضوان! خواہ وہ گمنام ہی ہو۔ میں ایسی زندگی پر دائمی آسائش کی ہزار زندگیاں قربان کرنے کے لئے تیار ہوں اور ایسی زندگی مجھے اُسی دنیا میں ہی میسر آ سکتی ہے ـــــ"

میرے قلم کی نوک ٹوٹ گئی۔ مگر میرا جسم بھی خستہ ہو چکا تھا۔ اب اس سے آگے لکھنے کی مجھ میں قوت ہی باقی نہ رہی تھی۔ میرا سر سنوں وزنی ہو گیا اور دھڑام سے احمریں بالوں والی ساحرہ کی سوانح پر جا گرا۔ میرا جسم پھڑک رہا تھا گویا کہ اس کا ذرہ ذرہ درد سے بیتاب ہے۔ اسی عالم میں میری زبان سے یہ الفاظ نکلے :۔

"کہو! خط پسند آیا؟"

مگر وہاں جواب کون دیتا!

جس نے مجھے خط لکھنے پر آمادہ کیا تھا اور جس سے جواب کی توقع کی جا سکتی تھی اُسی کا خون تو ان سطروں کی نذر کیا گیا تھا

انور اعجاز قیصر

عجائبات جسم انسانی

آپ کو معلوم ہے کہ جسم انسانی کی ساخت کن کن اجزاء سے ہوئی ہے؟ چربی، لوہا، شکر، کاربن، کیلشیم، فاسفورس، ہائیڈروجن اور آکسیجن گیس۔ اور ان کی مقدار اتنی ہے کہ چربی سے دس ٹکیاں صابون کی طیار ہو سکتی ہیں اور لوہے سے ۲/۱ انچ لمبی دو کیلیں۔ شکر کی مقدار اتنی ہے کہ اس سے تین پیالیاں قہوہ کی میٹھی کی جاسکتی ہیں۔ کاربن البتہ زیادہ ہے اور اس سے ۹ ہزار پنسلیں بن سکتی ہیں، اسی طرح کیلشیم بھی کافی ہے یعنی اس سے ایک چھوٹے سے کمرہ کی دیواروں پر سپیدی پھیر سکتے ہیں اور فاسفورس کی مقدار اتنی ہے کہ ۲۲۰۰ دیاسلائیوں کے سرے پر لگایا جاسکتا ہے۔ ہائیڈروجن اور آکسیجن گیس کی مقدار بھی کافی ہے یعنی ان سے ہم ۵۰۰ گز تک سڑک کی لالٹینوں کو دو گھنٹے تک روشن رکھ سکتے ہیں

اگر ذرات جسم انسانی کے درمیان کے خلایا کو دور کر کے ایک جگہ جمع کر دیا جائے تو بھی ہم انھیں بغیر خوردبین کی مدد کے نہیں دیکھ سکتے۔ جسم انسانی کی ساخت میں جو مادہ صرف ہوا ہے وہ جسم کے ہزارویں حصہ سے بھی کم ہے درانحالیکہ کل ذرات کثرت کے لحاظ سے اتنے ہیں کہ آپ ایک میں ۲۷ صفر بڑھانے کے بعد بھی ان کی تعداد کو ظاہر نہیں کر سکتے

یوں تو جسم انسانی میں پانی کا اوسط ۶۵ فی صدی ہے، لیکن علحدہ علحدہ اجزاء کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ دماغ، طحال اور ریڑھ میں پانی کی مقدار ۵ء، فی صدی ہے اور آنکھ میں ۹۹ فی صدی۔ خون میں ۵/۴ حصہ پانی کا ہے

جسم کے مختلف اعضاء کا درجۂ حرارت بھی مختلف ہے۔ سب سے زیادہ گرمی جگر اور گردوں میں پائی جاتی ہے۔ دل ان سے ایک درجہ کم اور پھیپھڑے دو درجہ کم گرم ہیں۔ اگر جسم انسانی کی گرمی دفعۃً ہوتی رہے تو ۲۴ گھنٹے میں انسانی ٹمپریچر بجائے ۹۸ کے ۱۸۵ ڈگری ہو جائے

جوان آدمی فی منٹ ۱۶ سے ۲۰ تک سانسیں لیتے ہیں۔ بچے جلد جلد سانس لیتے ہیں، بخار کی حالت میں بھی سانسیں بڑھجاتی ہیں۔ سکون کی حالت میں انسان فی منٹ دس بارہ سیر ہوا اندر لیجاتا ہے، گویا ہر سانس کے ساتھ تین پاؤ ہوا

پھیپھڑے میں پہونچتی ہے۔ لیکن ورزش یا دوڑ دھوپ کے وقت اس کی مقدار سہ چند ہو جاتی ہے۔ اگر پھیپھڑے کی تمام تہیں کھول کر پھیلا دی جائیں تو ان کا رقبہ ۱۵۶ مربع گز ہوتا ہے یعنی وہ اتنی جگہ گھیر سکتی ہیں کہ ۵۰۰ آدمی اس پر کھڑے ہو جائیں۔ ۴۰ سال کی عمر میں انسان تقریباً ۵۰۸۰۰۰۰۰ سانسیں لے لیتا ہے اور ۹۶۰۰۰۰ مکعب فٹ ہوا اندر کی طرف کھینچتا ہے۔

اوووم (Ovum) یعنی وہ بیضہ کا سا مادہ جس سے انسان بنتا ہے وزن میں $\frac{1}{25}$ گرام ہوتا ہے، حالانکہ ایک تندرست انسان کا وزن ایک من ۳۰ سیر کے قریب ہوتا ہے۔ انسان کا قد ۳۰ سال کے بعد کچھ گھٹ جاتا ہے اور ۶۰ سال کے بعد وزن میں کمی ہو جاتی ہے

یورپ میں سب سے زیادہ طویل القامت انسان اسکینڈ نیویا (یعنی سویڈن، ناروے، ڈنمارک) میں پایا جاتا ہے اور ساری دنیا کو دیکھتے ہوئے افریقہ میں طویل ترین و حقیر ترین دونوں قسم کے انسان پائے جاتے ہیں

انسان کے جسم میں جو سالمات (molecules) یا دقائق حیات پائے جاتے ہیں وہ گویا برقی ڈائنمو (Dynamo) ہیں، جن سے دماغ، اعصاب، عضلات اور قلب وغیرہ کو برقی رو پہونچتی رہتی ہے اور انسانی حرکت و عمل سب انھیں پر موقوف ہے۔

حرارت کی مقدار مرد کے جسم سے بہ نسبت عورت دس فی صدی زیادہ خارج ہوتی ہے۔ اسی طرح کھڑے ہونے کی حالت میں بہ نسبت سونے کے دس فیصدی زیادہ ہو جاتی ہے۔ تیز چلنے میں یہ ۲۰۰ فی صدی اور بہت زیادہ محنت و مشقت کے وقت ۷۰۰ فی صدی بڑھ جاتی ہے۔ غذا کے بعد اس کا اخراج ۴۰ فی صدی زیادہ ہو جاتا ہے، لیکن دماغی کام کے وقت صرف چار فی صدی۔

پروفیسر بارٹین کا نظریہ ہے کہ استقرار نطفہ کے وقت ہی نر و مادہ کی تعیین ہو جاتی ہے۔ اس کا بیان ہے کہ عورت کے اُووم (Ovum) میں صرف لڑکی ہی پیدا کرنے کا مادہ ہوتا ہے اور مرد کے مادۂ منویہ میں لڑکی اور لڑکا دونوں کے جراثیم پائے جاتے ہیں۔ اگر عورت کا اُووم، مرد کے اس مادہ سے ملتا ہے جس میں لڑکی پیدا کرنے کی صلاحیت ہے تو لڑکی پیدا ہوتی ہے اور اگر لڑکا پیدا کرنے والے مادہ سے ملتا ہے تو لڑکا پیدا ہوتا ہے۔

انسان کی جلد میں تقریباً ۲۰ لاکھ مسامات ہوتے ہیں۔ یعنی ہر مربع انچ میں اوسطاً ۵۰۰۔ ہتیلیوں اور تلووں میں دو ہزار فی مربع انچ کا اوسط ہے۔ یہ مسامات گویا وہ غدود ہیں جن سے پسینہ نکلتا ہے۔ گرمی میں جب کوئی محنت نہ کی جائے تو

تقریباً سوا سیر پسینہ ہر روز ایک انسان کے جسم سے خارج ہوتا ہے جس میں سوائے ایک فیصدی نمک کے باقی پانی ہوتا ہے ایسے آدمی شاذ ہیں جن کے یہ غدود نہ ہوتے ہوں۔ ایسے لوگوں کا ٹمپریچر گرمیوں میں ۱۰۰ درجہ تک پہونچ جاتا ہے۔ انسان کے جسم میں خاص حصے ایسے پائے جاتے ہیں جو گرمی یا سردی کو بہت محسوس کرتے ہیں، لیکن ابھی تک ان حصوں کے فرائض کا علم حاصل نہیں ہو سکا۔ کوئی شخص نہا کر ہوا میں نکل آئے تو اس کا درجۂ حرارت گر کر ۶۰ درجہ تک پہونچ جاتا ہے اور وہ کانپنے لگتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ سردی محسوس کرنے والے حصۂ جسم نے سردی کو محسوس کر کے اعصاب میں کپکپی پیدا کر دی، کیونکہ اعصاب کی انھیں جنبش سے گرمی عود کر آتی ہے

اگر کوئی شخص گرم پانی کے ٹب میں جس کا درجۂ حرارت ۱۰۴ ہو، بیٹھ جائے لیکن سر باہر نکلا ہو تو پیشانی پر پسینہ آنے لگتا ہے، لیکن اگر وہ اپنا ایک ہاتھ ٹھنڈے پانی میں ڈالدے تو پسینہ بند ہو جاتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ وہ اعصاب جن کا تعلق پسینہ کے غدود سے ہے وہ پسینہ کے اخراج کو حسب ضرورت کم و بیش کرتے رہتے ہیں۔

انسان کے جسم پر ہر جگہ کثرت سے رونگٹے پائے جاتے ہیں اور ایک ایک جگہ سے تین تین چار چار اُگتے ہیں۔ یہ گویا بالوں کا ایک ہلکا سا لباس ہے جو اس وقت کی یادگار ہے جب انسان رینگنے والے جانوروں کی شکل میں پایا جاتا تھا اسکے بعد انسان دوسرے دورِ ارتقا سے گزرا اور حیوانات کی طرح اس کے بال زیادہ سخت، گھنے اور بڑے ہو گئے۔ چنانچہ ابرو، کان اور ناک کے بال اور داڑھی مونچھ اسی زمانہ کی یادگار ہے۔

سوائے بندر اور ہاتھی کے جانوروں میں غم و غصہ کا اظہار آنسوؤں کے ذریعہ سے نہیں ہوتا لیکن انسان کا بچہ ابتدا ہی سے رونے لگتا ہے۔ رونے کی حقیقت یہ ہے کہ جب بچہ بھوکا ہوتا ہے یا کسی بات پر خفا ہو جاتا ہے تو آنکھ کے اوعیۂ دم (Blood Vessels) خون سے بھر جاتے ہیں اور آنکھ کے پاس کے اعصاب سکڑنے لگتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہو کہ آنکھ کے اطراف کے غدود سے پانی نکلنے لگتا ہے جس کا نام آنسو ہے۔

دوسرے سال، بچہ کا وزن ستمبر اور دسمبر کے درمیان زیادہ بڑھتا ہے۔ جنوری سے اپریل تک کم بڑھتا ہے اور مئی و اگست کے درمیان بڑھنا بند ہو جاتا ہے۔ لیکن قد زیادہ بڑھتا ہے اپریل سے اگست تک پانچ سال کے لڑکے لڑکیوں سے لمبے ہوتے ہیں، سات سال میں دونوں برابر ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد نو سے بارہ سال لڑکے پھر زیادہ بڑھنے لگتے ہیں لیکن تیرھویں اور پندرھویں سال میں لڑکیاں پھر انھیں پکڑ لیتی ہیں۔ پندرہ سال کے بعد البتہ لڑکوں کا نشو و نما مستقلاً لڑکیوں کی نسبت زیادہ ہو جاتا ہے۔

بچوں کے ناخن، بڑی عمر کے لوگوں سے زیادہ جلد بڑھتے ہیں۔ یہاں کے جاڑوں کے ۱۳۲ دن میں اور گرمیوں کے ۱۱۶ دن میں وہ بالکل نئے ہو جاتے ہیں۔ بائیں ہاتھ کے ناخن کو البتہ بالکل بدلجانے کے لئے دس دن زیادہ درکار ہوتے ہیں۔ وہ شخص جو داڑھی منڈاتا ہے اس کی داڑھی ہر ہفتہ ۳/۲۵ انچ یا سالانہ ۶ انچ بڑھتی ہے یا یوں سمجھئے کہ وہ شخص جس نے برابر ۶۰ سال تک داڑھی مونڈی ہے، گویا دس گز داڑھی مونڈی ہے

ایک جوان انسان کا سر، اس کی ولادت کے وقت سے صرف دوچند لمبا ہوتا ہے۔ لیکن ہاتھ چوگنے اور ٹانگ پانچ گنا زیادہ لمبی ہو جاتی ہے۔

انسان کی خوش چلنی یا بد چلنی کا اثر نسل انسانی پر کتنا پڑتا ہے۔ اس کا اندازہ آپ کو یوں ہوگا کہ سنہ ۱۷۴۰ء میں ایک امریکی عورت نہایت بد چلن قسم کی پائی جاتی تھی ــــ سنہ ۱۹۳۵ء میں ۱۲۵۰ مرد عورت اس کی نسل کے موجود تھے، جن میں ۴۴ عورتیں کسبیاں تھیں، ۱۸۰ مرد جرائم پیشہ تھے، ۳۱۰ گداگر تھے، ۱۲۹ سرکاری مشقت گاہوں میں کام کرتے تھے، ۱۸۱ عادی میخوار تھے اور ان کے علاوہ جتنے تھے وہ سب کمزور دل و دماغ کے تھے۔

اس کے برخلاف ایک مشہور مقرر و مصنف کی اولاد کا حال دیکھئے۔ سنہ ۱۹۰۰ء تک ان کی نسل میں ۱۳۹۴ آدمی پائے جاتے تھے۔ ان میں سے ۱۳ صدرِ جامعہ تھے اور ۶۵ پروفیسر۔ ۶۰ ڈاکٹر تھے اور اتنے ہی مصنف، ۱۳۰ قانون پیشہ تھے اور ۷۵، فوجی افسر، ۱۰۰ پادری تھے اور باقی دوسرے شریفانہ پیشوں میں مصروف۔

دماغِ انسانی کا وزن مختلف ہوتا ہے اور اس میں قد، عمر، جنسیت اور قومیت کو بڑا دخل ہے۔ لمبے آدمی کا دماغ بہ نسبت چھوٹے آدمیوں کے بڑا ہوتا ہے، اسی طرح اوسطاً عورت کا دماغ بہ نسبت مرد کے چھوٹا ہوتا ہے۔

ایک بچہ کا دماغ بہ نسبت جوان آدمی کے وزن میں ۱/۴ ہوتا ہے۔ ابتدائی تین سال میں دماغی نشو و نما زیادہ ہوتا ہے، اس کے بعد چار سال تک یہ رفتار کم ہو جاتی ہے اور پھر تیرہ سال تک اور کم۔ ۲۰ سال کی عمر میں انسانی دماغ کا وزن پورا ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ ہر سال بہ اندازہ ایک گرام کم ہونے لگتا ہے۔

لیکن یہ ضروری نہیں کہ جس کا دماغ بڑا ہو اس کی دماغی قابلیت بھی زیادہ ہو۔ اسکے لئے دماغ کا بڑا ہونا اہم چیز نہیں بلکہ اس کی ساخت اصل چیز ہے۔ تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ سب سے اچھا دماغ وہ ہوتا ہے جس کے پیچ اور بل تعداد و نوع میں زیادہ پائے جائیں۔ چڑیوں اور رینگنے والے جانوروں کے دماغ بالکل سادہ اور چکنے ہوتے ہیں۔ کتوں، بلیوں، بندروں وغیرہ کا دماغ پیچدار ہوتا ہے، لیکن انسانی دماغ کی ساخت میں بہت نازک پیچ پائے جاتے ہیں۔

۴۸، اونس وزن کے انسانی دماغ میں تقریباً چودہ ارب خلایائے اعصاب (Nerve cells) پائے جاتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ جسم انسانی کے اور تمام خلایا تو برابر بدلتے رہتے ہیں، لیکن یہ خلایا جوں کے توں قایم رہتے ہیں۔

اندازہ کیا گیا ہے کہ اعصاب کی حرکت سے دماغ میں احساس کی جو کیفیت پیدا ہوتی ہے، اسکی رفتار ۱۱۵ سے ۲۶۵ فٹ فی سکنڈ ہے۔ ایک ماہر پیانو یا وائلن بجانے والا فی سکنڈ دس پندرہ مرتبہ اپنی اُنگلیوں کے اعصاب کو حرکت دیسکتا ہے اور ایک مشاق خطیب و مقرر کے اعصاب نطق میں فی سکنڈ تیس جنبشیں پیدا ہوتی ہیں۔

بعض غیر شعوری حرکتیں (Reflexes) فطرت سے تعلق رکھتی ہیں۔ مثلاً ہاتھوں کی گرفت کی حرکت بچہ میں ولادت کے بعد ہی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ کسی چیز کو پکڑ کر اپنے آپ کو سنبھالنا چاہتا ہے۔ انسان کی یہ فطری قوت یادگار ہے اس زمانہ کی جب وہ اپنے ابتدائی دورِ ارتقا میں جانوروں کی طرح درختوں پر رہا کرتا تھا۔

دماغی مادہ میں اَمونیا (نوسادر کی قسم کا مادہ) پایا جاتا ہے جو اعصاب کی حرکت سے بنتا رہتا ہے۔ بعض لوگوں کے مرنے کے بعد ان کے دماغ کا آپریشن کیا گیا تو معلوم ہوا کہ دماغ میں اَمونیا کی پیداوار کا انحصار زیادہ تر جنبش پر ہے، چنانچہ بعض مرگی سے مرنے والوں کے دماغ کا آپریشن کیا گیا تو ان میں اَمونیا بہت زیادہ پایا گیا۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ جب دماغ کے خلایا پر خیالات کا اثر ہوتا ہے تو کسی کیمیاوی تغیر کی بنا پر اَمونیا پیدا ہونے لگتا ہے۔

دنیا کے تمام موٹروں میں سب سے زیادہ مکمل موٹر قلب ہے۔ جب تک انسان زندہ ہے یہ مشین کسی وقت بند نہیں ہوتی۔ ستر سال کی عمر میں اس کے ضربات کی تعداد تقریباً تین ارب ہوتی ہے۔ اس کی حرکت میں سکڑاؤ اور پھیلاؤ ہوتا ہے ہر سکڑاؤ کے لئے اُسے ۰.۰۵ سکنڈ درکار ہوتا ہے اور ہر پھیلاؤ کے لئے $\frac{1}{10}$ سکنڈ لیکن ان دونوں حرکتوں کے درمیان $\frac{2}{5}$ سکنڈ کا وقفۂ سکون بھی ہوتا ہے۔

قلب کا وزن اوسطاً دس اونس (۲۵ تولہ) ہوتا ہے اور روزانہ اتنی قوت صرف کرتا ہے کہ اس سے ۴۰ ہزار پونڈ کا وزن ایک گز اونچا اُٹھایا جا سکتا ہے۔ ہر ۲۴ گھنٹے میں وہ ۲۰ ہزار پائنٹ (تقریباً ۲٫۵ من) خون پھینکتا ہے اور جس قوت سے وہ یہ کام لیتا ہے یہ اس کی اصلی قوت کی صرف ۵ فی صدی ہے۔

انسانی قلب کے ضربات کی تعداد کا انحصار قلب کی جسامت اور عمر دونوں پر ہے، لیکن جانوروں میں صرف جانور کی جسامت پر، یعنی جانور جتنا چھوٹا ہوگا اتنے ہی زیادہ ضربات قلب ہوں گے۔ چڑے کا دل ایک منٹ میں ۸۰۰ بار دھڑکتا ہے چوہے کا ۷۰۰ بار، خرگوش کا ۱۵۰ بار اور گھوڑے کا صرف ۴۰ بار۔ انسانوں میں بچہ کے دل کی حرکت پیدائش کے وقت ۱۳۵، پہلے سال ۱۱۱، چھٹے سال ۹۶، سولھویں سال ۸۰ اور ۵۰ سال کے بعد ۶۰ ہے۔

نپولین کا دل ایک منٹ میں صرف ۶۰ مرتبہ حرکت کرتا تھا اور ایک شخص جسٹی نس کرنر (Justinus Kerner) ایسا ہوا ہے جو قلب کی حرکت کو جب چاہتا کم و بیش کر سکتا تھا۔

شریان اور عروق (Arteries + Veins) انسانی جسم میں اس قدر کثرت سے پائے جاتے ہیں کہ اگر ان کو جوڑ کر پھیلایا جائے تو ان کی لمبائی ۳۵۰۰۰۰ میل ہو، یعنی ان کو سارے کرۂ ارض کے گرد چودہ مرتبہ لپیٹا جا سکتا ہے۔

انسان کا مادۂ حیات (مادۂ منویہ) ۲۵ اجزاء سے مل کر بنا ہے، جس سے اربوں صورتیں اختلاط اجزاء کی پیدا ہو سکتی ہیں، جسم انسانی کے نظام میں ۸ ارب خلایا (Cells) پائے جاتے ہیں جو صرف ایک خلیہ (Cell) سے نشو و نما پاتے ہیں۔

خون کی گردش کا نظریہ سب سے پہلے ایک انگریزی طبیب ولیم ہاروی (W. Harvey) نے سنہ ۱۶۱۶ء کے قریب دریافت کیا تھا، لیکن وہ یہ نہ معلوم کر سکا تھا کہ خون شریانوں سے عروق میں کیونکر پہونچتا ہے۔ اس کے بعد مارسلو مالپگھی (Marcello Malpighi) نے خوردبین کی مدد سے معلوم کیا کہ شرائین اور عروق کا تعلق نہایت چھوٹے چھوٹے اوعیۂ دم یا ظروف خون (Blood Vessels) سے ہے۔ اسی نے یہ بھی معلوم کیا کہ خون میں سرخ و سفید دو قسم کے ذرات (Corpuscles) پائے جاتے ہیں۔

خون کی مقدار جسم انسانی میں کُل وزن کی ۵ فی صدی ہے۔ جس کے سُرخ ذرات کی تعداد ۲ کروڑ اور سفید ذرات کی تعداد ۵ کروڑ ہے۔

انسان پانچ حواس رکھتا ہے۔ دیکھنے کی حس، سننے کی حس، سونگھنے کی حس، چکھنے کی حس اور چھونے کی حس۔
کان کی اندرونی جھلی یا پردے میں تیرہ ہزار خلایا پائے جاتے ہیں جو فی سکنڈ ۳۲ ہزار تموجات یا اہتزازات آواز (Vibrations) کو محسوس کر سکتے ہیں۔ حالانکہ موسیقی میں فی سکنڈ ۲۵ ہزار اہتزازات سے زیادہ نہیں پائے جا سکے۔

کان کے پردے کے پاس ایک طبل (Drum) ہوتا ہے جو تموجات آواز کو قبول کر کے سننے کی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ اگر یہ بیکار ہو جائے تو انسان کچھ نہیں سن سکتا۔

حال ہی میں بلجیم کے ایک ڈاکٹر نے مصنوعی طبل (Drum) ایسا بنایا ہے جس کی مدد سے بہرے اچھی طرح سن سکتے ہیں اور اگر اس کو کان سے علحدہ کر دیا جائے تو پھر کوئی آواز نہیں آتی۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ زبان کے اوپر بہت چھوٹے چھوٹے دانے اُبھرے ہوئے سے نظر آتے ہیں۔ لیکن شاید یہ معلوم ہوگا

کان میں سے ہر دانہ ۵۰۰ ریشے چکھنے والے اعصاب کے اپنے اندر رکھتا ہے۔ ذایقہ کی حس اتنی نازک ہے کہ پیکنگ کے مدرسۂ چاء (Tea Schools) کے بعض ماہر چالیس قسم کی چاء کا مزہ آنکھ بند کرکے الگ الگ معلوم کرلیتے ہیں۔

چھونے کی حس ۵ لاکھ ذرات سے متعلق ہے جو انسانی جلد میں پھیلے ہوئے ہیں۔ کہیں کم اور کہیں زیادہ۔

صحیح بینائی رکھنے والے انسان سو میں مشکل سے چھ نکلتے ہیں۔ دیکھنے کی قوت آنکھ میں ہے لیکن فرق و امتیاز کا کام دماغ کا ہے۔ انسانی بینائی شہد کی مکھی کی بینائی سے سو گنا اور معمولی مکھی کی بینائی سے ہزار گنا زیادہ قوی ہے۔ ہم دو سو میل فی گھنٹہ رفتار سے چلنے والی چیز کو بھی سو گز کے فاصلہ سے دیکھ سکتے ہیں۔ آپ نے ایک خاص لفظ "ژرف نگاہی" سنا ہوگا اس کا تعلق بصیرت سے بھی ہے اور بصارت سے بھی آپ نے دیکھا ہوگا بعض لوگ نہایت مختصر سی جگہ میں بڑی بڑی عبارتیں لکھ لیتے ہیں۔ سسرو نے لکھا ہے کہ ایک شخص نے پوری ایلیڈ (Iliad) چھال کے اتنے ٹکڑے پر لکھی جو اخروٹ کے اندر آسکتا تھا۔ یونان کے ایک صناع نے چار گھوڑوں والی رتھ ہاتھی دانت کی اتنی چھوٹی بنائی تھی کہ ایک مکھی اس کو ڈھک سکتی تھی۔ اسی طرح کی اور بہت سی مثالیں ژرف نگاہی کی ملتی ہیں۔

بعض لوگوں میں سننے کی قوت بھی اتنی ہی زبردست ہوتی ہے۔ چنانچہ ۱۸۳۵ء کے فوجی ریویو کے وقت پالرمو میں ایک ایسا سپاہی ملا جو صرف کانا پھوسی کو ۸۰ گز کے فاصلہ سے سن سکتا تھا۔

بعض آدمی ایسے بھی دیکھنے میں آئے ہیں جو آواز سنکر رنگ کا پتہ چلا لیتے ہیں اور یہ اہلیت بہ نسبت مردوں کے عورتوں میں زیادہ پائی جاتی ہے۔ اسی طرح بعض آدمیوں میں اعداد و شمار یاد رکھنے کی اہلیت زیادہ ہوتی ہے۔ ان کے کان میں جب کسی عدد کی آواز پڑتی ہے تو وہ ان کے دماغ میں ایک خاص شکل اختیار کر لیتا ہے، چنانچہ بعض لڑکے ریاضی کے بڑے بڑے سوال زبانی حل کر لیتے ہیں اور یہ اسی قوت کا کرشمہ ہے۔

رنگوں کے انتخاب میں بھی یہی احساس کام کرتا ہے۔ بعض لوگوں کو بعض رنگ مرغوب ہوتے ہیں اور بعض سے نفرت ہوتی ہے، اسی طرح رنگوں کی شناخت میں بھی بعض کی حس تیز ہوتی ہے، بعض کی کند۔

سونگھنے کی حس مردوں میں زیادہ قوی ہوتی ہے، اور تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ اگر کئی خوشبوئیں ملا دی جائیں تو مرد زیادہ صحت کے ساتھ ان کا تجزیہ کر سکتے ہیں۔

بغیر مادۂ ہارمون (Harmone) کے صحت انسانی میں توازن قائم نہیں رہ سکتا۔ ہارمون، ایک رقیق مادہ ہے جو غدود سے پیدا ہوتا ہے اور اس کی کمی بیشی سے انسان کے جسم و دماغ دونوں متاثر ہوتے ہیں۔

غدود دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو ٹیوب یا نالی رکھتے ہیں۔ ان کا کام پسینہ یا لعاب خارج کرنا ہے۔ دوسری قسم بغیر نالی کے غدود ہیں، ان کا مادہ تیل کی قسم کا ہوتا ہے جیسے آیوڈین (Iodine) کہتے ہیں اور براہ راست خون میں ملتا ہے

یہ مادہ صحت انسانی کے لئے سخت ضروری ہے۔ چنانچہ اگر آپ غدود درقیہ (Thyroid gland) کو جو گلے میں پائے جاتے ہیں، نکال دیں تو انسان بہت جلد ضعیف ہو کر فنا ہو جائے۔

انسان کے جسم میں آیوڈین کی مقدار سو میں کروڑواں حصہ بھی نہیں ہے، لیکن اگر اس میں ذرا بھی کمی ہو جائے تو صحت کی بربادی یقینی ہے۔ قدوں کے نشوونما میں بھی غدود ہی کام کرتے ہیں۔ چنانچہ بونوں میں یہ غدود بہت ضعیف ہوتے ہیں اور بہت لمبے آدمیوں میں ضرورت سے زیادہ قوی۔

بالوں کے نشوونما میں بھی غدود ہی کا حصہ ہے بعض عورتوں کے جسم میں بال بکثرت پیدا ہونے لگتے ہیں، لیکن اگر بعض مخصوص غدود کو نکال دیا جائے تو بال گر جائیں۔

عورتوں اور مردوں کی ساخت میں نمایاں فرق پایا جاتا ہے۔ تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ مردوں میں اعصاب اور چربی کی نسبت ۴۲ اور ۱۸ کی ہے لیکن عورتوں میں ۳۶ اور ۲۸ کی، اسی لئے عورتوں میں موٹے ہونے کی زیادہ صلاحیت پائی جاتی ہے۔ مرد ۴۰ سال میں اپنے انتہائی وزن تک پہونچ جاتا ہے اور عورت ۵۰ سال میں۔

عورتیں جب بیٹھی ہوں تو مردوں کی بہ نسبت زیادہ لمبی نظر آتی ہیں، لیکن کھڑے ہونے میں مرد زیادہ لمبا معلوم ہوتا ہے اس کا سبب یہ ہے کہ نسبتاً عورت کا درمیانی دھڑ مرد سے زیادہ لمبا ہوتا ہے، مرد کے ہاتھ پاؤں بھی زیادہ لمبے ہوتے ہیں اور جبڑا بھی زیادہ بڑا ہوتا ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ مرد، عہدِ وحشت سے زیادہ قریب ہے اور عورت زیادہ ارتقائی صورت رکھتی ہے۔

قدیم کہاوت ہے کہ انسان کا دھڑ انڈے کی طرح ہے، یعنی ایک سرا پتلا دوسرا چوڑا ہوتا ہے۔ لیکن مرد کے دھڑ میں چوڑا سرا اوپر ہوتا ہے اور عورت میں نیچے کی طرف۔ کیونکہ عورت کے شانے بہ نسبت کولوں کے کم بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔

عورتوں کی عقل داڑھ مردوں سے جلد نکل آتی ہے۔ عورتوں میں یہ دانت بائیسویں سال نکل آتا ہے اور مردوں میں تئیسویں سال کے بعد عورتوں کے دانت بہ نسبت مرد کے جلد خراب ہوتے ہیں کیونکہ عورتوں میں مادہ کیلشیم (Calcium) کا صرف زیادہ ہے اور ہڈیوں کی نشوونما کا تعلق اسی مادہ سے ہے۔ عورتوں میں اوپر کے دو دانت نسبتاً زیادہ بڑے معلوم ہوتے ہیں، کیونکہ اُن کا جبڑا یا دہانہ مردوں کی بہ نسبت زیادہ چھوٹا یا تنگ ہوتا ہے

عورت مرد کی قوتِ احساس میں بھی کافی فرق پایا جاتا ہے۔ عورت کے داہنے ہاتھ کا احساس مرد سے دو چند ہے

لیکن مرد کے بائیں ہاتھ کا احساس زیادہ ہوتا ہے۔

تکلیف کی برداشت بھی دونوں میں مختلف ہے۔ پانچ سے پندرہ سال کی عمر تک قطع اعضا کی تکلیف بچے زیادہ آسانی سے برداشت کر لیتے ہیں اور عورتیں عموماً زیادہ۔ چنانچہ تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ قطع اعضا کے ۴۴۱۲ واقعات میں ۱۱۴۱ مرد جانبر نہ ہو سکے اور ۲۸۴ واقعات میں عورتیں صرف ۸۳ ہلاک ہوئیں۔ یعنی مردوں میں ۳۵ فی صدی ہلاکت واقع ہوئی اور عورتوں میں ۲۹ فی صدی۔

عمر کا تعلق زیادہ تر پیشہ اور مشغلۂ زندگی سے ہے۔ ان کارخانوں کے کام کرنے والے جہاں زہریلی چیزوں سے زیادہ کام لیا جاتا ہے، کم زندہ رہتے ہیں اور کاشتکاروں، معلموں، اور پادریوں کی عمر زیادہ ہوتی ہے، معمولی صناعوں کی عمر کا اوسط ۴۴ سال ہے اور درزیوں اور صرافوں کی عمر کا ۴۴ سال۔ گلیوں میں پھیری لگانے والے ۴۰ سال تک زندہ رہتے ہیں کلرکوں کی عمر کا اوسط ۴۴ سال اور ججوں کی عمر کا ۶۵ سال دریافت ہوا ہے۔ ایکٹر اور نجومی سب سے زیادہ عمر پاتے ہیں۔ عورتوں کی عمر اوسطاً مرد سے زیادہ ہوتی ہے۔

ایک ہی دن پیدا ہونے والے مردوں اور عورتوں کی حیات و ممات کی جانچ سے معلوم ہوا ہے کہ ایک لاکھ مردوں میں آدھے سے زیادہ ۶۶ سال کی عمر میں ختم ہو جاتے ہیں اور عورتیں ۶۸ سال تک زندہ رہتی ہیں۔ مردوں کی تہائی آبادی ۷۲ سال کی عمر تک پہونچتی ہے اور عورتوں کی تہائی آبادی ۷۵ سال تک۔

مرد کی زندگی کا بہترین زمانہ ۳۰ اور ۵۵ سال کے درمیان کا ہے اور عورتوں میں ۲۵ اور ۴۰ سال کے بیچ کا۔

بخار زیادہ تر ۱۵ سے ۲۰ سال تک کی عمر میں ستاتا ہے۔

چند قابل مطالعہ کتابیں

مضامین رشید: پروفیسر رشید احمد صدیقی کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے، یہ مضامین کیا ہیں دریائے لطافت سے سینچی ہوئی کشت زعفران، تر و تازہ شاداب اور فرحت بخش کتاب کی ظاہری خوشنمائی میں بھی خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ قیمت مجلد ۴؍

میدانِ عمل: ملک کے مشہور و معروف ادیب منشی پریم چند کا بے نظیر ناول جو انکے تمام پچھلے کارناموں پر بھاری ہے۔ قیمت مجلد ۴؍

بیوہ: منشی پریم چند آنجہانی نے ایک بیوہ کے حالات دردناک پیرایہ میں لکھے ہیں۔ ضمناً یہ بھی بتایا ہے کہ ایک بیوہ کو کیسی زندگی بسر کرنا چاہئے۔ قیمت مجلد عہ

منیجر نگار لکھنؤ

دو مزدور فلسفی

بنک کی نوکری اور پھر سال تمام کا حساب کتاب، کھوکھلے ہندسوں کا جوڑ باقی کوئی دلچسپ مشغلہ تو ہے نہیں۔ گھوش بابو بنک میں اکاؤنٹنٹ تھے۔ کروڑوں اربوں روپئے، روپئے کی صورت دیکھے بنا لے دے چکے اور پائی پائی کی بدھ بٹھا چکے تو اطمینان کی سانس لی۔ بنک سے اُٹھے تو اپالو بندر کی طرف ہوا خوری کو نکل گئے جو دفتر سے کچھ ایسا دور نہ تھا۔

سمندر کے کنارے پہونچکر دریائی ہوائیں دماغ کو لگیں تو کچھ فرحت ہوئی اور وہ سمندر کی لہریں کھاتی ہوئی نیلی چادر پر سنہری کرنوں کے پڑنے سے جو آنکھ مچولی کھیلی جا رہی تھی اس کے نظارے میں کھو گئے۔ ہلکی ہلکی موجوں پر گھڑی میں چمک آجانا اور گھڑی میں سایہ پڑنا، ایک جگہ روشنی دوسری جگہ پرچھائیں، اتنا دلکش نظارہ تھا کہ ایک دفعہ تو بے حس آدمی بھی اُسمیں کھو جاسکتا تھا۔

تفریح کرنے والوں کی بھیڑ تھی۔ گھوش بابو بھی اس ہجوم میں مل گئے تھے۔ ایک چوبیس پچیس سال کا سانولا جوان بڑھا اور گھوش سے کہنے لگا:۔

"بوٹ پالش سیٹھ؟"

"نہیں!"

وہ "بوٹ پالش" گھوش کا انکار سن کر بے پروایانہ انداز میں مسکراتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ مگر اُس کی مسکراہٹ کچھ ایسی تھی کہ گھوش کے دل میں گرہ بن گئی۔ گھوش نے محسوس کیا کہ اُس کے لمبوترے اور شانت چہرے پر مسکراہٹ کا کھیل اصل میں ایک طوفان کی نشانی ہے، اُس کے سگھڑ ناک نقشے پر یہ مسکراہٹ گہرے رنج کا پتا دے رہی ہے! یہ محسوس کرکے گھوش بابو اُس طرف کو بڑھے جدھر وہ "بوٹ پالش" گیا تھا وہ ایک جگہ بیٹھا ہوا کسی کے جوتے پر پالش کر رہا تھا۔

اس دفعہ گھوش نے اُسے جائزہ لینے والی نظر سے دیکھا۔ اُس کے کپڑے میلے تھے مگر چہرے مہرے سے شرافت اور تہذیب ٹپک رہی تھی۔ سر کے بال گھنے اور چمکیلے تھے۔ ناک ذرا بڑی اور نتھنے پھیلے ہوئے تھے۔ گھنے ابروؤں کے نیچے سیاہ پتلیاں دُکھ بھری نگاہوں کا گھر معلوم ہوتی تھیں — چپ منگتا کتے کی نگاہوں کی طرح رحم طلب کرتی ہوئی نگاہیں! ایسی نگاہیں جو نرمی سے واقف نہ ہوں، جو انسان سے امید اور آس کرنا چھوڑ چکی ہوں! ایک ایسے شخص کی نگاہیں جس نے

جیون کا بھید پالیا ہو، جسے کوئی مغالطہ نہ رہ گیا ہو، جو زندگی کے ساتھ جنگ کر رہا ہو!

اُس کے سنجیدہ انداز اور گمبھیر سبھاؤ نے گھوش پر جادو سا کر دیا۔ گھوش نے چپکے سے اپنے جوتے اُس کے سامنے آگے کر دیئے اور وہ گردن جھکائے پالش کرنے لگا۔ پھر گھوش نے باتیں شروع کر دیں۔ اُس کا گھر اور وطن پوچھا:۔

"کیا کیجئے گا پوچھ کر؟ میں دکھ نگر کا رہنے والا ہوں ــــ ظلم اور مصیبت کے دیس کا!"

"تم ہو کون؟"

"ایک بوٹ پالش!"

وہ پالش کر چکا تھا۔ اُس نے اپنے تھیلے میں برش وغیرہ رکھا تو گھوش نے اس میں چند کتابیں بھی دیکھیں۔

"یہ کیا کتابیں ہیں؟"

"یونہی ہیں!"

"ذرا دکھاؤ تو سہی!"

اُس نے بیدلی کے ساتھ کتابیں نکال گھوش کے ہاتھ میں دیدیں۔ وہ سب انگریزی اور ٹھوس علمی کتابیں تھیں گھوش نے کہا "جبھی تو! میں حیران تھا، تم 'معمولی بوٹ پالش' معلوم ہی نہ ہوتے تھے!"

"غیر معمولی بھی نہیں ہوں!"

"تم پڑھے لکھے ہو ــــ انگریزی داں ہو!"

"آج کل انگریزی جاننا کیا کوئی غیر معمولی بات ہے کہ جب روٹی کھانے کا ذریعہ یہی سمجھا جاتا ہے!

اس "بوٹ پالش" کے جواب مختصر تھے اور ذہین۔ گھوش کی دلچسپی اور بڑھ گئی اور اُس نے کہا:۔

"اگر برائی نہ سمجھو تو آؤ میرے ساتھ چل کر چائے پیو؟"

وہ راضی ہو گیا۔ پاس کے ایک ریسٹوران میں پہونچکر گھوش بابو نے چائے منگائی۔ چائے پیتے میں گھوش نے اس سے نام پوچھا تو اُس نے بتایا:۔

"رائے!"

"میں سمجھ رہا تھا کہ تم بنگالی ہو، اگرچہ تم نے ڈھنگ ایسا بنا لیا ہے کہ مشکل سے پہچان ہوتی ہے۔ میں بھی بنگالی ہوں!"

"کوئی آدمی کہاں پیدا ہوتا ہے، کس کے گھر پیدا ہوتا ہے، یہ ایک بالکل 'اتفاقی' بات ہے!"

"رائے بابو، تمہاری تعلیم کہاں تک ہے؟"

"میں بابو وابو تو ہوں نہیں، خالی ایک بوٹ پالش ہوں، اور میری تعلیم مصیبت کے اسکول میں ہوئی۔ میں نے ظلم اور سختی کی یونیورسٹی سے ڈگری لی ہے!"

"خیر! اگر تم نے اپنی تعلیم کے مطابق کوئی پیشہ چنا ہوتا ــ یہ تو نہایت ذلیل کام ہے!"

"ضرورت! بوٹ پالش، بہر حال ایک پیشہ ہے! پیشہ اصل میں ہات پاؤں کی محنت کا نام ہے۔ اور ہمیں جو تعلیم دیجاتی وہ بس یہی نہیں سکھاتی۔ مگر آدمی کے لئے یہی کافی نہیں کہ وہ کوئی پیشہ اختیار کرے بلکہ اُس نفرت کو کچلنا بھی ضروری ہے جو کسی خاص پیشے کے ساتھ اُس کے دل میں پیدا ہو گئی ہو۔ میں تو یہاں تک کہوں گا انسان کو ضرورت ہو تب بھی محنت کرنے کی عزت حاصل کرنا چاہئے، اور ایک شخص جتنا گرا ہوا پیشہ اختیار کرے گا اتنا ہی اونچا انسان ہو جائے گا!"

"لیکن آدمی شریف پیشہ ہی کیوں نہ ڈھونڈے؟"

"میں نے بہت دھکے کھائے ــ یہ ذلیل پیشہ فاقے سے بچائے رکھتا ہے!"

اندھیرا ہو چلا تھا اور ریسٹوران میں آنے والوں کی تعداد بڑھ رہی تھی۔ اس سے وہ "بوٹ پالش" کچھ بے آرامی سی محسوس کرتا معلوم ہوا۔ وہ کھڑا ہو گیا۔ اُس کی شخصیت اور اُس کے فلسفۂ زندگی نے گھوش کو اُلجھا سا لیا تھا۔ گھوش نے اُس کے گھر تک ساتھ چلنے کی خواہش ظاہر کی۔ وہ "بوٹ پالش" پھر مسکرا دیا۔ گھوش نے ایک جاتی ہوئی ٹیکسی کو روک لیا اور اُس کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ ٹیکسی میں داخل ہوتے کچھ گھبرا رہا تھا۔ جب یہ دونوں بیٹھ لئے تو ٹیکسی تیزی کے ساتھ دادر کی طرف چل دی، جہاں اُس کا مکان تھا۔ ٹیکسی میں دونوں چپ بیٹھے رہے۔

"بوٹ پالش" نے ہند ماتا سینما کے پاس ٹیکسی رکوائی۔ دونوں اُترے اور گھوش بابو ٹیکسی کا کرایہ دیکچکے تو ایک گلی میں داخل ہو گئے۔ داہنے ہات کے چوتھے مکان کی دوسری منزل پر پہونچ کر "بوٹ پالش" نے ایک کمرے کا تالا کھولا۔ کمرہ کیا کوٹھری تھی جس کے اندر ایک چارپائی اور دو کرسیاں پڑی تھیں، کھڑکی میں چند کتابیں رکھی تھیں اور دیواروں پر چند تصویریں ٹنگی تھیں۔ ایک تصویر میں وہ تنہا تھا، دوسری میں بیوی کے ساتھ، تیسری مہاتما بودھ کی دھیان اور استغرق کی حالت کی تصویر تھی اور چوتھی تصویر میں سولی پر چڑھے ہوئے یسوع مسیح کے سامنے ایک ننگی بدن عورت جھکی ہوئی تھی جس کا تماشا بہت سے راہب اور راہبائیں دیکھ رہی تھیں۔

کوٹھری میں پہونچ کر گھوش کو محسوس ہوا کہ یہ شخص بمبئی کے ہجوم میں، زندگی کی اس بھیڑ میں بھی تنہائی اور ایکانت سے کتنی محبت کرتا ہے! گویا اُس نے دنیا کی ہر چیز کو دیکھا پرکھا اور کھوٹا پایا ہے۔

اُس کے کہنے سے گھوش بابو ایک کرسی پر بیٹھ گئے تو وہ کہنے لگا:۔

"میری بیوی وفادار نہیں، ماں باپ نے چھوڑ دیا، اور دوستوں نے بھی کنارہ کر لیا، مگر مجھ پر ان باتوں کا کوئی اثر نہیں، مجھے کوئی ملال نہیں!"

اُس کے ان چند لفظوں میں اُس کی زندگی کا فلسفہ بھی تھا اور زندگانی کا طریقہ بھی! گھوش نے اُس سے سوال کیا۔

"اور تم اس حالت سے خوش اور مگن ہو؟"

"انسان کی خوشی بس ایک علمی مسئلہ ہے جس کا جواب فلسفی اور گیانی ہی دیکھتا ہے، مجھے تو کسی کا یہ قول پسند ہے کہ خوشی آئی سس[1] دیوی کے نقاب کی طرح ایک چیز ہے جسے فانی انسان (اُٹھانے کے لئے) ہات بھی نہیں لگا سکتا۔

گھوش نے اپنی جگہ فیصلہ کیا کہ یہ مزدور فلسفی اپنی حالت سے تو مطمئن نہیں لیکن زندگی کی حرکت اور اُس کی حیرت آفرینی سے مطمئن ہے۔ ہمیشہ رنگ بدلتی ہوئی بہے جانے والی زندگی اس کے دل میں ولولے پیدا کر رہی ہے۔ راستوں پر خلقت کا گزرنا، ساحل پر موجوں کا مچلنا، ٹرام کی رفتار، برقی ریل کی تیز روی، فضا میں پرندوں کی اڑان اور آسمان پر بادلوں کی دوڑ، وہ ان تمام حرکتوں کو خود بے تعلق ہو کر انسان کی زندگی کے ساتھ نسبت دیتا اور اس سے لطف اُٹھاتا ہو وہ اپنے اس مشغلے میں نغموں کا ترنم اور روانی سنتا ہے" لیکن ساتھ ہی آہوں کی حرکت کا بھی رازدار ہے اور شہری زندگی کے تاریک پہلوؤں سے واقف ہے۔ بدنصیب مردوں اور عورتوں سے بھائی چارہ رکھتا ہے۔ اس احساس کے بعد گھوش نے اس سے پھر سوال کیا:۔

"تم خدا کو مانتے ہو؟"

"نہیں! یہی سبب ہے کہ بمبئی میں ہوں۔ ورنہ کسی گاؤں میں کھیتی باڑی کرتا اور بھگوان کو یاد کرتا ہوتا! منکر کو دیہات کی رہائش نہیں بھاتی۔ اُسے خوش باشی اور لطف و لذت، سندر عورتیں اور کتابیں، شہر ہی میں مل سکتی ہیں۔ ایک ناستک ان چیزوں کے بغیر جی نہیں سکتا! اور یہ بھی یہی کہ زندگی کے معرکے سے گریز کا نام بھگوان ہے — جس آدمی کے اندر کشاکش بہت ہوتی ہے وہی خدا کے نام میں پناہ لیتا ہے!"

"لیکن ہر آدمی کی زندگی کا ایک فلسفہ ہوتا اور وہ اس کے مطابق زندگی جیتا ہے!"

"یہ ٹھیک ہے"

یہ کہکر اُس نے ایک کتاب اُٹھالی یہ (Whitman) کی نثر کا مجموعہ تھا۔ دیباچے میں سے پڑھنے لگا:۔

"میں سورج سے، زمین سے اور جانوروں سے محبت کرتا ہوں۔ اپنی آمدنی اور محنت کو دوسروں کے لئے وقف رکھتا ہوں۔ ظلم کرنے والوں سے نفرت کرتا ہوں۔ احمقوں اور سنگیوں کا طرفدار ہوں۔ لوگوں کے ساتھ رواداری برتتا ہوں ..... کسی انسان کے سامنے نہ جھکو۔ قوی نوجوانوں اور جاہلوں سے آزادی سے ملو۔ اسکول میں جو کچھ سیکھا، مذہب نے جو کچھ سکھایا اور کتابوں میں جو کچھ پڑھا، اُس سب کو جانچو اور اُس حصے کو خارج کر دو جو تمہاری روح کی توہین کرتا ہو!"

رات ہونے لگی تھی۔ گھوش نے اُس سے رخصت حاصل کی۔ وہ دروازے تک پہونچانے آیا اور کہنے لگا:۔

---

[1] مصریان قدیم تثلیث کا عقیدہ رکھتے تھے آئسس اور Osiris کا لڑکا Horu تھا۔ آئی سس کی مورتی پر ایک نقاب پڑا رہتا تھا جسے کوئی انسان اُٹھا نہ سکا تھا۔

"میں خوشی اور عیش کی دنیا کے لئے ایک پہیلی اور دکھ درد کی دنیا کی زبان ہوں ۔۔۔ میرے لئے تمہارا دل دکھانا بیکار ہے۔"

گھوش بابو اُس کو اِس عقیدے اور خیال میں مبتلا چھوڑ کر رخصت ہوئے کہ وہ زندگی کو سمجھ چکا اور زندگی جی رہا ہے۔ وہ اُن کے لئے دل دکھاتا ہے جو زندگی کو بے رحم یا ایک فریب سمجھتے ہیں! وہ زندگی کے سارے جذبوں اور اس کی ساری لذتوں کا تجربہ کر چکا ہے! اور اس کے خیال میں زندگی کے کسی پہلو یا منظر پر حیرت رکھنا حماقت ہے! لیکن گھوش کا اپنا خیال بہرحال یہ تھا کہ مسٹر رائے یعنی اس "بوٹ پالش" کا عقیدۂ زندگی یا طریقۂ زندگانی دوسروں کے لئے نمونہ نہیں ہو سکتا۔ اگر ساری دنیا وہی سمجھے اور ویسی ہی زندگی جینے لگے تو دنیا کا کیا حال ہو؟ مگر اس کے باوجود گھوش کو اتنا تسلیم تھا کہ وہ اپنے عقیدۂ زندگی اور طریقۂ زندگانی میں پُرانے خیالات والی دنیا کے لئے ایک چیلنج ہے ۔۔۔ ایک ایسا دھکا یا صدمہ ہے جو ناگوار نہیں ہو سکتا!

(۲)

شاید گھوشس بابو کا یہی آخری خیال اس بات کا ضامن تھا وہ پھر ایک دن شام کے وقت اُس کے گھر پہنچ گئے کھٹ کھٹایا تو "بوٹ پالش" نے دروازہ کھولا۔ سلام اور مزاج پرسی ہوئی۔ گھوش نے دیکھا کہ کوٹھری کے بیچ میں ایک دُبلا، بدہیئت اور لامبے قد کا آدمی خاکی کوٹ اور پیجامہ پہنے کھڑا ہے جس کے سر پر ایک میلی سی بے پھندنے اور بے قالب کی ترکی ٹوپی ہے۔ لیکن اُس کے چہرے پر بے گنتی لکیروں کے آڑے ترچھے نشانوں میں بھی ایک کشش اور حُسن ہے! اس کی آنکھوں میں کوئی خصوصیت نہیں۔ لیکن ان کے اندر سے نکلنے والی نگاہیں ایسی ہیں کہ جس پر پڑیں گہری اتر جائیں اور اس کی چھدری موچھیں اگر نہ ہوتیں تو بدصورتی نامکمل رہتی۔

"بوٹ پالش" نے گھوش بابو سے اس کی پہچان کرانے کو کہا:۔

"یہ میرے متر مسٹر فقیر احمد ہیں۔ چھے یوروپین زبانیں بول سکتے ہیں۔ آج کل وکٹوریا چلاتے ہیں۔"

فقیر احمد نے کرسی سرکا دی اور گھوش بابو اس پر بیٹھ گئے۔

"تم نے سیٹھ کی پہچان تو کرائی نہیں!" اس کی آواز گہری اور روکھی تھی۔

گھوش نے خود ہی اُسے اپنا نام اور کام بتایا اور یہ بھی کہ "بوٹ پالش" سے ان کی ملاقات کس طرح ہوئی۔ "بوٹ پالش" گھوش سے اجازت لے کر نل کے نیچے نہانے چلا گیا اور گھوش نے اس "وکٹوریا والے" کی زندگی کا فلسفہ معلوم کرنا چاہا۔ پہلے جیب سے سگرٹ کیس نکال کر اس کی طرف بڑھایا، اُس نے انکار کیا تو گھوش نے کہا:۔

"پیتے ہی نہیں؟"

"نہیں سیٹھ!"

"مگر مسٹر فقیر احمد آپ سا آدمی وکٹوریا ہانکتا ہے! کوئی بہتر پیشہ نہ مل سکتا تھا؟"

"سیٹھ، مسلمانوں کے پیغمبر نے جن کو ساری دنیا کم سے کم ایک بڑا آدمی ضرور مانتی ہے، پیشہ کرنے والوں کو اللہ کا دوست یا پیارا بتایا ہے۔ یہ دنیا چاہے تو مجھے پاگل سمجھ لے۔"

"ایک آدمی اعلےٰ تعلیم پاکر بھی جاہلوں کی سی زندگی گزارے تو تعلیم کا فایدہ ہی کیا ہوا؟"

"پر سیٹھ تعلیم کا مقصد یہ کب ہے کہ اُس کے ذریعے سے زیادہ روپیہ کمایا جائے؟ تعلیم کا فایدہ تو یہ ہے کہ وہ انسان کو انسان بنادے! آدمی اپنی اصل کی حیوانیت اور گھمنڈ کو تمام انسانوں کی مجموعی اغراض کا ماتحت بنا کر ان کو اونچا اور باعزت بنائے!"

پھر گھوشس نے گاندھی جی کے بارے میں اس کی رائے پوچھی تو اُس نے کہا:۔

"گاندھی جی کی بڑائی ماننے سے اختلاف کرنے والے بہت ہوں گے، لیکن ہوس پروری اور ریاکاری کے اس زمانہ میں بھی سچائی کا پیغام لانے والا آسکتا ہے، یہ بات گاندھی جی کے دم سے ثابت ہے!"

"تو تم کھدر کیوں نہیں پہنتے؟"

"سیٹھ، سب کے سب کھدر پہننے لگیں تو اتنا آئیگا کہاں سے؟ اور ان ملوں کا کیا حشر ہوگا؟ بند کر دینا پڑیں گے۔ لاکھوں آدمی بیکار پھرنے لگیں گے اور کروروں روپئے کی مشینیں ردی لوہا ہو کر رہ جائیں گی۔ مشین کے زمانے میں ہات سے چرخہ چلانا گاندھی جی کے لئے تو ٹھیک ہے، میرے تمہارے لئے نہیں۔

"پر تم اُنھیں بڑا درجہ دیتے ہو؟"

"ہاں سیٹھ، مگر آدمی ہی سمجھ کر، ہر آدمی میں تھوڑی بہت سنک ہوتی ہے، ان کی یہی سنک ہے کہ وہ دنیا کو تین ہزار برس پیچھے سرکا دیں۔ آجتک دنیا میں دنیا کو آگے بڑھانے والے تو ہوے، پیچھے لیجانے والے گاندھی جی پہلے آدمی ہیں۔ ان کی اس دُھن کو ان کے لئے ہی چھوڑ دینا چاہئے۔ وہ اور جو کچھ کہتے ہیں، سچ اور اہنسا کا جو سبق دیتے ہیں اُسے ماننا چاہئے!"

"اچھا یہ تو بتاؤ کہ تم خدا کو مانتے ہو؟"

"میں ان لوگوں میں سے تو بے شک نہیں ہوں جو یہ مانتے ہیں کہ خدا عرش و کرسی پر بیٹھا ہوا چوبیس گھنٹے تقدیریں لکھتا کاٹتا اور پھر لکھتا رہتا ہے ——"

"تو کیا خدا قادرِ مطلق نہیں ہے؟"

"تو سیٹھ خدا ایسا بھی نہیں کہ میں نے دعا مانگی تو کسی سے مجھے روپیہ دلا دیا اور اُس نے مانگی تو کسی اور سے اُسے دلا دیا! قادرِ مطلق کے تو یہی معنے سمجھے جاتے ہیں۔ روپیہ سب مانگتے ہیں اور خدا کی ٹکسال الگ ثابت نہیں ہے۔ اب اگر وہ اسی سے خدا بنا ہے تو یہ کام خدا کا نہیں ہو سکتا۔ میرے نزدیک تو جو میں نہیں وہ خدا ہے!"

"اچھا تمہیں کسی عورت سے کبھی محبت ہوئی؟"

"نہیں سیٹھ! میں مانتا ہوں کہ عورت کی محبت جذبات کو مزیدار بنا دیتی اور زندگی میں نشہ ملا دیتی ہے، مگر آدمی سے صحیح فیصلہ کرنے کی قوت چھین تا بھی لیتی ہے۔ اس لئے میں عورت سے گھبراتا ہوں ــــ نفرت کرتا ہوں!"

"اپنی ماں کی محبت سے بھی نفرت کرتے ہو؟"

"پر سیٹھ میں اپنا باپ ماں اُس مرد و عورت کو سمجھتا ہی نہیں جن کی واردات کی تلاش میری ہستی کا سبب بن گئی میرے ماں باپ تو اُس "اتفاق" کو سمجھو جس نے ان دونوں کو اکٹھا کر دیا!"

"مسٹر فقیر احمد تمھارے خیالات تو بہت پرانے ہیں، شاید اس وقت کے ہیں جب انسان اور حیوان میں بہت معمولی فرق تھا!"

"سیٹھ، یہ تو ٹھیک ہے کہ پچھلی دو تین صدیوں میں سائنس کی ترقی نے انسان کے مادی معاملات کا پیمانہ بدل دیا ہے مگر اس تہذیب و تمدن نے بھی انسان کے سیاسی عقیدوں کو نئے سانچے میں ڈھال دینے کا کام نہیں کیا۔ سیاسی عقیدوں کی بنیادیں اب تک وہی ہیں! اور حقیقت تو سیٹھ ڈراؤنی ہے ہی ــــ اس لئے اسے حیوانیت کہا جائے تو کچھ برائی بھی نہیں!"

"یعنی تمھارے خیال میں تہذیب و تمدن کی ترقی بیکار رہی؟"

"میں تو سیٹھ یہ سمجھتا ہوں کہ فطری کلچر جب بوڑھا ہو جاتا ہے تو اُسے تہذیب و تمدن نام دے دیا جاتا ہے ــــ مگر اُس حقیقی کلچر کو پھر سے جوان بنا دینا بھی ہمارا ہی کام ہے!"

"اس سے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ تم دنیا میں کسی چیز کا احترام اور عزت نہیں کرتے؟"

"سیٹھ، عزت اور احترام تو میں اس "بوٹ پالش" کا کرتا ہوں اور بس!"

گھوش بابو کو کہیں اور بھی جانا تھا۔ وہ ان دونوں سے رخصت ہوئے۔ "بوٹ پالش" پھر اُسی عجیب و غریب انداز سے مسکرایا۔ گھوش بابو سارے راستے سوچتے رہے کہ یہ وکٹوریا ہانکنے والا ایک ایسا بت شکن ہے جس کی نظر میں دنیا کا کوئی مجسمہ مقدس نہیں! اور وہ ہر مسلمہ روایت کے بت کو ریزہ ریزہ کر دے گا۔ اُس کے دل میں انسانی ہمدردی کی پھٹک بھی نہیں جو زندگی کو خوشگوار بناتی ہے! وہ خودی اور گھمنڈ کا ایک ایسا پتلا ہے جسے بس ہاتھ پاؤں کی محنت میں مزا ملتا ہے!

اس کے بعد بھی گھوش بابو کے خیال میں یہ دونوں مزدور فلسفی اکثر آتے رہتے ہیں اور وہ ان دو طبیعتوں پر جو ایک دوسرے کی ضد ہیں غور کرتے رہتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے سے مختلف مزاج رکھتے ہیں لیکن اُن کے خیالات میں یکرنگی ہے ــــ بلا کی یکتا ہے! "بوٹ پالش" گہرا ہے جسے زندگی میں راحت و خوشی میسر نہیں ہوئی! لیکن وہ خوش باشی اور آوارگی کا عاشق ہے، ایک ہی وقت میں محتاط اور جری ہے! اور یہ "وکٹوریا والا" اُتھلا اور خیال پرست ہے، مگر اس کی زندگی کی ایک ایک گھڑی پاک اور بیداغ ہے۔ وہ ایک ہی وقت میں آوارہ اور جری ہے!

"بوٹ پالش" زندگی کے معرکے میں مبتلا رہتا ہے، "وکٹوریا والا" موقعہ باز ہے۔ اُس کو کوئی اخلاقی یا جسمانی خطرہ ڈرا نہیں سکتا، اس کے لئے آوارگی ہی زندگی کا جوہر ہے! اُس کے لئے زندگی ایک سخت قسم کی حزنیہ ہے اور وہ مغموم ہے، اسکے لئے زندگی ایک بڑا مذاق ہے اور یہ اُس سے مذاق کر رہا ہے!

ل۔ احمد (مختار)

میں سوچ رہا ہوں اور آپ بھی سوچئے

کہ کیا اس وقت ایک ایسے اخبار کی ضرورت نہیں ہے، جو صرف مسایل جنگ سے بحث کرے اور اعداد و شمار، نقشوں، کارٹونوں، تصویروں اور تحقیقی مقالوں کے ذریعہ سے ہر ہفتے لوگوں کو بتاتا رہے کہ جنگ کی موجودہ رفتار کیا ہے، آیندہ کیا کیا امکانات اس میں پوشیدہ ہیں اور ہم کو کیا پالیسی اختیار کرنا چاہیے۔

اگر آپ واقعی اسکی ضرورت سمجھتے ہیں اور کم از کم ایک روپیہ ماہوار اس پر صرف کر سکتے ہیں، تو فی الحال آپ اس تجویز کے معاونوں میں ایک کارڈ بھیجکر اپنا نام درج کرا لیجئے — (روپیہ بھیجنے کی ضرورت نہیں) جسوقت دو سو ناموں کی فہرست پوری ہو جائیگی اسی وقت یہ اخبار جس کا نام "جنگ" ہوگا جاری کر دیا جائے گا اور آپ کو اپنا ماہوار چندہ بھیجنے کی زحمت دیجائے گی۔

آپ خود بھی غور کیجئے، اپنے حلقۂ احباب میں بھی اس کا ذکر کیجئے اور مجھے بتایئے کہ آپ نے کیا فیصلہ کیا — یہ اخبار میری ادارت میں شایع ہوگا اور زیادہ تر میرے ہی مقالات اس میں شایع ہوں گے۔ اس کا حجم ۱۶ صفحے اور سائز بڑا ہوگا۔

نیاز فتحپوری

موجودہ جنگ اور جاپان

ابھی تک یہ جنگ یورپ کے ایک محدود و مخصوص حصہ سے آگے نہیں بڑھی، لیکن ساری دنیا اسے عالمگیر جنگ (World War) ہی کے نام سے موسوم کرتی ہے، کیونکہ اس کے خطرناک امکانات اور مستقبل کے اندیشوں کو دیکھتے ہوئے ہر شخص سمجھتا ہے کہ اس آگ کا ساری دنیا میں پھیل جانا بالکل قرین قیاس ہے۔

یورپ کے رہنے والوں کے لئے عالمگیر جنگ کا جو مفہوم بھی ہو، لیکن باشندگانِ ایشیا اور خصوصاً ہندوستان والے، مشرقِ بعید کی سیاسیات کو نظر انداز کر کے عالمگیر جنگ کا کوئی تصور قایم ہی نہیں کر سکتے۔ یا بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ اگر ایشیا تک اس جنگ کے اثرات پہونچنے کا سوال ہوگا تو ان تعلقات ہمسایگی کی بناء پر جو چین و جاپان کے ساتھ حاصل ہیں، ہم کو یہ دیکھنا پڑے گا کہ بین الاقوامی تعلقات اور تجرباتِ ماضیہ کے لحاظ سے جاپان کی پالیسی کیا ہو سکتی ہے۔

جاپان کو مشرقِ بعید میں جو اہمیت حاصل ہے اس کا تعلق نہ صرف ایشیا سے ہے اور نہ ایشیائی سمندروں سے بلکہ زیادہ تر اس بات سے کہ اس کی صنعتی و تجارتی وسعت نے اگر ایک طرف بحر پاسفک اور بحر اٹلانٹک کی تمام حکومتوں سے اسے قریب تر کر دیا ہے تو دوسری طرف اس کی فوجی ساکھ نے شمالی ایشیا کی سب سے بڑی حکومت (روس) کو بھی اپنے حدود سے آگے بڑھنے نہیں دیا ــــ یہ ہے وہ خصوصیت جاپان کی جو اس کی غیر معمولی اہمیت کی ضامن ہے اور جس کو قایم رکھنا وہ اپنا فرض جانتا ہے۔

سیاسیات میں رائے زنی کرتے وقت، عام طور پر یہ غلطی کی جاتی ہے کہ ہم لوگ واقعات و حقایق سے رو گردانی کر کے جذبات سے کام لینا چاہتے ہیں۔ یعنی ہم یہ نہیں دیکھتے کہ حالات کا اقتضاء کیا ہے بلکہ خود اپنی خواہشات کو سامنے رکھکر واقعات کی غلط تاویلیں کرنے لگتے ہیں جس کا ہماری ذہنیتوں اور اجتماعی احساسات پر خراب اثر پڑتا ہے۔

دنیا میں واقعات و حالات کا ظہور ایک خاص سبب، ایک خاص مقصود کے تحت ہوا کرتا ہے اور اس لئے ہم کو بین الاقوامی سیاست سمجھنے کے لئے اپنے جذبات کو سامنے نہ رکھنا چاہئے بلکہ ملکوں کے مصالح و اغراض کو دیکھنا چاہئے ان کی گزشتہ سیاسی تاریخ پر غور کرنا چاہئے۔ موجودہ اقتصادی و اجتماعی حالت کا مطالعہ کرنا چاہئے اور ان کے لائحۂ عمل اور توقعاتِ مستقبل سے اُن کی پالیسی کو متعین کرنا چاہئے۔

آپ سیاسیات عالم کی تاریخ کا مطالعہ کریں گے تو معلوم ہوگا کہ اس کا تعلق نہ تحریری معاہدوں سے ہے، نہ زبانی عہد و پیمان سے، بلکہ اُن اندرونی میلانات سے جن کا پتہ دوسروں کو اسی وقت چلتا ہے، جب کھلم کھلا آستینیں چڑھائی جاتی ہیں اور توپ کی سب سے پہلی گرج جنگ کا اعلان کر دیتی ہے اس کا دوسرا نام سیاسی چال اور جنگی داؤں گھات ہے۔

اس وقت موجودہ جنگ میں فریقین کی تعیین یقیناً بہت غیر متوازن ہے، یعنی روس و جرمنی ایک طرف اور ساری دنیا دوسری طرف، اور اسی لئے ابتک اس نے وسعت اختیار نہیں کی۔ لیکن اس کا اندیشہ ضرور ہے کہ روس و جرمنی اپنا پلہ بھاری کرنے کے لئے دوسرے ملکوں کو بھی اس آگ میں کودنے کی طرف مایل کریں گے۔

حال ہی میں منچوکو کی سرحد پر جاپان اور روس کے درمیان جو عارضی التوائے جنگ ہوا ہے، اس کو سامنے رکھکر کہا جاتا ہے کہ شاید جاپان بھی، روس و جرمنی کے ساتھ شامل ہونے والا ہے۔ لیکن جاپان کے متعلق یہ خیال قایم کرنا، اسکی گزشتہ تاریخِ سیاست اور موجودہ پروگرام کو نظر انداز کر دینا ہے۔

یہ تو ظاہر ہے کہ جاپان کو ملکی، مذہبی اور قومی کسی حیثیت سے بھی روس و جرمنی سے دلچسپی نہیں ہو سکتی ہے، اور اگر وہ ان کے ساتھ کوئی تعلق پیدا کر سکتا ہے تو محض اپنے مفاد کے خیال سے لیکن واقعات ہم کو بتاتے ہیں کہ جاپان کا روس و جرمنی سے اتحاد پیدا کر کے برطانیہ و فرانس سے دشمنی مول لینا اس کے مصالح کے یکسر خلاف ہے۔

روس و جاپان کی مخالفت اتنی دیرینہ بات ہے اور ان کے باہمی تعلقات اتنے زمانہ سے خراب چلے آرہے ہیں کہ بظاہر ان کے سدھرنے کا نہ امکان ہے نہ کوئی سبب۔ جاپان اچھی طرح جانتا ہے کہ روس کے دل سے جذبۂ انتقام کبھی فنا نہیں ہو سکتا اور وہ ہمیشہ اپنی شکست کا بدلہ لینے کی فکر میں رہتا ہے ابتک اگر وہ اپنے اس ارادہ کو پورا نہیں کر سکا تو اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ اس کی بحری قوت جاپان کے مقابلہ میں ہیچ ہے اور دوسرے یہ کہ مشرق کی اس دور دراز سرحد پر اپنے ذرایع مواصلات ناقص ہونے کی وجہ سے یہ آسانی فوجوں کا اجتماع نہیں کر سکتا۔ چنانچہ جاپان کی ہرانوما کیبنٹ نے اس حقیقت کو پیش نظر رکھکر صاف صاف اس کا اظہار کر دیا کہ جب تک اس کا امکان باقی ہے کہ روس ولاڈی واسٹک کے ساحل سے ٹوکیو پر بمباری کر سکتا ہے، اس وقت تک روس کے ساتھ جاپان کا اتحادِ عمل کوئی معنی نہیں رکھتا۔

علاوہ اس کے دوسری چیز جس نے جاپان کو روس کی طرف سے بہت زیادہ بدظن کر دیا ہے وہ اس کی بدعہدی ہے۔ روس و جاپان کے درمیان اگر آج کوئی معاہدہ ہو جائے تو وہ کوئی نئی چیز نہ ہوگا، لیکن اگر روس اس معاہدہ پر قایم رہے تو بیشک نئی بات ہوگی۔ سنہ ۲۵ء میں روس و جاپان کے درمیان جو معاہدہ ہوا ہے، اس کی رو سے روس نے اپنے آپ کو پابند کیا تھا کہ وہ حدود جاپان میں اشتراکی پروپاگنڈا نہ کرے گا، لیکن وہ اس سے باز نہیں آیا۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ چین و جاپان کے مسئلہ میں کبھی چین کی مدد نہ کرے گا، لیکن اس نے مدد کی اور کر رہا ہے، اس نے جاپان کو یقین دلایا تھا کہ سوویٹ حکومت میں جاپانی باشندوں کو ہر طرح کی آزادی حاصل ہوگی، لیکن اس نے مطلق آزادی نہیں دی۔ — اسی طرح وہ یہ بھی جانتا ہے کہ

زیکوسلوویکیا سے روس نے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ آزادی قایم رکھنے میں اس کی پوری مدد کرے گا لیکن نازی حکومت زیکوسلوویکیا کو تباہ و برباد کررہی تھی اور وہ تماشہ دیکھ رہا تھا۔ وہ اس سے بھی واقف ہے کہ روس نے چین سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کے کسی دشمن سے اتحاد پیدا نہ کرے گا اور اس نے جاپان سے التوائے جنگ کا معاہدہ کرکے اس عہد کی خلاف ورزی کی۔ الغرض جاپان کو نہ روس کی دوستی کا اعتبار ہے نہ دشمنی کا۔

اب جرمنی کو لیجئے اور دیکھئے کہ جاپان کے ساتھ اس کا سلوک کیا رہا ہے۔ جب تک قیصر برسر حکومت رہا، جاپان کو ہمیشہ زرد خطرہ کہہ کر تمام سفید اقوام کو اس کے خلاف بھڑکاتا رہا اور جب ہٹلر برسر اقتدار ہوا تو اس نے بھی اپنی کتاب (Mein Kampf) میں جاپانیوں کو اتنا ہی برا کہا جتنا وہ یہودیوں کو کہہ سکتا تھا۔ فرق یہ ہے کہ یہودیوں کے ساتھ اس نے کیا بھی وہی جو کہتا تھا اور جاپانیوں پر اس کی دست رس نہیں، اس لئے مجبور ہے۔

پھر جاپان اچھی طرح جانتا ہے کہ جب کبھی روس و جاپان میں آویزش ہوئی تو جرمنی نے ہمیشہ روس کا ساتھ دیا اور گزشتہ نصف صدی میں جب کبھی جاپان نے چین کے خلاف قدم اٹھایا تو جرمنی نے ہمیشہ چین کی مدد کی اور جاپان کو اپنے فتوحات سے کبھی پوری طرح فایدہ اٹھانے نہیں دیا۔ وہ اس حقیقت سے بھی واقف ہے کہ چین و جاپان کی موجودہ جنگ میں، جرمنی نے چین کو ۰۰ فی صدی اسلحہ و سامان حرب سے مدد پہونچائی اور اسی لئے جب میونک کانفرنس میں جرمنی نے جاپان کو بھی اپنی طرف ملانا چاہا تو اس نے صاف انکار کردیا، کیونکہ وہ اچھی طرح سمجھتا تھا کہ آج یہ روس کی مخالفت کرکے جاپان کے تعاون سے ناجایز فایدہ اٹھانا چاہتا ہے، لیکن کل اگر ضرورت ہوئی تو پورے جاپان کا سودا، اسٹالین کے ہاتھ کرنے سے دریغ نہ کرے گا۔ الغرض جاپان و جرمنی کے گزشتہ تعلقات عرصہ سے بہت خراب چلے آرہے ہیں اور جاپان کبھی اس پر بھروسہ کرکے ان اغراض کو صدمہ نہیں پہونچا سکتا جن کی تکمیل روس و جرمنی سے علحدہ رہنے ہی کی صورت میں ہوسکتی ہے۔

ہوسکتا تھا کہ کوئی صنعتی یا تجارتی لالچ کسی وقت جاپان کو روس و جرمنی کی طرف مایل کرسکتی، لیکن منچوکو اور جاپان دونوں اپنی پیداوار اور صنعت کے لحاظ سے اس قدر مستغنی ہیں کہ انھیں نہ روس کے غلہ اور پٹرول کی ضرورت ہے، نہ جرمن ماہرین سائنس کی، اور اگر اس کی ضرورت ہو بھی تو جاپان کے سامنے اور ملک بھی ہیں جن کی وساطت سے اس غرض کو پورا کیا جاسکتا ہے۔

جاپان کے لئے اس وقت سب سے زیادہ ضروری مسئلہ یہ ہے کہ وہ اپنی بڑھتی ہوئی آبادی کے لئے اپنی حکومت کے اثرات کو وسیع بنائے اور اپنی مصنوعات کی منڈیاں بڑھا کر اپنی صنعت کو ترقی دے۔ یہی وہ ضرورت تھی جس نے اسے منچوکو کی طرف اقدام کرنے پر مجبور کیا تھا اور اب چین کی طرف اسے متوجہ کئے ہوئے ہے جس پر گزشتہ تین سال کے اندر وہ بے اندازہ دولت صرف کرچکا ہے اور جس کے مقابلہ میں وہ کسی اور مسئلہ کی طرف توجہ کرہی نہیں سکتا۔

پھر دیکھنا یہ ہے کہ چین کا مسئلہ سلجھانے اور اپنی فتوحات کو مفید بنانے کے لئے وہ روس و جرمنی کا ساتھ دیسکتا ہی

یا نہیں۔ روس وجرمنی کی نیت کا حال تو اسے معلوم ہی ہے کہ وہ جاپان کے خلاف برابر چین کی مدد کر رہے ہیں لیکن برطانیہ کی طرف سے اسے کسی خاص شکایت کا موقعہ ابتک نہیں ملا ہے۔ ہرچند چین میں جاپان کی مداخلت برطانیہ کو پسند نہیں آسکتی، لیکن برطانیہ نے جاپان کے خلاف کوئی کارروائی ایسی نہیں کی، جو معاہدہ کے خلاف ہو اور نہ کوئی اندرونی سازش کرکے جاپان کو الجھاوے میں ڈالا۔ علاوہ اس کے امریکہ کا قدم ایسا درمیان ہے، جو جاپان کو برطانیہ کا مخالف کر ہی نہیں سکتا۔ امریکہ و برطانیہ کے تعلقات اب اسدرجہ وسیع ہوگئے ہیں کہ نہ امریکہ سے بگاڑ کرکے کوئی برطانیہ کو خوش کر سکتا ہے، نہ برطانیہ سے بگاڑ کر امریکہ سے نباہ کر سکتا ہے۔ اور امریکہ کی مخالفت نہ کرنے پر جاپان اس لئے مجبور ہے کہ روس کے ساتھ جنگ ہونے کی حالت میں بحر پاسفک اس کے جہازوں کی آمد و رفت کے لئے کھلا رہنا چاہئے، اور اس کا امکان اسی وقت ہے جب امریکہ کے ساتھ اس کا اتحاد قایم رہے۔

امریکہ و جاپان کے درمیان، مخالفت کا امکان اگر ہو سکتا تھا تو صرف دو باتوں میں۔ ایک جزایر فلپائن کے مسئلہ میں اور دوسرے جاپانیوں کے امریکہ جاکر آباد ہونے میں۔ اور اب یہ دونوں مسئلے بالکل صاف ہو گئے ہیں۔ کیونکہ نہ جزائر فلپائن پر جاپان قبضہ کرنا چاہتا ہے اور نہ امریکہ میں اپنے یہاں کے آدمیوں کو بھیجنا اس کے لئے ضروری ہے کیونکہ ایشیا کی بعض حکومتوں میں اسکی زاید آبادی کی کھپت آسانی سے ہونے لگی ہے۔ الغرض جاپان و امریکہ کے تعلقات اتنے صاف و شگفتہ ہیں کہ ان کے خراب ہونے کا کوئی امکان نہیں، خصوصیت کے ساتھ جاپان تو امریکہ سے بگاڑ ہی نہیں سکتا، کیونکہ وہ اپنے یہاں سے خام ریشم وہاں بھیجتا ہے اور وہاں سے لوہا، روئی اور تیل وغیرہ منگواتا ہے اور اس درآمد برآمد میں اسے ۴۰۰ ملین ین کا سالانہ فایدہ ہوتا ہے۔ اور امریکہ سے یہ تمام تعلقات اسی وقت اچھے رہ سکتے ہیں، جب برطانیہ کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھایا جائے۔

ایک پہلو بحث کا اور ہے، وہ یہ کہ اگر جاپان، روس وجرمنی کا ساتھ دے بھی تو اسے کس فایدہ کی توقع ہو سکتی ہے اول تو جنگ کی موجودہ صورت ایسی ہے کہ بین الاقوامی تعلقات کے لحاظ سے ابھی تک اس کی نوعیت معلوم ہی نہیں ہو سکی اور اسکو محض خیال وعقیدہ Ideology کی جنگ تسلیم کر لیا جائے تو بھی جاپان اپنے اصول حکومت کے لحاظ سے نہ روس کا ہم عقیدہ ہو سکتا ہے نہ جرمنی کا۔ علاوہ اس کے یوروپ کی سرزمین سے جاپان کا کوئی تعلق ایسا نہیں کہ وہاں اسے کسی حصۂ زمین پر قبضہ پانے کی لالچ ہو، ایشیا میں البتہ ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جس سے اس کے فواید متعلق ہو سکتے ہیں، لیکن اس کو جاپان بھی اچھی طرح جانتا ہے کہ ہندوستان خود آزادی کی منزل سے قریب ہے اور بیرونی حکومت کی مداخلت کا کوئی موقع نہیں خصوصیت کے ساتھ وہ حکومتیں جو ملوکیت یا ڈکٹیٹرشپ کی حامی ہوں۔ برطانیہ کے ساتھ ہندوستان اپنے تعلقات کو اس منزل تک کھینچ لایا ہے کہ برطانیہ جمہوری حکومت ہونے کے لحاظ سے خود اس کی آزادانہ ترقی کی حمایت کر رہا ہے اور ہندوستان برطانیہ کو پریشانیوں میں مبتلا کرکے اپنی ان توقعات کو کبھی خاک میں نہیں ملا سکتا۔

رہگیا تجارت کا سوال، سو ظاہر ہے کہ ہندوستان سب سے بڑی منڈی جاپانی مال کی ہے اور یہ تجارتی تعلقات صرف اسی حالت میں قایم رہ سکتے ہیں کہ برطانیہ سے اس کے تعلقات دوستانہ رہیں۔

ہوسٹل کے ایک گوشہ میں بیٹھکر

یہ ہیں ہماری یونیورسٹیاں !

مجھے یقین ہے کہ آپ ڈگری کلاس کے طلبا سے کبھی نہ کبھی ضرور ملے ہوں گے، کیونکہ اس جنس کا سد کی کمی نہیں لیکن اگر ایسا نہیں ہوا تو یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ آپ دنیا کی ایک بڑی دلچسپ چیز کے مطالعہ سے محروم ہیں۔

صوفیہ کے خانوادوں کی طرح ان کی بھی کئی متعدد تقسیمیں ہیں۔ اب معلوم نہیں کہ ان میں سے آپ کس سے ملے ہیں اور کس سے نہیں، اس لئے اس مشکل کو حل کرنے کے لئے میں سبھی کا تعارف کرائے دیتا ہوں ان کی ترتیب آپ خود کر لیجئے۔

سب سے اونچی سطح پر تو وہ توجہ کو منعطف کر لینے والے "سجیلے، بشاش و مطمئن" افراد ہیں جو کالج کو نمائش گاہ سمجھ کر چلے آئے ہیں اور یونیورسٹی کو سروس کمیشن کا شاگرد پیشہ جانتے ہیں، ان کو پورا یقین ہے کہ تعلیم خود کوئی مقصد نہیں بلکہ حصول مقصد کا ذریعہ ہے اور اسی قسم کا طرز عمل تعلیمی اداروں میں ان سے ظاہر ہوتا ہے یہ جتنی دیر ٹھہرتے ہیں اس کا خاص التزام رکھتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ لوگ ان کے لباس کو دیکھ سکیں اور اسی خصوصیت کے ساتھ انھیں پہچانیں۔ ان کے اُستاد ہمیشہ مہمل لکچر دیتے ہیں جن سے سوائے اس کے کوئی مقصود نہیں کہ نوٹ لکھا لکھا کر انگلیوں کو تھکا دیا جائے۔

دوسرے وہ متوسط درجے کے لوگ ہیں جن کے والدین ان کا "پیٹ سا" کسی نہ کسی طرح ہر ماہ مہیا کرتے رہتے ہیں لیکن یہ یہی سمجھتے ہیں کہ ان کا باپ ان سے روپیہ بچا رہا ہے۔ بہرحال وہ کالج کی فیس، لائبریری کارڈ کی دی ہوئی رعایت کی صورت میں مختلف دوسری نمائش گاہوں سے وصول کر لیتے ہیں اور اس طرح اس ذمہ داری سے بھی سبکدوش ہو جاتے ہیں جو ان کا پیسہ ان پر عاید کرتا ہے۔

لیکن ایسے اصحاب دول پر بعض صاحبان عمل غلبہ حاصل کرتے جاتے ہیں جن کی تصویر زیادہ دلچسپ ہے۔ یہ بالعموم دبیز لباس استعمال کرتے ہیں، اتنا دبیز کہ گویا اس کے ہر تار کو ہم خوردبین سے دیکھ رہے ہیں۔ ان کے بال اس طرح پیچھے اُلٹے رہتے ہیں گویا انھوں نے اپنی تمام اُلجھنوں کو پس پشت ڈال دیا ہے اور ایک خوشنما مستقبل ان کے سامنے ہے۔

مگر میرے ان اشارات کی حیثیت طفلانہ ہو جاتی ہے جب یہ نظر آتا ہے کہ یہی لوگ حقیقۃً کلاس کی جان ہیں۔ کالج کی پوری مشین جس میں ہنگاموں، ہڑتالوں، مطالبات، تحریکات اور موت و زندگی کے بیشمار پہیئے لگے ہوئے ہیں انھیں کے دم سے چلتی ہے۔ ان میں اکثر اچھے دماغ کے بھی ہوتے ہیں اور شاید ان میں سب سے بڑی اچھائی یہی ہے کہ وہ ان

دماغوں کو بھی اُبھرنے کا موقع دیتے ہیں جو عام حالات میں (یکسر غیر ضروری وجوہ کی بنا پر) کبھی روشنی میں نہ آسکتے۔ لیکن بحیثیت مجموعی کارو نظر کا فرق یہیں زیادہ دکھائی دیتا ہے۔ اگر یہ اپنی اجلے اور بے داغ ظاہر و باطن بھی ویسا ہی بنا سکتے اور صرف آئندہ کی توقعات میں اُلجھے رہنے کی اعصابی کمزوری میں مبتلا نہ ہوتے تو حال میں ضروری و مفید تبدیلیاں پیدا کر سکتے تھے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ اس کے بجائے ان میں ایک طرح کا دماغی تبختر پیدا ہو گیا ہے جسے "ذہنی امارت" کہا جا سکتا ہے اور جو اسی قدر لایق استکراہ ہے جس قدر سرمایہ پرستی۔

اسوقت تک ان لوگوں کا بیان ہوا ہے جن کے اور یونیورسٹی کے درمیان کوئی رابطِ عقلی نہیں پایا جاتا۔ لیکن ان کے علاوہ ایک گروہ اور یہاں پایا جاتا ہے جو "پڑھنے والوں" کے حقیر خطاب سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان کی خراب صحتیں اور ردی حالتیں ان کے بعض لایق ناقدین کی رائے میں انھیں مجبور کرتی ہیں کہ وہ صرف پڑھیں۔ اس مقولہ کے مطابق کہ دشمن کے اتہام میں بھی کچھ اصلیت ہوتی ہے، اس "رائے" میں بہت ممکن ہے کچھ سچائی ہو اور اتنا تو آپ نے بھی دیکھا ہی ہوگا کہ پڑھنے کے بعد ان میں امتحان مقابلہ کا موقع پاتے ہی ایسا اُچھل پڑتے ہیں گویا وہ صرف اسی کے منتظر تھے۔

یہ پڑھتے ہیں لیکن پڑھنے کے شوق سے اتنا نہیں جتنا فکر و عمل کی تکلیف سے بچے رہنے کے لئے۔ کتاب کا مطالعہ انکے لئے ایک میکانکی حرکت بن جاتا ہے اور ہمہ گیری کی ضرورت ان کو مجبور کرتی ہے کہ کتابوں کے اصل سرچشمہ کی طرف جانے کی زحمت گوارا نہ کریں۔ کچھ تو اس کا سبب یہ ہے کہ اصل کتابوں کے مطالعہ کے لئے کافی وقت نہیں ملتا اور کچھ یہ کہ انھیں اس کی ضرورت بھی نہیں، کیونکہ جب تک دوسروں کی کہی ہوئی باتوں سے "تنقید و شرح" سب کچھ ایک ہی دن میں تیار ہو سکتی ہو تو پھر کتابوں کے دیکھنے کی کیا ضرورت ہے۔

اس کا سب سے بڑا فایدہ یہ ہے کہ ہر شخص بغیر ملٹن کا پورا نام جانے پیراڈائز سے لے کر لی سی ڈس اور لے ایلاگرو تک گردان جاتا ہے اور اگر کوئی ماخذ کا سوال کر بیٹھے تو اسے اس طرح چپ کیا جا سکتا ہے کہ یہ ان بنگالی بابو کی کتاب سے لیا گیا ہو جن کے دادا اس انگریز سوداگر کے پاس ملازم تھے جو پہلے ایک ملٹن کے کلام کے سستے ایڈیشن کرنے والے مطبع میں کام کرتا تھا۔

کیسے غضب کی بات ہے کہ ایک گریجویٹ لڑکے کو غالب پر رائے دینے کے لئے اپنی کوئی رائے نہیں ملتی، غالب کا کلام نہیں ملتا، غالب کے مکتوبات نہیں ملتے بلکہ اسے سوانح نگاروں، تذکرہ نویسوں اور نقادوں کی متضاد رایوں کا سہارا ڈھونڈھنا پڑتا ہو۔ اس مستعار واقفیت سے کیا فایدہ اور محض یہ معلوم ہو جانا کہ فلاں شخص فلاں کے متعلق کیا کہتا ہے۔ کس طرح مفید ہو سکتا ہے۔ خود پڑھنا دوسروں کی پڑھائی یا جہالت خریدنے کے مقابلہ میں اس لئے زیادہ ضروری ہے کہ یہ ذاتی فکر و دانش کو ترقی دینے کا پہلا زینہ ہے۔ صرف پڑھ لینا تو کسی بڑی مشکل کو حل نہیں کرتا۔ لاک کہا کرتا تھا اگر میں نے اتنا ہی پڑھا ہوتا تو اسی قدر کم جانتا ہوتا۔ صحیح طالب علم وہ ہے جو پڑھتا کم ہے اور سوچتا زیادہ ہے۔

لیکن ہمارے ڈگری کلاس کے طالب علم کا حال یہ ہے کہ وہ علم کے سوا دنیا میں ہر چیز کا طالب علم ہوتا ہے اور اگر ان

اداروں میں کوئی شخص کچھ سوچتا ہے تو اس کی تقسیم یہ ہے کہ طلباء امتحان کے متعلق سوچتے ہیں، یونیورسٹیاں اپنی آمدنی کے متعلق سوچتی ہیں اور ہمارے پروفیسر اپنی آمدنی کے متعلق!

یہ ہیں ہماری شادیاں!

ہندوستانی بچے کو خدا شاید اس لئے پیدا کرتا ہے کہ وہ صرف نوکری اور شادی کرنے کی کوشش کرتا رہے۔ آپ نہ جانے ان میں سے کس چیز کو زیادہ ضروری سمجھتے ہیں، لیکن وہ شادی کو زیادہ اہم سمجھتا ہے اور شاید سنجیدہ لوگ دونوں کو واجب قرار دیتے ہیں۔ لیکن قدرت کسی کے چاہنے کی پرواہ نہیں کرتی اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نوکری میں تو کامیابی بہت کم ہوتی ہے مگر شادی میں ناکامی کا رواج نہیں۔ رواج سے بہت سی باتیں سہل ہو جاتی ہیں چاہے ان کی ضرورت ہو یا نہیں مثلاً انگلینڈ جانا یا مقابلے کے امتحان میں بیٹھنا، بیکار بیٹھنے سے اچھا ہے۔ یا جب تک کوئی دوسری صورت پیدا ہو یا گھر کی جائداد بکے شادی کر لینے میں کیا حرج ہے۔

چاہے آپ اپنی زندگی صرف علوم کی تحقیقات میں گزارنا چاہتے ہو یا اعصابی امراض کے باعث آپ کی صحت اچھی نہ ہو یا کھانے کو کچھ نہ ہو مگر ہندوستان کہتا ہے شادی کیجئے۔ آپ کے بچے آپ کے کام کو تمام کریں گے۔ بیوی مزاج کی اصلاح کرے گی یا اسی کوشش میں فنا ہو جائے گی۔ رہا فاقہ، سو وہ دونوں طرح ہے۔ اگر کھانے کو کچھ نہ ہو تو جس طرح ایک آدمی بھوکا رہ سکتا ہے اسی طرح دو اور اس سے زاید بھی بھوکے رہ سکتے ہیں۔ پھر چونکہ وطن کے مطالبات کو ٹھکرانا آسان نہیں، اس لئے اکثر وہ لوگ بھی شادیاں کر لیتے ہیں جن کی حالت گھر میں ایسی ہوتی ہے جیسے ایک میخ کو بے موقع جڑ دیا جائے اور وہ ٹیڑھی ہو جائے۔

ہمارے یہاں اوسطاً ہر شخص ایک شادی کرتا ہے اور لطف یہ ہے کہ ملک کی تمام اجناس میں کتنی ہی کمی ہو جائے لیکن انسانی جنس کی کوئی کمی محسوس نہیں ہوتی اور انگریزی اخبارات برابر کہتے رہتے ہیں کہ ہندوستان ترقی کر رہا ہے۔ یعنی شادیاں ترقی کر رہی ہیں، بچے ترقی کر رہے ہیں، موت ترقی کر رہی ہے، افلاس ترقی کر رہا ہے!

شادی کے متعلق یہ نظریہ کتنا عجیب و غریب ہے کہ بغیر اس کے دنیا بھی خراب اور آخرت بھی۔ ایک کرنا واجب، چار کرنا سنت اور یوں تو جتنی شکر ڈالی جائے۔۔۔۔ لیکن اس طرف کسی کا ذہن نہیں جاتا کہ اگر کبھی نہ کی جائے تو کیا ہرج واقع ہو جب کہ سوائے بقائے نسل کے کوئی دلیل شادی کی حمایت میں پیش نہیں کی جا سکتی۔ یہ سوال کہ جنسی ضروریات کا پورا کرنا انسانی فطرت میں داخل ہے یا نہیں، طے ہو چکا ہے۔ گاندھی جی نے نہایت معقولیت سے ثابت کر دیا ہے کہ آدمی اس ضرورت کو پورا کئے بغیر بھی رہ سکتا ہے۔ بلکہ شاید زیادہ بہتر طریقہ سے رہ سکتا ہے۔ باقی رہا فطرت کا سوال سو علم الاعضاء

کے لحاظ سے ممکن ہے یہ کچھ وزن رکھتا ہو لیکن ہمارا تمدن ایسی فطرتوں کو کبھی گوارا نہیں کر سکتا۔ خصوصاً بیسویں صدی کا زمانہ جو انسانوں کی موجودہ تعداد ہی کو خوراک مہیا نہیں کر سکتی اور اگر راشن کی مدد سے یہ بوجھ اُٹھائے تو بھی وہ بیمار مردوں اور مجہول الدماغ انسانوں کو کیا کرے گی جو بڑھتی ہوئی آبادی کے لازمی جزو بنتے جا رہے ہیں۔ کوئی شخص اگر اپنے دل پر قابو نہیں رکھ سکتا تو اسے چاہئے کہ آپریشن کرا لے یا خودکشی کر لے۔ کیونکہ جب مریض خون ورثہ میں ملا ہو تو اسے کیا حق ہے کہ اپنے جذبات کی بنا پر دنیا کو مصیبت میں ڈالے۔

بغیر روک ٹوک کی شادیوں نے دنیا کے تین چوتھائی فقیر، مجرم، بیکار اور صاحب فراش بیمار پیدا کر دئے۔ اور کوئی تیار نہیں کہ اس حالت کو سمجھے اور دور کرے۔ اس سماجی نقصان کے علاوہ بعض شادیاں انفرادی غلطیوں کی حامل بھی ہوتی ہیں مثلاً بد مزاجی، ذاتی منافرت، تفاوت عمر وغیرہ جو زندگی کو انتہا درجہ تلخ بنا دیتے اور دق کے ذریعہ میاں بیوی میں سے کسی ایک یا دونوں کی موت عمل میں لانے کا ذریعہ ثابت ہوتے رہتے ہیں۔

لیکن ہندوستانی مرد کے دماغ سے یہ خیال نکلنا مشکل ہے کہ شادی اس کا ذاتی معاملہ ہے، اور ذاتی معاملہ میں کسی کو دخل دینے کا حق حاصل نہیں۔ پھر آپ جانتے ہیں، اس ضد کا نتیجہ کیا ہوگا۔ یہ کہ جسم و دماغ میں تنزل ہوتے ہوتے صرف سسکنے والے اپاہج بھیک مانگنے کو باقی رہ جائیں گے اور شاید ان کی تربیت کا فرض ہی سب سے بڑا انتقام ہوگا جو برطانیہ سے کیا جا سکے گا۔

نظیر حیدر

نگار کے پُرانے پرچے

نگار کے مندرجہ ذیل پرچے دفتر میں موجود ہیں جن کی دو دو تین تین کاپیاں دفتر میں رہ گئی ہیں جن اصحاب کو ضرورت ہو طلب کر لیں۔ قیمتیں وہی ہیں جو سامنے درج ہیں:-

(سنہ ۲۶ء) جنوری ۵ر — (سنہ ۳۰ء) مئی ۴ر — (سنہ ۳۱ء) جولائی تا دسمبر ۴ر فی پرچہ (سنہ ۳۲ء) جنوری، فروری تا دسمبر (علاوہ اپریل، اگست و اکتوبر) ۴ر فی پرچہ — (سنہ ۳۳ء) فروری و جولائی ۴ر فی پرچہ — اکتوبر ۵ر (سنہ ۳۶ء) جنوری ۸ر فروری تا دسمبر (علاوہ مئی تا اکتوبر) ۵ر فی پرچہ — (سنہ ۳۷ء) جنوری ۸ر، مارچ تا اگست ۶ر فی پرچہ — (سنہ ۳۸ء) پورا فایل صہ ر

منیجر نگار لکھنؤ

روس کے خارجی طرزِ عمل پر ایک نظر!

آپ نے اکتوبر کے نگار میں روس کے طرزِ عمل پر تبصرہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے کہ "اس سے قبل روس میں جتنے ڈکٹیٹر ہوئے ہیں ان کا مقصدِ عظیم تحریک اشتراکیت کو تمام دنیا میں پھیلانا تھا" مجھے اس تحریر کے پہلے ٹکڑے کی صحت میں شک ہے کیونکہ روس میں اسٹالین سے قبل صرف ایک ڈکٹیٹر ہوا ہے جس کا نام لینن تھا، اگر آپ روس کے آمروں کی فہرست میں کیرنسکی (Kerensky) کو بھی شامل کرتے ہیں تو یہ اس لئے غلط ہے کہ کیرنسکی اس غیر اشتراکی حکومت کے نام و نہاد پارلیمنٹ کا صدر اعظم تھا جو انقلاب کے فوراً ہی بعد کچھ عرصے کے لئے قایم ہوئی تھی اور جس کا مقصد روس میں اشتراکی پروگرام کو پس پشت ڈالکر متوسط الحال طبقہ کی حکومت قایم کرنا تھا، ظاہر ہے کہ کیرنسکی کو تمام دنیا میں اشتراکیت کی اشاعت سے کیا واسطہ ہو سکتا تھا، لیکن سب سے زیادہ جس چیز نے مجھے یہ مقالہ لکھنے پر مجبور کیا وہ آپ کا یہ خیال تھا کہ "اسٹالین اس کا حامی نہیں کہ ساری دنیا کو اشتراکی بنایا جائے"۔

اگر آپ اسے خود ستائی پر نہ محمول کریں تو میں یہ عرض کرنے کی جرأت کروں گا کہ مجھے جرمنی اور روس کے معاہدہ کے بعد ہی یقین ہو چلا تھا کہ روس، پولینڈ کے کچھ حصے ضرور اپنی حکومت میں شامل کرے گا لیکن اس کے ساتھ یہ بھی خوف تھا کہ ہندوستان و نیز دوسرے ممالک کے اشتراکی اور خصوصاً وہ جو ٹراٹسکی اور اس کے رفقا کے بے سروپا پروپگنڈا کا شکار ہو گئے ہیں یہ سمجھنے لگیں گے کہ روس نے اپنے تمام بین الاقوامی پروگرام کو خیرباد کہکر ملوکیت پرستی کا رویہ اختیار کر لیا ہے چنانچہ آپ کے مقالے نے میرے اس خوف کے صحیح ہونے کا پورا ثبوت دے دیا۔

دراصل نہ تو روس نے اشتراکیت کی اشاعت و توسیع کے اہم پروگرام سے منھ موڑا ہے اور نہ اس نے پولینڈ کو ملک گیری کے ارادہ سے اپنے قلمرو میں شامل کیا ہے، روس کے اس طرزِ عمل کے اسباب، جنگ کے قبل ہی فراہم ہو چکے تھے جن میں اہم ترین "اشتراکیت کی عالمگیر اشاعت کا جذبہ" تھا، ضرورت ہے کہ روس کی موجودہ پالیسی پر تبصرہ کرنے سے پہلے موجودہ جنگ کے پس منظر پر ایک نگاہ ڈال لی جائے۔

آپ کو لینن کے ان الفاظ پر کوئی اعتراض نہ ہوگا جو اس نے سنہ ۱۹۰۷ء میں اشتراکیوں اور اشتمالیوں کے بین الاقوامی جلسہ میں جنگ کے حقیقی اسباب کی تشریح کرتے ہوئے کہے تھے:-

"عالمگیر سرمایہ داری اس درجے تک پہونچ چکی ہے کہ اب مخالف طاقتوں میں بازار کی تقسیم کے لئے ہولناک مناقشات ضرور پیدا ہوں گے"

پھر یہ یورپ کی شہنشاہی قوتوں کی ہوس ملک گیری ہی تھی جس نے گزشتہ جنگ کا مواد فراہم کیا اور پھر موجودہ جنگ میں انسانیت کو مبتلا کر دیا جنگ عظیم کے خاتمہ پر بالشویک جماعت نے جو حال ہی میں روس کے اندر قائم ہوئی تھی، برطانیہ، فرانس، اور امریکہ سے درخواست کی کہ وہ اس قسم کے صلحنامہ کی تشکیل کرے جس کی رو سے کوئی نیا خطہ برطانیہ اور فرانس کے سرمایہ دارانہ حرص و آز کا شکار نہ ہو، لیکن اتحادیین فتح کے نشہ میں اتنے چور تھے کہ انھوں نے نہ صرف مغربی ایشیا کے بعض ممالک کو غلام بنا لیا بلکہ مغربی یورپ میں بھی جرمنی کے بعض اہم خطے، زیکوسلاویکیا اور پولینڈ میں شامل کر کے Self determination کے اصول کو نقصان عظیم پہونچایا۔ اتحادیوں کا ارادہ اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ جرمنی کو دائمی گمنامی میں ڈال کر یورپ کی ایک مخالف شہنشاہی قوت کا خاتمہ کر دے تاکہ بازار کی تقسیم میں ان کی کوئی مزاحمت کرنے والا نہ ہو۔

لیکن بالشویک حکومت کی ترقیوں نے یہ ثابت کر دیا کہ برطانیہ و فرانس کا سب سے خطرناک دشمن سوویٹ روس ہے جس کو برطانیہ اور فرانس سے حصہ داری کا جھگڑا نہیں ہے بلکہ اصولی اور بنیادی جھگڑا ہے اور جو دنیا کی ان دو سب سے زبردست شہنشاہی قوتوں کی بنیادیں متزلزل کر دینا چاہتا ہے، چنانچہ جنگ عظیم کے بعد برطانیہ کے خارجی طرزِ عمل کا واحد مقصد یہ قرار پایا کہ وہ کسی طرح اشتراکیت و اشتمالیت کے خوفناک سیلاب کو روس کی سرحدوں سے ادھر نہ بڑھنے دے، جنگ کے بعد جرمنی ایک خطرناک اقتصادی انحطاط کے دور سے گزر رہا تھا اور وہاں اشتراکی رجحانات روز بروز قوی ہوتے جا رہے تھے یہ بات برطانیہ کے لئے زبردست خطرے کا باعث تھی کیونکہ جرمنی میں اشتراکیت کے قیام کے معنی تھے۔ برطانیہ اور فرانس میں اشتراکیت کی تحریکوں کا قیام، اس کے بعد کیا ہوتا اس کو یا تو خود برطانیہ سمجھ سکتی ہے یا ہر وہ اشتراکی جو دنیا میں اقتصادی لوٹ کھسوٹ کو جلد از جلد ختم کر دینے کا خواہاں ہے۔

ہاں تو جرمنی میں اشتراکیت کے امکانات اتنے قوی ہو رہے تھے کہ حکومت نے بھی دھیرے دھیرے ذاتی ملکیت کا خاتمہ کرنا شروع کیا جو اشتراکیت کا بنیادی اصول ہے حکومت کے اس طرزِ عمل نے وہاں کے سرمایہ داروں اور بڑے بڑے جاگیرداروں کو چونکا دیا اور اسی خطرہ کے احساس نے جرمنی میں قومی مزدور جماعت پیدا کر دی۔ اس نازک وقت میں ہٹلر، سیاسی منظر پر نمودار ہوا، سنہ ۱۹۲۱ء میں وہ قومی مزدور جماعت کا صدر اعظم بن بیٹھا اور جنوری سنہ ۱۹۲۳ء میں اس کا نام بدل کر "قومی اشتراکی جرمن مزدور جماعت" رکھ دیا، رفتہ رفتہ یہ جماعت ہٹلر کا زبردست آلۂ کار بن گئی اور اس کے دو مستقل مقاصد قرار پائے، ایک تو جرمنی سے اشتراکیت کے تمام امکانات کا خاتمہ کر دینا اور دوسرے برطانیہ و فرانس سے کھوئے ہوئے خطوں اور نو آبادیات کا مطالبہ کرنا۔

برطانیہ نے، ہٹلر کے عروج کو اپنے لئے باعث رحمت سمجھا کیونکہ اب اُسے اشتراکیت سے بہت کم خوف رہ گیا تھا

لیکن وہ جرمنی کو اتنا مضبوط اور طاقتور دیکھنا چاہتی تھی کہ وسطِ یورپ پر اثر انداز ہوکر اشتراکیت و اشتمالیت کے خلاف ایک زبردست دیوار کا کام دے سکے، برطانیہ کو معاہدہ و رسائی سے زیادہ اس بات کی فکر تھی کہ وسطِ یورپ میں اشتراکیت نہ قایم ہوجائے۔ برطانیہ نے اسی پالیسی کے تحت ہٹلر کو آسٹریا اور زیکوسلاویکیا بآسانی حوالہ کردیا ورنہ کیا یہ اس کے بس سے باہر تھا کہ وہ ابتدا ہی میں ہٹلر کی تمام قوتوں کا خاتمہ کردیتی؟ ہٹلر کے ساتھ برطانیہ کی اندرونی ہمدردی اس سے ثبوت ملتا ہے اور اس نے نہ صرف اشتراکیت کی بیخ کنی کے لئے خود ہٹلر کو بھاری بھاری رقمیں دیں بلکہ فرانس اور امریکہ سے بھی دلائیں، یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اگر برطانیہ، امریکہ اور فرانس کی شہنشاہی حکومتیں اور وہاں کے پرائیوٹ سرمایہ دار اور کروڑ پتی ہٹلر کی جیب وزنی نہ کردیتے تو ہٹلر کا عروج غیر ممکن تھا اس طرح ان شہنشاہی حکومتوں نے ہٹلر کو اشتراکیت و اشتمالیت کے خلاف ایک تیز آلے کی طرح استعمال کیا اس کا سب سے بڑا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ جب جاپان، اطالیہ اور جرمنی کے درمیان "اتحاد اشتراکیت شکن" وجود میں آیا تو برطانیہ اور فرانس نے ٹھنڈی سانسیں لیکر اپنے روحانی سکون و اطمینان کا اظہار کیا۔

ادھر روس کی دو مستقل کوششوں نے برطانیہ کو اور سہما دیا ایک تو جمعیۃ الاقوام کو آلۂ کار بناکر فرانس برطانیہ اور دوسرے سرمایہ دار ممالک میں ذاتی ملکیت کے خلاف تحریکیں قایم کرنا اور دوسرے فتح آسٹریا کے بعد نازیت کے خلاف زیکوسلاویکیا اور فرانس سے معاہدہ کرنا جس سے ایک فایدہ یہ بھی ہوتا کہ ان ممالک میں اشتراکی تحریکیں بہت سرعت سے فروغ پاتیں، لیکن برطانیہ جو روس کو دشمنِ ازلی سمجھے بیٹھی تھی کسی قیمت پر روس کی ان تحریکوں کو برداشت نہیں کرسکتی تھی، چنانچہ برطانیہ کی منظم کوششوں نے روس کی پہلی تحریک کو تو ابتدا ہی میں ختم کردیا اور روس کے دوسرے پروگرام کو میونک (Munich) سانحہ پیدا کرکے خاک میں ملادیا، یہ تمام حرکتیں برطانیہ سے اسوقت تک عمل میں آئیں جب تک خود برطانوی مفاد قطعی طور پر محفوظ رہے، اس حقیقت کا ثبوت ہمیں مسٹر چیمبرلین کی دارالعوام کی تقریر سے ملتا ہے، مسٹر چیمبرلین نے برطانوی اسلحہ جات میں اضافہ پر زور دیتے ہوئے کہا:۔

> "ہوسکتا ہے کہ ایسے مواقع پیدا ہوجائیں جس کے تحت برطانیہ کو جنگ میں کودنا ہی پڑے، خصوصاً اس وقت جب ہمارے وہ مفاد خطرے میں پڑجائیں جو ہمیں سب سے زیادہ عزیز ہیں"

آگے چلکر وہ ان "عزیز مفاد" کی تشریح یوں فرماتے ہیں:

> "برطانوی علاقوں اور نوآبادیات سے سلسلۂ آمد و رفت کی حفاظت کے مسئلے ہماری بنیادی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں"

یہاں پر یہ بات صاف ظاہر ہوجاتی ہے کہ پولینڈ پر حملے کے قبل برطانوی مفاد نازیت سے براہ راست نہیں ٹکراتے تھے اسلئے برطانیہ نے ہٹلر کے خلاف جنگی اقدام نہیں کیا۔ لیکن جب ہٹلر کی آتش ہوس نے براہ راست برطانوی اثر و رسوخ پر شعلے

برسانا شروع کئے تو اسے مجبوراً ہٹلر کے خلاف حقیقی معنوں میں آواز بلند کرنا پڑی، کیونکہ پولینڈ پر نازی قبضہ کے معنی تھے بالٹک میں برطانوی رعب وداب کا مکمل خاتمہ، اب برطانیہ نئی چال چلا اس نے اپنے پرانے دشمن روس کا دروازہ کھٹکھٹایا! یہ حیرت انگیز بات ہے کہ جب روس کو جرمنی سے بنیادی اختلافات موجود تھے تو بالٹک میں برطانوی اثر ورسوخ کی محافظت کے لئے اس سے معاہدہ کرنے کی کیا ضرورت پیش آئی، کیا خود برطانیہ بالٹک میں اپنے مفاد کی حفاظت نہ کرسکتا تھا؟ - لیکن معاملہ بالکل صاف ہے، برطانیہ جنگ میں کود کر دنیا میں اشتراکیت کا خطرہ نہیں بڑھانا چاہتا تھا - خصوصاً اسوقت جب برطانیہ کے زیرنگیں ممالک میں قبل ہی سے اشتراکی رجحانات فروغ پا رہے ہیں، چنانچہ وہ روس کو جرمنی سے ٹکرا کر خود صاف نکل جانا چاہتا تھا۔ یہاں پر یہ بات یاد رہے کہ روس و برطانیہ کی گفت وشنید کی ناکامیابی کا واحد سبب برطانیہ کی یہ شرط تھا کہ روس بالٹک میں برطانوی اثر ورسوخ کی محافظت کرے اور اگر جرمنی، روس پر حملہ آور ہو تو برطانیہ خاموش بیٹھی رہے - لیکن روس، برطانیہ کی ریشہ دوانیوں کو بہت قبل سمجھ چکا تھا -

روس نے بالکل وہی حربہ استعمال کیا جو برطانیہ اپنے مفاد کی خاطر استعمال کرنا چاہتی تھی، یعنی اس نے جرمنی سے معاہدہ کرکے ایک طرف تو برطانیہ کو زبردستی اعلان جنگ کرنے پر مجبور کردیا، اور دوسری طرف "اتحاد اشتراکیت شکن" (کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کردیا، گویا روس کے طرزِ عمل نے نہ صرف فاشیت ونازیت کے اتحاد میں پھوٹ ڈال دی بلکہ برطانیہ کی خارجی پالیسی کو ایک زبردست شکست دیدی -

چونکہ روس کا مقصد دنیا سے شہنشاہیت کا خاتمہ کرنا ہے، اس لئے اسے نہ صرف فاشیت ونازیت کے خلاف جہاد کرنا ہو بلکہ دنیا کی سب سے زبردست شہنشاہی قوتیں، برطانیہ اور فرانس کے متحدہ محاذ کو شکست فاش دینا ہے، چنانچہ روس یہ نہیں دیکھ سکتا کہ جرمنی کی تنہا طاقت کو برطانیہ وفرانس کی متحدہ قوتیں شکست دیکر دنیا میں شہنشاہیت کی بنیادیں پہلے سے بھی زیادہ مضبوط کردیں، اس لئے وہ جرمنی کو اسلحہ جات سے امداد دیکر جنگ کو طویل اور ہولناک بنا دینا چاہتا ہے تاکہ جنگ کی طوالت سرمایہ دار ممالک میں معاشی زوال پیدا کرکے اشتراکی انقلاب کے لئے فضا طیار کرے، اس عظیم خطرہ کو محسوس کرکے امریکہ جنگ سے علٰحدہ رہنے کا قبل ہی اعلان کرچکا ہے اور اطالیہ "اتحاد اشتراکیت شکن" کے خاتمہ کے بعد مارے غم وغصہ کے خاموش ہے -

لیکن کیا روس، جرمنی کی ظاہری امداد کرکے یورپ میں نازیت کی بنیادیں مضبوط کرنا چاہتا ہے؟ بالکل نہیں ----- اس نے پولینڈ کے نصف سے زیادہ حصے کو صرف اس لئے اپنی سلطنت میں شامل کیا تاکہ نہ صرف پولینڈ کا ایک بڑا حصہ نازیت کی لعنت سے محفوظ ہوجائے بلکہ شمال ومغرب کی طرف روس کی سرحدوں کی توسیع سے بالٹک کی چھوٹی چھوٹی حکومتیں نازی رعب وداب کا شکار ہونے سے بچ جائیں - چنانچہ روس نے پولینڈ پر فوج کشی کے فوراً ہی بعد لیتھوانیا، لٹویا اور فن لینڈ سے گفت وشنید شروع کردی اور اس طرح ان حکومتوں کو اپنے زیرسایہ لاکر بالٹک اور شمال میں ہٹلر کے تمام مقاصد کا خاتمہ کردیا!

اس کا ایک دوسرا بڑا فایدہ یہ بھی ہے کہ اگر کبھی برطانیہ نے اشتراکی روس کے خلاف براہ راست جنگ چھیڑ دی تو وہ ان علاقوں کو ایک زبردست بحری محاذ کے طور پر استعمال کرکے شاہنشاہی قوتوں کو عظیم نقصانات پہونچا سکتا ہے پولینڈ پر فوج کشی کا دوسرا فایدہ یوں ظاہر ہوا کہ روس نے بلقان کی سب سے اہم ریاست رومانیہ سے قریب ہوکر وہاں سے نازی اثرات کی بیخ کنی کر دی ہے، گویا روس کی سیاسی چال نے ایک طرف تو فرانس و برطانیہ کے شہنشاہی مفاد کو خطرے میں ڈال دیا ہے اور دوسری طرف یورپ میں ہٹلر کے تمام مقاصد کا خاتمہ کرکے نازیت کو چاروں طرف سے محصور کر رکھا ہے۔

لیکن پولینڈ پر فوج کشی کا سب سے بڑا فایدہ یہ ہوا کہ روس کی سرخ افواج اب جرمنی کی سرحدوں سے اتنی قریب ہوگئی ہیں کہ وہ جس وقت چاہیں جرمنی میں کسی اشتراکی انقلاب کو امداد پہونچا سکتی ہیں، آپ نے دیکھ لیا کہ روس کا موجودہ طرزِ عمل "تمام دنیا میں اشتراکی تحریکیں پھیلانے کے اصول" سے کتنا موافق ہے۔

اب روس صرف یہ انتظار کر رہا ہے کہ جنگ کی طوالت دنیا کی شہنشاہی قوتوں کو ٹکرا کر ختم کردے اور وہ نہ صرف یورپ بلکہ دوسرے ممالک میں اشتراکی انقلاب برپا کرکے انسانیت کو سرمایہ داری کی لعنت سے ہمیشہ کے لئے محفوظ کردے۔

طفیل احمد خاں سلطانپوری

(نگار) آپ نے اسٹالین کی سیاست پر جس نقطۂ نظر سے بحث کی ہے، وہ یقیناً قابل توجہ ہے اور دنیا کے بعض سیاست داں اسٹالین کی اس پالیسی کو اسی نگاہ سے دیکھتے ہیں جو آپ کی ہے، لیکن افسوس ہے کہ میں اس قدر قطعیت و اذعان کے ساتھ آپ کی رائے کا ہمنوا نہیں ہو سکتا۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ لینن کی موت کے بعد روس میں دو جماعتیں پیدا ہوگئیں۔ ایک کا لیڈر اسٹالین تھا اور دوسری کا ٹراٹسکی۔ آپ غالباً اس سے بھی واقف ہوں گے کہ ان دونوں جماعتوں میں اختلاف کا باعث کیا تھا۔ اگر یہ دونوں لینن کے قایم کئے ہوئے اصول کے پابند ہوتے تو مخالفت کی کوئی وجہ نہ تھی، ظاہر ہے کہ ان کے درمیان کوئی اصولی اختلاف پایا جاتا تھا اور وہ صرف یہ تھا کہ ٹراٹسکی تمام دنیا میں اشتراکیت کی تبلیغ کا حامی تھا اور اسٹالین اسے صرف روس تک محدود رکھنا چاہتا تھا۔ اس اختلاف میں اسٹالین کامیاب ہوا اور ٹراٹسکی جلاوطن کر دیا گیا۔

اس لئے آپ کا یہ دعویٰ کہ اسٹالین کا مقصود اس جنگ سے یوروپ میں اشتراکیت کو پھیلانا ہے، اسٹالین کے اس مقصود کے منافی معلوم ہوتا ہے جس کی بنا پر اس نے ٹراٹسکی کی مخالفت کی تھی آپ اس سے بھی واقف ہوں گے کہ اسٹالین نے حصول اقتدار کے بعد اپنی پنج سالہ اسکیم پیش کی جس سے

مقصود روس کو کاشتکاری کی سطح سے بلند کر کے ایک صناع ملک بنانا تھا - پھر کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ روس صحیح معنے میں صناع ملک بن گیا ہے اور کیا دنیا کا کوئی ملک اتنے قلیل عرصہ میں اپنی صنعت وحرفت کو اس قدر ترقی دے سکتا ہے کہ وہ اس سے بے نیاز ہو کر کسی اور نئی اسکیم کی طرف متوجہ ہو سکے - مدعا یہ کہ اگر اسٹالین کا واقعی مقصود وہی ہو جو آپ کہتے ہیں یعنی اشتراکیت کو دنیا میں پھیلانا، تو کیا روس کی صنعت وحرفت آخری حد تک ترقی کر چکی ہے اور اب اسٹالین کو اس کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت نہیں - علاوہ اس کے ایک اور پہلو بھی بحث کا ہے - ایک ملک کی صنعتی ترقی کو آپ اس کے تجارتی پہلو سے علٰحدہ نہیں کر سکتے، یعنی اگر کسی ملک کی صنعتی پیداوار بڑھ رہی ہے تو قدرتاً وہ یہ بھی چاہے گا کہ دنیا کے بازاروں میں اس کی کھپت ہو اور یہ خیال بجائے خود سرمایہ دارانہ پہلو رکھتا ہے اور اشتراکیت کے منافی ہے -

آپ نے موجودہ جنگ کا پس منظر پیش کرنے میں بھی چونکہ اسٹالین کی اسی پالیسی کو سامنے رکھا ہے جس سے مجھے تھوڑا سا اختلاف ہے، اس لئے ہو سکتا ہے کہ دوسرا فریق یہ کہے کہ جس طرح ہٹلر اپنے چھنے ہوئے علاقے واپس لینا چاہتا ہے، اسی طرح اسٹالین بھی چاہتا ہے اور اب دونوں ایک ہی اصول آمرانہ پر عمل کر رہے ہیں بہر حال یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا، لیکن اس میں شک نہیں کہ روس کی حالت ابھی اتنی قابل اطمینان نہیں ہے کہ وہ خود اندرون ملک مسائل سے قطع نظر کر کے دوسرے ملکوں میں تبلیغ اشتراکیت کے لئے جنگ پر آمادہ ہو جائے

اسٹالین سے پہلے میں نے جن ڈکٹیٹروں کا ذکر کیا ہے ان سے مراد لینن اور ٹراٹسکی تھے -

---

چند سیاسی کتابیں

جدید دستور کا خاکہ :- از جناب زین العابدین احمد صاحب مترجمہ جناب شفیق الرحمٰن صاحب قدوائی بی - اے (جامعہ) یہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا ایک پمفلٹ ہے، جو موجودہ سیاسی گتھی کو سمجھنے کے لئے بہت ضروری ہے قیمت ۲ر

دیہی جنبش :- دیہی جنبش اور دیہات کی نئی تعمیر پر ایسی کتاب جو دیہات سدھار کے کام کرنے والوں کے لئے مفید ہے از جی - سی کمار پا صاحب - قیمت ۲ر

ہندوستان میں زراعت کا مسئلہ :- از زین العابدین مترجمہ مولوی شفیق الرحمٰن صاحب قدوائی بی - اے (جامعہ) اس مختصر سے پمفلٹ میں کاشتکاروں کی کثرت اور زمین کی قلت کسانوں کے افلاس اور اُنکے قرضے وغیرہ سے بحث کی گئی ہے قیمت ۴ر

شہری آزادی :- اس کتاب میں بیرونی ممالک کے انجمنوں اور اُنکے شہری حقوق کا ذکر کرتے ہوئے اعداد و شمار سے بتایا گیا ہے کہ کس طرح موجودہ حکومت ہندوستانیوں کو اُنکے حقوق سے محروم کرنے کے درپے ہے جن سے اُنکی زندگی وابستہ ہے - قیمت ۴ر

منیجر نگار لکھنؤ

مکتوبات نیاز

ماشاء اللہ، کیا کہنا، "جبیں سائی" کا نام آپ نے "قسمت آزمائی" رکھا ہے۔ تمایر انسانی کی ناکامی کوئی ایسا تجربہ نہیں جس پر حیرت کی جائے، لیکن "بندگی" میں بھلا نہ ہونا، عبد و معبود دونوں کے لئے شرمناک ہے۔

مجھے اس سے اختلاف نہیں کہ آپ اس بات پر قایم رہیں جسے آپ مناسب سمجھتے ہیں، لیکن جب عزتِ نفس اور غیرت و خودداری کی قربانی کا سوال ہو تو میرے نزدیک دیر و حرم دونوں برابر ہیں انسان اگر خود اپنا مسجود نہیں بن سکتا تو پھر وہ اس قابل بھی نہیں کہ اس کا سجدہ قبول کیا جائے

یقیناً مجھے آپ کے موجودہ حالات سے آگاہی حاصل کرنے کے لئے، قریب تر مطالعہ کی ضرورت ہے، لیکن میں اسکی تمنا کبھی نہ کروں گا، کیونکہ مجھے پھر اور زیادہ تکلیف ہوگی۔ جب تک آپ سے دور ہوں، "تاویلیں کرنے کا تو موقعہ حاصل ہے آپ سے نزدیک ہونے کے بعد یہ سہارا بھی ہاتھ سے جائے گا

تن آسانیوں کی فکر میں سر کھپانے والوں کو یہ کیونکر سمجھاؤں کہ "پھٹے ہوئے گریبان" اور "دامانِ چاک چاک" پر کتنی شاہانہ آسودگی پنہاں ہے ـــ آجکل شاعر چند خزف ریزوں کے لئے ادھر اُدھر مارا پھرتا ہے، حالانکہ اس سرزمین ہند سے یہ کہنے والے بھی پیدا ہوئے ہیں کہ

دنیا اگر دہند نہ جنبم زجائے خویش

پھر کیوں نہ آپ ہی اس "آوازۂ منصور" کی تجدید کریں ؟

جب سے ہندوستان کے شاعر نے "آوارگی" کا پیشہ اختیار کیا ہے، آپ ہی بتائیے کہ سکنڈ کلاس کا کرایہ لیکر نیچے درجہ میں سفر کر کے کتنی دولت اس نے جمع کر لی ہے۔ وہ گاتا ہے، ناچتا ہے، تھرکتا ہے اور پاتا کیا ہے ؟ مصارفِ سفر، اور شاید دیسی شراب کی ایک بوتل!

یہ تو ہوئی کمائی، اب دیکھئے وہ کھوتا کیا ہے ؟ - لیکن معاف فرمایئے میرا یہ سوال ہی غلط ہے ـــ اسکے پاس ہے کیا جو کھوئے گا ـــ میں خط ختم کرتا ہوں، کیونکہ مجھے اب تنفص پیدا ہو چلا ہو۔ ممکن ہو آپ کی شان میں بھی کوئی نازیبا بات منہ سے نکل جائے۔ بایئے آپ بھی مارے مارے پھریئے۔ کون منع کرتا ہے ـــ تا کجا خواہم فشردایں دامنِ نمناک را !

یوں کہنے میں آپ کو "قبلۂ حاجات"، "کعبۂ مراعات" سب کچھ لکھ دوں، لیکن جانتا ہوں کہ ہے یہ سب "خرافات"! آپ کو میں اپنا دوست سمجھتا ہوں اور بغیر اعترافِ احسان کے آپ کے الطاف سے فایدہ اُٹھا سکتا ہوں۔ کاش کہ میں بھی اس قابل ہوتا کہ آپ مجھے اپنا دوست سمجھ سکتے! "الانف بالانف" کا اصول، شریعت کا اصول ہے، کچھ کیونہیں سکتا ورنہ وہ دشمنی ہو یا دوستی، دینے یا لینے کی چیز صرف جان ہی ہے۔ پھر اگر میں یہ کہوں بھی کہ سوائے "خشک جان" کے میرے پاس کیا ہے، جو آپ کی محبت کے عوض پیش کر سکوں تو آپ کو اس کی قدر کیوں ہونے لگی اور ہونا بھی نہ چاہئے کیونکہ، جان کا لطف اسی وقت تک ہے جب تک ہم کسی کو "جانِ جاں" کہہ سکیں۔ یہ نہیں تو پھر جان میں کیا دھرا ہے!

خیر، اس کو چھوڑئے۔ طبیعت اس وقت ذرا ضلع جگت کی طرف مایل تھی، اس لئے چند مہمل باتیں بک گیا۔ اب یہ بتائیے ــــ میں مذاق نہیں کرتا، سنجیدگی سے پوچھتا ہوں کہ آپ کیوں مجھے موردِ الطاف بنانا چاہتے ہیں۔ غالب کی طرح "طالعِ محسن کُش" تو نہیں رکھتا، لیکن ضرور جانتا ہوں کہ مجھ سے کسی کو "لہنا" نہیں ہے

جس حد تک زبانی تسکین و استمالت کا تعلق ہے، یقیناً میں آپ کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ رہ گیا، اصل مداوا سو وہ نہ آپ کے بس کی بات ہے نہ مجھے اس کے اعتراف کی ضرورت ــــ باتوں سے بھی کام چل جاتا ہوگا، لیکن میں تو صرف کام کی بات چاہتا ہوں ــ معلوم نہیں آپ کے پاس یہ چیز ہے یا نہیں، خدا حافظ!

آپ کا مقالہ پڑھا، جنگ کے وقت آپ سر چھپا کر بیٹھ رہنے کا مشورہ دیتے ہیں، حالانکہ میرے نزدیک یہ زمانہ صرف اس درس کا ہے:

"مرغابی شو کہ کار با طوفان ست"

علوم جدیدہ نے وقت کی عجیب عجیب تقسیمیں کی ہیں۔ شاعرانہ لمحے ــ نفسیاتی لمحے ــ طبیعیاتی لمحے اور خدا جانے کیا کیا ــ لیکن میرے نزدیک ایک لمحہ اور بھی آتا ہے جسے "انفجاری" کہنا چاہئے۔ اس سے میری مراد (Bursting Point) سے ہے۔ یعنی پھوٹ پھٹ کر اپنے آپ کو واشگاف کر دینے کا لمحہ! "بالم بہ خود چنانکہ نہ گنجم بہ بندِ تو" کا لمحہ!ــ

میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت ہندوستان کے سامنے یہی لمحہ آیا ہے ــــ آپ بھی غور کیجئے، شاید اس میں کچھ صداقت نظر آئے۔ تفصیل بعد کی چیز ہے، پہلے "اجمال" میں تو میرا آپ کا اتفاق ہو جائے۔ چلتے چلاتے نسبتی کا ایک شعر سن لیجئے:

چارہ نتواں کرد دردِ کہنہ و دیرینہ را
دست بر دل می نہادم پارہ کردم سینہ را

ابھی ابھی لفافہ ملا، غزل پڑھی اور کئی بار پڑھی۔

میں کچھ عرصہ سے محسوس کر رہا ہوں کہ آپ کا ذوقِ تغزل بہت خطرناک ہوتا جا رہا ہے، آپ کے لئے بھی اور دنیا کے لئے بھی۔ وہ یوں کہ اگر آپ اس سلسلہ میں "واقعی زندگی" کو پا گئے تو بقول آپ کے اس کی بری گت بن جائے گی اور یہ اس لئے کہ بے سمجھے بوجھے لوگ تقلید شروع کر دیں گے اور غزل نام ہو جائے گا ایک ایسے مرکب ناقص کا، جس کے الفاظ تو سب ہندوستانی ہوں گے، لیکن معنے کے لحاظ سے وہ بالکل (No man's land) کی چیز ہوگی۔

ایک تو ہے خالص فلسفۂ عشق، دوسری چیز ہے (فلسفہ + عشق)، آپ تو پیش کر رہے ہیں وہ اور دنیا سمجھے گی یہ۔ آپ جانتے ہیں اس کا نتیجہ کیا ہوگا — نہ عشق عشق رہے گا نہ فلسفہ فلسفہ، یعنی نہ جینے کا مزہ باقی رہے گا نہ مرنے کا!

یہ تو معلوم ہی ہے کہ اس شعلہ بیانی سے کسی نہ کسی دن آپ کے سینہ سے دھواں اٹھنے والا ہے، لیکن

ہم دیکھ کر بھی دیکھ سکیں حسنِ یار کو
اتنی طویل فرصتِ نظارگی نہیں

میں اس باب میں "نظریۂ اضافیت" کا قایل ہوں جو وقت و زمان میں بھی انحنا (Curvature) تسلیم کرتا ہے۔ لیکن آپ کیوں ماننے لگے، آپ مجھی کو اپنی غزل سنائیں گے، اور صرف اس نیت سے کہ پرانے زخم پھر ہرے کر لوں بہتر ہے — سنائے جائیے!

معاف فرمائیے، مجھے صدارت و دارت کا شوق نہیں۔ یہ کیا ضرور ہے کہ جب میں چلوں تو میرے چہرہ پر سرچ لائٹ بھی پڑتی رہے۔ میں زندگی کی ان شاہراہوں سے گزر رہا ہوں جو خود بہت روشن ہیں۔ روشنی کی ضرورت گلیوں سے گزرنے والوں کو ہوتی ہے، انھیں کو یہ نوید دیجئے۔ علاوہ اس کے ایک بات اور بھی ہے۔ وہ یہ کہ میں شاعر نہیں ہوں اور صحبت شعر میں ایک غیر شاعر کی شرکت ہی کوئی معنی نہیں رکھتی، چہ جائیکہ صدارت! بہر حال آپ کی اس عنایت کا شکر گزار ہوں اور اس سے فایدہ نہ اٹھا سکنے پر متاسف!

حضرت سلامت، سچ کہتا ہوں آپ کی یہ "سلامت روی" میری جان لئے بغیر نہ رہے گی، ظاہر ہے کہ آپ کا یہ ٹھہراؤ، یہ جمود اور یہ عاقلانہ پس و پیش ایک دن برداشت سے باہر ہو جائے گا اور میں خودکشی کر لوں گا۔ غضب خدا کا پورا ایک سال ختم ہونے میں آیا اور آپ اب تک یہ فیصلہ نہ کر سکے کہ دن کو دن کہنا مناسب ہے یا نہیں۔ اچھا تو آپ دن کو رات ہی کہئے، لیکن خدا کے لئے کہئے تو، یہ ٹانکے تو کسی طرح ٹوٹیں، یہ تو معلوم ہو کہ آپ کی قوت گویائی سلب نہیں ہوئی۔ کیا میرے مرنے کے بعد آپ اپنی زندگی کا ثبوت دیں گے؟

آپ جانتے ہیں کہ انتظار سے مجھے نفرت ہے، یہاں تک کہ جنت بھی مجھے اسی لئے منظور نہیں کہ اس میں ایک لانہایت انتظار کی ضرورت ہے۔ پھر جو آپ نے میرے معاملہ کو جھلا رکھا ہے، تو کیا آپ سمجھتے ہیں، میں اس سے بہت خوش ہوں گا۔ سچ کہتا ہوں کہ میں بہت ناخوش ہوں اور اگر تھوڑا سا نا معقول خیال آپ کی بزرگی کا نہ ہوتا، تو میں آپ کو خدا جانے کیا کیا کہہ ڈالتا

بہرحال جو کچھ آپ کرنا چاہتے ہوں وہ اسی ہفتہ میں ہو جانا چاہئے، ورنہ اس کے بعد —— اب آپ کیوں کہلواتے ہیں کہ کیا ہوگا۔

اللہ، اللہ، آپ تشریف لا رہے ہیں! ڈر رہا ہوں کہیں ساکنانِ ملاء اعلیٰ کی نظر نہ لگ جائے، حجرۂ فلک سے جھانکتی جھانکتی کہیں حوریں نہ زمین پر آ رہیں، کہیں کروبیانِ عالمِ قدس اپنی تسبیح و تہلیل نہ بھول جائیں —— اور —— کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ آتے آتے رہ جائیں!

اے، کیوں بیوقوف بناتے ہو۔ تم اور وعدہ پورا کرو! سچ کہتا ہوں جس دن ایسا ہوگا تو آسمان پھٹ پڑے گا، زمین شق ہو جائے گی اور ہم تم دونوں اس میں سما جائیں گے۔ آپ تو مہربانی فرما کر وہیں جمے رہئے جہاں آپ نصب کر دئے گئے ہیں۔ گلگشت کی ضرورت نہیں۔ چمن والے یونہی تباہ ہیں۔

مکرمی۔ گرامی نامہ کا جواب مجھے ابھی نہ دینا چاہئے تھا لیکن آپ کے تقاضہ سے ڈرتا ہوں، اس لئے بغیر سوچے سمجھے جواب دے رہا ہوں، معلوم نہیں صحیح یا غلط۔

بیشک اُن سے میرے مراسم ہیں، لیکن کس حد تک۔ اس کا علم غالباً آپ کو نہ ہوگا۔ آپ کہیں گے پھر لکچر بازی شروع کر دی لیکن کیا کروں دنیا میں یہ حماقت بھی گاہے گاہے کرنا پڑتی ہے۔

دوستی کے مدارج کا تو میں قایل نہیں، کیونکہ اس کی صورت تو بالکل ایمان کی سی ہے "لا یزید و لا ینقص" لیکن شناسائی کے مدارج اتنے ہی ہو سکتے ہیں جتنے انسان دنیا میں پائے جاتے ہیں۔ پھر یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ میں نے ان کو دوست کہنے کی عزت کبھی حاصل نہیں کی اسلئے اگر میں یہ بتانا بھی چاہوں کہ میری ان کی شناسائی کا درجہ کیا ہے تو شاید کامیاب نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کا رنگ ہر صبح و شام بدل سکتا ہے بلکہ یہاں تک کہ اگر آج ہے تو کل نہیں —— اور —— آپ نے بات وہ کہی جو ایک دوست ہی سے کہی جا سکتی ہے۔

اس لئے اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں ان سے ذکر کروں، تو پہلے اس کا موقعہ دیجئے کہ میں اُن سے دوستی پیدا کر لوں۔ گو اس کوشش میں دل و دماغ دونوں کا خون مجھے کرنا پڑے گا لیکن آپ کی خاطر یہ بھی گوارا کروں گا۔ بہرحال جلدی نہ کیجئے اور مجھے کم از کم اتنی مہلت ضرور دیجئے کہ خود اُن کے ذرائع و وسایل کی حقیقت معلوم کر لوں۔

اگر وہی کچھ نہ نکلے تو پھر یہ کوشش و کاوش بیکار ہے۔

حضرت، میں اُن لوگوں میں کہاں ہوں جنھوں نے "ساقیِ کوثر" سے شراب پینے کا فتویٰ حاصل کیا ہے، میرا شمار تو ان تشنہ کاموں میں ہے جن کا نقطۂ نظر یہ ہے:

افقہا پُر از ابر بہمن، ہہی، 　　سفالینہ جام من از مے تہی

جہاں از گل و لالہ پُر بوے و رنگ 　　من و حجرہ و دامنے زیرِ سنگ

یہ آپ سے کس نے کہدیا۔ اور کسی نے کہا بھی تھا تو آپ نے مجھے اتنا خوش نصیب کیوں سمجھ لیا!

میری ان کی صحبت، یقین کیجیے، حسرتِ "جلوۂ برق شرابِ گاہ گاہی" سے زیادہ نہیں اور وہ بھی اتنے رکھ رکھاؤ کے ساتھ کہ اگر میں انھیں دیکھوں تو وہ نگاہ نیچی کرلیں اور وہ دیکھیں تو میں شرما جاؤں!

افسوس ہے کہ مجھی کو زیادہ جرأت نہیں، ورنہ ان کی بزم میں تو "پاکوبی" کا اذنِ عام ہے۔ بہرحال آپ تشریف لائیے، میں آپ کا تعارف ان سے کرادوں گا۔ خدا کرے میری حسرتیں آپ ہی نکال لیں، لیکن یہ سمجھ لیجئے کہ

وصلش از شعلہ می چکاند آب!

آپ اور قصدِ کشمیر! خدا کی شان ہے، لیکن سچ کہتا ہوں ایک ایک سانس کا حساب لونگا، ایک ایک نگاہ کا اقتضا کروں گا۔ یہ بھی کوئی تماشہ ہے کہ آپ تو وہاں پہونچکر مزے اُڑائیں اور مجھے تڑپنے کے لئے یہاں تنہا چھوڑ جائیں!

نمی ترسی ز آہِ آتشینم!

جب میں ہی وہاں نہ پہونچ سکوں تو آپ کو کیا حق جانے کا ہے، جناب، یہ کوئی جنت تو ہے نہیں کہ جدھر دیکھئے کہنہ مشق نمازی اپنی خشک و عبوس روحیں لئے ہوئے حوروں سے کلمۂ شہادت پڑھوا رہے ہیں، یہ کشمیر ہے، نائے و سرود والا کشمیر، چنگ و رباب والا کشمیر، جہاں گناہ کو گناہ سمجھ کر کیا جاتا ہے۔ پھر آپ کو اتنی توفیق کہاں!

یقیناً اپریل میں وہاں پہونچ جانا چاہئے تاکہ آپ ہی کے سامنے وہاں کی برف گھل گھل کر پھولوں سے لبریز دامنِ کوہ کو پیش کر سکے۔ کشمیر میں کسی دوست کے یہاں قیام کرنا اپنے ساتھ دشمنی کرنا ہے۔ وہاں تو یہ سمجھ کر جائے کہ سوائے اپنی ذات کے ساری دنیا حرفِ غلط ہے اور یہ بات اسی وقت حاصل ہوسکتی ہے، جب آزادی کا مفہوم "ہمیں جائے من و جائے تو باشد" کے علاوہ کچھ نہ ہو! پھر یہ لطف کسی کے یہاں قیام کرنے میں کیونکر حاصل ہوسکتا ہے۔ دوست لاکھ بے تکلف ہو، لیکن اُس حوّا کا کیا علاج ہے جو گھر کے اندر ہی بیٹھی بیٹھی آپ اور آپ کے دوست دونوں کا دل خون کردے گی۔

جب زمانہ قریب آئے تو پھر اطلاع دیجئے گا۔ مجھے تو اس ذکر میں لطف آتا ہے!

باب الاستفسار

کمیونزم

(جناب اسد اللہ صاحب - کرتارپور)

مہربانی فرماکر مختصراً کمیونزم پر تاریخی و اصولی حیثیت سے روشنی ڈالئے اور اسی کے ساتھ یہ بھی بتائیے کہ سیاسیات میں سوشلزم، کمیونزم، انارکزم وغیرہ بہت سی (ism) رکھنے والی اصطلاحیں کتنی ہیں اور کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ آپ ان سب کو یکجا کرکے ایک رسالہ کی صورت میں شایع کردیں۔

(نگار) ا۔ آپ کی تجویز بہت مناسب ہے۔ کتابی صورت تو خیر کیا لیکن نگار کی آیندہ اشاعت میں تمام ان اصطلاحات کا مفہوم پیش کردوں گا جو (ism) پر ختم ہوتی ہیں، ردیف وار اس قسم کی اصطلاحات کی فہرست ملاحظہ ہو:۔

Absolutesm	= استبدادیت	Guild Socialism	گلڈ اشتراکیت =
Activism	= عملیت	Imperialism	ملوکیت =
Anarchism	= فوضویت	Isolationism	اجتنابیت =
Anti-Semitism	= ضد سامیت	Marxism	مارکسیت =
Bolshevism	= بالشویت	National Socialism / Nazism	نازیت =
Caesarism	= قیصریت	Nihlism	عدمیت =
Capitalism	= راس المالیت یا متاعیت	Pacifism	امنیت =
Centralism	= مرکزیت	Pan Islamis	ہمہ اسلامیت =
Chauvinism	= شادینت	Socialism	اشتراکیت =
Clericalism	= کلیسائیت	Syndicalism	صنعی اشتراکیت =
Collectivism	= اجتماعیت	Zionism	صیہونیت =

اشتمالیت = Communism فسطائیت = Fascism

اقطاعیت = Feudalism

۲ - کمیونزم یا اشتمالیت ایک انقلابی تحریک ہے جس کا مقصود یہ ہے کہ سرمایہ داری[1] کے نظام کو فنا کرکے "آمریت پرولتاری" (Proletarian Dictatorship) قایم کردی جائے - یعنی سرمایہ داروں کے اقتدار کو مٹا کر، مزدور جماعت کی حکومت اس کی جگہ رواج دیجائے -

جب ۱۹۱۷ء میں روس کی انتہا پسند اشتمالی جماعت یعنی بالشیوکوں[2] کو اقتدار حاصل ہوا، تو ان کے لینن[3] نے اس جماعت کا نام کمیونسٹ رکھا اور ۱۹۲۰ء میں بمقام ماسکو (کمیونسٹ) حکومت کے قیام کا اعلان کردیا گیا -

لینن کے قایم کئے ہوئے نظریوں کے مطابق یہ لوگ جمہوری اشتراکیت (Democratic Socialism) کے بھی مخالف ہیں اور اشتراکیت پسندوں کو بھی سرمایہ داروں کا آلۂ کار سمجھتے ہیں - ان کا خیال ہے کہ جس چیز کو آجکل جمہوریت یا اشتراکیت سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ فی الاصل سرمایہ داروں ہی کا بنایا ہوا ڈھونگ ہے جس کے ذریعہ سے وہ قوم کی دولت کو اپنے صرف میں لاتے ہیں - ان کے نزدیک صحیح معنی میں اشتراکیت اسی وقت پیدا ہوسکتی ہے جب پرولتاری حکومت قایم ہوجائے اور سرمایہ یا سرمایہ داری کا وجود ہی دنیا سے مٹ جائے -

ماسکو میں جب اشتمالی حکومت کے قیام کا اعلان ہوا تو انھوں نے صرف روس ہی تک اس انقلاب کو محدود رکھنا نہیں چاہا، بلکہ تمام دنیا میں انقلاب پیدا کرنے کی کوششیں شروع کردیں - اس پہلے دورِ اشتمالیت میں جس کا لیڈر لینن تھا چار سال تک خانہ جنگیاں (Civil War) رہیں اور دوسرے ملکوں میں بھی اس تحریک کو رواج دینے کی سعی کی گئی،

---

[1] Proletariat کی ضد ہے - بورژوا (Bourgeoisie) کا - بورژوا فرانسیسی لفظ ہے جسے پیروانِ کارل مارکس کی اشتراکیت پسند جماعت نے "سرمایہ دار طبقوں" کے لئے وضع کیا تھا - اسی کا مقابل پرولتاری ہے جس سے مراد وہ طبقہ ہے جو کوئی ملکیت اپنے پاس نہیں رکھتا اور صرف محنت مزدوری سے پیٹ پالتا ہے -

[2] بالشیوک (Bolsheviki) روسی لفظ ہے جس کے معنے اکثریت کے ہیں، چونکہ انتہا پسند اشتراکیوں نے پارٹی کانگرس میں زیادہ رائیں حاصل کرکے اکثریت حاصل کرلی تھی اس لئے انھیں بالشیوک کہنے لگے -

[3] لینن جس کا پورا نام (Lenin Vladimir Ilyitch) تھا، ۲۲ اپریل ۱۸۷۰ء کو بمقام سمبرسک (Simbirsk) پیدا ہوا - اس کا باپ ایک کالج میں معلم تھا - یہ قانون کی تعلیم حاصل کرکے مزدوروں کی تحریک میں شامل ہوگیا چونکہ یہ کارل مارکس (مشہور اشتراکی) کے اصول کا پابند تھا اس لئے روس کی انتہا پسند اشتراکی جماعت کا لیڈر ہوگیا - لیکن ۱۹۰۰ء میں فرانس کی طرف جلاوطن کردیا گیا اور ۱۹۱۷ء تک اسی جوار میں اپنے مقاصد کی تبلیغ کرتا رہا - (بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۷۰ پر ملاحظہ فرمایئے)

لیکن جب سنہ ۲۳ء میں یہ دور ختم ہوا تو اس وقت لینن ہی کی جماعت برسر اقتدار تھی۔ اس نے ایک نئی اقتصادی پالیسی قایم کی جس میں چھوٹی چھوٹی صنعتوں اور تجارت کو ترقی دینے کے لئے پرائویٹ حقوق بھی لوگوں کے تسلیم کئے گئے، اس پالیسی کو اصطلاح میں نیپ (NEP[1]) پالیسی کہتے ہیں۔

جب سنہ ۲۴ء میں لینن کا انتقال ہو گیا تو وہاں دو جماعتیں پیدا ہو گئیں ایک اسٹالین کی سرکردگی میں، دوسری ٹراٹسکی کی قیادت میں۔ اسٹالین کہتا تھا کہ روس کی بالشیوک تحریک کو صرف فی الحال ملک ہی کے اندر محدود رکھنا چاہئے اور ٹراٹسکی کہتا تھا کہ ساری دنیا کو انقلاب کی دعوت دینا چاہئے لیکن اسٹالین کو کامیابی ہوئی اور ٹراٹسکی جلاوطن کر دیا گیا۔ یہ تھا اشتمالیت کا دوسرا دور

تیسرا دور سنہ ۲۷ء سے شروع ہو کر سنہ ۳۵ء میں ختم ہوتا ہے۔ اس میں پنج سالہ اسکیم خاص اہمیت رکھتی ہے جس کی رو سے روس ایک کاشتکار ملک سے صناع ملک میں تبدیل ہو گیا۔ اور روس سے باہر جو کمیونسٹ جماعتیں تھیں، ان کی قوت بھی زیادہ تر نظریوں کی تبلیغ یا انتخابات کی سرگرمی میں صرف ہوئی۔ خود روس کے اندر البتہ اسٹالین کو اعتدال پسند سوشلسٹوں کا مقابلہ سخت کرنا پڑا، جنھیں وہ اشتراکی فاسسٹ جماعت اور دشمن نمبر (۱) کے نام سے یاد کرتا ہے۔ اس کے بعد اسٹالین کو ایک ڈکٹیٹر کی حیثیت حاصل ہو گئی۔

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۶۹)

جب سنہ ۱۷ء میں روس کے اندر انقلاب شروع ہوا تو لینن نے پھر وہاں پہونچنا چاہا۔ جرمنی، چونکہ روس کے انقلاب سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا، اس لئے اس نے لینن کو ایک بند گاڑی میں حفاظت کے ساتھ وہاں بھیجدیا۔
یہ اپریل سنہ ۱۷ء میں پٹرسبرگ پہونچا اور بالشیوک جماعت کی قیادت کرنے لگا۔ اس کے بعد ٹراٹسکی کی مدد سے اس نے جولائی سنہ ۱۷ء میں کرنسکی (Kerensky) کی اعتدال پسند حکومت کو الٹ دینا چاہا لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ نومبر سنہ ۱۷ء کو پھر کوشش کی اور کامیاب ہوا۔ یہ کونسل کا صدر ہو گیا اور پرولتاری امریت، مزدوروں اور سپاہیوں کے نمایندوں کے ہاتھ میں آگئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب جنگِ عظیم جاری تھی اور روس میں اندرونی خانہ جنگیوں کی وجہ سے سخت انتشار پایا جاتا تھا، اس لئے جرمنی سے پیچھا چھڑانے اور تحریک انقلاب پر تمامتر توجہ صرف کرنے کے لئے لینن نے جرمنی اور آسٹریا سے معاہدۂ برسٹ لٹوسک (Brest Litovsk) کے مطابق صلح کر لی۔
روس میں یہ خانہ جنگیاں سنہ ۲۱ء تک جاری رہیں جن میں آخرکار لینن کو کامیابی حاصل ہوئی۔ سنہ ۲۲ء میں ایک عورت نے جو بالشیوک تحریک کی مخالف تھی، لینن کو گولی کا نشانہ بنایا، ہر چند یہ مرا تو نہیں لیکن اس کی صحت بہت خراب ہو گئی اور سنہ ۲۳ء میں بیمار پڑ کر ۲۱ جولائی سنہ ۲۴ء کو مر گیا۔

[1] "NEP" اختصار ہے "Novaya Ekonomitcheskaya Politica" کا جس کے معنے ہیں (New Economic Policy) یعنی اقتصاد جدید کی پالیسی۔

چوتھا دور ۳۵ء سے ۳۸ء تک قایم رہا اور اس دور میں پاپولر فرنٹ پالیسی[1] (Popular Front Policy) کو سامنے رکھا گیا۔ اس سے مقصود یہ تھا کہ فاسسٹی اور نازی تحریک کو دبانے کے لئے جمہوریت، اشتراکیت اور اشتمالیت سب متفقہ طور پر کوشش کریں۔ چنانچہ فرانس میں بھی ۱۹۳۶ء میں پاپولر فرنٹ گورنمنٹ قایم ہوئی اور اس کے بعد اسپین میں بھی، لیکن وہاں ۳۸ء کے شروع میں ختم ہو گئی اور یہاں اسے جنرل فرانکو نے ختم کر دیا۔ خود روس کے اندر بھی اسٹالین کی پالیسی کے خلاف سازشیں ہوئیں، لیکن اسٹالین نے ان کو نہایت سختی سے دبا دیا۔

پانچواں دور اشتمالیت کا موجودہ جنگ کے وقت سے شروع ہوتا ہے اور جرمنی کے ساتھ روس کی شرکت نے اسکو عجیب معمہ بنا دیا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اب اشتمالیت روس میں ختم ہو گئی ہے اور ڈکٹیٹرشپ کا وہی دور وہاں شروع ہوا ہے جو جرمنی یا اٹلی میں پایا جاتا ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ اسٹالین اب بھی ساری دنیا میں اشتمالیت کو رواج دینے کا حامی ہے اور اب بزور شمشیر یوروپ میں اسے پھیلانا چاہتا ہے۔

(جناب سید اخلاق حسین صاحب - اجمیر)

جناب سیماب اکبر آبادی کا ایک مصرعہ ہے:

گنجایشِ جہل و صد صفر باقی ہے

جس میں صفر بہ فتحِ فا استعمال ہوا ہے۔ کیا یہ صحیح ہے۔

اسی طرح جناب جوش کی ایک نظم ہے جس کا عنوان "پیغمبری و کافری" ہے۔ اس میں انھوں نے ابتری، داوری اور خودسری کے قوافی کے ساتھ ایک جگہ شاعری قافیہ باندھا ہے:

زمیں پہ کفر و بغاوت کی شاعری بھی رہے

اس کی بابت کیا رائے ہے۔

(نگار) جناب سیماب نے صفر (Zero) کے معنی میں استعمال کیا ہے اور اس کا صحیح تلفظ صِفْر بہ سکونِ فا ہے۔ سیماب صاحب کو سہو ہو گیا ہوگا، ورنہ یہ ایسی بات نہ تھی کہ ان کے علم سے باہر ہوتی۔ اسی طرح حضرت جوش کو بھی یہ خیال نہ رہا کہ شاعری کی عین مکسور ہے اور ابتری وغیرہ کے ساتھ اس کو ہم قافیہ بنانا ٹھیک نہیں۔

---

[1] (Popular Front Policy) سے مراد وہ پالیسی ہے جس کا مدعا یہ تھا کہ اشتراکیت، اشتمالیت اور جمہوریت سب نازی اور فاسسٹی تحریک کی مخالفت کریں۔

مطبوعات موصولہ

۱۔ نوائے کارگر
۲۔ آتش خاموش
۳۔ چراغاں

جناب احسان دانش کی نظموں کے مجموعے ہیں جنھیں مکتبۂ دانش مزنگ لاہور نے شایع کیا ہے۔ دانش کی نظموں کے متعلق اظہار خیال، جانی بوجھی بات کو دُہرانا ہے۔ دانش کی شاعری ادب کے موجودہ رجحانات کی ایسی نمایاں مثال ہے کہ اگر ہم چاہیں تو اسے معیاری صورت سے پیش کر سکتے ہیں کیونکہ موجودہ انقلابی شاعری کے دور میں ایسے شاعر جن کی شاعری کو "اپنی بیتی" کہا جا سکتا ہے، بہت کم ہیں۔

دانش کے جذبات خالص اس کے ماحول کی پیداوار ہیں، محض انعکاسی آگاہی کا نتیجہ نہیں، اسی لئے اس میں اقبال جوش ہے، التہاب ہے اور وہ "داشگافی" جو خود نشتر کھائے بغیر پیدا نہیں ہو سکتی۔ اسلوب شاعری کے لحاظ سے دانش یقیناً اقبال اسکول ہی کا شاعر ہے اور جوش کا نقش ثانی، لیکن دوسروں کی طرح وہ "متضاد و متوارث" پیام کا حامل نہیں۔ وہ جو کچھ کہتا ہے اس میں حال سے زیادہ مستقبل کی حقیقتیں پنہاں ہیں اور اس کا نقطۂ نظر افقِ حجاز نہیں بلکہ افقِ انسانیت ہے اور اس لئے اس کی شاعری تنگ نظری سے یکسر پاک ہے ــــ دانش ابھی منازل تکمیل سے گزر رہا ہے اور اس کے اندر ایک ایسا شاعر تشکیل پا رہا ہے جس کی حقیقت ہم کو ابھی نہیں کچھ دنوں کے بعد معلوم ہوگی، اس لئے اس کی موجودہ نظموں کو پڑھکر یہ نہ سمجھئے کہ دانش جو کچھ ہے "اسی قدر" ہے۔ دورِ "رہروی" کے بعد دورِ "رہبری" بھی آیا کرتا ہے اور اگر دانش ناسازگار حالات سے مغلوب نہ ہوا اور اس نے صرف دنیا کی "واہ واہ" کو اپنی "آہ، آہ" کا مقصود حقیقی نہ سمجھ لیا تو اس کا مستقبل یقیناً زیادہ شاندار ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ میں دانش کو یہ مشورہ بھی دوں گا کہ وہ اپنے اندر اور پختگی پیدا کرنے کی کوشش کریں اور کسی شاعر کے کلام کو دلیل راہ نہ بنائیں۔

ان تینوں مجموعوں کی قیمت علی الترتیب عہ ۔ ۸ر ۔ ۸ر ہے۔

نقوشِ سلیمانی

یہ مجموعہ تعویذوں کا نہیں، بلکہ جناب سید سلیمان ندوی کے بعض خطبات و مقالات کا ہے جو اس سے قبل معارف میں شایع ہو چکے ہیں۔ ان مقالات میں اُردو زبان و اُردو ادب سے متعلق مختلف مباحث پر گفتگو کی گئی ہے جو یقیناً بہت مفید ہے۔ لیکن بعض بعض جگہ غیر عالمانہ تنگ نظری سے بھی کام لیا گیا ہے جو شاید کوئی اچھی بات نہیں۔

اس مجموعہ کا آخری حصہ ان مقدمات پر مشتمل ہے جو بعض دواوین یا کلیات پر لکھے گئے ہیں۔ ان میں سے بعض ایسے

نہ تھے جو کتاب میں شامل کئے جاتے، لیکن ادعائے "شرفِ سخن سنجی" کی تکمیل کے لئے شاید یہ ضروری سمجھا گیا۔

یہ کتاب مکتبۂ جامعۂ ملیہ دہلی یا لکھنؤ سے مل سکتی ہے۔ قیمت درج نہیں ہے۔

گل نغمہ جناب عظیم الدین احمد صاحب کا مجموعۂ کلام ہے، جن کی تصویریں تو اس کتاب میں تین جگہ نظر آتی ہیں، لیکن حال ایک جگہ بھی نہیں۔ ابتدا میں کلیم الدین احمد صاحب کا (جو نام سے اُن کے بھائی معلوم ہوتے ہیں) ایک بسیط مقدمہ ضرور ہے لیکن اس سے بھی پتہ نہیں چلتا کہ شاعر کی تاریخ شعر گوئی کیا ہے۔

اس مجموعہ میں بعض نظمیں طبعزاد ہیں اور بعض انگریزی سے لی گئی ہیں۔ لیکن شاعر کی ذہانت کا پتہ دونوں قسم کی نظموں سے چلتا ہے۔ چونکہ عظیم صاحب صوبۂ بہار کے رہنے والے ہیں، اس لئے بعض جگہ غیر مانوس زبان تو بیشک نظر آتی ہے، لیکن مفہوم کے لحاظ سے نامانوس نہیں۔ اس مجموعہ میں جتنی نظمیں ہیں وہ سب منظری یا انتقادی ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کو مطالعۂ جزئیات سے خاص شغف حاصل ہے۔ الفاظ کے انتخاب اور تراکیب کے استعمال سے شاعر کی علمی قابلیت بھی ظاہر ہوتی ہے، لیکن زبان کا صحیح علم نہ ہونے کی وجہ سے کہیں کہیں ناگوار عدم توازن نظر آتا ہے۔ مثلاً ایک شعر ہے:-

زیست آ ماجگہ عزم تسلط ہے عظیم، کچھ بھی ہو جائے ارادے سے نہ ٹل ہونے دے

پہلے مصرعہ کے شاندار الفاظ کے بعد، دوسرے مصرعہ کا "ٹل ہونے دے" کس قدر تکلیف دہ بات ہے۔

اسی مجموعہ میں ایسے ایسے شعر بھی نظر آتے ہیں:-

پھر بہار آئے گی، پھر جوش میں سودا ہوگا ۔۔۔ زخمِ دیرینہ سے پھر خون ٹپکتا ہوگا

کیا کوئی موت ہے غفلت کہ نہ چونکا جائے ۔۔۔ زندگی ہے تو سنبھلنے کا تقاضہ ہوگا

بادِ صرصر نے جو چھوڑے ہیں خزاں میں تنکے ۔۔۔ ڈوبتوں کو انھیں تنکوں کا سہارا ہوگا

ہر چند پہلے شعر میں جوشش کے بعد "میں"، دوسرے شعر میں "نہ چونکا جائے" اور تیسرے میں "چھوڑے ہیں" ضرور محلِ نظر ہیں، لیکن نہ ایسے کہ اشعار کا حسن ختم ہو جائے۔

اس کے پبلشر بی۔ ڈی۔ کھنا، داناپور (پٹنہ) ہیں۔ قیمت درج نہیں ہے۔

یادگارِ جگر منشی رنگ بہادر لعل جگر مرحوم کی غزلوں کا مختصر سا مجموعہ ہے جسے ان کے بھانجے پانڈے سرسوتی پرشاد صاحب نے شایع کیا ہے۔ جگر مرحوم گورکھپور کے رہنے والے تھے اور وہیں وکالت کرتے تھے۔ عمر زیادہ نہ تھی لیکن دق کے مریض تھے اس لئے جتنا جئے بہت جئے اور آخر کار ۳۸ء میں انتقال کر گئے۔

اس مجموعہ میں پروفیسر فراق، پروفیسر مجنوں اور جناب الیاس احمد صاحب ایم۔ اے کی طویل رائیں شامل ہیں اور یہ سب ان کی شاعری کے معترف ہیں۔

مرحوم نے بہت کم غزلیں کہی ہیں، لیکن جتنی کہی ہیں ان میں ہم کو اچھے اچھے شعر نظر آتے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ

وہ شاعری کا نہایت پاکیزہ ذوق رکھتے تھے۔ مثالاً چند اشعار یہاں درج کئے جاتے ہیں:۔

اب تو اغیار بھی کہتے ہیں مجھے سودائی | میں جو کہتا تو کبھی ان کو نہ باور ہوتا
رنگ برہم ہے آج مجلس کا | شور برپا ہے "کون ہے کس کا"
چل دئے سب کے سب سحر کے وقت | رنگ دیکھا گیا نہ مجلس کا

یہ مجموعہ نہایت اہتمام سے شایع کیا گیا ہے اور لائبریرین گورکھپور ہائی اسکول سے ایک روپیہ میں مل سکتا ہے۔

داستانِ عجم نواب نصیر حسین خیالؔ کی تصنیف ہے، جسے شاد بک ڈپو (پٹنہ) نے شایع کیا ہے۔ خیالؔ مرحوم جس پایہ کے ادیب تھے اس کے اظہار کی ضرورت نہیں۔ انھوں نے جو کچھ لکھا ایک خاص تیکھے پن سے لکھا اور پوری تحقیق و جستجو کے بعد لکھا۔ یہ کتاب شاہنامۂ فردوسی پر ایک تبصرہ ہے اور شاید ایسا کہ اُردو میں اس انداز سے کسی نے نہ لکھا ہوگا۔

ابتدا میں پروفیسر رشید احمد صدیقی اور آقائے عباس شوستری کے دو مقدمے بھی شامل ہیں، وہ حضرات جو خیالؔ مرحوم کے لٹریچر یا شاہنامہ سے دلچسپی رکھتے ہیں، ان کے لئے اس کتاب کا مطالعہ لطف و افادہ سے خالی نہیں۔

شاعر کی دنیا جلد اول حیدرآباد کے ۸۰ شعراء کا منتخب کلام ہے مع ان کے حالات کے جسے محمد عظیم الدین محبت بی۔اے (عثمانیہ) نے مرتب کیا ہے۔ اس انتخاب میں وہ شعراء بھی شامل ہیں جو دکن کے باشندے تو نہیں ہیں، لیکن دکن سے وطن ہی کا سا تعلق رکھتے ہیں۔ یہ پہلی جلد ہے اور اس کی ۸۰ شعراء کی فہرست میں اخترؔ، فانیؔ اور ماہرؔ کا نام بھی نظر آتا ہے۔ قیمت درج نہیں ہے اور ملنے کا پتہ یہ ہے: ام۔اے۔این۔ روبرو نظامت کروڑگیری حیدرآباد دکن۔

یوروپ کے تاثرات اس کتاب میں بعض مخصوص حضرات کے وہ تاثرات یکجا کردئے گئے ہیں جو قیام یوروپ کے بعد وہ اپنے ساتھ لائے۔ فہرست میں ہمکو بڑے بڑے پچیس آدمیوں کے نام نظر آتے ہیں (جو شخص یوروپ جائے اس کے بڑا ہونے میں کیا شک ہوسکتا ہے) اور ان میں سے اکثر حیدرآباد ہی سے تعلق رکھنے والے ہیں۔ ان میں اولین نام علامہ عبداللہ یوسف علی کا ہے اور آخری ڈاکٹر حمید اللہ ام۔اے کا۔ چونکہ یہ بیانات مختلف ذوق و خیال کے لوگوں کے ہیں اس لئے کتاب میں کافی تنوع پیدا ہوگیا ہے۔

جناب بدر شکیب اس کے مرتب ہیں اور اس میں شک نہیں کہ انھوں نے اپنی جدت سے کام لیکر ایک اچھی کتاب ملک کے سامنے پیش کی ہے۔ قیمت ۲؎ ہے اور ملنے کا پتہ: سید عبدالقادر اینڈ سنس۔ چارمینار، حیدرآباد دکن۔

ہند کا جدید صوفی مختصر سا تذکرہ ہے مولوی حکیم عبدالاحد صاحب کا جسے پروفیسر سید نواب علی ام۔اے نے مرتب کیا ہے۔ مولوی عبدالاحد صاحب کسمنڈی کے ایک بزرگ تھے اور یہیں لکھنؤ میں ملازم تھے ان کے حُسنِ اخلاق کے اکثر لوگ مداح تھے اور بعض کے نزدیک وہ واقعی صاحبِ دل انسان تھے۔ پروفیسر صاحب نے

ان کے کچھ حالات تو ان حضرت کی قلمی بیاض سے لئے ہیں اور کچھ خود اپنی واقفیت سے قلمبند کئے ہیں۔ اسکی قیمت ۶ر ہے اور ملنے کا پتہ: صدیق بک ڈپو لکھنؤ

عصرِ نو ایک طویل ترجیع بند ہے جناب محمد صادق ضیا کا جسے مکتبۂ قصر الادب آگرہ نے شایع کیا ہے، یہ نظم تبصرہ ہے حالاتِ حاضرہ پر جس سے موجودہ عہد کے رجحاناتِ ادب پر بھی کافی روشنی پڑتی ہے۔ جناب ضیا، اسوقت کے اچھا کہنے والوں میں سے ہیں اور جو کچھ کہتے ہیں اس میں معنویت ہوتی ہے۔ اگر اس کی زبان زیادہ سہل ہوتی تو لوگوں کو زیادہ فایدہ پہونچتا قیمت ۴ر ہے۔

تاریخ جنوبی ہند موضوع نام سے ظاہر ہے اور اس کے مولف جناب محمود خاں محمود ہیں۔ یہ ۴۲۰ صفحات کی ضخیم کتاب ہے جس میں پہلے جنوبی ہند کے جغرافیہ سے تفصیلی بحث کی گئی ہے اور پھر آرین حملوں کے وقت سے انگریزوں کے تسلط تک کے تمام واقعات صحیح ماخذوں سے حاصل کرکے یکجا کر دئے گئے ہیں۔ جابجا تصاویر اور نقشوں سے بھی اس کو مزین کیا گیا ہے۔ جو تاریخی کتابوں کے لئے ضروری ہیں۔ زبان صاف اور سلیس ہے اور اندازِ بیان اُلجھا ہوا۔

اُردو میں اسوقت تک کوئی کتاب جو صرف اس موضوع کے لئے وقف ہو شایع نہ ہوئی تھی، اس لئے ملک کو جناب محمود کا ممنون ہونا چاہئے اور اُن کی اس محنت و کاوش کی قدر کرنا چاہئے۔ وہ حضرات جو جنوبی ہند یا اس کی تاریخ سے دلچسپی رکھتے ہیں، ان کے لئے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

قیمت تین روپیہ ہے اور ملنے کا پتہ: محمد سراج الدین کتب فروش ڈکنسن روڈ۔ بنگلور

مطالعۂ حافظ جناب مولوی احتشام الدین صاحب ام۔ اے دہلوی کی تصنیف ہے جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ حافظ کا کلام کتنا بڑا گنجینہ علم تصوف کا ہے اور وہ کیسے کیسے عجیب و غریب نکاتِ درویشی اسکے اندر مضمر پاتے ہیں۔

جناب مولف، کلام حافظ سے بڑا شغف رکھتے ہیں اور اسی لئے انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس کا تعلق شاعری سے آشنا نہیں ہے جتنا اُن کے والہانہ جذبات سے۔ جابجا تاریخی واقعات کا بھی ذکر آگیا ہے جس نے کتاب کو بہت پر لطف بنا دیا ہے۔

قیمت ۸؎ ہے اور ملنے کا پتہ: کتب خانۂ علم و ادب دہلی

سائنس کے کرشمے اس کتاب میں سائنس کے بعض ایسے مسایل کے متعلق دلچسپ و مفید معلومات یکجا کر دی گئی ہیں جن کا جاننا ہر شخص کے لئے ضروری ہے۔ مثلاً ہوا، پانی، بجلی، فن طیران وغیرہ۔ یہ مقالات سب ماہرینِ فن کے لکھے ہوئے ہیں اور زبان و اسلوب بیان کے لحاظ سے بہت سہل و سادہ ہیں، ابتدا میں ڈاکٹر زور کا دیباچہ ہے اور اس کے بعد میر حسن ام۔ اے کا مقدمہ، جو اس مجموعہ کے مرتب ہیں۔ یہ کتاب اس قابل ہے کہ لڑکوں اور لڑکیوں کو درساً درساً پڑھائی جائے۔ اس کی قیمت ایک روپیہ ہے اور ملنے کا پتہ:۔ سب رس کتاب گھر خیریت آباد حیدرآباد دکن

ارمغانِ جذب

جناب رگھوندر راؤ جذب کی رباعیوں کا دوسرا مجموعہ ہے جسے حیدرآباد کے ادارۂ ادبیات اُردو نے شایع کیا ہے۔ جذب صاحب حیدرآباد کے ایک وکیل ہیں، لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ فطرت انسانی کے اس تاریک پہلو نے جس سے ہر وقت وکیلوں کو واسطہ پڑتا ہے، ان کے احساس کو بہت روشن کر دیا ہے ان کی رباعیاں زیادہ تر اخلاقی ہیں اور خاص اثرات کے تحت لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ ابتدا میں جناب ماہر القادری کا ایک مقدمہ بھی شامل ہے، جس میں انھوں نے مختلف پہلوؤں سے جذب کی رباعیوں پر روشنی ڈالی ہے۔

قیمت ۱۲/ر۔ ملنے کا پتہ:۔ ادارۂ ادبیات اُردو۔ حیدرآباد دکن

مغربی تصانیف کے اُردو تراجم

میر حسن ام۔ اے کی تالیف ہے اور بڑے کام کی چیز ہے۔ اس میں انھوں نے سنہ ۱۸۰۰ء سے لیکر اس وقت تک جتنے تراجم مغربی تصانیف کے اُردو میں ہوئے ہیں ان سب کی مکمل فہرست پیش کر دی ہے۔ اس موضوع پر اسوقت تک کوئی کتاب موجود نہ تھی۔

اس کی قیمت ۱۲/ ہے اور ملنے کا پتہ ادارۂ ادبیات اُردو حیدرآباد دکن

مکتوباتِ شاد عظیم آبادی

مجموعہ ہے شاد عظیم آبادی کے اُن خطوط کا جو سید ہمایوں مرزا بیرسٹر اور ان کی بیگم کے نام لکھے گئے تھے۔ ان کی ابتدا شاد کی عمر کے پچاسویں سال سے ہوتی ہے، اس لئے ان میں وہ سب کچھ ہے جو ایک پختہ کار شاعر و انسان کے خطوط میں ہونا چاہئے۔ ان مکاتیب سے نہ صرف شاد کی سیرۃ پر روشنی پڑتی ہے بلکہ بہت سے شاعرانہ نکات بھی سامنے آجاتے ہیں۔

ڈاکٹر زور کی یہ خدمت اُردو ادب میں نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھے جانے کے قابل ہے۔

قیمت ۱۲/ر۔ ملنے کا پتہ:۔ ادارۂ ادبیات اُردو۔ حیدرآباد دکن

محبت کی چھاؤں

مرزا ظفر الحسن بی۔ اے کے بارہ مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے۔ مرزا صاحب حیدرآباد کے نوجوان ادیبوں میں سے ہے اور ایک خاص اندازِ تحریر کے مالک ہیں۔ "ہلکا ہلکا مزاح اور صاف صاف تنقید" یہ ہے اصل روح ان فسانوں کی جو بیک وقت دلچسپ بھی ہیں اور مفید بھی۔

ان افسانوں کی تحریر کی غایت جو کچھ ہو، لیکن چونکہ ان کا تعلق عہد حاضر کی معاشرت سے ہے اسلئے ہمارے لئے ان میں سامانِ تفریح ضرور موجود ہے۔ قیمت ۱۲/ ہے اور ملنے کا پتہ ادارۂ ادبیات اُردو۔ حیدرآباد دکن

مسلمان کیا کریں

مجموعہ ہے ان تمام مقالات کا جو اس موضوع پر اخبار مدینہ میں عرصہ تک شایع ہوتے رہے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کی موجودہ سیاسیات کو سمجھنے کے لئے ان مضامین کا مطالعہ نہ صرف مسلمانوں بلکہ تمام اہل فکر و نظر کے لئے ضروری ہے۔ کارکنان مدینہ نے اچھا کیا کہ ان کو کتابی شکل میں شایع کر دیا۔ ضخامت ۳۰۴ صفحات ہے اور قیمت ایک روپیہ چار آنے۔

کلامِ ماہر لکھنوی

(مسلسل)

موضوع کی تکمیل کے لئے اب میں چاہتا ہوں کہ کچھ مثالیں تشبیہ۔ مراعات النظیر طباق و تضاد ایہام تناسب وغیرہ کی بھی پیش کردوں جنکے متعلق میں کہہ چکا ہوں کہ شاعری کے خارجی زیور ہیں اور وہ اُسی حد تک مستحسن ہیں جبتک کہ انھیں ضمنی حیثیت حاصل رہے۔

تشبیہ | اس میں کامیابی شاعر کی اصابتِ تخئیل اور صحتِ مذاق سے وابستہ ہے۔ اگر تخئیل صائب ہو تو تشبیہ بسا اوقات مکمل ہوگی مگر پھر بھی ممکن ہے وہ طبیعتِ شاعری پر گراں گزرے جیسے "حسان العجم" حضرت خاقانی کے بہت سے تشبیہات و استعارات جو ادبِ لطیف کی بارگاہ میں ہرگز پسندیدہ نہیں ہیں۔ اس کے لئے ذوقِ سلیم کی ضرورت ہے جس سے بیچارہ خاقانی محروم تھا۔

اُردو میں میر علی اوسط رشک جو اپنے ادبی معلومات کی بنا پر بڑا امتیاز درجہ رکھتے تھے مگر ذوقِ سلیم کی نعمت سے محروم ہونیکی وجہ سے کامیاب شاعر نہ بن سکے۔ مثال کے طور پر یہی ایک شعر سن لیجئے ؎

اُڑائے پھرتی ہے بادِ مخالف مجھکو گردوں پر　　نہ جانے کوئی جبھا ہوں کہ چیچک کا پھپھلا ہوں

ماہر کے کلام میں تشبیہات فراوان ہیں جن کی اکثر مثالیں "کائناتِ عالم پر تبصرہ" کے تحت میں آئیں گی۔ یہاں اُن میں سے چند اشعار درج کئے جاتے ہیں جن میں اصابتِ تخئیل اور صحتِ مذاق دونوں خصوصیتیں نمایاں ہیں۔

نہ کس طرح سے کھٹکتا اسے یہ جسمِ نزار　　میں زیرِ آبلۂ چرخ مثلِ خار رہا
دکھائیگا مجھے کوئی نہ کوئی سانحہ گردوں　　کہ آنکھیں تک جھپک کر رہی ہیں مشق ماتم کی
کس کی نظریں تھیں خطِ نورِ چراغِ آفتاب　　بال پڑنے سے برسا آخر ایاغِ آفتاب
مست کیوں ہوں اب نہ جویائے سراغِ آفتاب　　دھوپ پھیلی ہے کہ چھلکا ہے ایاغِ آفتاب
یہ سمجھکر ہے شعاعِ صبح پر نازاں فلک　　ہیں فتیلے لاکھ اور اک ہے چراغِ آفتاب
لے ضعفِ دردِ دل سے میں کیا بنگیا ہوں ابر　　منھ برسا آنسوؤں کا جو اُٹھا کسی طرح
دلِ جانباز کو کیونکر نہ اب شوقِ شہادت ہو　　نہیں ہیں پسلیاں تیغیں کھنچی ہیں دونوں پہلو میں
جرّاح دردِ زخم سے روؤں یہ خو نہیں،　　دل ہنس رہا ہے بخیۂ تارِ رفو نہیں،
اشکوں سے کچھ سکون ہے مجھ پُر گناہ کو　　تھامتا ہے لنگروں نے جہاز تباہ کو
پھرتی ہمراہِ چشمِ مست کیوں نظریں نہ محفل کی　　ہزاروں ہاتھ بڑھتے ہیں جدھر پیمانہ آتا ہے
بیجا نہیں سکوت جو سوزِ نہاں میں ہے　　چھالا سہر ایک مُہرِ خموشی زباں میں ہے

مراعاۃ النظیر اس میں کامیابی یہ ہے کہ علاوہ اس صفت کے شعر سے کوئی خصوصی مفاد بھی پیدا ہو یعنے یہ نہ معلوم ہو کہ شعر صرف "مراعاۃ النظیر" کے لئے کہا گیا ہے جیسے یہ اشعار :-

بحر عالم میں نہ مٹتے ہوئے کچھ دیر لگی — نقش بر آب خط مہر سلیماں دیکھا

مفاد یہ ہے کہ سلیمان کی سلطنت بے بقا تھی۔

کہو تو جو ماہر کو مارا عبث — بتو تم سے راضی خدا ہو گیا

مطلب یہ ہے کہ مجھے بیجرم و خطا قتل کیا۔

کوئی تو پوچھ دے یہ باغبان سے مجھکو گلشن میں — وہ کھٹکے آنکھ میں کیونکر جو تنکے تھے نشیمن میں

مقصد یہ ہے کہ میرا نشیمن باغ میں تھا تو کسی کا کیا بگڑتا تھا؟

کیا چلتے پھرتے لوگوں کا شکوہ ہو لے فراق — بیٹھا ہوا جو دل تھا وہی ہمنشیں نہیں،

یعنے غیروں کا کیا شکوہ جب اپنے ساتھ نہیں دیتے۔

اب زمیں پر قدم وہ کیا رکھیں، — بر میں پوشاک آسمانی ہے،

یعنے آسمانی رنگ کی پوشاک سے وہ حسن بڑھا کہ غرور کی انتہا نہ رہی۔

رو رہا ہوں جو میں خجالت سے — اشک ہر ایک پانی پانی ہے

مطلب یہ ہے کہ میری شدت گریہ سے اشک بھی شرمندہ ہیں کہ وہ تھمتے نہیں۔

ہمنشینوں کے کلیجوں میں بھی پنکھے لگ گئے — کس قدر گرمی الٰہی اپنے سوز دل میں ہو

یعنے میرے سوز دل سے ہمنشینوں کو بھی اضطراب پیدا ہو گیا

اب کچھ اشعار وہ بھی سن لیجئے جن میں سوائے مراعاۃ النظیر کے کوئی افادیت نہیں۔ مجھے یہ جنس پسند نہیں ہے مگر یہ دکھلانا ہے کہ چونکہ اُس زمانہ میں عام رنگ یہ تھا اس لئے ماہر بھی اُس سے بالکل علحدہ نہ رہ سکے :-

رقم جو حال تکدر کبھی کیا میں نے — ہر ایک حرف میں رنگ خط غبار رہا

میرے پرکار قدم سے نقطۂ خال سیاہ — دایرہ سرگشتگی کا دہر میں کھنچوائے گا

مریض حرص زر پائیں نہ اس سے کس طرح صحت — اثر ہے شربت دینار کا دینار سے پیدا

وقت گریہ آگیا جب روئے روشن کا خیال — دیدۂ تر چشمۂ خورشید محشر ہو گیا

ظاہر ہو پسِ مرگ کہ تھی حسرتِ دیدار — سلوائیں کفن دوست مرا تار نظر سے

کیونکر پڑے نہ آنکھ ہر اک کی لباس پر — اشکوں سے جسم جامۂ آب رواں میں ہے

طباق و تضاد اس کے حسن و خوبی کا معیار بھی وہی ہے جو میں مراعاۃ النظیر میں لکھ چکا ہوں۔ ملاحظہ ہوں ذیل کے اشعار :

ہے تعدد بھی بتوں کا اُسکی وحدت کی دلیل
کب خدائی کا سماں دیر برہمن میں نہیں

مطلب صاف ہے کہ وحدت اصل کثرت ہے اس لئے "دیر برہمن" میں بتوں کی کثرت خدائے واحد کی وحدت کا پتہ دیتی ہے

زیست کے دن پورے کرکے نکلی میرے تن سے روح
جس کو بھرنے نے کیا خالی میں وہ پیمانہ ہوں

مقصد یہ ہے کہ "تکمیل مدتِ حیات" کا نام "موت" ہے۔ وہ کوئی مستقل حادثہ نہیں۔

پیش رو راہِ عدم میں ہیں جوانوں سے مسن
یاں ضعیفی جسے کہتے ہیں توانائی ہے

یہ ایک شاعرانہ خیال ہے۔ سفر میں کمزور لوگ پیچھے رہ جاتے ہیں مگر سفرِ آخرت میں کمزور ہی آگے جاتے ہیں گویا اُنکی ضعیفی وہاں کے لئے توانائی کا حکم رکھتی ہے۔ — اس کے برخلاف ذیل کے اشعار میں مجھے طباق و تضاد ہی مقصود اصلی معلوم ہوتا ہے۔

خوشی و عیش سچ تو یہ فلک اب کس جگہ ٹھہریں
ادھر دل بیٹھتا ہو درد اُدھر اٹھتا ہو پہلو میں

مجھ بگڑے دل کی دھوم ہے، چرچے میں نام ہے
بن بن کے لٹنے کی کسی کو خبر نہیں

پست و بلند دہر ہے راہِ عدم میں بھی،
تابوت کا چڑھاؤ لحد کا اُتار ہے،

یہام تناسب | یہ صنعت اگر محاورہ کے ساتھ استعمال ہو اور شعر میں کوئی افادی حیثیت بھی ہو تو ذوق کو لذت بخشتی ہے ان اشعار میں اس کا استعمال نہایت حسن کے ساتھ ہوا ہے:-

دھواں یہ ہے آہ آتشیں کا مکاں ہے تاریک ہر مکیں کا
بجھا ہے دل جب سے مجھ حزیں کا چراغ جلتا نہیں کہیں کا

لیلی و قیس میں لڑنے لگیں آنکھیں جو باہم
صلح کو بیچ میں خود پردۂ محمل آیا،

دوست جو پھر گئے بے پھول چڑھائے ماہر
کیا چراغ سرِ مدفن کو گل افشاں دیکھا

کچھ نہ پوچھو ضبط دردِ دل میں جو گزری یہاں
پی گئے آنسو جو تر اشکوں سے داماں ہو گیا

بنایا جو قسمت نے دانا مجھے
فلک فرق پر آسیا ہو گیا،

منعم بھی کیوں نہ مر کے جنازہ میں ہوں سوار
اگلی ہوائے سر تو ہوا دار لے گیا،

ماہر امید عفو گنہ عشق میں کہاں
تر دامن اور ہو گا ذرا چشم تر تو ہو،

اک اشارے میں قلم کے کھنچ گئے کیونکر حضور
آپ کو اپنی کشش پر تو بہت کچھ ناز تھا

وصل کی صبح کا یہ قول ہو تو دور نہیں
باتوں باتوں میں نہ اُڑ جاؤں تو کافور نہیں

آئینہ لیکے ہاتھ میں غیروں پہ طعن ہے
خود گر پڑے جو حسن پہ، اُسکی خبر نہیں،

شامیانہ ہو کہ تصویر ہو یا عطر و گلاب
جو مری قبر پہ آتا ہے کھنچا ہوتا ہے،

بالغہ | اس میں مقبول اور مردود کی دو قسمیں ہر ایک کو معلوم ہیں — ماہر کے کلام میں اکثر اسکا استعمال خوبصورتی سے ہوا ہے:

کچھ سا بھی نالہ کش کوئی دارِ محن میں ہے
دل منہ کو آگیا ہے، زباں کب دہن میں ہے

سُن ہی لینا گر یو ہیں آہوں کی شہرت رہ گئی
تیر کے بر تاب پر آکر قیامت رہ گئی،

سب بھول جائیں وسعت صحرائے حشر کو
دکھلا دوں گر میں دامن زخم جگر کبھی

وہ دل جلا ہوں لحد سے اگر نکل آئے
ہر استخواں مرا شمع مزار ہو جائے

بہر حال مجھے اس جنس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اس لئے اس کی مثالیں زیادہ پیش نہیں کرنا چاہتا۔ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ ماہر کے زمانہ میں ابتذال کا بڑا دور دورہ ہے مگر ماہر کا کلام ابتذال سے بہت حد تک ابتذال سے پرہیز پاک ہے۔ میں نے ڈھونڈھکر ماہر کے کلام میں وہ مضامین نکالے ہیں جو میرے نزدیک بہت مبتذل ہیں پھر بھی آپ دیکھیں گے کہ وہ اُس درجۂ ابتذال سے کوئی نسبت نہیں رکھتے جو اُن کے معاصرین کے کلام میں موجود ہے۔

چوم لیتا ہوں جو سونے میں کفِ نازک کو
اُسی بوسے کا نشاں دزدِ حنا ہوتا ہے

شاید آپ کو مجھ سے اتفاق ہوگا اگر میں یہ کہوں کہ مہذب ترین بوسہ یہ ہے جو ماہر نے نظم کیا ہے یعنی "کفِ نازک کا بوسہ"

بوس و کنار بلبل و گل دیکھتے ہو کیا
تم تھوڑی ہو گلے جو لگا یا تو ہٹ گئے

ہٹ جانے کے ذکر نے شعر کو ابتذال سے دور کر دیا ہے۔

جب سے آئی ہے جوانی یہی دیکھا ہم نے
جاگ کر رات کٹی صبح کو آرام کیا

اس میں گنجائش بہت کچھ سمجھنے کی ہے مگر ماہر نے ابہام رکھا ہے۔

جاؤ بیجا کچھ نہ دیکھا اس طرح لیٹی ردا
تھا جوانی کا جو سونا قہر کا انداز تھا،

"جاؤ بیجا" کے ابہام نے شائستگی کا انتظام کیا ہے۔

سر کی ہے ردا جن کی، کوئی اُن سے یہ کہدے
سونا بھی جوانی کا اور اس بیخبری کا

"اس" میں وہ سب کچھ مضمر ہے جسے شاعر نے صاف کہنا نہیں چاہا ہے۔

کیوں پسلیاں نہ ہجر کی راتوں میں ٹوٹ جائیں
پہلو کو ڈھونڈھتی ہے تمھارے ہی خوئے دل

ایسی خلوت میں بھلا کس کو بلائیں ہم تم
شرم آئے تو پسینہ میں نہائیں ہم تم

نہ شرم آئی شب وصل اگر تو خواب آیا
غرض اُنھیں یو ہیں نیند آئی یا حجاب آیا

میں سمجھتا ہوں کہ "معاملہ بندی" میں اس سے زیادہ متین اشعار غزل میں کم مل سکتے ہیں — انتہائی مبتذل اشعار اس جنس کے حسب ذیل ہیں:-

سلامتی سے لڑیں بھی اور اُس پہ یوں سوئیں
گہہ اپنے فرش پہ ہیں گہہ پرائے بستر پر

دعوے میں فرق آئیگا شرمائیں گے حضور
کچھ پوچھئے نہ مجھ سے جو دیکھا ہے خواب میں

رکھے رہیں نہ ہاتھ وہ چہرہ پہ کس طرح
عادت ہے پیار کی کسی خانہ خراب میں

بوسہ کسی نے چھپ کے لیا جب تو یہ کہا
عادت ہے یہ فقط اُسی خانہ خراب میں

ع۔ ن

(باقی)

نگار

ہندوستان کے اندر سالانہ چندہ پانچ روپیہ ششماہی تین روپیہ
ہندوستان کے باہر سالانہ چندہ آٹھ روپیہ یا بارہ شلنگ

ششماہی چندہ میں "نگار" کا جنوری نمبر
بہ وجۂ اضافۂ ضخامت وقیمت شامل نہ ہوگا

ہمیشہ یاد رکھئے کہ پرچہ نہ پہونچنے کی اطلاع اگر اُسی مہینہ کے اندر نہ دی گئی تو آئندہ مہینہ کے آخر تک پانچ پیسے کے ٹکٹ آنے پر دوبارہ روانہ ہوگا (کیونکہ ڈاک خانہ اب پچھلے پرچوں کا محصول پنج گنا وصول کرتا ہے) اور اُس کے بعد قیمتاً یعنی ۸ر کے ٹکٹ وصول ہونے پر۔

منیجر "نگار"

جلد ۳۷	فہرست مضامین اپریل سنہ ۱۹۴۰ء	شمارہ ۴

ملاحظات ---------- اڈیٹر ---------- ۲
ازمیات ---------- اڈیٹر ---------- ۹
خلیفہ گلزار علی آسیر ---------- تمکین کاظمی ---------- ۱۹
داستان ابر و باد ---------- اڈیٹر ---------- ۲۸
انقلاب پسندی اور اصلاحِ عالم ---------- گلاب چاند ---------- ۳۳
راجہ بنسی ---------- حیات اللہ انصاری ---------- ۴۲
اخبار کمپنی کے عہد حکومت میں ---------- سید محمد عبد العلیم ہاشمی ---------- ۵۳
مکتوبات نیاز ---------- اڈیٹر ---------- ۶۶
باب الاستفسار ---------- اڈیٹر ---------- ۷۰
کلام ماہر لکھنوی ---------- ع-ن ---------- ۷۳
متنوعات ---------- اڈیٹر ---------- ۷۹

نگار

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

شمارہ ۴	اپریل سنہ ۴۰ء	جلد ۳۷

ملاحظات

ہمارے سیاسی اجتماعات!

رام گڈھ میں کانگرس کا جلسہ بھی ختم ہوگیا، لاہور میں مسلم لیگ کا اجتماع بھی منتشر ہوگیا، فاروڈ بلاک کانفرنس بھی اپنی تجویزیں پیش کر چکی ——— لیکن دنیا جہاں پہلے تھی اب بھی وہیں ہے اور ہندوستان، دور تذبذب و بے اعتمادی کی جس منزل سے گزر رہا تھا، ہنوز اسی جگہ ہے ———

ایک دفتر تدبیر و مصلحت پیش کیا گیا لیکن ایک ایسا دفتر جو اقدام عمل کی راہوں سے خالی تھا ——— جرأت و مردانگی کے بڑے بڑے دعوے کئے گئے لیکن اس حال میں کہ دل گرمی سے اور دماغ عقل سے معرا تھا ——— آوازیں بلند ہوئیں لیکن ایسے صحرا میں جہاں ان کا سننے والا کوئی نہ تھا!

یہ تھا علے الترتیب ان تینوں سیاسی اجتماعات کا رنگ جن کا ذکر ابھی کیا گیا، لیکن آیئے اس اجمال کی تفصیل پر بھی اک سرسری نگاہ ڈال لیں

دفتر تدبیر و مصلحت

مولانا ابوالکلام آزاد نے صدر کانگرس کی حیثیت سے جو خطبہ دیا ہے وہ اپنے سنجیدہ لب و لہجہ اپنے مضبوط دلایل اور اپنے تجزیہ تاریخی کے لحاظ سے یقیناً ایک ایسا پرخلوص لٹریچر ہے

جسے ہم ایک "دفترِ تدبیر و مصلحت" تو ضرور کہہ سکتے ہیں، لیکن جس وقت ہم اس کے اوراق میں لائحۂ عمل کی جستجو کرتے ہیں تو ہمیں سخت ناکامی ہوتی ہے

مولانا آزاد نے جس اختصار و خوبی کے ساتھ ہندوستان کی تحریکِ آزادی اور برطانوی سامراج پر تبصرہ کرتے ہوئے برطانوی سامراج کو چیلنج دیا ہے اس کے برمحل ہونے سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا، لیکن عملی نقطۂ نظر سے مولانا آزاد کا یہ خطبہ کیا حیثیت رکھتا ہے؟ یہ بہت دل دکھا دینے والی بات ہے

مولانا، خطبہ کے اختتام پر ملک کو تین ہدایتیں کرتے ہیں - ایک اتحاد، دوسرے تنظیم، تیسرے، گاندھی جی کی رہبری پر اعتمادِ کامل! اور چونکہ یہ تینوں باتیں ایک ہی سانس، ایک ہی فقرہ اور ایک ہی سلسلہ میں کہی گئی ہیں، اس لئے یہ تینوں ہدایتیں ملکر ایک ہی ہدایت کی حیثیت رکھتی ہیں اور مولانا اس پر راضی نہیں ہو سکتے کہ ان میں سے ہر ایک ہدایت پر علٰحدہ علٰحدہ غور کیا جائے۔ اس صورت میں اس کے معنے صرف یہ ہوتے ہیں کہ ملک کا اتحاد اور قوم کی تنظیم بھی بیکار ہے اگر اس مخصوص قیادت کو تسلیم نہ کیا جائے ـــــ گویا بہ الفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ جب تک گاندھی جی کے "عصائے موسوی" کے پیچھے پیچھے قدم نہ اٹھایا جائے ہم "بنی اسرائیل" کی نجات ممکن نہیں!

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ دنیا میں صرف اُصول و ضوابط نے کبھی انقلاب پیدا نہیں کیا، بلکہ ہمیشہ شخصیتوں ہی نے انقلاب پیدا کیا ہے، لیکن تشخص پرستی کی یہ ارتجاعی شدت کہ کسی مخصوص فرد کی قیادت پر ایمان لانا بھی اُصولِ کار میں شامل کر لیا جائے، ایسی عجیب و غریب ذہنیت ہے جس کی تائید مولانا ابوالکلام ایسے آزاد انسان کی طرف سے بالکل گوسالۂ سامری کا معجزہ نظر آتا ہے اور جس پر جتنی حیرت بھی کی جائے کم ہے!

گاندھی جی کی عظمت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا، ان کے خلوص و صداقت پر ایک لمحہ کے لئے بھی شک نہیں کیا جا سکتا لیکن زمانہ کے ساتھ ساتھ عظمتوں کا اور نیتوں کے ساتھ صداقتوں کا معیار بھی بدلتا رہتا ہے ـــــ کل کا بڑا انسان آج چھوٹا ہے اگر اس نے وقت کا ساتھ نہ دیا اور آج کا چھوٹا انسان کل بڑا ہو سکتا ہے اگر وہ زمانہ کی نباضی کر سکتا ہے۔ پھر مجھے اس میں کلام ہے کہ گزشتہ بیس سال کے اندر دنیا اتنی آگے نہیں بڑھ گئی ہے کہ گاندھی جی کی ایک رُبع صدی قبل کی ذہنیت بدستور رہبری کی صلاحیت اپنے اندر رکھتی ہو، اور وقت کے تقاضہ کو شخصی اعتماد یا ذاتی اعتقاد کے سامنے یک لخت نظرانداز کر دیا جائے

اول تو گاندھی جی کا، کانگرس سے علٰحدہ رہنے کے باوجود کانگرس پر حکمرانی بجائے خود ایسی غیر آئینی بات ہے جس کا جواب نہ گاندھی جی دے سکتے ہیں نہ اربابِ کانگرس، لیکن اگر اس بیسویں صدی میں یہ ممکن ہے کہ ایک شخص کسی اجتماع سے علٰحدہ رہنے کے بعد بھی اسی اجتماع کا ایک فرد مانا جا سکتا ہے، یا اگر گاندھی جی کی ہستی کو تمام دنیاوی مصالح و تدابیر اور انسانی اُصولِ کار کی سطح سے بلند و برتر سمجھ لیا گیا ہے، تو بھی یہ بات مشکل سے یقین کی جا سکتی ہے کہ اگر آج تک

ساکنان ملاءِ اعلیٰ نوعِ انسانی کے مصائب کو دور نہیں کر سکے، تو اب گاندھی جی کی "فرشتہ خوئی" کیونکر ہمارے دُکھ درد کا علاج ہو سکتی ہے — اگر الہام کا دروازہ بدستور کھلا ہوا ہے تو ہم کو تاریخ نے یہ بھی بتایا ہے کہ الہام محض سے کبھی دنیا کا انتظام نہیں ہو سکا!

گاندھی جی کا حقیقی مفہوم ہندوستان کی آزادی و جنگ آزادی سے کیا ہے۔ اس کا سمجھنا بہت دشوار ہے۔ وہ شخص جو مکمل آزادی سے گھٹ کر مستعمراتی آزادی قبول کرنے پر آمادہ ہو جائے، جو مستعمراتی آزادی کی طرف سے بھی مایوس ہو کر پھر آزادی کامل کا مطالبہ کرنے لگے، جو باوجود علمبردار حریت ہونے کے برطانوی دامن کا ہاتھ سے چھوڑنا پسند نہ کرتا ہو، جو باوصف تمام ہندوستان کی نمایندگی کا دعوے کرنے کے مذہبیت کی لعنت میں گرفتار ہو، جسے باایں ہمہ ادعائے رواداری دوسری قوموں کے جذبات کو صدمہ پہونچانے سے دریغ نہ آتا ہو اور جس کے ملہماتِ غیبی کا مولد و منشا صرف چرخہ اور کھدر ہو ——— اُس سے یہ توقع کرنا کہ وہ ملک کو غلامی کی لعنت سے آزاد کرا سکتا ہے، بنجر زمین میں تخم ریزی کرنا ہے اور ہمیں سخت افسوس ہے کہ اس سال کانگرس نے صرف یہی کیا

کانگرس نے تو اپنی جگہ یہ فیصلہ کر دیا کہ گاندھی جی کے ارشاد پر آنکھ بند کر کے عمل کرنا ہی تنہا ذریعۂ نجات ہے، لیکن گاندھی جی فرماتے ہیں کہ ملک کی آزادی کے لئے پہلے چرخہ اور کھادی کی غلامی لازم ہے اس لئے سوال اب آزادی کا ہے نہ جنگ آزادی کا بلکہ صرف "ننھا کاتنے" کا اور ایک "کچے دھاگے" سے ملک کی قسمت وابستہ کر دینے کا!

اس میں شک نہیں کہ اگر کسی ملک کی تمام آبادی کسی ایک بات پر متفق ہو جائے تو بڑی بات ہے، لیکن یہ بڑی بات نہ کبھی ہوئی ہے نہ ہوگی۔ چھوٹی جماعتیں ہی بڑھ کر بڑی ہوئی ہیں اور جن آگوں نے قیصر و کسریٰ کے محلوں کو پھونک کر خاک کر دیا تھا وہ پہلے چنگاریاں ہی تھیں

ہمیں افسوس ہے کہ یہ سال جو حقیقتاً سب سے زیادہ سازگار سال تھا، کانگرس نے بالکل ضایع کر دیا اور نتیجہ کے لحاظ سے اس نے کوئی بات ایسی پیش نہیں کی جسے عملی اہمیت حاصل ہو

ہمیں یقین ہے کہ گاندھی جی پھر برطانوی حکومت سے مصالحت کی کوشش کریں گے اور اگر انھیں کسی غیر یقینی وعدہ کی بنا پر کوئی ہلکی سی توقع قایم کرنے کا موقعہ مل گیا تو وہ یہی مشورہ دیں گے کہ صوبوں میں کانگرسی جماعت پھر عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لے اور پھر وہی لوگ برسرِ اقتدار آجائیں جن کی آستینوں میں مہاسبھائی خنجر چھپے ہوئے ہیں اور جن کے نزدیک آزادیٔ ہند کا مفہوم، برطانوی اقتدار کے سایہ میں ہندو راج سے زیادہ کچھ نہیں

سفیہانہ مطالبات

لاہور میں مسلم لیگ کا اجلاس بھی اپنے اجتماع کے لحاظ سے بہت شاندار رہا اور اس میں بھی کانگرس کی طرح ایک ہی رزولیوشن پیش کیا گیا، لیکن فرق یہ ہے کہ کانگرس کے رزولیوشن میں عمل کا فقدان تھا اور مسلم لیگ کے رزولیوشن میں عمل و عقل دونوں کا۔ مطالبہ دونوں جگہ

آزادی کا تھا، لیکن وہاں شخصیت پرستی میں تبدیل ہوگیا اور یہاں واہمہ پرستی میں۔ وہاں جبر نے اُسے کھا گیا اور یہاں اقلیت کا خوف!

مسلم لیگ کے اس یادگار رزولیوشن میں تین باتوں پر زور دیا گیا ہے ایک یہ کہ وفاقی حکومت کے خیال کو بالکل ترک کردیا جائے، دوسرے یہ کہ جس وقت آئین جاریہ پر نظر ثانی کیجائے تو یہ سمجھ لیا جائے کہ مسلمان کبھی اسے قبول نہ کریں گے اگر ان کے مشورہ و منظوری کے بغیر اسے نافذ کیا گیا اور تیسرے یہ کہ صوبۂ سرحد، صوبۂ پنجاب اور صوبۂ بنگال کو (جہاں مسلم اکثریت ہے) علحدہ علحدہ آزاد و خودمختار حکومت تسلیم کیا جائے اور دوسرے صوبوں میں مسلم اقلیت کی قومی، مذہبی و اقتصادی حقوق کی حفاظت کی ذمہ داری لیجائے

اس رزولیوشن کا اہمال اتنا کھلا ہوا ہے کہ معمولی دماغ کا انسان بھی اس کو کسی صحیح الدماغ انسان کا نتیجۂ فکر قرار نہیں دیسکتا۔ اگر بنگال و پنجاب کو علحدہ علحدہ خودمختار مسلم حکومت تسلیم کر لیا گیا تو جن صوبوں میں ہندو اکثریت ہے انھیں بھی خودمختار حکومت تسلیم کیا جائے گا اور اس طرح نصف سے زیادہ مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ بدستور ہندوؤں کے ہاتھ میں رہیگا۔ تو کیا مسلم لیگ، اس مفاہمت پر راضی ہے کہ اگر نصف سے کم مسلمان اپنی جان بچا سکتے ہیں تو باقی نصف سے زیادہ مسلمانوں کو وہ جہنم میں ڈالنے پر راضی ہو جائے گی اور کیا اس مطالبہ کی بنا پر وہ تمام اسلامی ہند کی نمایندہ ہونے کا دعوے کرتی ہے۔ لیکن اگر یہ کہا جائے کہ مسلم اقلیت کے حقوق کے تحفظ کی شرط ہی اس لئے لگائی ہے کہ ہندو صوبوں میں مسلمانوں پر جبر و ظلم نہ ہوسکے تو پھر اس صورت میں خودمختار مسلم حکومتوں کا سوال بھی بے معنی ہوکر رہ جاتا ہے کیونکہ اس طرح برطانوی اثر و اقتدار بدستور قایم رہے گا اور صورت بدستور وہی رہیگی جو اسوقت پائی جاتی ہے

چودھری خلیق الزماں صاحب نے اس رزولیوشن کی تائید کرتے ہوئے جو کچھ کہا وہ رزولیوشن سے زیادہ مضحکہ خیز ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کو اقلیت کہنا صحیح نہیں۔ وہ ایک قوم ہے اور ایسی قوم جو تلوار سے فیصلہ کرنے سے کبھی نہیں ڈرتی، لیکن مشکل یہ ہے کہ معاملہ کا انحصار رایوں پر ہے، اس لئے اگر کانگرس نے کانگرسی مسلمانوں کی رائے پر عمل کیا تو "سول وار" ہو جانا یقینی ہے۔ یہ ہے تقریر اُس شخص کی جو حکومت یو۔پی کے صدر مقام میں میونسپلٹی کا بڑا قانون داں چیرمین ہے۔ لیکن وہ یہ سمجھنے سے عاری ہے کہ اس کے اس ایک جملہ میں کتنی متضاد باتیں پائی جاتی ہیں

ایک طرف تو وہ تلوار کے ذریعہ سے فیصلہ کرنے پر طیار نظر آتا ہے اور دوسری طرف سول وار سے بھی ڈرتا ہے تو کیا "سول وار" کا تعلق کسی ایسی تلوار سے ہے جس کا بوجھ چودھری صاحب کی نازک کلائی برداشت نہیں کرسکتی۔ یا "سول وار" سے مراد صرف گالی گلوج ہے۔ پھر اگر صورت، وہ ہے تو تلوار کا نام بھی ان کو زبان پر نہ لانا چاہئے اور

اگر صورت دوسری ہے تو ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں کیونکہ وہ اس باب میں کانگریسیوں سے زیادہ مشاق ہیں اور مسلم لیگ کا پلیٹ فارم سب وشتم میں کافی شہرت حاصل کر چکا ہے!

اس میں شک نہیں کہ کانگرس نے متعدد غلطیاں کی ہیں، سب سے پہلی اور بڑی غلطی تو یہ تھی کہ اس نے وزارتوں کے قبول کرنے کا فیصلہ کیا اور دوسری اتنی ہی نامعقول غلطی یہ تھی کہ وزارتوں پر مہاسبھائی ذہنیت رکھنے والوں کو قابض ہو جانے دیا۔ پہلی غلطی کا نتیجہ یہ ہوا کہ برطانوی ملوکیت پھر ایک ربع صدی کے لئے اپنی جگہ مطمئن ہو گئی اور دوسری غلطی نے مسلمانوں کو کانگرس سے بالکل متنفر کر کے مسلم لیگ کے مُردہ جسم میں پھر جان ڈال دی

یقیناً مسلمانوں کو اپنے قومی تحفظ کے لئے منظم ہو جانا چاہئے، لیکن اگر یہ تنظیم غیر وطنی جذبات پر قایم ہوتی ہے تو اس سے انتشار ہی بدرجہا بہتر ہے اور میں مسلم لیگ کا صرف اسی لئے مخالف ہوں کہ وہ اپنے آپ کو ہندوستان اور ہندوستانی آبادی سے علٰحدہ رکھنا چاہتی ہے اور ہندوؤں کی اکثریت سے ڈر کر وہ ایسے بزدلانہ طریقوں سے کام لینا چاہتی ہے جو مسلمانوں کی روایات تاریخی کے بالکل منافی ہیں

مسلم لیگ کا یہ رزولیوشن، بہ الفاظ دیگر گویا قیام "پاکستان" کی تحریک ہے، جس میں قومی آزادی کی جدوجہد برطانوی سامراج کے سامنے دستِ سوال پھیلانے سے زیادہ کچھ نہیں۔ اور اسلام کی تاریخ میں غالباً یہ بالکل پہلا موقعہ ہے کہ اس نے بھیک مانگنے کا نام آزادی قرار دیا ہو

صدا بہ صحرا

فارورڈ بلاک کانفرنس میں بھی حقیقتاً ایک ہی رزولیوشن پیش کیا گیا جس میں آیندہ معرکہ سے بحث کرتے ہوئے یہ بتایا گیا ہے کہ اب انتظار کا وقت ختم ہو گیا ہے اور جنگ آزادی کو ۶ اپریل سے شروع ہو جانا چاہئے

اس قرارداد میں اس بات پر بھی زور دیا گیا ہے کہ ایک مرتبہ جنگ شروع کرنے کے بعد نہیں راستہ میں دم نہ لینا چاہئے اور نہ کوئی دوسرا راستہ اختیار کرنا چاہئے جیسا کہ سنہ ۳۲ء میں ہریجن تحریک شروع کر کے اختیار کیا گیا تھا

میں اس کو صدا بہ صحرا کہتا ہوں کیونکہ "گاندھی گردی" میں اس پامردی کو کون پوچھتا ہے

جنگ کے آیندہ امکانات

جیسا کہ خیال تھا، بہار کے شروع ہوتے ہی فنلینڈ کا قصہ ختم ہو گیا اور روس کو فنستان کے شمالی، مشرقی و جنوبی علاقہ پر پورا اقتدار حاصل ہو گیا۔ فن لینڈ کی شکست ایک تسلیم شدہ مسئلہ تھا، لیکن اتنی دیر صرف شدت سرما کی وجہ سے ہوئی جس نے یہاں کے علاقہ کو روسی افواج کے لئے ناقابل گذر بنا دیا تھا۔ بہر حال وہ تو جو کچھ ہونا تھا ہو چکا، اب سوال یہ ہے کہ آیندہ نقشۂ جنگ کیا ہوگا

اس سے قبل جنگ کے تین محاذ خیال میں آتے تھے، ایک سرزمین بلقان، دوسرے سویڈن وناروے، تیسرے ہالینڈ وبلجیم اور گمان تھا کہ جس وقت روس، فنلینڈ کی طرف سے فارغ ہو جائے گا تو ان محاذوں میں سے کوئی ایک محاذ ضرور متعین ہو جائے گا، لیکن یہ خیال غلط نکلا اور جو صبر آزما انتظار پہلے تھا وہی اب بھی باقی ہے اور دنیا کی دماغی اُلجھن واعصابی کشمکش برابر بڑھتی ہی جا رہی ہے

اس دوران میں ہٹلر اور مسولینی کی ملاقات نہایت اہم واقعہ کی حیثیت رکھتی ہے اور جرمنی کے مقابلہ میں اتحادئیں کی یہ دوسری سیاسی شکست ہے۔ اس سے پہلے دنیا نے سمجھ لیا تھا کہ شاید مسولینی وہٹلر کا اتحاد ختم ہو گیا ہے، لیکن ان دونوں کی آخری ملاقات نے اس کی پوری طرح تردید کر دی اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہ سرزمین بلقان میں جنگ چھڑنے کا بہت کم امکان رہ گیا ہے

جرمنی اور روس کی طرف سے رومانیا کی آزادی کو قایم رکھنے کے معنے یہی ہیں کہ جرمنی یہاں لڑائی چھیڑ کر اپنے اُس سرمایہ کو تباہ کرنا نہیں چاہتا جو کروڑوں پونڈ کی مقدار میں ریاستہائے بلقان کے اندر پھیلا ہوا ہے اور نہ اپنے اُن تجارتی وصنعتی فواید کو نقصان پہونچانا مناسب سمجھتا ہے جو بلقان سے صرف امن ہی کی صورت میں حاصل کئے جا سکتے ہیں

سویڈن وناروے کی طرف کسی جنگ کا امکان تو نہیں ہے، لیکن یہ بہت ممکن ہے کہ جرمنی سویڈن کے بعض ساحلی مقامات کا مطالبہ کرے اور سویڈن بغیر جنگ کئے اسے دیدے، کیونکہ وہ پولستان وفنستان کا حشر دیکھ چکا ہے، علاوہ اس کے یوں بھی ہمیشہ سے اس کا رجحان جرمنی کی طرف رہا ہے اور وہاں کی حکومت جرمنی سے اپنے تعلقات خراب کرنا نہیں چاہتی

ہالینڈ وبلجیم البتہ ابھی تک خطرہ میں ہیں اور ہٹلر کئی بار ان پر حملہ کرتے کرتے رہ گیا ہے۔ لیکن یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ان پر حملہ کرے گا یا نہیں اور کرے گا تو کب تک۔ لیکن روس کی شرکت نے چونکہ اس جنگ کو مشرق کے لئے بھی ایک حد تک خطرہ سے قریب کر دیا ہے، اس لئے اگر ان خبروں پر اعتماد کیا جائے جو سرحد ایران پر روسی افواج کے اجتماع کے متعلق آئی تھیں، تو ایران کے ساتھ ہی ہندوستان تک اس آگ کی لپٹ کا پہونچ جانا ممکن نہیں ہے۔ اول تو روس وایران سے حال ہی میں ایک تجارتی معاہدہ ہو چکا ہے، اس لئے اگر روس نے مشرق کا رُخ کیا تو ایران اس کا مزاحم نہ ہوگا اور اگر ہوا تو وہ ایک دن بھی مقابلہ کی تاب نہ لا سکیگا، کیونکہ ایران کی فوجی حالت خراب ہے۔ اور میثاق سعد آباد کی رو سے افغانستان، ترکی وعراق کا اس کی مدد کرنا امید موہوم سے زیادہ نہیں۔ کیونکہ ترکی اور عراق وایران کے باہمی تعلقات اچھے نہیں ہیں اور ایک دوسرے کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ نہ ترکی کا روپیہ ایران میں چل سکتا ہے، نہ ایران کا ترکی وعراق میں اور ان کے درمیان آپس میں کوئی تعاون نہیں پایا جاتا

اس میں شک نہیں کہ جرمنی کا ایک مقصود تو اس جنگ سے یہ ہے کہ آرکٹک سے لیکر باسفورس تک اور رھائن سے لیکر ولاڈی واسٹک تک پھیلے ہوئے اقتصادی و تجارتی اثرات برطانیہ کے ختم کردے، دوسرا مقصود اسی کے ساتھ یہ ہے کہ مشرقِ ادنیٰ میں تمام برطانوی فوجی مستقروں کو تباہ کردے اور تیسرا مدعا یہ ہے کہ فرانس کو برطانیہ سے علحدہ کرکے غیر جانبدار رہنے پر مجبور کردے۔ اس کے مقابلہ میں برطانیہ نے بھی اپنی جگہ یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ پولستان اور زیکوسلوویکیا کو دوبارہ زندہ کرکے نازی حکومت کے زور کو توڑنا ہے

اس لئے اس جنگ کے جلد ختم ہونے کے آثار نہیں ہیں، کیونکہ باوجود اس عزم بلند کے فریقین میں سے کسی نے اقدام کی جرأت نہیں کی ہے اور دونوں اپنی اپنی جگہ گھات میں لگے ہوئے ہیں

برطانیہ کی پالیسی یہ ہے کہ وہ جرمنی کو صرف اپنی ناکہ بندی سے بیدست وپا کردینا چاہتا ہے اور فوج کشی کرنے سے احتراز کرتا ہے۔ فرانس کی پالیسی اس باب میں زیادہ تیز ہے اور وہ چاہتا ہے کہ اگر جرمنی حملہ نہیں کرتا تو خود ہی حملہ کردینا چاہئے، لیکن برطانیہ اس کے لئے آمادہ نہیں۔ دوسری طرف جرمنی کی اقتصادی حالت بھی ایسی خراب نہیں کہ برطانوی ناکہ بندی اس کو جلد سر جھکا دینے پر مجبور کرسکے۔ اول تو اس کے یہاں خود خام اشیاء کا ذخیرہ بہت کافی موجود ہے، علاوہ اس کے روس و بلقان کی طرف سے تمام اشیاء کی درآمد بدستور جاری ہے اور ناکہ بندی کی دسترس سے باہر ہے۔ اب فنستان پر روس کے اقتدار نے جرمنی کے ذرایع کو زیادہ وسیع کردیا ہے

الغرض اسوقت تک جنگ نے جرمنی کو کوئی نقصان نہیں پہونچایا بلکہ سچ پوچھئے تو وہ فایدہ ہی میں ہے، برطانیہ کو اس وقت تک فایدہ کوئی نہیں ہوا اور نہ اس کی کوئی توقع کی جاسکتی ہے، کیونکہ اس کا موقف ہی مدافعانہ ہے۔ البتہ اگر مشرقِ ادنیٰ میں جنگ شروع ہوگئی یا ہندوستان پر حملہ کا خطرہ پیدا ہوا، تو برطانیہ کو اپنی موجودہ جنگی تدابیر میں تغیر کرنا پڑے گا اور اس کی تمام وہ بحری، بری و فضائی قوت جو جبرالٹر، بحر روم، اسکندریہ، عدن، خلیج فارس، عراق، فلسطین اور بحر ہند میں پھیلی ہوئی ہے حرکت میں آجائے گی کیونکہ سنہ ۱۹۰۳ء میں لارڈ لینسڈون دارالامراء میں مشرق کے متعلق برطانوی پالیسی متعین کرچکے ہیں کہ خلیج فارس یا اس کے آس پاس برطانیہ کسی اور حکومت کا اقتدار دیکھ ہی نہیں سکتا جس کی تائید سنہ ۱۹۰۷ء میں سر ایڈورڈ گرے کی طرف سے بھی ہوچکی ہے

اس دوران میں یہ خبر بھی آئی تھی کہ ہٹلر نے مسولینی سے ملنے کے بعد صلح کی چند شرطیں پیش کی ہیں جن میں پولینڈ اور زیکوسلوویکیا کو بیس پچیس سال کے اندر آزاد کردینے کا وعدہ کیا ہے۔ لیکن جرمنی کی طرف سے اسکی تردید ہوچکی ہے اور اگر یہ تردید صحیح ہو تو اسکے معنے یہ ہیں کہ اتحادیین غالباً ان شرایط پر صلح کرنے کے لئے طیار ہیں اور انھیں جرمنی سے منسوب کرکے نازی حکومت کا منشاء معلوم کرنا چاہتے ہیں — اگر یہ خیال صحیح ہے اور واقعی جرمنی نے کسی وقت ان اصول پر صلح کا ارادہ ظاہر کیا تو اتحادیین اسے منظور کرلیں گے۔ لیکن ابھی تک یہ تمام باتیں ظن و قیاس کی حدود سے آگے نہیں بڑھیں اور نہیں کہا جاسکتا کہ یہ جنگ تیقنات اور تعینات کی حدود میں کب تک آئے گی۔

ازمیات Isms

(چند سیاسی اصطلاحیں)

پچھلے مہینے ایک صاحب کے استفسار کا جواب دیتے ہوئے میں نے ایک فہرست ان سیاسی اصطلاحات کی پیش کی تھی جو انگریزی میں ازم (isms) پر ختم ہوتی ہیں اور وعدہ کیا تھا کہ نگار میں ان سب پر روشنی ڈالی جائے گی چونکہ جنگ کی وجہ سے اسوقت بہت سے لوگوں کو سیاسیات کی طرف توجہ ہو گئی ہے اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ بغیر کسی مزید تعویق کے اس سلسلہ کو شروع کر دینا مناسب ہے

ہو سکتا ہے کہ ازمیات کے ختم ہونے کے بعد اور سیاسی اصطلاحات بھی پیش کئے جائیں جن سے ہمیں روز مطالعۂ اخبار میں واسطہ پڑتا ہے

فہرست چونکہ پچھلے مہینے دیجا چکی ہے اس لئے اس کو دوبارہ پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں ان اصطلاحوں کو ردیف وار پیش کروں گا، لیکن انگریزی حروف ہجا کے لحاظ سے اور ہر ممکن اختصار کے ساتھ تاکہ فرہنگ سے بڑھکر یہ علمی تالیف کی صورت نہ اختیار کرے۔ ان اصطلاحوں کا مفہوم زیادہ تر والٹر تھیم کے تصریحات کو سامنے رکھکر متعین کیا گیا ہے

۱۔ Absolutism (استبدادیت) :-

وہ طریق حکومت ہے، جس کے لئے کوئی آئینی یا قانونی حد نہ مقرر ہو۔ اس نظام حکومت میں جمہور کی نمائندگی بالکل نہیں ہوتی، یعنی نہ اُن کی رائے کو دخل ہوتا ہے، نہ وہ نظم و نسق میں کوئی حصہ لے سکتے ہیں

سولھویں اور سترھویں صدی کی استبدادی حکومتیں، گو مطلق العنان حکومتیں تھیں، لیکن ان کی قوت کا راز امرا و شرفا کی مدد میں پنہاں تھا۔ اور اگر عوام پر کسی طبقہ یا فرد کی طرف سے کوئی ظلم ہوتا تھا تو ان کی فریاد بھی سنی جاتی تھی اور انصاف بھی ہوتا تھا لیکن اس کے بعد جب جمہور کے جذبات آزادی اور حقوقِ شاہی کے درمیان تصادم ہوا تو پھر رفتہ رفتہ استبدادیت کا وہ مفہوم قرار پایا جو آج کل آمرانہ حکومتوں میں پایا جاتا ہے، جیسے جرمنی اور اٹلی۔

۲- Activism (عملیت) :-

سیاسی جماعتیں دو قسم کی ہوا کرتی ہیں، ایک وہ جو صرف پروگرام بنایا کرتی ہیں اور عمل کی جرأت نہیں کرتیں، دوسری وہ جن کا مقصود صرف عملی اقدام ہے۔ انھیں لوگوں کا نظریہ عملیت کہلاتا ہے

۳- Anarchism (فوضویت)

اس سے مراد کسی حکومت کا نہ ہونا ہے بلکہ صرف ایک ایسی سوسائٹی کا قیام جو قوانین حکومت سے بے نیاز ہو۔ اس نظریہ کے ماننے والے کہتے ہیں کہ حکومت کی ہر قسم (ملوکیت، جمہوریت، جمہوری اشتراکیت) بری ہے اور ظلم و استبداد کا سبب۔ یہ چاہتے ہیں کہ دنیا سے قانون، فوج، پولیس، قید خانے وغیرہ سب مٹ جائیں اور سوسائٹی کا نظام صرف آپس کے معاہدوں پر قایم ہو

اس نظریہ کے بڑے بڑے علمبردار یہ تھے :-

(۱) ولیم گاڈون (William Godwin) سنہ ۱۷۵۶ء - ۱۸۳۶ء

یہ انگریز تھا اور حکومت و سرمایہ داری کا سخت مخالف تھا۔ یہ چاہتا تھا کہ بغیر کسی حکومت کے صرف سوسائٹیاں قایم ہو جائیں اور سوائے ضروری ملکیت کے کوئی اور سرمایہ کسی کے پاس نہ رہے۔ یہ کہتا تھا کہ صرف انصاف و اخلاق کی تبلیغ سے ہمیں امن پسند سوسائٹیاں پیدا کرنا چاہئے تاکہ کسی حکومت کی ضرورت دنیا میں باقی نہ رہے۔

(۲) میکس اسٹرنر (Max Stirner) سنہ ۱۸۰۶ء - ۱۸۵۶ء

یہ جرمنی تھا اور معلمی کا پیشہ کرتا تھا۔ یہ فلسفۂ خودی کا بڑا زبردست علمبردار تھا، اس نے اس موضوع پر ایک کتاب بھی لکھی تھی جس میں خودی و انفرادیت کو سوسائٹی سے زیادہ اہم ثابت کیا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ اخلاق و اخلاقیات مہمل چیزیں ہیں اور کسی مقصد کے متعلق یہ کہنا کہ وہ اچھا ہے یا برا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ میں خود اپنا مقصد ہوں اور میں نہ اچھا ہوں نہ برا۔

(۳) پیری جوزف پرودھن (Pierre Joseph Proudhan) سنہ ۱۸۰۹ء - ۱۸۶۵ء

یہ فرانس کا باشندہ تھا اور مزدوروں کا لیڈر تھا۔ اس نے ایک کتاب لکھی، جس کا عنوان ہے "ملکیت کیا ہے" اور آخر میں ثابت کیا کہ "ملکیت چوری ہے"

اس کے بعد اس کی مخالفت صرف بڑے بڑے صاحبان ملکیت تک محدود ہو گئی اور چھوٹی چھوٹی ملکیتوں کی طرفداری کرنے لگا۔ وہ سکہ کے رواج اور سود کا سخت مخالف تھا۔ وہ کہتا تھا کہ ضروریات انسانی صرف اشیاء کے باہمی تبادلہ سے پوری ہونا چاہئے، جو بنکوں کے ذریعہ سے ممکن العمل ہے۔ آخر عمر میں وہ فوضویت ترک کر کے وفاقی (Federalism) طرز کی حکومت کا قایل ہو گیا۔

(۴) میکائیل باکونن (Michael Bakunin) سنہ ۱۸۱۴ء - سنہ ۱۸۷۶ء

یہ روس کا نہایت مشہور انقلاب پسند فوضوی (انارکسٹ) تھا اس نے ایک آزاد غیر مرکزی اشتراکیت کو رواج دیا جو کارل مارکس کے نظریۂ "حکومتِ اشتراکی" کے خلاف تھی یعنی کارل مارکس تو یہ کہتا تھا کہ تمام ملکیت حکومت کے سپرد کر دینا چاہئے، لیکن باکونن کہتا تھا کہ چھوٹی چھوٹی مقامی جماعتوں کے سپرد ہونا چاہئے جو باہمی معاہدوں کے ذریعہ سے توازن کو قایم رکھیں، یہ پارلمانی (Parliamentary) طریق حکومت کو غیر مفید بتاتا تھا اور اس کا نعرۂ عمل تھا:-

فوضویت - اجتماعیت اور لامذہبیت (Anarchism, Collectivism, Atheism)

اس نے اپنے اطالوی، ہسپانوی اور روسی مقلدین کی ایک بین الاقوامی انجمن سنہ ۱۸۶۸ء میں قایم کی لیکن متبعین مارکس نے اس کی سخت مخالفت کی اور سنہ ۱۸۷۲ء میں یہ انجمن ٹوٹ گئی۔ اس کے بعد بیس سال تک فوضویوں نے بڑا ہنگامہ برپا کیا اور باکونن کے نائب نشایف (Netchayeff) نے قتل و خون کے ذریعہ سے فوضویت کو پھیلانا چاہا، چنانچہ روس کا زار اسکندر۔ اٹلی کا بادشاہ ہمبرٹ (Hamburt)۔ فرانس کا صدر کارنو (Carnot)۔ آسٹریا کی ملکہ الزبتھ، اور امریکہ کا پریسیڈنٹ میک کنلی (Mackinley) سب انھیں کے ہاتھوں سے قتل ہوئے

امریکہ میں فوضویت کے علمبردار بنجامن ٹکر (Benjamin Tucker) اور جان موسٹ (Johann Most) آخر الذکر جرمنی کا اشتراکی تھا۔ امریکہ کے فوضویوں نے سنہ ۱۸۸۳ء میں اپنی کانگرس منعقد کی لیکن سنہ ۱۸۸۶ء میں اس تحریک کو دبا دیا گیا اور سنہ ۱۸۹۱ء سے قانوناً ممنوع قرار دی گئی یہاں تک کہ اب کوئی شخص سرزمین امریکہ میں قدم نہیں رکھ سکتا جب تک وہ یہ اقرار نامہ داخل نہ کرے کہ وہ فوضوی خیال کا نہیں ہے۔

(۵) پیٹر کروپٹکن (Peter Kropotkin) سنہ ۱۸۴۲ء - ۱۹۲۱ء۔

روس کا ماہر جغرافیہ تھا اس نے "اشتمالی فوضویت" (Communist Anarchism) کو رواج دیا۔ چونکہ بڑے بڑے صنعتی ادارے فوضویت کے رواج میں حایل تھے اس لئے اس نے سب سے پہلے انھیں کی مخالفت کی اور کہا کہ صنعتی پیداوار چھوٹی چھوٹی صنعت گاہوں کے ذریعہ سے ہونا چاہئے اور ملکیت کو چھوٹے چھوٹے اداروں میں تقسیم کر دینا چاہئے تاکہ وہ اپنے اپنے ممبروں کی ضروریات زندگی فراہم کرنے کے ذمہ دار رہیں وہ تقسیم محنت و عمل کا بھی مخالف تھا اور اجرت کی تعیین کا بھی۔ وہ کہتا تھا کہ ہر شخص کو اس کی ضرورت کے لحاظ سے اجرت ملنا چاہئے اور چار پانچ گھنٹے روزانہ سے زیادہ کسی سے کام نہ لینا چاہئے۔

آخر میں یہ بہت اعتدال پسند ہوگیا تھا، چنانچہ گزشتہ جنگ عظیم میں وہ اتحادیین کا موافق تھا اور جب سنہ ۱۷ء میں روس کے اندر انقلاب ہوا تو یہاں آگیا اور کرنسکی (Kerensky) کا طرفدار ہوگیا۔ اس کے بعد جب روس میں اشتمالیت پسندوں (Communists) کا غلبہ ہوا تو اس نے پرولتاری (مزدور پیشہ لوگوں کے) اقتدار کی مخالفت شروع کی اور یہیں سنہ ۲۱ء تک رہا

(۶) ٹالسٹائی (Count Leo Tolstoy) سنہ ۱۸۲۸ء - سنہ ۱۹۱۰ء

یہ مشہور روسی مصنف تھا اور اس کی فوضویت کا رجحان زیادہ تر مذہب کے خلاف تھا۔ وہ کہتا تھا کہ حکومت و قانون کا جوڑ مذہب کے ساتھ کوئی ہی نہیں۔ اور بجائے قانون کے وہ محبت کی حکومت کا قایل تھا۔ وہ امن پسندانہ عدم تعاون کا قایل تھا (جسے بعد کو گاندھی جی نے اختیار کیا)۔ وہ چاہتا تھا کہ لوگ فوجی ملازمت ترک کر دیں، ٹیکس ادا نہ کریں، عدالتوں کو تسلیم نہ کریں تاکہ نظام حکومت از خود ٹوٹ جائے۔

۴۔ Anti Semitism **(عند سامیت)** :- یہودیوں کے خلاف جو تحریک قایم ہو اسے اس نام سے پکارتے ہیں۔ پہلے یہ مخالفت یہودی مذہب سے تھی لیکن اب یہودی قوم سے ہے۔ نازی جرمنی اب اس تحریک کا مرکز ہے۔ اس سے پہلے روس میں بھی یہ تحریک پائی جاتی تھی لیکن سنہ ۱۷ء کے انقلاب کے بعد سے ختم ہوگئی ہے۔

اس تحریک کا آغاز انیسویں صدی کے وسط سے ہوتا ہے جب آرین یا نارڈک (Nordic) قوموں کی برتری کا نظریہ پیش کیا گیا (جس پر آیندہ دیگر سیاسی اصطلاحات کے سلسلہ میں روشنی ڈالی جائے گی) یہودیوں کے خلاف اس تحریک کا سبب زیادہ تر اقتصادی ہے۔ چونکہ یہودی قوم نے صنعت و حرفت اور تجارت میں غیر معمولی ترقی کرکے ایک بہت بڑی سرمایہ دار جماعت کی حیثیت حاصل کرلی ہے اور سیاسیات پر بھی اس کا اثر پڑتا ہے، اس لئے یورپ کی بعض یہودی قومیں ان کی مخالفت پر آمادہ ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ جرمنی میں ان کے ساتھ نہایت ظالمانہ برتاؤ کیا جاتا ہے اور ان کو تمام شہری حقوق سے محروم کیا جا رہا ہے۔

۵۔ Bolshevism (بالشویزم) - کمیونزم کا دوسرا نام ہے۔ سنہ ۱۹۰۳ء میں روس کی سوشل ڈیماکریٹک پارٹی دو جماعتوں میں منقسم ہوگئی تو انتہا پسند جماعت نے جس کا لیڈر لینن تھا کثرت رائے سے اقتدار حاصل کرلیا اور چونکہ اکثریت کو روسی زبان میں بالشنسٹو (Bolshinstvo) کہتے ہیں اسلئے اس جماعت کے لوگوں کو بالشیوکی (Bolsheviki) یعنی افراد اکثریت اور دوسری اعتدال پسند جماعت منشیوکی Menshiviki یعنی افراد اقلیت کہنے لگے۔

۶۔ Caesarism (قیصریت) - یہ اصطلاح، جولیس قیصر

(Julius Caesar) کے وقت کی یادگار ہے۔ یہ روم کا مشہور ڈکٹیٹر تھا۔ اس سے مراد فوج یا اہل سیاست میں سے بڑے بڑے لوگوں کی حکومت ہے اور جمہوریت کی ضد۔ اس زمانہ کی ڈکٹیٹری حکومتیں، قیصریت ہی کی قسمیں ہیں۔

۷۔ Capitalism (راس المالیت) ۔ اس کو سرمایہ داری بھی کہتے ہیں اور متاعیت بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس سے مراد وہ اقتصادی نظام ہے جس کے تحت دولت کی پیداوار اور تقسیم پرائیویٹ لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔ ایسے لوگوں کو سرمایہ دار کہتے ہیں اور ان کی کاروبار میں لگی ہوئی دولت جس سے بڑا نفع حاصل کرتے ہیں سرمایہ کہلاتی ہے اس کی ضد اشتراکیت (Socialism) ہے جو سرمایہ داری کے نظام کو مٹا کر دولت کو جمہور میں برابر برابر تقسیم کر دینا چاہتی ہے، تاکہ انفرادی فایدہ کے بجائے وہ پبلک مفاد کی صورت اختیار کرے۔

۸۔ Centralism (مرکزیت) ۔ ایک سیاسی نظام ہے جس کی رو سے تمام سلطنت کا انتظام ایک خاص مرکز سے متعلق ہوتا ہے یہ اس وفاقی حکومت کی ضد ہے، جس میں ملک کے صوبوں کو اختیارات کلی دیدئے جاتے ہیں۔

۹۔ Chauvinism (شاونیت) پنولین اول کے ایک نہایت جوشیلے سردار کا نام ساون (Chauvin) تھا یہ اصطلاح اسی کے نام سے نکلی ہے جس سے مراد کسی خاص مقصد یا قومیت پرستی کی انتہائی طرفداری کرنا ہے۔

۱۰۔ Clericalism (کلیسائیت) کیتھولک مذہب والوں کی سیاسی تحریک کو اس نام سے منسوب کرتے ہیں۔

۱۱۔ Collectivism (اجتماعیت) ۔ ان تمام اقتصادی وسیاسی تحریکوں کا نام ہے جو آپس میں اتحادِ عمل اور مرکزیت کے ساتھ کام کریں۔

۱۲۔ Communism (اشتمالیت) ۔ اس کی صراحت پچھلے مہینے ہو چکی ہے۔

۱۳۔ Fascism (فسطائیت) ۔ اٹلی کی قومی تحریک ہے جس کو ۱۹۲۲ء میں مسولینی نے جاری کیا۔ اس کا ماخذ اطالوی لفظ (Fascio) ہے جس کے معنے ہیں لکڑیوں کے گٹھے، قدیم روم میں حاکم اعلیٰ کے آگے آگے لکڑیوں کا گٹھا اور کلہاڑی اظہار شان کے لئے لیکر چلتے تھے۔

فسطائی نظام حکومت، اشتمالیت اور پارلیمانی حکومت کا ضد ہے۔ یہ نہ سرمایہ دارانہ حکومت ہے نہ اشتراکی۔ یہ ذاتی ملکیت کو تسلیم کرلیتی ہے، لیکن اسے حکومت کے اقتدار میں رکھنا چاہتی ہے۔ تجارتی اور صنعتی ادارے سب فسطائی حکومت کے زیر اثر ہیں۔

اٹلی میں اسوقت صرف یہی ایک سیاسی پارٹی ہے جس کے ممبر مسولینی کی اطاعت پر مجبور ہیں۔ یہ لوگ سیاہ قمیص پہنتے

ہیں اور قدیم اہلِ رومہ کی طرح اوپر ہاتھ اُٹھا کر سلام کرتے ہیں ۔ فسطائی تنظیم بالکل فوجی تنظیم ہے اور اس کا مقصود قدیم رومہ کی کھوئی ہوئی عظمت کو حاصل کرنا ہے ۔ یہ جمہوریت کے بھی خلاف ہیں اور لبرل حکومت کے بھی ۔ ان کے یہاں ابتدا ہی سے فوجی تعلیم لازم ہے اور ۱۸ سال کی عمر میں ہر نوجوان فسطائی جماعت کا ممبر ہو جاتا ہے ۔ یہاں شاہنشاہیت قایم رکھی گئی ہے، لیکن برائے نام ۔ تمام انتظامات فسطائی کونسلِ عظمیٰ کے سپرد ہیں جسے مسولینی نے مقرر کیا ہے ۔ اس کونسل کو مسولینی کا جانشین نامزد کرنے کا اختیار حاصل ہے ۔ کیتھولک مذہب کے اقتدار کو یہاں دوبارہ قایم کیا گیا ہے اور ۳۸ء سے یہودیوں کے خلاف بھی تحریک شروع ہو گئی ۔

۱۴- Feudalism (اقطاعیت) ۔ اس سے مراد یوروپ کا وہ نظام حکومت ہے جو انقلاب فرانس تک پایا جاتا تھا ۔ اس سے مراد جاگیرداروں اور امراء کی حکومت ہے ۔ یعنی بادشاہ کے یہاں انھیں لوگوں کا اثر ہوتا تھا اور یہی سیاہ و سفید کے مالک تھے ۔ ان کے پاس فوج بھی ہوتی تھی اور حکومت کے مختلف عہدے بھی انھیں کے قبضہ میں ہوتے تھے ۔

۱۵- Guild Socialism (گلڈ اشتراکیت) ۔ گلڈ قرونِ وسطیٰ میں اس ٹاؤن ہال کو کہتے تھے جہاں جلسے ہوا کرتے تھے ۔ گلڈ اشتراکیت سے مراد وہ تحریک ہے جو سنہ ۱۹۰۶ء میں عہدِ وسطیٰ کے گلڈ کی نظامِ حکومت کو موجودہ ترقی یافتہ اُصولِ حکومت کے ساتھ ملانے کے لئے جاری ہوئی تھی، اس سے مقصود یہ تھا کہ حکومت کو مختلف تجارتی جماعتوں میں تقسیم کر دیا جائے اور ہر جماعت اپنی جدا کونسل مقرر کرے ۔ یہ تحریک اس اشتراکیت کے خلاف تھی جس میں صنعت و حرفت حکومت کے زیرِ اثر مانی جاتی تھی ۔

سنہ ۱۵ء میں ان کی ایک لیگ قومی گلڈ لیگ کے نام سے قایم کی گئی اور سنہ ۲۰ء میں ان کی کونسل مرتب ہوئی جس نے بڑے وسیع پیمانے پر جدید عمارتوں کے بنانے کا انتظام شروع کیا، لیکن یہ کام نہ چل سکا اور سنہ ۲۵ء میں یہ تحریک ختم ہو گئی ۔

۱۶- Imperialism (ملوکیت) ۔ جس حد تک برطانوی حکومت کا تعلق ہے، ملوکیت سے مراد برطانیہ کی وہ پالیسی ہے جس کی رو سے مقبوضات برطانیہ کے درمیان تعلقات استوار کر کے ان کو سیاسی حیثیت سے انگلستان کا تابع قرار دیا گیا تھا اور جدید مقبوضات حاصل کر کے سلطنت کو اور وسیع کیا جا رہا تھا ۔ سنہ ۱۸ء تک اسی پر عملدرآمد ہوا، لیکن اس کے بعد اس تحریک کو نظر انداز کر دیا گیا ۔

زیادہ وسیع معنے میں ملوکیت سے مراد یہ ہے کہ دوسرے ممالک فتح کر کے سلطنتوں کو وسیع کیا جائے ۔ موجودہ ملوکیت کی ابتداء اُنیسویں صدی میں ہوتی ہے اور انھیں مختلف ملوکیت پسند حکومتوں کا تصادم جنگ عظیم کا باعث ہوا ۔ اس ملوکیت میں خصوصیت کے ساتھ انھوں نے زیادہ حصہ لیا، جن کی تجارتی و صنعتی ترقیاں حال ہی میں ہوئی تھیں

(مثلاً جرمنی، اٹلی اور جاپان) اور دوسری بڑی سلطنتوں سے اس لئے خفا تھیں کہ انھوں نے ساری دنیا کو اپنے اندر تقسیم کر رکھا ہے۔ چنانچہ یہی وہ جذبہ تھا جس کے زیر اثر جاپان نے ۱۹۳۲ء میں چین پر حملہ کیا، اٹلی نے ۱۹۳۵ء میں حبشہ پر حملہ کیا اور جرمنی نے آسٹریا، زیکوسلوویکیا اور پولینڈ پر قبضہ کر لیا۔

ملوکیت فی الحقیقت وہ سرمایہ دارانہ نظام حکومت ہے جو تجارت و صنعت کی ترقی کے سلسلہ میں مختلف ملکوں کو ایک دوسرے کے خلاف جنگ پر آمادہ کرتا ہے اور دولت کو ایک محدود جماعت کے لئے وقف کر دیتا ہے۔ عوام اور مزدوری پیشہ لوگوں کو اس سے کوئی فائدہ نہیں پہونچتا اور نہ تمدنی حیثیت سے نیچے درجے کے لوگ ترقی کر سکتے ہیں۔ موجودہ آمرانہ حکومتیں بھی، ملوکیت ہی کی مختلف صورتیں ہیں جو جدا جدا ترکیبوں سے سرمایہ دارانہ جنگ میں کامیابی حاصل کرنا چاہتی ہیں۔

۱۷- Islationism (اجتنابیت) امریکہ کی ایک مخصوص سیاسی جماعت کا یہ نظریہ کہ یوروپ کے معاملات سے انھیں کوئی سروکار نہ رکھنا چاہئے۔ موجودہ لڑائی سے پہلے برطانیہ میں بھی کچھ لوگ اس خیال کے پائے جاتے تھے۔

۱۸- Marxism (مارکسیت)۔ اس سے مراد کارل مارکس کے نظریے ہیں۔ کارل مارکس ۱۸۱۸ء میں جرمن میں بمقام ٹریوز (Treve) پیدا ہوا اور ۱۸۸۳ء میں لندن میں مرا۔ یہ یہودی تھا اور تعلیم پانے کے بعد اخبار نویسی کا پیشہ کرنے لگا تھا۔ اس کی رائیں چونکہ حکومت کو پسند نہ تھیں اس لئے جرمنی سے خارج البلد کر دیا گیا۔ یہ فرانس پہونچا اور یہاں بھی نہ رہنے دیا گیا۔ یہ ۱۸۴۸ء میں پھر جرمنی آیا، لیکن پھر ناکام رہا اور آخرکار لندن چلا گیا۔ موجودہ اشتراکی و اشتمالی تحریکوں پر مارکس کی تعلیم کا بڑا زبردست اثر ہے۔ اس کے اصول مختصراً یہ ہیں کہ دولت کی پیداوار کا ذریعہ صرف مزدوروں کی محنت ہے اور انھیں کو ملنی چاہئے۔ سرمایہ دار کوئی چیز نہیں ہے اس لئے اسے بالکل محروم کر دینا چاہئے۔

مارکس کے نظریہ نے گزشتہ ۶۰ سال کے اندر سیاسیات و اقتصادیات کے ہر شعبہ کو متاثر کیا ہے اور اس کے دشمنوں کو بھی کسی نہ کسی حد تک اس کی تعلیمات پر عمل کرنا پڑا ہے۔

لینن روس کا مشہور انقلابی اسی کے فلسفہ کا پیرو تھا اور روس کی اشتمالیت، مارکسیت ہی کی عملی صورت ہے۔

۱۹- Nazism (نازیت) دوسرا نام بلکہ مخفف ہے National Socialism (قومی اشتراکیت) کا۔ سب سے پہلے ۱۹۱۲ء میں جرمنی کی لیبر پارٹی نے آسٹریا میں اس تحریک کو شروع کیا تھا۔ لیکن ہٹلر کا براہ راست اس پارٹی سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ہٹلر کی پارٹی کی بنیاد ایک جرمن مزدور ڈریکسلر (Drexler) نے ۱۹۱۹ء میں قائم کی تھی۔ جب ہٹلر اس میں شریک ہوا تو اس کا نام (National Socialist Party) رکھا اور اس کے ۲۵ اصول مقرر کئے جن میں سے خاص خاص یہ ہیں:-

تمام جرمن اقوام کا اتحاد ـــ معاہدہ ورسائی کی تنسیخ ـــ حقوق و فرائض میں مساوات ـــ رومن قانون کی جگہ جرمن قانون کا قیام ـــ صحتِ جسمانی کی ترقی ـــ جبریہ فوجی تعلیم ـــ غیر جرمن اقوام اور یہودیوں کا اخراج ـــ بڑے بڑے تجارتی وصنعتی اداروں پر حکومت کا اثر ـــ کاشت کی اصلاح ـــ عام قومی تعلیم۔

لیکن جب ۱۹۳۳ء میں ہٹلر برسرِ اقتدار ہوا تو اس تحریک کا اشتراکی حصہ تو نظر انداز کر دیا گیا اور اسکی حیثیت صرف قومی تحریک کی سی رہگئی۔ یہاں سرمایہ داروں کی حکومت تو نہیں ہے، لیکن سرمایہ داری کی ضرور ہے، یعنی ہر چند امراء اور صاحبانِ دولت کا اقتدار حکومت پر نہیں ہے لیکن دولت کی تقسیم بھی ایسی نہیں کہ واقعی اہلِ احتیاج کی ضرورتیں پوری ہو سکیں۔

نازی پارٹی کا نظریہ ہے کہ صرف آرین قوم ہی دنیا میں حکومت کے لئے آئی ہے اور خالص آرین نسل کے لوگ وہی ہیں۔ یہودیوں سے نفرت کا سبب یہ ہے کہ وہ سامی قوم سے تعلق رکھتے ہیں اور جرمنی کا اقتصادی نظام بالکل اُنکے ہاتھ میں تھا

۲۰- Nihilism (عدمیت) لاطینی لفظ (Nihil) سے ماخوذ ہے، جسکے معنے "کچھ نہیں" کے ہیں۔ سترھویں صدی میں روس کے اندر بعض لوگوں نے ایک ذہنی نظریہ یہ قایم کیا تھا کہ حکومت یا اقتدار کسی قسم کا بھی ہو ناقابل تسلیم ہے۔ ہر شخص اپنی جگہ آزاد ہے اور اپنے افعال کا مالک۔ اس تحریک کو ٹرگینو (Turgenyeff) کے ناول (Father + Son) کی وجہ سے زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔ ہر چند اس تحریک نے انقلابی خیالات پیدا کرنے میں کافی مدد پہونچائی، لیکن یہ بجائے خود کوئی سیاسی تحریک نہ تھی بلکہ صرف فلسفہ اور نظریوں تک محدود تھی۔

۲۱- Pacifism (امنیت)۔ دنیا سے جنگ کو ختم کر دینے کی تحریک اس نام سے موسوم کیجاتی ہے۔ اس قسم کی سوسائٹیاں برطانیہ، امریکہ، جرمنی اور فرانس وغیرہ ہر جگہ قایم کی گئیں اور ہر چند اس کے ممبروں کی تعداد زیادہ نہیں بڑھی لیکن اس کا اثر بیشک دُنیا پر بہت پڑا، چنانچہ جنگ عظیم سے پہلے ایک بین الاقوامی صلح پسند کانفرنس کا انعقاد اس کا نتیجہ تھا اور جنگ کے بعد مجلس اقوام کا وجود، بین الاقوامی عدالت گاہ کا قیام اور معاہدہ کلاگ[1] (Kellogg) اسی تحریک کا نتیجہ تھے۔ لیکن یہ تمام باتیں صرف معاہدوں اور تحریروں تک محدود رہیں اور عملاً بالکل بیکار ثابت ہوئیں۔

۲۲- Pan Islamism (ہمہ اسلامیت)۔ اس سے مراد تمام مسلم اقوام و مسلم حکومتوں کا اتحادِ عمل ہے۔ یہ تحریک سلطان عبدالحمید خاں ثانی کے زمانہ میں شروع ہوئی تھی اور سنہ ۱۹۱۱ء میں ایک پان اسلامی کانگرس

[1] امریکہ کے وزیر خارجہ کا نام (Kellogg) تھا اس کی تحریک اور فرانسیسی وزیر خارجہ بریاں (Briand) کی تائید سے تقریباً دنیا کی تمام قوموں نے سنہ ۱۹۲۸ء میں معاہدہ کیا تھا کہ آیندہ بین الاقوامی نزاعات لڑائی سے نہیں بلکہ آپس کے سمجھوتہ سے ہونا چاہئے۔ لیکن اس پر عمل کسی نے نہ کیا۔ اس معاہدہ کا نام معاہدہ کیلاگ ہے۔

کے انعقاد کی بھی کوشش کی گئی تھی۔ لیکن چونکہ سلطان عبدالحمید بہت کمزور انسان تھا اس لئے یہ تحریک کامیاب نہ ہوئی اور جنگ عظیم میں ترکوں کا ساتھ مسلمانوں نے نہیں دیا۔ اس کے بعد جب کمال اتاترک نے خلافت کا وجود ختم کر دیا تو اس تحریک کا مرکز سرزمین عرب قرار پائی اور خلافت کا مسئلہ طے کرنے کے لئے قاہرہ اور مکہ میں مسلمان جمع ہوئے، لیکن چونکہ ایک سے زاید دعویدار خلافت پیدا ہو گئے اس لئے کوئی بات طے نہ ہو سکی۔

میثاق سعد آباد کی رُو سے ایران، افغانستان، ترکی اور عراق میں بیینگ معاہدہ اتحاد ہو چکا ہے اسی طرح مصر، عراق اور سعودی عرب میں بھی معاہدۂ اتحاد ہوا ہے، لیکن ان کو پان اسلامزم نہیں کہہ سکتے، کیونکہ ان کا تعلق بجائے مذہب کے سیاسیات سے زیادہ ہے۔

۲۳- اشتراکیت (Socialism) - اس تحریک کا مقصود یہ ہے کہ دنیا کی ملکیت تمام انسانوں میں برابر تقسیم ہونا چاہئے۔ عہدِ حاضر میں اس کی ابتدا انیسویں صدی کے آغاز سے ہوتی ہے، جب سر ٹامس مور (Sir Thomas Moor) کے خیالی ہیئت اجتماعیہ (Utopia[1]) کو عمل میں لانے کی کوشش کی گئی۔ اس کے بعد ایک فرانسیسی فوریر (Fourier) (۱۷۷۲ء - ۱۸۳۷ء) نے سوسائٹی کا ایسا نظام تجویز کیا جس سے طبقات انسانی کفیل بالذات ہو جائیں اور پھر رابرٹ اوون Robert Owen (۱۷۷۱ء - ۱۸۵۸ء) نے اپنی ساری دولت صرف کر کے نمونہ کے طور پر ایک ایسی فیکٹری اشتراکیت کے اُصول پر قایم کی لیکن سوائے اس کے کہ تجارتی اداروں میں اتحاد عمل کا جذبہ تو ضرور اس سے پیدا ہو گیا اور کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

اس تحریک کی سیاسی اہمیت ۱۸۴۸ء سے شروع ہوتی ہے۔ جب براؤڈھن (Proudhon) نے فرانس میں سکّہ کا چلن موقوف کرنے کے لئے تبادلۂ اشیاء کے بنک اور اتحاد باہمی کی کمیٹیاں مقرر کرنے اور لوئی بلانش (Louis Blanc) نے ایک قومی دارالصنعت قایم کر کے صنعت و حرفت کو قومی اُصول پر رواج دینے کی تجویزیں پیش کیں۔ کارل مارکس اور فریڈرک انجلس (Frederick Engels) ان خیالی باتوں کے مخالف تھے اور اشتراکیت کو عملی حیثیت سے چلانا چاہتے تھے۔

اسوقت جرمنی اشتراکیت کا مرکز بن گیا تھا اور فرڈیننڈ لاسیل (Ferdinand Lasalle) ایک اور اشتراکی جرمن نے سوشلسٹ پارٹی کی بنیاد ڈالی۔ مارکس اس کا مخالف تھا اور اشتراکی حکومت کا قیام چاہتا تھا۔ جب ۱۸۶۴ء میں لاسیل (ایک واقعۂ محبت میں) قتل ہو گیا تو پھر اس کی پارٹی بھی مارکس کی پارٹی سے مل گئی اور اشتراکیت

---

[1] سر ٹامس مور کی کتاب کا نام ہے جس میں اس نے اپنی خیالی حکومت کو سامنے رکھ کر ایک فرضی جزیرہ کا حال بیان کیا تھا کہ وہاں کی ملکیت کس طرح سب لوگوں میں برابر تقسیم تھی اور وہ کیسی امن و سکون کی زندگی بسر کرتے تھے۔ یہ کتاب پہلے لاطینی میں شایع ہوئی (۱۵۱۶ء) اور پھر اس کا ترجمہ انگریزی میں بھی کیا گیا۔

کا اتنا زور ہوا کہ برطانیہ، فرانس، آسٹریا اور روس ہر جگہ یہ تحریک پھیل گئی۔

سنہ ۱۸۶۵ء میں مارکس نے ایک بین الاقوامی انجمن مزدوروں کی قایم کی جسے اصطلاح میں پہلی انٹرنیشنل (First International) کہتے ہیں۔ اس کے بعد اشتراکیت اور فوضویت میں تصادم ہوتا رہا اور دونوں پارٹیاں ایک دوسرے کی مخالفت کرتی رہیں، تاہم اشتراکیت کی تحریک برابر جاری رہی اور مارکس کے انتقال (سنہ ۱۸۸۳ء) کے بعد بھی لوگ اسے چلاتے رہے۔

سنہ ۱۸۸۹ء میں انٹرنیشنل کی پھر تجدید ہوئی اور تمام دنیا کی اشتراکی جماعتیں اس میں شریک ہوگئیں۔ اس کو دوسری انٹرنیشنل کہتے ہیں۔ اسی دوران میں ایک اصلاحی جماعت اور پیدا ہوگئی جو اصولِ اشتراکیت کی تو قایل تھی لیکن تدریج کے ساتھ منزلِ مقصود تک پہونچنا چاہتی تھی اور مارکس کی تعلیم یہ تھی کہ ہنگامہ کرکے فوراً انقلاب پیدا کرنا چاہیے۔

سنہ ۱۹۱۲ء میں انٹرنیشنل نے جنگ کے خلاف تجویز پاس کرکے سرمایہ داروں کو ڈرایا کہ اگر انھوں نے جنگ میں حصہ لیا تو وہ بغاوت کردیں گے، لیکن جب سنہ ۱۴ء میں لڑائی شروع ہوئی تو اکثر اشتراکی اپنی اپنی حکومتوں کے ساتھ جنگ میں شریک ہوگئے۔ تاہم انتہا پسند اشتراکیوں کی ایک جماعت ایسی موجود تھی جو اپنے خیال پر قایم تھی اور آخرکار اسی نے لینن کی قیادت میں سنہ ۱۷ء میں روس کے اندر انقلاب پیدا کیا اور خود جرمنی میں بھی اسی تحریک نے لڑائی کو ختم کردینے میں بڑا حصہ لیا، کیونکہ جرمنی کی قیصریت و ملوکیت کو اشتراکی تحریک ختم کرچکی تھی اور ملک جنگ کے لئے آمادہ نہ تھا۔

اس انقلاب کے بعد جرمنی میں، تو اعتدال پسند اشتراکیوں کا غلبہ ہوا، لیکن روس میں انتہا پسندی کا وہ زور ہوا کہ اشتراکیت کمیونزم بن گئی۔

برطانیہ میں اشتراکیت کی نمایندگی ایک حد تک لیبر پارٹی کررہی ہے، لیکن کمیونزم کا وہاں پتہ نہیں۔ جرمنی میں البتہ اشتراکی ووٹوں کی تعداد ہٹلر کے سامنے ۳۸ فی صدی تک پہونچ گئی تھی۔ اس وقت صرف روس ہی ایک ایسی سلطنت ہے جہاں انتہا پسند اشتراکیت کی حکومت ہے اور اب میکزیکو (Mexico) میں بھی قایم ہوگئی ہے، ورنہ دوسری سلطنتوں میں اس وقت تک اس کا رواج نہیں ہوا ہے۔

۲۴۔ (صنعی اشتراکیت Syndicalism)۔ یہ مزدور طبقہ کی انقلابی تحریک ہے جسکا مقصود یہ ہے کہ تجارتی و صنعتی اداروں کی تنظیم مزدوروں اور کام کرنے والوں کے مطالبات و اغراض کو سامنے رکھ کر کیجائے۔ ان کا خاص حربہ ہڑتال (strike) ہے۔ جنگ کے بعد یہ تحریک اشتراکیت کا جزو بن گئی ہے۔

۲۵۔ (صیہونیت Zionism)۔ یہ یہودیوں کی تحریک ہے جسکا مقصود فلسطین میں یہودی حکومت قایم کرنا ہے۔ اس کی ابتدا سنہ ۱۸۹۵ء میں ہوئی اور سب سے پہلی اسکی کانگرس کا جلسہ ۱۸۹۸ء میں ہوا۔ ڈاکٹر ہرزل (Dr. Herzl) اس کا بانی ہے اور اسوقت ۲۰ لاکھ یہودی اسکے ممبر ہیں۔

خلیفہ گلزار علی اسیر

خلیفہ گلزار علی اسیر میاں نظیر کے فرزند اکبر تھے مولف زندگانی بے نظیر کا بیان ہے کہ سنہ ۱۲۱۲ھ میں پیدا ہوئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ میاں نظیر ہی کے مکتب میں تعلیم و تربیت پائی تھی اور باپ سے شاعری بھی ورثہ میں ملی تھی، میاں نظیر کی زندگی تک گلچھرے اُڑاتے رہے سنہ ۱۲۴۶ھ میں نظیر نے انتقال کیا تو اسیر (تیس سال کی عمر میں) مہاراجہ بلونت سنگھ کاشی والا، اور مائی تھان والوں کو پڑھانے لگے، دو جگہ کی آمدنی ستر روپیہ ماہوار تھی، گوالیار میں ان کے دو گھوڑے بھی تھے وہاں سے فی گھوڑا بائیس روپے آتے تھے جس میں سے بارہ وہیں کٹ جاتے اور بتیس روپئے خلیفہ جی کو ملتے تھے. اس طرح سو روپیہ ماہوار سے زیادہ آمدنی تھی، میاں نظیر کی سی غربت اور بھلمنساہٹ ان کی طبیعت میں نہ تھی. مؤلف زندگانی بے نظیر کسی نوازش علی بیگ کی زبانی روایت کرتے ہیں کہ سنہ ۱۲۵۲ھ میں مہاراجہ بلونت سنگھ نے آگرے میں ایک مشاعرے کی بنا ڈالی اور بڑی دھوم دھام سے مشاعرہ ہونے لگا چونکہ خلیفہ جی مہاراجہ کے نوکر تھے اس لئے مہاراجہ نے ان سے خواہش کی کہ مشاعرہ کے لئے غزل کہہ دیا کریں۔ انھوں نے کہا میں اس لئے نوکر نہیں کہ اپنی غزل تمھیں بخشا کروں تم خود کچھ کہو جہاں کہیں خامی یا نشیب و فراز ہوگا، درست کر دوں گا، مہاراجہ نے مجبور ہو کر حاتم علی مہر کو بلوالیا اور وہی غزل کہہ دینے لگے، مگر ان کے اس تیکھے پن کے باوجود مہاراجہ انھیں بھی مشاعرہ میں بلواتے اور اپنا اُستاد سمجھتے، مشاعرہ میں خلیفہ جی کو اپنی داہنی طرف بٹھاتے اور مہر کو بائیں طرف، دونوں کے آگے چاندی کا حقہ لگایا جاتا، مرزا حاتم علی مہر تو حقہ پر اکتفا کرتے مگر خلیفہ افیون کے رسیا اور بھنگ کے دلدادہ تھے حقہ سے بھلا کیا سیر ہوتے، ساقن جو دوسروں کو حقہ پلانے مقرر ہوتی اس کو بلاتے اور گرما گرم حقہ سے محفل مشاعرہ کو دھواں دھار بناتے تھے، مہر ذرا مہذب آدمی تھے پہلی دفعہ انھوں نے خلیفہ جی کی یہ حرکت دیکھی تو کچھ حیرت کا اظہار کیا خلیفہ جی کب چوکنے والے تھے فوراً یہ مطلع سنایا:-

دل میں الفت ہے جو اک سانولی متوالی کی
گو مسلماں ہوں یہ بول اُٹھتا ہوں جے کالی کی

خلیفہ کی تعلیم بھی نہایت معمولی ہوئی تھی میاں نظیر کی ولایت کے ثبوت میں مولف زندگانی بے نظیر نے ایک روایت نوازش علی کے حوالے سے بیان کی ہے کہ جب کبھی میاں نظیر خلیفہ جی کو ساتھ لے کر مکتب کی طرف روانہ ہوتے خلیفہ جی پیٹ کے درد کا بہانہ کر کے مکان کو واپس ہو جاتے، میاں نظیر پر فالج کا حملہ ہوا اور تین روز کی بیہوشی کے بعد چوتھے روز ہوش آیا

تو انھوں نے دریافت کیا کہ مکتب کون پڑھا رہا ہے اس کے جواب میں خلیفہ جی نے کہا آپ کے سوا بھلا کون پڑھا سکتا ہے میں نے تو ابھی تک گلستاں بھی ختم نہیں کی ہے مکتب کے طلباء طغرا اور ابوالفضل پڑھتے ہیں بھلا میں انھیں کیا پڑھا سکتا تھا اس لئے کوئی انتظام نہ ہو سکا، میاں نظیر نے کہا تم جاؤ بھی تو، چنانچہ خلیفہ کا بیان ہے کہ "ارشاد سے ان کے گیا اور اُن کی دعا سے کچھ ایسا بہرہ کھلا کہ پھر کوئی کتاب مشکل ہی معلوم نہ دی حقیقتاً یہ بھی اُن کا ایک تصرف تھا" اس سے پتہ چلتا ہے کہ خلیفہ بس یوں ہی خلیفہ بن گئے تھے پڑھے لکھے اسی قدر تھے کہ گلستاں تک نہیں ختم کی تھی۔

مولف زندگانی بے نظیر کا بیان ہے کہ خلیفہ کے شاگردوں کی تعداد بھی خاصی تھی اور شاگردوں کا جم غفیر ہمیشہ لگے ساتھ رہتا تھا، شہباز نے خلیفہ جی کے دو دواوین کا تذکرہ کیا ہے ایک مطبوعہ اور دوسرا قلمی لالہ سری رام نے خمخانۂ جاوید میں ان کی ایک مثنوی کا ذکر کیا ہے جو سوز عشق کے نام سے مشہور تھی۔

خلیفہ جی نے ۱۲۹۵ھ میں انتقال کیا ان کے ایک شاگرد غلام محمد خاں رہا نے تاریخ وفات کہی تھی جو لوحِ مزار پر کندہ ہے

گفت اسیر دام ہستی شد رہا

اس میں چھ عدد کا تخرجہ ہے۔

یہ حالات تھے خلیفہ جی کے جو پروفیسر شہباز کی کتاب زندگانی بے نظیر سے ملے، آئیے اب ہم اسیر کا مطالعہ ان کے کلام کی روشنی میں کریں۔ ہمارے پیش نظر اسیر کا دیوان مطبوعہ مطبع حیدری واقع دارالخلافہ اکبرآباد کٹرہ حاجی محمد حسن بماہ شعبان المعظم ۱۲۷۶ھ مطابق فروری ۱۸۶۳ء ہے جو رائل سائز اور (۱۳) سطری مسطر پر طبع ہوا ہے متن میں ۱۳ اور حاشیہ پر ۱۴ اس طرح فی صفحہ ۲۷ شعر ہیں، ۱۶۷ صفحات ہیں بظاہر اس دیوان میں (۴۵۰۹) شعر ہیں، آخر میں دو ایک خمسے ایک آدھ مسدس چند رباعیاں ہیں مگر سب معمولی شروع سے ۱۶۹ صفحات تک غزلیات ہیں عموماً غزلیں بڑی بڑی ہیں اور دو غزلہ سہ غزلہ کہتے گئے ہیں جس سے ان کی پرگوئی کا اندازہ ہوتا ہے۔

دیوان پیش نظر خلیفہ جی کی زندگی ہی میں طبع ہوا ہے اس دیوان کی طباعت کے اُنیس سال کے بعد خلیفہ جی نے انتقال کیا ہے انیس سالہ شاعری جس دیوان میں تھی وہ پروفیسر شہباز کی نظر سے گزر چکا ہے مگر افسوس ہے کہ انھوں نے کوئی اچھا انتخاب اس دیوان سے نہیں کیا صرف چند شعر اسیر کے نقل کئے ہیں جن میں سے اکثر اس مطبوعہ دیوان میں ہیں۔ بقیہ چار چھ شعر ایسے ہیں جو اس دیوان میں نہیں مگر وہ شعر بھی کوئی خاص بات نہیں رکھتے، مثنوی جس کا ذکر سری رام صاحب نے کیا ہے ہمیں نہ مل سکی اور نہ پروفیسر شہباز ہی کو اس کا پتہ چلا ورنہ وہ ضرور مثنوی کا تذکرہ کرتے۔ اس دیوان کے مطالعہ سے ذاتی حالات بہت کم معلوم ہوتے ہیں ان کی مفلسی پر روشنی پڑتی ہے اور ناقدری کا پتہ چلتا ہے، حب اہل بیت اور رندی بھی توغل بھی ظاہر ہوتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ شاعرانہ ثروت نگاہی بھی نظر آتی ہے باوجود اس کے کہ سو روپیہ ماہوار خلیفہ جی کی آمدنی تھی اور اس زمانہ میں سو روپیہ خاصی اہمیت رکھتا تھا کیونکہ بڑے بڑے

شاعر بیس بیس روپیہ ماہوار پر زندگی بسر کر رہے تھے ملک الشعراء اُستاد ذوق پانچ روپیہ ماہوار پاتے تھے انکے مقابل میں تو اسیر کی آمدنی بہت زیادہ تھی مگر متعلقین کی زیادتی کے علاوہ افیون نوشی اور اس کے لوازمات کی کثرت کی وجہ سے شاید یہ آمدنی ان کو کفاف نہیں کرتی تھی اسی وجہ سے مفلسی کا رونا روتے رہے اس سُبک وضعی کا احساس انکو بھی تھا چنانچہ کہتے ہیں :-

یہ سچ ہے نسب میں ہوں گراں قدر اسیر آہ ‏ لیکن میں سبک وضعی سے مطعونِ جہاں ہوں

اس کے ساتھ ہی ساتھ جادۂ پدری سے انحراف کا بھی انھیں افسوس تھا۔

افتادگی کی چال چلو تم بھی اب اسیر! ‏ وضع پدر جو چھوڑے وہ فرزند کچھ نہیں

انھیں وجوہ سے فراغت نصیب نہ تھی اور روتے تھے کہ

سر میں بھی اُٹھاؤں جو ترے دور میں اے چرخ ‏ ہوگی کبھی کاہے کو فراغت سے مجھے اتنی

مفلسانیم و ہوائے مئی و مطرب داریم ‏ کیونکر اس شہر میں اوقات گزاری ہوگی

افلاس میں ہو سیر تو دل سیر ہو کیا خاک ‏ دولت ہی کا سب میلہ ہے دولت کا تماشا،

اے لذتِ دُنیا تجھے کیا یاد کریں گے ‏ دو دن کے لئے ہم نے جو کی آن کے جاگرم

تس پر بھی نہ پیچھا کبھی افلاس نے چھوڑا ‏ پانی جو ملا سرد تو کھانا نہ ملا گرم

افلاس کا غلبہ ہوتا تو یہ کہہ کر تسکین دے لیا کرتے تھے کہ

مولیٰ کی اک نظر ہے فقط کیمیا اسیر ‏ کچھ غم نہیں جو آیا ہے افلاس اب کے بھر

مگر باوجود اس مفلسی کے گلچھرے اُڑاتے تھے

مفلسی میں تو یہ گلچھرے اُڑاتا ہے اسیر ‏ جانے کیا کرتا ترے پاس اگر زر ہوتا،

مفلسی میں انسان متمولوں سے متنفر ہوجاتا ہے اور یہ جذبہ اس قدر شدت اختیار کر لیتا ہے کہ وہ کسی متمول کی صورت بھی دیکھنا نہیں چاہتا،

ہو جو مقدور تو دنیا میں منادی کر دوں ‏ سامنے ہو کے نہ مفلس کے تونگر نکلے

باوجود اس مفلسی کے خودداری اور غیرت کا یہ حال تھا کہ نودولتوں کی خوشامد یا مصاحبت کرنا پسند نہ کرتے تھے۔

سو داغ مفلسی مجھے دل پر قبول ہیں، ‏ لیکن نہیں ہے صحبتِ نودولتاں پسند

اسی مفلسی نے انھیں اپنی بدبختی کا احساس بھی پیدا کرا دیا تھا اور اپنے تئیں بڑا بیکس و بے بس تصور کرتے تھے۔

ہم کو ان کانوں نے جو جو کہ سنایا وہ سنا ‏ ہم کو ان آنکھوں نے جو جو کہ دکھایا دیکھا

پٹکا جو فلک نے تو زمیں نے دیا سرکا، ‏ میں اک گل بازی ہوں اِدھر کا نہ اُدھر کا

اسی سلسلہ میں یارانِ وطن سے بھی شکایت پیدا ہو گئی تھی،

بیڑیاں کاٹ جو صحرا کو نہ بھاگے گا اسیر — طوق پہنائیں گے یارانِ وطن گردن تک
یاں شمع کہاں ہے مرے ویرانے میں مجنوں — اک داغ ہے ہم صحبتیٔ اہلِ وطن کا،

اس کے باوجود اپنی پاک باطنی اور صاف دلی پر ناز تھا،

باطن آباد ہے ظاہر میں خرابی ہے اگر — گنج لیجاتی ہے دنیا مرے ویرانے سے

شاعری سے متعلق نہ صرف خلیفہ جی کے فنی معلومات ہی اچھے تھے بلکہ ژرف نگاہی بھی ان میں پیدا ہو گئی تھی، دوستوں کی تعریف کو وہ حقیقی تعریف نہیں سمجھتے تھے بلکہ انھیں معلوم تھا کہ یہ لوگ منھ دیکھے کی کہتے ہیں۔

نازاں نہ ہو اسیر اب کچھ اپنے شعر پر تو — کہتے ہیں یہ جو تیرے سب دوستدار اچھا
پر ہم تو اس کو اچھا کہتے ہیں جس کو سنکر — دشمن کے منھ سے نکلے بے اختیار اچھا

شاعری میں بعید مضامین اور گتھیاں سلجھانے کے بھی وہ قایل نہ تھے صاف اور سیدھے شعر چاہتے تھے۔

معنیٔ شعر جبکہ بدقت سمجھ میں آئے — تو شعر کا ہے کو وہ ہوا چیستاں ہوا۔

لوگوں کے مضامین لے کر اپنے رنگ میں باندھنے کے بھی وہ قایل نہ تھے بلکہ اُسے بُرا سمجھتے تھے

ہے اپنے قاعدے میں یہ شعر و سخن کی بات — نکلی ہوئی کہیں نہ کسی کے دہن کی بات

انھیں اس کا احساس تھا کہ بڑے سے بڑے اُستاد کی بھی پوری غزل مرصع نہیں ہوتی بلکہ ایک ہی دو شعر ہر غزل میں اچھے نکلتے ہیں

کیوں اہلِ معنی دادِ سخن دیں نہ اے اسیر — اچھے ہیں اس غزل میں بھی اشعار ایک دو

معلوم ہوتا ہے کہ آغازِ مشق میں ان پر اعتراض بہت ہوتے تھے کبھی توارد ہو جاتا تو لوگ سرقہ بتاتے تھے اور اگر غزل اچھی ہوتی تو کہتے کہ اُستاد سے کہلوا لیا ہے غالباً یہ باتیں نظیر کے انتقال سے پہلے کی ہیں اور یہ شعر بھی جب ہی کہے گئے ہیں۔

سخت مشکل ہے اگر ہووے توارد واقع — اس کو بس غیر کا مضمون بتاتا ہے کوئی
اور لکھتے ہیں جو ہم شستہ و رفتہ سی غزل — تہمت اُستاد کے شعروں کی لگاتا ہے کوئی

اس کے بعد چیلنج کرتے ہیں

شک ہو گر دل میں تو کر مصرعۂ رنگیں موزوں — کیوں نہیں طبع سے پھر طبع لڑاتا ہے کوئی
آج مرزا بھی ہیں منصف ابھی کھلجائے گا، — ہم چراتے ہیں غزل یا کہ چراتا ہے کوئی

غالباً مرزا سے مراد مرزا حاتم علی مہر ہے، کیوں کہ ایک اور شعر میں انھوں نے اپنے چند معاصرین کو گنایا ہے جن کے

منجملہ مہر بھی ہیں۔

مہر و مہ اعظم و آغا ہیں سخن سنج اسیر
شاعری پہلے جو چندے یہی صحبت رہ جائے

مگر انہیں عیب جوئی اور خوردہ گیری کی عادت نہ تھی۔

عیب جویان سخن ڈھونڈھتے ہیں عیب اسیر
جو ہنرمند ہیں وہ داد ہنر دیتے ہیں،

دلا تو عیب چھپا اور ہنر کو دیکھا کر
عدو کی چشم جو سوئے ہنر نہیں تو نہ ہو

معلوم ہوتا ہے کہ ان دنوں آگرہ میں شاعری کا زور شور تھا اور ہر شاعر طوطیٔ ہند بنا ہوا تھا، دیکھئے طنز کرتے ہیں اور کتنا گہرا طنز ہے

جس کو سنئے وہ جواب بلبل شیراز ہے
طوطیوں سے کشور ہندوستاں خالی نہیں

مگر اپنے کلام کی حقیقی قدر بھی آپ جانتے تھے اور آگرہ والوں کی ناقدری کے شاکی بھی تھے۔

گاہک ہی آگرہ میں سخن کا نہیں اسیر
مدت سے ہے دکان ہماری کھلی ہوئی

آج شاخ قلم خشک سے جز تیرے اسیر
اس طرح سے گل مضمون کھلاتا ہے کوئی

چپ رہنے کو تصویر ہوں برسوں بھی نہ بولوں
اور ریختہ کہنے کو سراپا میں زباں ہوں

اسیر سخن سنج کی کچھ نہ پوچھو
یہ جو کھا کے موتی اگلتا ہے عاشق

آپ کو یہ زعم بھی تھا کہ مرنے کے بعد آپ کی رنگینیٔ طبع سے گل احمر کھلیں گے، یہ مضمون تعلی میں بالکل نیا ہے :۔

کیا کیا گل احمر مری مٹی سے کھلیں گے
رنگینی پہ آئے گی اگر زیر زمیں طبع،

مگر یہ سب جوانی کی باتیں تھیں جب بڑھاپا آگیا تو طبیعت بیٹھ گئی

پیری میں کہاں رونق ایام جوانی،
رنگ رخ شمع سحر اچھا نہیں ہوتا

برجستہ شعر، بندش مضموں کہاں اسیر
ہم اپنی سرگزشت قلمبند کرتے ہیں

وہ گرمیٔ مضموں تو ہوئی سرد اسیر اب،
یہ دل کے نکلتے ہیں بخارات زباں سے

والد کے دیوان کی فکر بھی رہی ہے ممکن ہے کہ نولکشور کا پہلا اڈیشن جو بہت ضخیم تھا جس میں ہزلیات کا بھی خاصا حصہ تھا خلیفہ صاحب ہی کا مرتبہ ہو

گر چاہو کہ ہوں صاحب دیوان اسیر آپ
شیرازۂ دیوان پدر کھینچ کے باندھو

معلوم ہوتا ہے کہ آخر میں بالکل میاں نظیر کا رنگ اختیار کر لیا تھا اور با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا، پر عمل کرتے تھے۔

میں وہ ہوں دوست کہ دشمن کو بھی ناخوش نہ کروں
کچھ بجز لطف و مدارات مجھے یاد نہیں

نظیر کی طرح خلیفہ اسیر نے "مقامیات" پر کوئی مستقل نظم یا غزل نہیں کہی ہے مگر بعض شعر مقامی رنگ کے ضرور کہے ہیں

دیکھو تو آگرہ میں دیوالی کی روشنی ہر کوچہ ماہتاب ہے ہر خانہ آفتاب،

اے جنوں چل کسی ویرانے میں سر پھوڑیں گے اکبر آباد میں شوخ ایک نہ لڑکا دیکھا

وہ رنگ زرد مرا دیکھ ہنس کے کہتے ہیں، اب آگرہ میں بھی ہوتی ہے زعفران پیدا

کسی نے کہا ہے:- "دیوانہ باش تا غم تو دیگراں خورند" مگر اس سے اچھی چیز نیم پاگل پن ہے جسے اُردو میں اُلّو، گدھا وغیرہ کہتے ہیں اس کو ذرا پھکڑ قسم کے لوگ "چوتیاپن" کہتے ہیں اس قسم کی مخلوق دنیا میں بڑے مزے میں رہتی ہے خلیفہ جی نے اسی کو بے شعوری سے تعبیر کیا ہے:-

جو بے شعور ہیں دنیا میں چین سے ہیں اسیر خراب کرتا ہے کیا کیا مرا شعور مجھے

عاشقانہ شعر خلیفہ جی نے خوب کہے ہیں بعض شعر نزاکتِ تخیل کی بڑی اچھی مثال ہیں:

آیا جو چلتے چلتے تری زلف کا خیال آپ ہی اُلجھ اُلجھ کے کئی بار گر پڑا

دیکھئے کس قدر لطیف شعر ہے:

یاد آتی ہیں کسی کی غضب مہربانیاں سنتا ہوں جب کسی پہ کوئی مہرباں ہوا

اس شعر میں ایک سوز ہے جس کی جھلکیاں کہیں کہیں ملتی ہیں:

جب سے پڑا دل عشق میں تب سے قصہ خوانی بھول گیا اپنی کہانی یاد رہی اور سب کی کہانی بھول گیا

اسی غزل کے دو شعر اور سن لیجئے:-

جان پھنسی ہر آفت میں نے جیتے ہیں نے مرتے ہیں تم کیا بھولے مرگ بھی اب تو ہمکو جانی بھول گیا

ہائے رے اس نسیاں کا برا ہو رہ رہ کر پچھتاتا ہوں دیدیا خط قاصد کو اور پیغام زبانی بھول گیا

شعر ملاحظہ ہو بعض لوگ اس کو تصوف کے رنگ میں سمجھیں گے، مگر یہ عاشقانہ شعر ہے، خوب کہا ہے:-

میری دو آنکھیں اس کے لاکھ جلوے نکالوں حسرتِ دیدار کیونکر [1]

کس قدر صحیح کہا ہے:

جس کی گردن میں لپٹتی ہے سکھا دیتی ہے عشق پیچاں کہوں یا سنبلِ پیچاں ہو وہ زلف

چند شعر مختلف مضامین کے سنیئے:-

سینے میں مرے آہ تو مدت سے ہوئی سرد اک نالۂ محزوں ہے سو محتاج اثر کا

---

[1] شاید انیس کی رباعی اسی سے ماخوذ ہے:-

گلشن میں پھروں کہ سیر صحرا دیکھوں، یا معدن و کوہ و دشت و دریا دیکھوں،

ہر جا تری قدرت کے ہیں لاکھوں جلوے حیران ہوں دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں

جلے جو دل تو ہو آہِ شرر فشاں پیدا — لگے نہ آگ تو کس طرح ہو دھواں پیدا

شاید کہ ساتھ نالہ کے جاں ہو گئی رواں — مرغِ چمن جو کھول کے منقار گر پڑا

پھر کسی کا ہاتھ سے کھینچا ہے دامن غیر نے — پھر کسی کا چاک تا دامن گریباں ہو چلا

پھر کسی نے رُخ پہ اپنے چھوڑ دی زلفِ سیاہ — پھر کسی سودا زدہ کا دل پریشاں ہو چلا

حیف میں دیکھوں اور دل جائے — میری آنکھوں کے سامنے مارا

ظلمِ بتاں ہوا ستمِ آسماں ہوا — یک مشت استخواں پہ نہ کیا کیا یہاں ہوا

مرا فسانہ ہوا گوش زد خلایق کے — ہزار حیف تمہارے نہ کان تک پہونچا

دل ترا سینہ ترا سر ترا ساماں تیرا — پاس عاشق کے جو ہے سب ہے مری جاں تیرا

کب کے لے اُڑتی زمیں سے مجھے ساقی یہ شراب — کوئی معشوق بغل میں جو بھبھوکا ہوتا

میری وحشت نے رفوگر کو بھی حیراں کر دیا — جب تلک دامن سیا ٹکڑے گریباں کر دیا

سنئے اسے کان لگا کر ذرا — قصۂ دل ہے یہ کہانی نہیں

اپنے میں پاؤں کی زنجیر ہلا دیتا ہوں — جبکہ حلقہ درِ زنداں کا ہلاتا ہے کوئی

بزمِ اغیار میں بیٹھا ہوا تو یاد آیا — گردِ گل کے نظر آئے جو چمن میں کانٹے

مجھے خبر نہیں دامن تھا یا گریباں تھا — کئے ہیں رات کو کچھ تار تار سے میں نے

دل پہ اللہ اختیار نہیں — ہو نہ مجبور اس قدر کوئی

عجب کچھ تفرقے سے شہرِ آب و گل میں پھرتا ہوں — مجھے ڈھونڈھے ہے دل میں جستجوئے دل میں پھرتا ہوں

بے دل کے جلے سوزِ جگر میں نہیں ہوتا — خوشبو کے لئے آگ پہ رکھتے ہیں اگر کو

میخواری سے توبہ ہے پر اس وقت ہوں معذور — جب شاخ پہ گل صورتِ پیمانہ بنے گا

بخت جاگا کیا جب تک کہ رہے ہم سوتے — ہم جو بیدار ہوئے بخت کو سوتے دیکھا

کچھ جامہ زیبیاں تو گل اندا موں پر ہیں ختم — جس رنگ کی پہناؤ بدن میں قبا کھلے

آگرہ پر ہمیشہ دلی کا اثر رہا ہے مگر خلیفہ جی کے کلام میں لکھنؤ کا گہرا رنگ پایا جاتا ہے چند شعر ملاحظہ کیجئے:-

ستم سج دھج بناتا تھا بلا چوٹی گندھاتا تھا — غضب مسی لگاتا تھا قیامت پان کھاتا تھا

تیری آنکھیں پھرتے ہی عالم کی آنکھیں پھر گئیں — برۂ آہو زیادہ شیر نر سے ہو گیا

چہرہ خورشیدِ درخشاں سے ہے تاباں تیرا — مشرقِ نور ہے کرتی کا گریبان تیرا

رہتا ہے خزاں میں بھی ہرا زخم بدن کا — پانی تھا تری تیغ میں کیا نہرِ چمن کا

تیری مجلس کی چلیچی سے تپے ہے خورشید — آفتابے سے ہے پانی مہ کامل ہوتا،

کاسہ سر کو بنایا جو مرے خاک انداز — اے فلک کرتا تھا سرپوشِ کسی سینی کا

کام بندوق دونالی کا کیا کرتا ہے — اے بتِ صید فگن خال تری بینی کا

حجام خطِ یار کو اصلاح دیتے ہیں — جھلتے ہیں تیرے ہاتھ کے پروردگار حرف

جا، دم حقے کے جب غیر پلاتا ہے انھیں، — میرے اٹھتا ہے کلیجے سے دھواں دو دو دن

چوکھٹ پہ رہی اپنی جبیں شام سے تا صبح — کنڈی نہ مگر اس ستم ایجاد نے کھولی

نظیر کے مذہب کے متعلق میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ نظیر کے اجداد اہلِ تسنن تھے نہ جانے کس وجہ سے نظیر کے والد نے یا نظیر نے شیعہ مذہب اختیار کیا تھا مگر نظیر کے حالات اور کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن میں حُبِ اہلِ بیت کے علاوہ کوئی دوسری شیعی نشانی نہ تھی خلیفہ جی البتہ ذرا "اشد" معلوم ہوتے ہیں مقلدوں یعنی سنیوں پر ایک جگہ چوٹ کی ہے۔

خدا ہمیشہ مجھے اس مقلدی سے بچائے — کہ دل میں بغضِ علیؓ نام ہے غلامِ علیؓ

خلیفہ جی نے نعت اور منقبت میں بہت شعر کہے ہیں مگر کوئی خاص بات پیدا نہ کر سکے، البتہ جریدتین کا مضمون اس کثرت سے باندھا ہے کہ کسی شاعر نے اس قدر شعر اس مضمون کے نہیں کہے ہیں اس موضوع کی حد تک خلیفہ جی جریدہ ہیں

بعد مردن بھی مرے دل کے پھپھولے پھوٹتے ہیں — چبھتے جاتے ہیں جریدوں کے بدن میں کانٹے

شاخ سدرہ کا نہ جبریل کا رستہ دیکھو — دو جریدوں کی جگہ رکھدو کفن میں کانٹے

تر رکھا جو اشکوں نے عصائے بغلی کو — شاخوں میں جریدوں کے لگے بیر لحد میں

خلیفہ جی کے دیوان کے مطالعہ سے ایک عجیب و غریب توارد کا پتہ چلا، ایک شعر بہت مشہور ہے:—

کون سنتا ہے فغانِ درویش — قہرِ درویش بجانِ درویش

یہ شعر اس قدر مشہور ہے کہ بچے بچے کی زبان پر ہے مگر بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ یہ کس کا شعر ہے، یہ شعر حکیم مومن خاں کا ہے جو اُن کی تیسری مثنوی میں ہے، خلیفہ جی کے دیوان میں ایک غزل ہے جس کے دو شعر یہ ہیں:—

کون سنتا ہے فغانِ درویش — کون ہے مرتبہ دانِ درویش

چاہیے بند زبانِ درویش — قہرِ درویش بجانِ درویش

خلیفہ جی کے پہلے مطلع کا پہلا مصرع اور دوسرے مطلع کا دوسرا مصرع مومن کا شعر بنتا ہے خلیفہ جی اور مومن معاصر ضرور ہیں مگر سرقہ نہ تو مومن نے کیا ہے نہ خلیفہ جی نے یہ بھی بڑے مزے کا توارد ہے۔

چونکہ خلیفہ جی پر لکھنؤ کا اثر بہت تھا اس لئے محاوروں کے استعمال کی کوشش بھی کی ہے اور بہت

محاورے استعمال کئے ہیں:

صاحب زکوٰۃِ حسن کے ہم بھی ہیں مستحق — خیرات اپنی ہم کو بھی دو دار پھیر کر
تشنہ لب خوبیٔ قسمت سے تو رہتا ہے اسیر — ورنہ اے یار ترا یار تو ہے دل دریا

محاوروں کے شوق میں دل دریا جیسا بازاری محاورہ بھی استعمال کر جاتے ہیں۔

چونکہ کالی بیگم (افیون) کے شیدائی تھے اس لئے مٹھاس پر جان دیتے تھے یہی وجہ ہے جو بعض میٹھے میٹھے شعر کہے ہیں:

خون میٹھا عشق شیریں کے اثر سے ہو گیا — بند بند اپنا زیادہ نے شکر سے ہو گیا

پینک میں بھی خلیفہ جی نے شاعری کی ہے شعر ملاحظہ ہو:۔

دنیا خیال و خواب ہے اور میں بھی خواب ہوں — یہ دیکھتا ہوں خواب میں میں خواب دوسرا
دیکھا کوئی مکاں نہ کہیں آسمان پر — صاحب ہمیں زمیں پہ ہمیں آسمان پر

خلیفہ جی کے بعض اشعار ایسے بھی ہیں جن پر تصوف کا اطلاق ہو سکتا ہے مگر ان میں بھی کوئی بات نہیں۔

خلیفہ اسیر ایک پرگو صاحبِ مذاق اور واقفِ فن شاعر تھے زبان پر بھی خاصا عبور تھا درجۂ دوم کے شعراء میں ان کا شمار کیا جا سکتا ہے گو ان کی شاعری میں کوئی خاص بات نہیں ہے مگر کلام اس قابل بھی نہیں کہ بالکل نظر انداز کر دیا جائے، نظیرؔ کی ہمہ گیری اور روانی ان میں نہیں ہے مگر پھر بھی ایک اُپج ضرور ہے، چونکہ تریاکئی قدیم تھے اسلئے پینک میں بڑی دور کی کوڑی لاتے تھے، سوزن اور رشتۂ سوزن ایک پامال مضمون ہے دیکھئے اس کو کس عمدگی سے باندھا ہے:

دامنِ دشت پہ ہر گام میں کم ہوتی گئی، — زندگی اپنی مگر رشتۂ سوزن نکلی

فلسفۂ رنج و راحت کو کس مزے سے بیان کیا ہے:

راحت بغیر رنج کے ملنا محال ہے — جنت میں جائے گا جو جہنم میں گھر ہوا

اس قسم کے بیسیوں شعر ان کے دیوان میں موجود ہیں بتذل اشعار بھی ہیں اور ثقہ بھی، عمدہ بھی خراب بھی بہر حال اسیر کا دیوان ایک گلدستہ ہے جس میں "پھول بھی ہیں اور کانٹے بھی" مگر "جو گل کے جویا ہیں انھیں کیا خار کا کھٹکا"

تمکین کاظمی

داستانِ ابر و باد

لاکھوں برس پہلے کی بات ہے کہ جب کرۂ زمین کے مشتعل معدنی اجزاء آہستہ آہستہ سرد ہونے لگے، تو وزنی عناصر (جیسے سونا، چاندی، تانبہ اور لوہا) مرکز زمین کی طرف مایل ہوئے اور ہلکے عناصر (جیسے ہیلیم، ہائڈروجن، آکسیجن نائٹروجن) سطح پر رہ گئے جن کے امتزاج کا دوسرا نام فضا (Atmosphere) ہے۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ ہوا کی موٹی تہ جو زمین کو گھیرے ہوئے ہے، اس کا وزن ۶ ہزار بلین ٹن ہے (یعنی ۱۰ الکھرب ٹن)

ہوا میں پھیل جانے کی صلاحیت، سو سال قبل مسیح ہمیں معلوم ہو چکی تھی اور اس کے دباؤ کا حال بھی گلیلو کے ایک اطالوی شاگرد کو معلوم ہو چکا تھا جس نے پارہ کا تھرمامیٹر ایجاد کیا۔ ہوا کا دباؤ ہر مربع انچ پر ۷ر۱۴ پونڈ دریافت ہوا ہے، لیکن انسان اس دباؤ کو اس لئے برداشت کر سکتا ہے کہ خود اس کے جسم کا اندرونی دباؤ بھی اتنا ہی ہے اور وہ ہوا کے دباؤ کو سنبھالے رکھتا ہے۔

صاف ہوا، انسان کی صحت و زندگی کے لئے بڑی ضروری چیز ہے۔ اس میں تھوڑا سا نم بھی ہونا چاہئے، کیونکہ خشک ہوا میں گرمی بالکل نہیں ہوتی اور تر ہوا میں گرمی پائی جاتی ہے۔ زمین سے متصل حصہ ہوا کا نسبتاً زیادہ گندہ اور بھاری ہوتا ہے، اس لئے خالص ہوا زمین سے ۲۶ فٹ بلندی پر میسر آسکتی ہے اور صحت گاہیں بلند مقامات پر قایم کی جاتی ہیں۔

شہروں کی ہوا خراب ہونے کا سبب یہی ہے کہ اس میں مختلف چیزوں کے ذرات مل جاتے ہیں۔ جس چیز کا نام کُہر ہے وہ یہی ذرات ہیں جن میں آفتاب کی روشنی نفوذ نہیں کر سکتی۔ ایک ڈاکٹر کا بیان ہے کہ برطانیہ کے جزیرہ میں ہر سال ۱۵ لاکھ ٹن خاک کے خراب ذرات ہوا میں مل جاتے ہیں اور لندن کی فضا میں سالانہ ۵ لاکھ ٹن ذرات گندھک کے پائے جاتے ہیں۔

خشک ہوا میں ۷۸٫۰۳ فی صدی حصہ نائٹروجن پائی جاتی ہے، ۲۰٫۹۹ فی صدی آکسیجن، ۰٫۹۴ فی صدی آرگن (Argon) اور ۰٫۰۳ فی صدی کاربن۔ کچھ گیسیں اور بھی تھوڑی تھوڑی مقدار میں پائی جاتی ہیں۔ اگر ہوا میں آکسیجن کی مقدار گھٹ کر ۱۸½ فی صدی رہجائے تو شمع گل ہوجائے اور اگر ۱۰ فی صدی رہجائے تو انسان دم گھٹ کر مرجائے۔

زمین کے دو پھیپھڑے ہیں، بایاں پھیپھڑا اکناڈا ہے اور داہنا شمالی سائبیریا۔ جاڑوں میں یہ پھیپھڑے گرم ہوا کی بڑی مقدار اپنے اندر جذب کر لیتے ہیں اور سرد ہوا فراہم کرتے ہیں۔ گرمیوں میں ان کا یہ عمل اُلٹ جاتا ہے۔

زمین کے چاروں طرف فضا کی تہ اتنی شفاف ہے کہ آفتاب کی روشنی برابر آتی رہتی ہے۔ لیکن اس کی گرمی ۴۰ فیصدی فضا میں جذب ہو جاتی ہے۔

اگر ہم زمین کی گہرائی کی طرف چلیں تو ہر سو فٹ پر ایک درجہ حرارت بڑھا ہوا نظر آئے گا اور اگر ہم اوپر چڑھیں تو ہر ۳۰۰ فٹ پر نصف درجہ حرارت گرا ہوا معلوم ہوگا

کرۂ زمین کے چاروں طرف جو گیسیں پائی جاتی ہیں وہ بہت ہلکی ہیں لیکن زمین کی کشش کی وجہ سے وہ بہت اوپر جاکر ختم نہیں ہو جاتیں۔ پھر بھی بعض گیسیں ایسی ہیں (مثلاً ہائڈروجن اور ہیلیم) کہ وہ بھاگ ہی نکلتی ہیں اور زمین اُن پر پورا قابو نہیں رکھ سکتی۔

چاند کے چاروں طرف بھی کسی وقت گیسوں کی فضا پائی جاتی تھی لیکن اب وہ خلا میں تحلیل ہوکر ختم ہوگئی ہے۔ عطارد جو ہماری زمین کے بیسویں حصہ کے برابر ہے، کرۂ ارض کی طرح کوئی فضا نہیں رکھتا۔ زہرہ کے گرد البتہ ویسی ہی فضا پائی جاتی ہے جیسی زمین کے گرد، اس لئے اگر ہم وہاں پہونچ جائیں تو زندہ رہ سکتے ہیں۔

ہوا جتنی گرم ہوگی، بادل اتنے ہی اونچے ہوں گے۔ یعنی اگر خطِ استوا پر جہاں کی ہوا زیادہ گرم ہوتی ہے بادل چھ میل کی بلندی پر ہوں گے تو منطقۂ باردہ میں (مثلاً گرین لینڈ) ان کی بلندی نصف میل سے زیادہ نہ ہوگی۔ شمالی یورپ میں جہاں سردی زیادہ ہوتی ہے دوسرے موسموں میں بادلوں کی بلندی نصف میل سے ڈھائی میل تک ہوتی ہے اور بارش کے زمانہ میں آدھ میل سے سوا میل تک۔

انسان اسوقت تک زیادہ سے زیادہ چودہ میل کی بلندی تک پہونچ سکا ہے، لیکن غبارہ بیس میل کی بلندی تک گیا ہے۔ ۵۰۰۰ ہم فٹ کی بلندی پر درجہ حرارت صفر سے بھی ۶۳ درجے کم ہوتا ہے، ۱۲ میل کے بعد ۲۰ میل تک البتہ ہوا کی تہ میں

پھر گرمی شروع ہو جاتی ہے۔

گزشتہ جنگ عظیم میں جب جرمنی نے پیرس پر لمبی مار کی توپوں سے گولہ باری کی ہے تو گولہ ۲۲ میل اونچا خم بناتا تھا لیکن کراکاتوا (Karaktoa) کے آتش فشاں پہاڑ کا مادہ ۲۰ میل کی بلندی تک اڑ کر پہونچا تھا۔

بڑی بڑی آندھیاں جو زمین پر آتی ہیں، ان کا سبب ہوا کے وہ تموجات ہیں جو ۲۵۰ میل اونچے پیدا ہوتے ہیں تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ ۳۰۰ میل کی بلندی پر بھی ہائڈروجن اور نائٹروجن کے منتشر اجزا فضا میں پائے جاتے ہیں۔

دنیا کی قیمتی چیزوں میں گیسوں کا بھی شمار ہوتا ہے بعض گیسیں تو سونے اور پلاٹنم سے زیادہ قیمتی ہیں کیونکہ ان میں موسم کا مقابلہ کرنے کی بڑی زبردست قوت پائی جاتی ہے۔ یہ قیمتی گیسیں ہوا میں بھی پائی جاتی ہیں اور سمندروں کے پانی میں بھی بلکہ پانی میں ہوا سے زیادہ۔

ان گیسوں میں اس وقت ہیلیم (Helium) گیس کی بڑی قدر ہے کیونکہ یہ سب سے زیادہ ہلکی گیس ہے اور آگ کو قبول نہیں کرتی۔ غباروں میں اب اسی گیس سے کام لیا جاتا ہے اور اس کا ذخیرہ سب سے زیادہ امریکہ کے پاس ہے۔

قطبین کے پاس، ہوا کے ذرات زمین کے دوسرے حصوں کی بہ نسبت دوچند رفتار سے گردش کرتے رہتے ہیں۔ اور چونکہ آندھیوں کا تعلق ۵۲۰ میل بلند فضا کے تموجات سے ہے، اس لئے اکثر و بیشتر آندھیوں کا رخ اوپر ہی کی طرف ہوتا ہے ورنہ تباہ ہو جائے۔

امریکہ میں بہت زیادہ آندھیاں آتی ہیں یعنی وہاں سالانہ ۱۳۰ آندھیوں کا اوسط ہے اور سیکڑوں جانیں ان سے تلف ہو جاتی ہیں۔ ان کی رفتار ۵۰ میل سے ۵۰۰ میل فی گھنٹہ تک ہوتی ہے۔ ۱۹۲۴ء میں آندھیوں کے سلسلہ نے لوئی سیانا (Louisiana) سے لیکر ورجینا (Virginia) تک سیکڑوں آدمیوں کو ہلاک کیا۔ ۱۸۹۶ء میں سنٹ لوئی (St. Louis) کو آندھیوں نے ۲۰ لاکھ پونڈ کا نقصان پہونچایا اور ۱۹۲۷ء میں یہاں کی ۵۰۰۰ عمارتیں مسمار کر دیں۔ ۱۹۲۶ء میں ایک آندھی نے فلوریڈا کے بارہ سو اور گواڈلوپ کے ۱۲۷۰ آدمیوں کی جانیں لیں۔ یوروپ میں آندھیاں کم آتی ہیں لیکن ۱۹۲۲ء کی آندھی نے فرانس کے جنگلوں میں ۵۰ ہزار درخت جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دئے۔

یوروپ میں ہوا چکیوں کا رواج صلیبی جنگوں کے وقت سے ہوا ہے، جو ایران سے وہاں پہونچا تھا۔ بلجیم میں ایک ہوا چکی بارھویں صدی کی ابتک پائی جاتی ہے۔ ہالنڈ میں ۲۵۰۰ چکیاں مختلف قسم کے کام کرتی ہیں۔ چین میں بھی انکے ذریعے سے آبپاشی ہوتی ہے۔

بارش کے قطرے گرمیوں میں بہ نسبت جاڑوں کے زیادہ بڑے ہوتے ہیں، یعنی گرمیوں میں ان کا قطر ۳/۲ انچ سے ۱/۴ انچ تک ہوتا ہے۔ بارش کے قطرہ کا وزن اوسطاً ۰۴ء۰ گرام ہوتا ہے۔ یہ ۲۵ فٹ فی سکنڈ کی رفتار سے زمین پر آتا ہے۔ بارش کا اوسط مختلف ملکوں میں مختلف ہے۔ ہندوستان میں سب سے زیادہ بارش، آسام کے پہاڑی مقام چراپونجی میں ہوتی ہے جہاں کا سالانہ اوسط چار پانچ سو انچ ہے۔

کُہر بھی ایک قسم کا بادل ہی ہے لیکن زمین سے متصل۔ جب زمین کے بخارات میں دھوئیں کے اجزا الجھاتے ہیں اور وہ بخارات اوپر نہیں اُٹھ سکتے تو کُہر بنجاتے ہیں۔ کُہر سے بھی دنیا کو بہت نقصان پہونچتا ہے، چنانچہ سنہ ۱۹۰۴ء کے کُہر نے انگلستان کو ایک کرور پونڈ کا نقصان پہونچایا۔ فروری سنہ ۳۶ء میں ایک دن ایسا آیا تھا جب سارے یوروپ کو کُہر کی چادر نے لپیٹ لیا تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا کے تمام کام معطل ہو گئے۔

گرج کا طوفان بھی بادلوں ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ جب دو ہوائیں مختلف سمتوں میں چلتی ہیں تو ٹھنڈی ہوا اوپر سے آکر گرم ہوا میں داخل ہوتی ہے اور اس سے پانی پیدا ہوتا ہے۔ لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ ہوا پانی کے قطروں میں انجماد پیدا کر دیتی ہے اور انھیں کا نام اُولا ہے۔

اندازہ کیا گیا ہے کہ کرۂ زمین پر سالانہ ایک کرور ۶۰ لاکھ گرج کے طوفان آتے ہیں اور ۶۰ لاکھ بار بجلی کی چمک روزانہ پیدا ہوتی ہے۔ طوفان کے دوران میں بجلی ۲۰۰ مرتبہ فی گھنٹہ چمکتی ہے۔ بجلی فی الحقیقت ایک شعلہ یا چنگاری ہے جو زمین و بادل یا دو بادلوں کے درمیان تناؤ یا کشش کے دباؤ سے پیدا ہوتی ہے۔ اس میں ۵۰ کرور گھوڑوں کی قوت پنہاں ہوتی ہے اور اس کی رفتار ۱۸۶۰۰۰ میل فی سکنڈ ہے۔

گرم ممالک میں گرج کے طوفان زیادہ آتے ہیں۔ جاوا سب سے بڑا مرکز ان طوفانوں کا ہے جہاں ہر سال اوسط ۲۲۳ طوفان آتے ہیں۔

بجلی سے فایدے بھی دُنیا کو پہونچتے ہیں اور نقصان بھی۔ فایدہ تو یہ ہے کہ اس سے سالانہ دس کرور ٹن نائٹروجن پیدا ہوتا ہے جو زمین کو زرخیز بنانے کے لئے ضروری ہے۔ اور نقصان یہ کہ بہت سے درختوں میں اس سے آگ لگ جاتی ہے، فصلوں کو بھی نقصان پہونچتا ہے اور جانیں بھی ضایع ہوتی ہیں۔

گرج کی رفتار تقریباً ۵ سکنڈ میں ایک میل ہے، اس لئے اگر گرج چار میل دور ہو تو ٹیلی فون سے آپ تقریباً ۱۸ سکنڈ پہلے اس کی آواز کو سُن لیں گے۔ گرج کی آواز میں بازگشت پیدا ہوتی ہے ہوا کی اُن تہوں سے جو مختلف دبازت و ٹمپریچر رکھتی ہیں۔

موسم سے مراد فضا کی وہ کیفیت ہے جو کسی مخصوص حصۂ زمین میں کچھ عرصہ تک قائم رہتی ہے، خطِ استوا کے نیچے جتنے مقامات ہیں وہ زیادہ گرم ہوتے ہیں، کیونکہ آفتاب کی کرنیں یہاں سیدھی پڑتی ہیں۔ زمین کے ٹمپریچر کا اوسط ۱۶ درجہ سنٹی گریڈ ہے لیکن ترکستان میں وہ ۵۸ تک بڑھ جاتا ہے اور گرین لینڈ میں صفر سے بھی نیچے ۹۰ درجے تک گر جاتا ہے مخلوقات میں صرف انسان اور کتا دو ہی جاندار ایسے ہیں جو اپنے آپ کو مختلف موسموں کا عادی بنا سکتے ہیں خصوصیت کے ساتھ سفید اقوام میں یہ اہلیت زیادہ پائی جاتی ہے۔

تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ ہر حصۂ زمین کا موسم بھی بدلتا رہتا ہے، یعنے جو حصے پہلے گرم تھے وہ سرد ہوتے جا رہے ہیں اور جو سرد تھے وہاں گرمی بڑھتی جا رہی ہے۔ اس کا سبب آفتاب کے تغیرات کو قرار دیا جاتا ہے۔

آب و ہوا کے لحاظ سے دنیا کا سب سے زیادہ خشک مقام خرطوم ہے جہاں کی ہوا میں نمی کی مقدار صرف ۱۱ فیصدی ہے اور سب سے زیادہ مرطوب جگہ کیمرون پہاڑ کا دامن ہے جہاں کی ہوا میں ۹۲ فی صدی رطوبت پائی جاتی ہے۔ سب سے زیادہ ابر آلود مقام روس کا جزیرہ نمائے کولا ہے جہاں تقریباً ہمیشہ بادل گھرے رہتے ہیں اور سب سے زیادہ صاف فضا چلی کے ایک شہر کلاما کی ہے جہاں ابر کبھی نظر نہیں آتا۔

جزائر جلوئٹ (jalwit Islands) میں سال کے ۳۳۶ دنوں میں برابر بارش ہوتی رہتی ہے اور دریائے نیل کی وادی حلفہ میں دس دس برس تک پانی کا ایک قطرہ نہیں گرتا۔ دنیا میں سب سے زیادہ بارش ہوائی کا ایک مقام ویلیلی (Waialeale) میں ہوتی ہے، جہاں کا اوسط ۵۸۰ انچ ہے سب سے زیادہ تیز بارش جزایر فلپائن کے ایک مقام باگیو (Baguio) میں ہوتی ہے جہاں ایک بار چوبیس گھنٹے میں ۴۶ انچ بارش ہوگئی۔

زمین کو آفتاب سے جتنی گرمی پہونچتی ہے اس کی مقدار بہت کم ہے یعنی آفتاب کی گرمی کو ہم ۳۴ سال فرض کرلیں تو اس میں سے صرف ایک سکنڈ ہم کو ملتی ہے۔ دوسرے سیارے زمین سے دس گنا زیادہ حرارت حاصل کرتے ہیں اور باقی حرارت ضایع ہو جاتی ہے۔ آفتاب کی شعاعیں زمین تک فی صدی چالیس کے اوسط سے پہونچتی ہیں ۲۰ فی صدی فضا میں جذب ہو جاتی ہیں اور ۴۰ فی صدی واپس پلٹ جاتی ہیں۔

اگر آفتاب کی کرنیں جن کا درجۂ حرارت دس ہزار تعین کیا گیا ہے، دس فی صدی گرمی کھودیں تو دنیا کے گرم تر مقامات بھی منجمد ہو جائیں۔

انقلاب پسندی اور اصلاح عالم

عہدِ حاضر کو اگر انقلاب کی پرستش کا دور کہا جائے تو حقیقت سے چنداں بعید نہ ہوگا۔ یوں تو اس کی حمایت و تعریف میں صفحے ہی نہیں متعدد صحیفے سیاہ کئے جا چکے ہیں۔ خصوصاً انقلاب پسند جماعت نے اس خواب کو "رویار صادقہ" بنا کر پیش کر دیا ہے۔ لیکن جہاں تک سنجیدہ غور و فکر کا تعلق ہے بہت کم حضرات اس کی طرف متوجہ ہوئے ہیں ۔ مجھے اپنی نااہلی کا اعتراف ہے۔ لیکن ممکن ہے کہ میری لب کشائی اہل نظر کو اپنی طرف متوجہ کرلے اور میری غلطیاں مجھ پر روشن ہو جائیں۔

لفظ انقلاب کی عالمگیری نے اس کے معنی میں اتنی وسعت پیدا کردی ہے کہ شاید ہی کوئی دوسرا لفظ اپنے اندر اتنے مختلف و متضاد پہلو رکھتا ہو۔ لفظی معنی تو محض اُلٹ جانے یا گردش کھا جانے کے ہیں۔ دقت اس کی اصطلاحات سے شروع ہوتی ہے۔ عموماً نظام معاشرت یا نظام حکومت کے دفعتاً بالکل بدل جانے پر لفظ انقلاب کا اطلاق ہوتا ہے۔ اس مقصد کے لئے جد و جہد کو بھی انقلاب کہہ سکتے ہیں، کیونکہ ذہنی انقلاب تو بہرحال ہو ہی جاتا ہے۔ جب دو طبقے یعنی اعلیٰ اور ادنیٰ باہم متصادم ہوتے ہیں اور ایک دوسرے پر غلبہ حاصل کرنا چاہتے ہیں یا غالب ہو جاتے ہیں تو اسے بھی انقلاب کا نام دیا جاتا ہے۔ اس دور میں تو ترقی کی ہر کوشش اور اس کے لئے باہم جنگ آزمائیاں بھی انقلاب کے نام سے پکاری جاتی ہیں۔ اگر انقلاب کو اس کے وسیع ترین تخیل میں دیکھا جائے تو یہ کہنا بھی بے جا نہ ہوگا کہ انقلاب ایک فطری تقاضہ ہے۔ انقلاب وارتقا بظاہر دو متضاد چیزیں معلوم ہوتی ہیں لیکن درحقیقت ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ ایک ہی واقعہ اگر آج اپنے جزئیات کی وجہ سے انقلاب معلوم ہوتا ہے تو کل یہی ارتقا کے نام سے یاد کیا جانے لگے گا۔ مثال کے لئے اپنے ہی دور کو لیجئے۔ کیا یہ دورِ انقلاب نہیں ہے؟ لیکن کچھ مدت کے بعد اگر ہماری یہی رفتار رہی تو آنے والی نسلیں یہی سمجھیں گی کہ ہم برابر ارتقائی منازل طے کر رہے تھے۔ ٹھیک اُسی طرح جیسے زمانۂ ماسبق کی رفتار ہم کو سوائے ارتقا کے دوسری چیز نظر نہیں آتی۔ لیکن آج کی فرصت میں میرا روئے سخن اس قسم کے انقلاب کی طرف نہیں ہے اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں عوام بھی انقلاب کے یہ معنی نہیں لیتے۔ انقلاب کا نام لیتے ہی ذہن فوراً اس بغاوت و بدامنی، قتل و غارت کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جو انقلاب فرانس یا روس کا طرۂ امتیاز رہا ہے اور جس کی لازمی شرط ایک طبقہ کا دوسرے طبقہ پر جبریہ غلبہ حاصل کرلینا ہے۔ اس کے انقلاب کہے جانے پر تو چنداں اعتراض نہیں ہے۔ لیکن مابہ النزاع مسئلہ یہ ہے کہ یہ ہماری رفتارِ ترقی کا معاون ہے!

مخالفت۔ یہ ہماری ارتقائی منزلوں کا زینہ ہے یا راہ کا ایک سنگِ گراں۔

ماضی عموماً حال و مستقبل دونوں کی آئینہ داری کیا کرتا ہے۔ ممکن ہے کہ اس باب میں بھی ہماری رہنمائی کرے اور تاریخ کی ورق گردانی سے ہم کسی نتیجہ پر پہونچ سکیں۔ لیکن پہلے اس پر غور کر لینا چاہئے کہ انقلاب کیوں ہوتا ہے اور اسکی رفتار کا کیا رخ رہتا ہے۔ سوال کا پہلا جزو آسان ہے۔ دقت اس کے دوسرے حصہ سے شروع ہوتی ہے اور یہی ہمارا موضوعِ بحث ہے۔

عوام میں اضطراب و بے چینی جب حد کو پہونچ جاتی ہے۔ جب مصائب کے برداشت کرنے کی قوت مفقود ہو جاتی ہے اور صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے، خصوصاً اسوقت جب یہ دیکھتے ہیں کہ وہ طبقہ جو نسبتاً خوشحال اور برسرِ اقتدار ہے ان سے مطلق ہمدردی نہیں رکھتا اور اپنی رنگ رلیوں میں مست اور بے خود ہے تو بدبختی اور بدحالی کا احساس اتنا تیز ہو جاتا ہے کہ یہ انتقام پر اُتر آتے ہیں اور شر و فساد اور قتل و غارت کا طوفان موجیں مارنے لگ جاتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ عوام الناس کی مصیبت اور افلاس تو ہر ملک اور ہر زمانہ میں موجود رہی ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ انقلاب شاذ و نادر ہی وقوع پذیر ہوئے؟ اس کے دو اسباب ہیں، ایک سیاسی اور دوسرا ذہنی۔ سیاسی یہ کہ اگر حکومت مضبوط رہی تو محکوم لاکھ بدحال، بدظن اور مضطرب ہو کر بھی کامیاب بغاوت نہیں کر سکے، ایک قوی اور چوکس حکومت انھیں اُبھرنے کے قبل ہی دبا دے گی۔ عوام تو درکنار، خواص تک یہاں پر غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ انقلاب حکومت کو کمزور نہیں کرتا بلکہ یہ خود حکومت کی کمزوری کی علامت ہے۔ بدامنی اور بغاوت زوال پزیر حکومتوں کے لوازم میں داخل ہیں چنانچہ واقعات تاریخ اس کی شہادت دے رہے ہیں کہ ایک مضبوط حکومت کتنا ہی ظلم کر جائے اور عوام کے حقوق کی کتنی ہی پامالی کرتی رہے، کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں ہوتی اس کے برخلاف حکومت میں جہاں کمزوری آئی اور معمولی معمولی باتیں فساد برپا کرنے لگیں ——— دوسری طرف جسے انقلاب کا داخلی یا ذہنی سبب بھی کہہ سکتے ہیں انقلاب اگرچہ عوام الناس کے ذریعہ وقوع پذیر ہوتا ہے، لیکن درحقیقت چند خواص ہی اس کے بانی ہوتے ہیں۔ اس لئے اس کی کامیابی کے لئے ایک یا چند نباضِ فطرت انقلابیوں کا وجود بھی ازبس ضروری ہے۔ محض عوام کی نکبت و پستی انھیں نہیں اُبھارا کرتی، بلکہ یہ اسوقت اُبھرتے ہیں جب انھیں اپنی پستیوں کا احساس ہو جاتا ہے۔ احساس پیدا کرنے والے یہی چند انقلابی ہیں اور اسکی ہولناکیوں کے ذمہ دار بھی چند اشخاص قرار دئے جا سکتے ہیں۔ یہاں پر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ایسے لوگوں کی حسی قوت بہت تیز ہوتی ہے اور اپنے ماحول سے یہ بہت جلد اور بہت زیادہ متاثر ہو جاتے ہیں وہی مصائب جو عوام پر کچھ اثر نہیں کرتے انھیں مضطرب کر دیتے ہیں ان کا اضطراب دوسروں کو اُبھارتا ہے پورے ملک میں بغاوت کی آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ پہلے کے خوشحال اور برسرِ اقتدار طبقہ کی دنیا دفعتاً بدل جاتی ہے۔ حکومت کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ عنانِ اقتدار انقلابیوں کے قبضہ میں چلی جاتی ہے۔

سوال اب یہ ہے کہ درحقیقت انقلاب کا مقصد پورا بھی ہوتا ہے یا نہیں۔ اگر اس کی غرض محض تخریب ہے تو اس کے کامیاب ہونے میں کسے شک ہو سکتا ہے؟ جیسا کہ متداول انقلاب پسند جماعت کہا بھی کرتی ہے کہ تعمیری اقدام کے لئے موجودہ فرسودہ نظام کا انہدام ضروری ہے۔ بنابریں ایک کامیاب انقلاب کے لئے کشت و خون، قتل و غارت لازمی شرط ہے۔

مسئلہ کی اہمیت ظاہر ہے اور اس پر ذرا وضاحت سے بحث نامناسب نہیں معلوم ہوتی۔ ممکن ہے کہ میرے اس قول پر کہ انقلاب اپنے تعمیری مقصد میں کبھی کامیاب نہیں ہوتا بلکہ صحیح معنوں میں اسے رجعت پسندانہ اقدام سمجھنا چاہئے، قارئین کو تعجب ہو۔ لیکن گزشتہ انقلابات کا مطالعہ مجھے ایسا کہنے پر مجبور کر رہا ہے۔ اسوقت میرے پیشِ نظر کم از کم پانچ ناکام انقلابوں کی روداد یں ہیں اور میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ طبقوں کی نزاعِ باہمی کے نعرے محض عوام کو فریب دینے کے طریقے ہیں، جس سے ملک بجائے فایدہ کے سخت نقصان اُٹھاتا ہے۔ کیونکہ عوام جو کچھ کر گزرتے ہیں وہ محض فوری جوش و خروش کا اثر ہوتا ہے۔ تخریب کے لئے تو یہ حربہ کارگر ہو سکتا ہے۔ لیکن تعمیری اقدام تا وقتیکہ بہت غور و فکر اور نہایت سنجیدگی سے کام نہ لیا جائے کامیاب نہیں ہو سکتا۔ انتقامی جذبہ کے تحت عوام نظامِ حکومت، نظامِ تمدن نظامِ معاشرت وغیرہ کو کامیابی کے ساتھ تاخت و تاراج تو ضرور کر دیتے ہیں لیکن جب تعمیر کی نوبت آتی ہے تو ان سے بنائے کچھ نہیں بنتا اور ایک سربرآوردہ منظم جماعت کے ہاتھ پر انھیں بیعت کرنی پڑتی ہے۔ بلکہ اکثر تو یہی ہوتا ہے کہ چند نفوس محض اپنے تفوق کے لئے (Class Struggle) کے نعرے لگا کر عوام کو اپنا آلۂ کار بنا لیتے ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ خود غرض جماعت ملک و قوم کا کتنا درد اپنے سینہ میں رکھتی ہوگی؟ اور اگر یہ بھی فرض کر لیا جائے کہ جو کچھ یہ کرتی ہے خلوصِ دل اور قوم کی محبت کے سبب سے کرتی ہے، پھر بھی اس کی نااہلی منزلِ مقصود تک اسے پہونچنے نہیں دیتی۔ اور نادانوں کی دوستی عقلمندوں کی دشمنی سے زیادہ مضر ثابت ہوتی ہے۔ میں انقلاب کو رجعت پسندانہ تحریک کہہ گیا ہوں۔ پہلے اسی پر ایک نظرِ غایر ڈال لینی چاہئے۔

عوام میں اضطراب، ضروریاتِ زندگی کی عدم فراہمی، حقوق کی پامالی اور حکمران طبقہ کا ان کے ساتھ بہیمانہ سلوک کی بنا پر تقویت حاصل کرتا ہے اور انھیں شکایات کو دور کرنے میں وہ کوشاں رہتے ہیں۔ کبھی تو حکومت ان کے کچھ مطالبات قبول کر کے ان کی اشک شوئی کر دیتی ہے اور کبھی انھیں خاموش رکھنے کے لئے ان کا رویہ اور بھی جارحانہ ہو جاتا ہے۔ غرض یہ کہ حاکم و محکوم میں ایک طرح کا مول تول ہوتا رہتا ہے۔ لیکن اس سے انکار ناممکن ہے کہ نہ زار کچھ نہ ہونے پر بھی عوام کچھ نہ کچھ فایدہ اُٹھاتے ہی جاتے ہیں اور حکومت آہستہ آہستہ ان کے مطالبات قبول کرتی جاتی ہے کیونکہ ایک بار عوام میں پستی کا احساس ہو جانے کے بعد کوئی قوت بھی اسے نہیں دبا سکتی اور ذہنی انقلاب بڑی بڑی سلطنتوں تک کے پایۂ عزم و ثبات کو متزلزل کر دیتا ہے لیکن اسی دوران میں قوم میں ایک ایسی جماعت بھی پیدا

ہوجاتی ہے جسے عام طور سے "گرم دل" کہتے ہیں اس کے افراد فطرتاً جوشیلے اور رجعت پسند ہوتے ہیں یہ چاہتے ہیں کہ جتنا بھی جلد ہوسکے ہر ممکن طریقہ کو بروئے کار لاکر حکومت کا خاتمہ کردینا چاہئے جس کا طریقہ سوائے کھلی ہوئی بغاوت کے انھیں دوسرا نہیں نظر آتا۔ عوام میں اتنی صلاحیت کہاں کہ تدریج ومیانہ روی کی خوبیوں کو سمجھ سکیں۔ ذرا شہ پاتے ہی یہ اُبل پڑتے ہیں، اگر حکومت میں کچھ دم خم ہوا تو بغاوت دبا دی گئی اور اس سختی سے انتقام لیا گیا کہ ایک زمانہ کے لئے ترقی کی ساری اُمیدیں خواب وخیال ہوکر رہ گئیں اور اگر حکومت کمزور ہوئی تو پورے ملک میں شر وفساد کی آگ بھڑک اُٹھتی ہے اور عوام الناس کی ایک اچھی خاصی جماعت بھی گھن کی طرح پس جاتی ہے۔ نئی حکومت چونکہ خون کا دریا بہا کر اقتدار حاصل کرتی ہے۔ قیام حکومت اور انتظام سلطنت کے لئے بھی اسے کشت وخون ہی کا سہارا لینا پڑتا ہے، شروع میں تو عوام کی مدد سے۔ عوام کے نام پر اور عوام کا ایک جزو بنکر یہ اُٹھتی ہے۔ لیکن قوت حاصل کرتے ہی اسکے اور جمہور کے درمیان پھر پہلا جیسا بعد المشرقین حایل ہوجاتا ہے ابتدا میں تو عوام اس تبدیلی کو نہیں سمجھ سکتے۔ کیونکہ تازہ کامیابی سے ان کی آنکھیں چوندھیائی رہتی ہیں۔ اور وہ اس امید موہوم پر بھولے رہتے ہیں کہ جب حکومت ہی ہماری ہوگئی تو پھر مطالبات کا کیا ذکر؟ جو چاہیں گے اور جیسے چاہیں گے کرلیں گے اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ شروع میں یہ من مانی کر بھی لیتے ہیں لیکن بہت جلد ان پر روشن ہوجاتا ہے کہ کوئیں سے نکل کر یہ کھائی میں جا گرے ہیں۔ انقلابی حکومت استحکام پاتے ہی ان کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔ پہلی حکومت میں تو خیر پشتہا پشت کے اشرافیت کی بعض خوبیاں بھی تھیں اُن نو واردوں' میں تو اس کا شمہ بھی نہیں ہوتا۔ ولولہ وجوش، عزم وثبات کی تو فراوانی ہوتی ہے لیکن وہ محاسن جو شرفاء کے طرۂ امتیاز اور انسانیت کے جزو لاینفک ہیں ان کے پاس مطلق نہیں ہوتے۔ دولت وحکومت کا نشہ انھیں کچھ اس طرح مخمور کردیتا ہے کہ دوسروں کو یہ بالکل بھول جاتے ہیں اور اپنے اقتدار کو قایم رکھنے کے لئے ہر ممکن جبر وتعدی کو بروئے کار لانے میں نہیں چوکتے۔ عوام اس وقت چونکتے ہیں جب حکومت کی زنجیریں انھیں اچھی طرح جکڑ چکتی ہیں۔ مزید براں عوام کو بے وقوف بنانے کے لئے عموماً حکومت کوئی ایسا کھلونا بھی پیش کردیتی ہے کہ دنیا ومافیہا سے بے خبر ہوکر یہ اس میں محو ہوجاتے ہیں۔ انقلاب فرانس کے بعد چونکہ فوراً ہی ملک پر بیرونی حملے شروع ہوگئے تھے پورے ملک کو فنافی الجد وجہد ہوجانا پڑا۔ انقلاب روس کے بعد کچھ دنوں تک تو خانہ جنگی جمہور کو بہلائے رہی اور اس کے بعد جو لوگ ذرا چونکے تو اصلاحات کے بعض کھلونے ان کو دیدیے گئے، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ اتنی سخت پابندیاں بھی عاید کردی گئیں کہ یہ چوں چرا تک نہ کرسکے۔ پھر یہ تو ممکن ہے کہ اس طرح ان کی معاشی حالت کچھ درست ہوجائے۔

لیکن ذہنی موت تو یقیناً ہوجاتی ہے، شہری زندگی کا بالکل خاتمہ ہوجاتا ہے اور انسانیت کی منزل سے اُتر کر یہ حیوانیت سے قریب تر آجاتے ہیں۔ اور اس طرح انقلاب کا مقصد فوت ہوجاتا ہے۔ ملک کی رفتار اگر پیچھے کی طرف مراجعت نہیں کرجاتی تو رک یقیناً جاتی ہے۔

انقلاب فرانس اور انقلاب روس کے افسانے آج گھر گھر دہرائے جا رہے ہیں اور بنی آدم کے لئے انھیں ایک غیر مشروط چیز سمجھا جا رہا ہے۔ اپنے دعوے کے ثبوت میں انھیں کو بطورِ شہادت پیش کرتا ہوں:

تفصیلی بحث کی اس مضمون میں گنجائش نہیں ہے، انقلاب کے بعد واقعات کی طرف محض اشاروں پر اکتفا کرونگا لیکن اس کے قبل یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ انقلاب فرانس اور اس کے واقعات انقلاب پسند جماعت کے طفیل کچھ اس طرح پیش کئے گئے ہیں کہ حقیقت سے زیادہ ان میں جذبات کا اثر حلول کر گیا ہے۔ چند ناموں اور چند مقولوں کو اس طرح اُچھالا گیا ہے کہ ان میں ایک خاص کیفیت اور عظمت پیدا ہو گئی ہے۔ اس لئے اغلب ہے کہ میرے خیالات جو عام اندازِ گفتگو کے بالکل برعکس ہیں، بعض حضرات کو مضحکہ خیز معلوم ہوں اور بعض طیش میں بھی آجائیں لیکن گزارش احوال واقعی ضروری ہے۔

اہلِ نظر سے انقلابِ فرانس کے اسباب پوشیدہ نہ ہوں گے۔ اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ملک کی حالت ناگفتہ بہ ہو رہی تھی طبقۂ امرا کے مظالم اس حد تک بڑھے ہوئے تھے کہ شاید ہی کسی ملک میں عوام کے ساتھ ایسا بے رحمانہ سلوک کیا جاتا ہو اس میں مطلق مبالغہ کو دخل نہیں ہے کہ سچ مچ انھیں جانور سمجھا جاتا اور یہی سلوک کیا بھی جاتا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی درست ہے کہ فرانس کے لئے یہ بدحالی کوئی نئی چیز نہیں تھی اور نہ لوئی شانزدہم کے زمانہ میں (جس کے عہدِ حکومت میں انقلاب ہوا) عوام کے مصائب میں کوئی خاص اضافہ ہی ہوا بلکہ اس دور میں تو حکومت انکے مصائب و افلاس کو دور کرنے کی تدابیر و ذرایع بھی تلاش کرنے لگ گئی تھی۔ پھر بھی انقلاب ہوا تو اس دور میں۔ جس کی وجہ وہی ہے جو مندرجۂ بالا سطور میں عرض کر آیا ہوں، یعنی ایک تو حکومت میں کمزوری آگئی تھی۔ دوسرے روسو اور والٹایر کا جادو اسوقت تک عوام پر کافی اثر کر چکا تھا۔ ملک کو اپنی پستی کا اچھی طرح احساس ہو گیا تھا اور عوام اپنی نکبت و بدحالی کے احساس سے مضطرب ہو رہے تھے اس میں جو کمی تھی وہ ۱۷۷۵ء کے سہ سالہ قحط نے پوری کر دی ٹرگوٹ (Turgot.) کی ناکامی کی ایک وجہ یہ تباہ کن قحط سالی بھی تھی۔ ورنہ اس کے اصلاحات سے طبقۂ امرا کی رعونت بہت کم ہو جاتی اور عوام الناس کے حقوق کافی حد تک محفوظ ہو جاتے لیکن ایک طرف پادریوں اور نوابوں کی مخالفت اور دوسری طرف قحط کے بنا پر حکومت کی مشکلات نے ٹرگوٹ کا ناطقہ بند کر دیا اس کے بعد نیکر (Necker) بھی انھیں مشکلات کی بنا پر اپنے اصلاحات کو بروئے کار لانے میں ناکام رہا۔ لوئی شانزدہم کو بھی اتنا موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا اس غریب کی خامی محض اس کی کمزوری تھی۔ ورنہ اگر امرا پر اس کا بس چلتا تو بات اتنی نہ بگڑتی۔ حکومت کے مالیات میں کمی اور محکوم کی بے چینی کے سبب سے یکے بعد دیگرے وزرا تبدیل ہو رہے تھے۔ اور کوئی بھی حکومت کی کشتی کو پار لگاتا نظر نہیں آتا تھا ہار کر ۱۷۸۸ء میں قلمدان وزارت پھر نیکر (Necker) کے سپرد کرنا پڑا۔ نیکر اچھی طرح سمجھ چکا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے اور کیا کرنے سے یہ ڈوبتی ہوئی کشتی اُبھر سکتی ہے۔ ۱۷۸۹ء میں اس نے باوجود شدید مخالفت کے States

(General) کا انتخاب کرا ہی لیا۔ پورے ملک میں اس کی مخالفت سے ایک ہنگامہ مچ گیا۔ جگہ جگہ انجمنیں قایم ہوگئیں اور حکومت کو کھلی ہوئی دھمکیاں دیجانے لگیں۔ پھر بھی امراء ہی میں ایک ایسی جماعت بھی موجود تھی جو حکومت کی دور اندیشی کی قایل اور ہر طرح اس کی امداد پر کمربستہ تھی۔ ڈیوک آف اورلینیں (Duke of Orleans) اس جماعت میں بہت ممتاز نظر آتا ہے۔ (States General) نے آئین و قوانین ہی میں نہیں ملک کے (Constitution) تک میں ایسی تبدیلیاں کر دیں کہ اگر یہ قایم رہ جاتیں تو صدیوں کی چند سری حکومت (Oligarchy) فوراً جمہوریت میں مبدل ہوجاتی لیکن امرا کی مخالفت کے سامنے اس کی ایک نہ چل سکی۔ اور لوئی نے ان اصلاحات کو قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ پھر بھی اس سے انکار ناممکن ہے کہ سب کچھ ہونے پر بھی حکومت جمہور کے مطالبات کے سامنے بہت جھک گئی تھی اور انھیں کچھ نہ ملنے پر بھی بہت کچھ حقوق مل گئے تھے۔ اس عہد کو اگر نصف صدی پہلے کے زمانہ سے مقابلہ کیا جائے تو حقیقت کھلے۔ لوئی چہاردہم کے قول (L'etat, C'est moi) (ریاست سے مراد میں ہوں) کا مقابلہ اس عہد کے نعرہ (L'etat, C'est nous) (ریاست سے مراد ہم ہیں) سے کرنے سے صاف ظاہر ہوجاتا ہے کہ عوام کی آواز کہاں تک پہونچ چکی تھی۔ امرا اچھی طرح سمجھ چکے تھے کہ اب ان کے اقتدار کے چند گنے ہوئے دن رہ گئے ہیں اور بہت جلد جمہور کے مطالبات کے سامنے انھیں سر تسلیم خم کر دینا پڑے گا۔

جب اہالیان شہر کو معلوم ہوا کہ (States General) کے مطالبات ٹھکرا دئے گئے ہیں اور نیکر (Necker) بھی برطرف کر دیا جانے والا ہے۔ تو ان میں آگ سی لگ گئی۔ جا بجا مظاہرے شروع ہو گئے اور محل شاہی کے سامنے ان کی ایک بہت بڑی جماعت اکٹھی ہونی شروع ہوگئی۔ لوئی کی حالت ناقابل بیان تھی۔ اگر اس کا دل عوام کی طرف تھا تو دماغ پر خواص قبضہ کئے ہوئے تھے۔ غرض عجیب کشمکش میں غریب کی جان تھی۔ بہرحال موقع کی نزاکت کو سمجھ کر (States General) کے مطالبات اسے قبول کرنے ہی پڑے —— لیکن اس کے سوا اب اور کیا کہا جائے کہ ناعاقبت اندیش امرا اور عوام کے جوشیلے اور عجلت پسند لیڈروں کا برا ہو کہ بات بنکر بگڑ گئی۔ ایک طرف امرا کی سازشیں نخوت و بددماغی اور دوسری طرف خودغرض لیڈروں کی غیر ذمہ دارانہ کھلی ہوئی بغاوت کی تبلیغ۔ نفرت و بیزاری کی آگ پر تیل چھڑک رہی تھی۔ اگر ایک طرف غیر ملکی رجمنٹوں کی آمد کا انتظار تھا۔ تو دوسری طرف انقلابی رہنما بھی کسی بہانے کے منتظر تھے۔ آخر قوم فروش امرا نے لوئی پر اتنا دباؤ ڈالا اور اس بدبخت کو اس طرح بہکایا کہ وہ نیکر کو برطرف کرنے پر رضامند ہوگیا۔ انقلابی تو موقعہ کی تاک میں تھے ہی۔ جولائی ۱۷۸۹ء کی بارہ تاریخ کو نیکر برطرف کیا گیا اور دفعتاً بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی۔ پورے ملک میں بھونچال سا آگیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ فرانس کی دنیا الٹ گئی ہے۔ انسان درندوں میں مبدل ہوگئے۔ کشتوں کے پشتے لگ گئے اور خون کی ندیاں نکلیں۔ جب عوام کا جوش غضب ذرا سرد پڑا اور قتل و غارت کا

طوفان تھما تو ہم دیکھتے ہیں کہ نہ کہیں عوام کے حقوق کا پتہ ہے اور نہ ان کے مطالبات کا ذکر۔ اگر ہیں تو چند فتنہ انگیز خطیب و لیڈر، حکومت ہے تو ان کی اور حقوق ہیں تو ان کے۔ غرض چند اشخاص کی مکاریاں اور سفاکیاں مسلسل چھ سال تک پورے ملک پر چھائی رہتی ہیں۔ حکومت کے لئے آئین بھی بنتا ہے۔ نظم و نسق کے لئے قوانین بھی بنائے جاتے ہیں۔ لیکن جمہور کو ان سب باتوں سے کوئی واسطہ نہیں۔ فاقوں کا مارا جیسے کھانے پر گرتا ہے۔ یہ بھی آزادی پر ٹوٹ پڑے اور تمام پابندیوں سے آزاد ہو گئے اور ایک دفعہ فرانس میں (State of Nature) کا دور دورہ ہو گیا۔ لیکن یہ روسو (Rousseau) نہیں (Hobes) کا (State of Nature) تھا۔

۱۷۹۵ء تک فرانس پر کیا گزری۔ ہم لوگوں کے لئے اس کا اندازہ کرنا بھی محال ہے۔ اسے انقلاب نہیں قتل و غارت کا گرداب سمجھنا چاہئے۔ چھ سال کی یہ خونچکاں داستان مشتمل ہے صرف سازشوں اور باہم ریشہ دوانیوں پر یا اسے قدرت کا انتقام کہئے کہ انقلابیوں کی ہر جماعت دوسری جماعت کی دشمن بن کر سامنے آئی اور سب کے سب آپس ہی میں کٹ مر کے رہ گئے جو پارٹی بھی غالب آتی اپنے پیشرو کو موت کے گھاٹ اتارتی آتی۔ غرض یہ کہ مسلسل چھ سال تک فرانس میں پے در پے انقلاب ہوتے رہے ([illegible]) کی عبرتناک موت کے بعد بدنصیب ملک کو طوفانِ انقلاب سے ایک گونہ نجات ملی اور فرانسیسی حیوانیت سے انسانیت کی طرف آہستہ آہستہ رجوع کرنے لگے۔ جون ۱۷۹۵ء میں گیارہ لوگوں کے کمیشن (The Commission of the Eleven) نے جو دستور العمل پیش کیا اور جس کی رو سے حکومت پانچ افراد کی ڈائرکٹری کے تحت میں آ گئی۔ اس پر لفظ قانون کا اطلاق تو ہو سکتا ہے۔ لیکن جہاں تک عمل کا تعلق ہے یہی کہنا پڑتا ہے کہ یہاں بھی ذاتیات اور خود پرستی، مآل اندیشی اور وطن پرستی پر غالب رہیں۔ ۱۷۹۹ء میں ڈائرکٹری کی حالت اتنی ابتر ہو گئی کہ پھر پہلا جیسا راج (Anarchy) کا دور بہت قریب نظر آنے لگا۔ لیکن عین اسی وقت نپولین بوناپارٹ میدانِ کارزار سے فرانس کی سیاسی بساط پر آ موجود ہوا اور جس طرح اس نے ملک کو تاجدارانِ یورپ کے شعلۂ انتقام سے بچایا تھا یہاں بھی خانہ جنگی کا قلع قمع کر دیا۔ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ فرانس کے لئے نپولین کی اٹھارہ سال کی حکومت رحمتِ ایزدی سے کم ثابت نہیں ہوئی۔ فرانس اس دور پر بجا طور سے ناز کر سکتا ہے۔ لیکن کیا انقلابِ فرانس کا مقصد یہی تھا کہ ایک نپولین پیدا کر کے خاموش بیٹھ جائے؟ کیا ۱۷۸۹ء میں انقلابیوں کا یہی مطمح نظر تھا کہ لوئی شانز دہم کی جگہ کسی نپولین کے قالب میں لوئی چہار دہم کی روح اپنی پوری شانِ رعونت کے ساتھ فرمانروائی کرنے لگے؟

تعمیر کو تو بالائے طاق رکھئے۔ اپنی تخریب تک میں انقلاب افسوسناک طریقہ سے ناکام رہا۔ اشرافیت جسے اس نے حرفِ غلط کی طرح مٹا دینا چاہا تھا۔ نپولین کے دور میں پھر عود کر آئی۔ اگرچہ اس کے زمانہ تک اسے صلاحیت کی اشرافیت (Aristocracy of merit) کہہ سکتے ہیں۔ لیکن ۱۸۱۵ء کے بعد بوربون خاندان کے

دوبارہ تخت نشین ہوتے ہی پرانی اشرافیت اپنی تمام قدیم روایات کے ساتھ پھر ملک پر مسلط ہو گئی۔ سنہ ۱۸۳۰ء میں پھر انقلاب ہوا۔ لیکن سنہ ۱۷۸۹ء کے انقلاب کے مقابلہ میں اسے صرف حکومت میں تبدیلی کہنا زیادہ مناسب ہے۔ یہ انگلستان کے سنہ ۱۶۸۸ء کے انقلاب سے بہت مشابہت رکھتا ہے اور حقیقی معنوں میں اسے فرانس کے جمہوری نظام کی پہلی ارتقائی سیڑھی سمجھنا چاہیے۔ لوئی فلپ چونکہ ہزار اچھے ہونے پر بھی بوربون خاندان ہی کا ایک فرد تھا۔ زمانہ کے بدلے ہوئے تیور نہ پہچان سکا۔ آخر سنہ ۱۸۴۸ء پھر ریپبلک حکومت قایم ہوئی، جو تاریخ میں دوسری ریپبلک کے نام سے مشہور ہے۔ لیکن اسے ریپبلک کہنا، ریپبلک پر ظلم کرنا ہے۔ کیونکہ اس کا صدر ایک ایسا شخص تھا جو اس وقت جمہوریت نہیں، شہنشاہیت کا خواب دیکھ رہا تھا۔ بہرکیف اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ عوام کی آواز اب بہت باثر ہو گئی تھی اور یہ ریپبلک ان کی شاندار فتح کہی جا سکتی ہے۔ سنہ ۱۸۵۲ء میں یہ ریپبلک شہنشاہیت میں پھر بدل گئی لیکن ضرور تھا کہ یہ ایسی شہنشاہیت تھی جسے جمہور خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ یہ فرانس میں شہنشاہیت کا سنبھالا یا اس کی آخری ہچکی تھی جو سنہ ۱۸۷۰ء میں شاید ہمیشہ کے لئے دفن کر دی گئی۔

مندرجہ بالا سطور سے مقصد صرف یہ دکھلانا تھا کہ سنہ ۱۷۸۹ء کا انقلاب نہ محض ناکامیاب ثابت ہوا بلکہ ملک کی رفتار ترقی اس کی وجہ سے اگر سو سال نہیں تو پچاس سال پیچھے ضرور پڑ گئی۔ اگر فرانس سنہ ۱۷۸۹ء میں انقلاب کی لعنت میں گرفتار نہ ہوتا اور اسکے رہنما انگلستان والوں کی طرح تدریجی ترقی کے قایل ہوتے، جیسا کہ سنہ ۱۸۳۰ء سے ان کا رویہ ہو گیا۔ تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ سنہ ۱۸۷۰ء کے بہت پہلے جمہوریت یا (Constitutional Monarchy) قایم ہو جاتی۔

مسٹر Prevos نے خوب کہا ہے "اگر جرمنی میں اصلاحات کی ابتدا ہوئی تو انتہا میں یہ انگلستان تک پہونچی۔ لیکن فرانس نے انقلاب کے دعوے دنیا کے سامنے پیش کئے اور خود اس کی بے راہ روی کا شکار بنتا رہا۔"

سطور بالا میں عرض کر آیا ہوں کہ ہر چند انقلاب، عوام کے ذریعہ سے وقوع پزیر ہوتا ہے لیکن چند خواص ہی اس کے بانی ہوتے ہیں، انھیں کی تحریر و تقریر عوام میں احساس پستی پیدا کر کے انھیں انتقام پر آمادہ کر دیتی ہے اور یہ بھی عرض کر چکا ہوں کہ ایسے لوگ عموماً دو قسم کے جذبہ سے متاثر رہتے ہیں۔ ایک تو محض انسانیت کی خدمت کا خیال یعنی عوام کی پستی کو دور کرنے کی کوشش اور دوسرا خود غرضانہ یعنی اپنے مفاد کے لئے عوام میں جوش پیدا کرنا اور اقتدار حاصل کر لینا، لیکن سنجیدہ نگاہی یہ کہنے پر مجبور کرتی ہے کہ یہ دونوں اپنے مقصد سے منزلوں دور رہ جاتے ہیں۔ انقلابی نہ تو عوام کے درد کا درماں کر پاتے ہیں اور نہ خود اپنے اقتدار کی محافظت کر سکتے ہیں۔ اول الذکر کی ناکامی کا سبب تو یہی ہے کہ تخریب سے تعمیر کا کام نہیں لیا جا سکتا اور وقتی جوش و ولولہ سنجیدہ و مفکرانہ اقدام کے مترادف

نہیں قرار دئے جاسکتے۔ انقلاب فرانس کے واقعات اس پر شہادت دے رہے ہیں کہ عوام کس بری طرح ناکام رہے اور ملک کو ان کی بے راہ روی کی بدولت کن مصائب سے دوچار ہونا پڑا۔ لیکن سب سے بڑی ناکامی اُسی جماعت کو ہوتی ہے جو اپنے اقتدار کے لئے عوام سے آلۂ کار کا کام لینا چاہتے ہیں۔ ابتدا میں تو یہ اس میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ لیکن وہی حربہ جو یہ اپنے پیش رو کے خلاف استعمال کرتی ہے۔ بہت جلد اس کے خلاف بھی اُٹھایا جاتا ہے اور جس طرح عوام کو ورغلا کر یہ اپنے دشمنوں کو نیچا دکھاتی ہے۔ اس کے مخالفین بھی اُسی طرح (Class Struggle) کے نعرے لگا کر اور اسے رجعت پسندی کا خطاب دیکر خود ان کی جگہ لے لیتے ہیں۔ کیونکہ ایک دفعہ عوام کا شر و فساد اور بغاوت و بدامنی کی طرف مائل ہو جانے کے بعد احترام قانون اور امن و آشتی کی طرف معاً راغب ہو جانا ناممکنات میں سے ہے۔ عوام کے مطالبات خصوصاً اُسوقت جبکہ ایک غیر مطمئن جماعت انھیں اُبھارتی رہے لامتناہی حد تک طویل ہو جاتے ہیں اور یہ سمجھ لینا کہ جس جماعت نے انھیں اُبھارا تھا۔ ان کے دبا دینے پر بھی قادر ہوگی۔ سخت غلطی ہے۔ انقلاب کی چنگاری جب ایک دفعہ بھڑک اُٹھتی ہے تو دم بہ دم اس کی آگ بڑھتی ہی جاتی ہے اور اُسوقت تک سرد نہیں پڑتی جب تک کہ ملک کے سامنے اس سے بھی مہیب تر کوئی دوسری آفت نہ آکھڑی ہو، یا خود عوام میں انتہائی قتل و غارت کے بعد اس کا فطری رد عمل شروع نہ ہو جائے۔ غرض یہ کہ انقلاب کی لیڈر شپ بڑی تیزی سے تبدیل ہوتی رہتی ہے اور ہر انتہا پسند جماعت کے بعد ایک انتہا پسند تر جماعت برسر اقتدار ہوتی جاتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ اِس انتہا پسندی اور رجعت پسندی کے درمیان کوئی حدِ فاصل متعین نہیں ہوتی بلکہ اس کا انحصار محض اُسی جماعت پر ہوتا ہے جو غیر مطمئن رہا کرتی ہے اور ظاہر ہے کہ مطمئن اور غیر مطمئن طبقہ کی تفریق تمام و کمال اضافی ہے، جس کی انتہا کبھی ہو ہی نہیں سکتی ہے۔ اسی طرح اپنے دوسرے مقصد میں بھی انقلاب ناکامیاب رہتا ہے اور انقلابی اپنے اقتدار تک کو برقرار نہیں رکھ سکتے۔ ممکن ہے کہ جواب میں یہ کہا جائے کہ روس میں تو ابتک انقلابی برسر اقتدار ہیں، لیکن اہلِ نظر سے یہ حقیقت پوشیدہ نہ ہوگی کہ لینن اور اس کے حواریں نے زار اور اس کی حکومت کا خاتمہ نہیں کیا تھا۔ بلکہ انھوں نے تو اُس جماعت کو تہ تیغ کیا جس نے سرزمین روس سے زاریت کا خاتمہ کیا تھا۔

گلاب چاند

(نگار) میں گلاب چاند صاحب کے اس مقالہ کے جواب میں کوئی بسیط گفتگو کرنا نہیں چاہتا۔ بلکہ صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آیا "انقلاب" کی تحریک کوئی انفرادی حیثیت رکھتی ہے یا اجتماعی۔ اگر انفرادی نہیں ہے تو یقیناً اس کی بنیاد صرف جذبۂ اصلاح یا طلب مداوا کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی۔ اب رہا یہ امر کہ اس تحریک کی قیادت کرنے والے غلطی یا خود غرضی میں مبتلا ہو جائیں، سو اس سے اصل تحریک کا نقص ثابت نہیں ہو سکتا ــــ علاوہ اسکے ایک بات اور دیکھنے کی ہے، وہ یہ کہ انقلاب کا سبب زیادہ تر اقتصادی عدم توازن ہوا کرتا ہے اور اس کو دور کرنا آسان کام نہیں۔ ہزارہا سال کے جذبۂ ملوکیت و سرمایہ داری کو مٹانے کے لئے ابھی کم از کم سیکڑوں برس درکار ہیں اور ظاہر ہو کہ اس کوشش میں غلطیاں بھی ہونگی، خود غرض لوگ اس سے ناجائز فائدہ اُٹھانے کی بھی کوشش کرینگے خدا جانے کتنی مرتبہ صورتیں بن بن کر بگڑیں گی لیکن اس عدم جزم کو دیکھ کر یہ حکم لگانا کہ "انقلاب" کی تحریک ہی بجائے خود غلط ہے، صحیح نہیں۔

راجہ بنبی

اس اقتصادی کشمکش، اس سیاسی اُلجھن اور اس علمی و انتقادی خشکی کے دور میں بعض وقت کتنا جی چاہتا ہے کہ کاش کے کبھی کبھی چند گھڑیاں اس زمانہ کی بھی میسر آجایا کریں جب انسان "روڑھا" نہ ہوا تھا اور ہر چیز کا مطالعہ طفلانہ سادگی سے کیا کرتا تھا۔ وہ پانی کو صرف پانی سمجھ کر اس سے کھیلتا تھا اور اس فکر میں مبتلا نہ تھا کہ اس میں آکسیجن کی مقدار کتنی ہے اور ہائیڈروجن کی کتنی، وہ پھول کو محض پھول جان کر اس سے سرور حاصل کرتا تھا اور اسے مطلق خبر نہ تھی کہ رات کے وقت اس کی خوبصورت پنکھڑیوں سے زہریلی گیس بھی نکلتی ہے۔ وہ چاند کی صرف ٹھنڈک سے لطف اُٹھاتا تھا اور یہ منحوس بات اس کے ذہن میں نہ آئی تھی کہ یہ ایک مُردہ کرہ ہے۔

آج ہمارے فسانوں میں انتقاد و علمیت ہے، نفسیات و سیاست ہے، طبیعیات و ریاضی ہے اور خدا جانے کیا کیا اسی طرح کی بہت سی ثقیل چیزیں موجود ہیں، لیکن اُس "معصومیت" کا پتہ نہیں جو ہماری کہانیوں میں پائی جاتی تھی۔

آپ بھی میری طرح شاید گھبرا اُٹھے ہوں گے اس لئے آیئے ہم آپ دونوں تھوڑی دیر کے لئے اس "مشین و عقل" کی دُنیا کو چھوڑ کر پھر اس عالم کی سیر کریں، جہاں فقیر کی دُعا سے بادشاہوں کے اولاد ہوجایا کرتی تھی اور جہاں شاہزادے ہمیشہ چوتھا ممنوع راستہ اختیار کر کے پریوں کی بستی میں پہونچ جایا کرتے تھے۔

ہمارے عزیز دوست حیات اللہ انصاری کو خدا خوش رکھے کہ ان کی وساطت سے کبھی کبھی یہ بھولی ہوئی دنیا پھر یاد آجاتی ہے۔

گہے طفلے شود مستانہ می رقص !

نیاز

سات دریا پار ایک ناگ دیس تھا جہاں کے بسنے والے رات کو کام کاج کرتے اور دن کو سوتے تھے۔ یہاں ناگ راجہ راج کرتا تھا۔ اس کا حکم سمندر کے گھڑیالوں جنگل کے شیروں اور آسمان کی چڑیوں پر بھی چلتا تھا۔ اس کے پاس دیوتاؤں کا دیا سب کچھ تھا۔ ایک نہیں تھا تو لڑکا ہی نہیں تھا جو اس کے بعد اس کا نام زندہ رکھتا اور اس کے راج کا مالک بنتا۔ راجہ اسکے کارن ہر وقت اُداس رہتا اور سادھوؤں اور بیراگیوں کی سیوا میں لگا رہتا۔ ایک بار اس کی سیوا سے خوش ہو کر ایک سادھو نے دعا دی کہ "جا، نو مہینے کے بعد تیری رانی کے ایسا سندر پتر ہوگا جسے دیکھے چندرماں شرما جائے اور پریاں جل جل جائیں۔"

سادھو کا کہنا پورا ہوا اور نویں مہینے رانی ایسا لڑکا جنی جو خوبصورتی میں چاند کا ٹکڑا اور ہیرے کی مورت معلوم ہوتا تھا خبر سنتے ہی راجہ نے خزانوں کا منھ کھول دیا اور اتنا سونا چاندی لٹایا کہ رعایا میں کوئی غریب نہیں رہا۔

راجہ نے اس کا نام راجکمار ہنسی رکھا اور اس کے رہنے کو ایک گنگا جمنی محل بنوایا جہاں روشنی کو ہیرے اور لال کے چاند سورج جڑوائے اس میں ایک باغ لگوایا جس میں ساری دُنیا کے سدا پھل اور سدا بہار درخت تھے۔ پھر پردیس کے سندر سے سندر لونڈی غلام منگوا کے وہاں رکھے اور ان کو حکم دیا کہ خبردار میرے راجکمار کی کسی بات پر نہیں نہ ہو۔ راجکمار اس محل میں اس طرح پروان چڑھا جیسے کلی کی گود میں پھول یا سیپی کے سینے میں موتی پروان چڑھتا ہے۔ راجکمار جب دس برس کا ہوا تو وہ ایسا سندر نکلا کہ جہاں جاتا وہاں اُجالا ہو جاتا اس کی سندر آنکھوں سے ہیرے کی ایسی جوت نکلتی اور چہرے سے سورج کی ایسی کرنیں پھوٹتی تھیں۔

راجکمار ہنسی کی کسی بات پر نہیں نہ ہوتی۔ اس کی آنکھ کے ایک اشارے پر آسمان سے تارے اور سمندر کی تہ سے موتی آ سکتے تھے مگر اس پر بھی راجکمار اُداس اُداس رہتا تھا اور باغ میں ایک ہرسنگھار کے درخت کے نیچے دن دن بھر چُپ بیٹھا رہتا تھا۔ راجہ کو اس کی بڑی فکر تھی مگر وہ کسی طرح راجکمار کو خوش نہ کر سکا۔

ایک دن کا قصہ ہے کہ راجکمار ہنسی شکار کھیلتے کھیلتے اپنے ساتھیوں سے بچھڑ گیا اور ایک گاؤں کے پاس ٹھہر کر ان کے آنے کی راہ دیکھنے لگا۔ اتنے میں گھٹا گھر آئی اور پیٹ پیٹ کر پانی برسنے لگا۔ راجکمار گھوڑے کو درخت کے نیچے باندھکر آپ ایک جھونپڑے کی آڑ میں کھڑا ہو گیا۔ اس جھونپڑی میں رہتا تھا ایک چڑیار۔ جسوقت راجکمار اس کی جھونپڑی کے پاس کھڑا تھا اُس نے اندر اپنی بیوی سے کوئی کام کو کہا بیوی نے کہا میں نہیں کروں گی۔ اس پر چڑیار نے اُس کو بُرا بھلا کہا بیوی نے بھی غصہ میں آ کر برابر کا جواب دیا اور دیر تک دونوں میں جھگڑا ہوتا رہا۔ تھوڑی ہی دیر میں چڑیار کی بیوی اپنا قصور سمجھ گئی اور اُس نے اپنے شوہر سے معافی مانگ لی دونوں گلے مل گئے اور خوشی خوشی باتیں کرنے لگے۔ راجکمار بھی ان کی خوشی دیکھ کر بہت خوش ہوا۔

اس وقت راجکمار کے ساتھی اس کو ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے آ پہونچے تھے اور یہ دیکھ کر کہ راجکمار کچھ باتیں سن رہا ہے ہاتھ باندھکر الگ کھڑے ہو گئے۔ راجکمار نے ان میں سے ایک کو پاس بلایا اور اُس سے پوچھا کہ یہ لوگ کون ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ ان کے ساتھی نے ادب سے ہاتھ باندھکر کہا:

"مہاراج، یہ لوگ چڑیار ہیں اور آپس میں کسی بات پر جھگڑ رہے ہیں"

راجکمار نے آج تک "جھگڑنے" کا لفظ ہی نہیں سُنا تھا۔ وہ دل میں سوچنے لگا کہ میں اتنا بڑا ہو گیا اور آج تک نہ کسی سے جھگڑا کیا اور نہ ملاپ کر کے چڑیار کی طرح خوش ہوا۔ اب اس کے دل میں یہ سودا سمایا کہ ہم بھی کسی سے کوئی بات کہتے اور چڑیاروں کی طرح وہ بھی اس کے کرنے سے انکار کر دیتا۔ پھر ہم بگڑتے اور وہ بھی بگڑتا اور دونوں خوب جھگڑتے۔ پھر

تھوڑی دیر کے بعد دونوں ملاپ کر لیتے اور چڑیار اور چڑیارن کی طرح خوش ہوتے۔ راجکمار کو اس کی لگن ایسی لگی کہ ڈ
محل پہونچتے ہی اپنے سب سے زیادہ سیوا کرنے والے نوکر کو بلایا جب وہ آیا تو اس سے کہا:

"جو میں کہوں وہ تو کرے گا"

اُس نے پاؤں چھو کر جواب دیا:

"اگر آپ کی آگیا ہو کہ میں اپنے ہاتھ سے اپنا سر کاٹ ڈالوں تو میں اپنا سر کاٹ ڈالوں گا،" راجہ ایسی باتیں روز
سنتا رہتا تھا۔ اس نے ادھر دھیان بھی نہیں دیا اور کہا "اچھا، تم ہم سے جھگڑا کرو"
یہ سنتے ہی وہ کانپ گیا اور ہاتھ جوڑ کر گڑگڑا کر کہنے لگا۔ "مہاراج آپ کے غلاموں کی کیا مجال کہ وہ اس کا خیال بھی
جی میں لائیں"۔

راج کمار نے اس کی بہت خوشامد کی مگر وہ ہاتھ باندھے گردن جھکائے بلا منہ سے ایک لفظ نکالے چپ کھڑا رہا۔
پھر راجکمار نے اس کو بہت ڈانٹا تب اس کی آنکھوں سے بڑے بڑے آنسو گرنے لگے مگر اسکی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلا
راجکمار نے بگڑ کر اس کو اپنے کمرے سے نکال دیا اور پھر ایک دوسرے نوکر کو بلایا جو راجکمار کے اشارے پر کٹھ پتلی کی طرح
چلتا تھا جب وہ آیا تو اُس سے کہا:

"جو میں کہوں وہ تو کرے گا"

اُس نے ادب سے پاؤں چھو کر جواب دیا:

"اگر مہاراج کی آگیا ہو کہ میں آگ میں کود پڑوں تو میں کود پڑوں گا"

راجکمار ایسی باتیں ہر وقت سنا کرتا تھا اُس نے ادھر دھیان بھی نہیں دیا اور کہنے لگا "ہم سے کسی بات پر جھگڑا کرو"
یہ حکم سنتے ہی وہ تھر تھر کانپنے لگا اور رونے لگا۔ پھر گڑگڑا کر بولا:

"مہاراج آپ کے اس غلام سے کیا قصور ہوا ہے جو اس کو ایسی آگیاں ملی ہے"

راجکمار نے منت کی اور جب نہ مانا تو اُس کو ڈانٹا ڈپٹا وفادار نوکر ہاتھ باندھے چپ چاپ کھڑا رہا راجکمار نے غصے میں
آکر اُس کو اپنے سامنے سے دور کیا اور ایک اور نوکر کو بلا بھیجا اور اس سے پوچھا تم میرے لئے کیا کر سکتے ہو۔ اُس نے ہاتھ
جوڑ کر کہا جہاں مہاراج کا پسینہ گرے وہاں میں اپنا خون بہا دوں راجکمار نے کہا:

"اچھا آؤ ہم تم جھگڑیں"

یہ سنتے ہی وہ پرانی دیوار کی طرح زمین پر گر پڑا اور کہنے لگا:

"میری ایسی مجال کہاں"۔ راجکمار نے ایک ایک کر کے اپنی سب داس داسیاں بلائیں لیکن ایک نے بھی اسکی
یہ اگیا پوری نہ کی۔ اب راجکمار اتنا اُداس رہتا کہ نہ باغ جاتا اور نہ کھانا کھاتا، دن بھر سر جھکائے بیٹھا رہتا راجہ نے اس کا

دل بہلانے کے لئے مسخرے، بھیجے کوئی مور کی طرح ناچتا تو کوئی کوّے کی طرح پھدکتا کوئی شیر کی طرح گرجتا تو کوئی مرغ کی طرح ککڑوں کوں کرتا یہ سب آئے اور اپنے کرتب دکھاتے رہے مگر راجکمار اسی طرح اُداس اپنے خیالوں میں کھویا چپ چاپ بیٹھا رہا۔ وہ یہ سوچ رہا تھا کہ یہ کیا زندگی ہے کہ جو میں چاہتا ہوں وہ نہیں ملتا ہے اور جو میں نہیں چاہتا ہوں وہ ملتا ہے،

ایک دن راجکمار کو کچھ خیال آیا اور اس نے دو چوبدار بھیج کر چڑیمار اور چڑیمارن کو بلا بھیجا۔ جب وہ دونوں آئے اور راجکمار کے سامنے کھڑے ہوئے تو ان کی گھگھی بندھی ہوئی تھی اور چہرے دھلے کپڑوں کی طرح سفید تھے۔ کیونکہ انھوں نے زندگی بھر نہ راج محل کو دیکھا تھا نہ کبھی راجکمار کو۔

راجکمار نے ان کی ڈھارس بندھائی اور کہا اگر تم میرا ایک حکم مانو تو میں تمھیں اتنا سونا چاندی دوں گا جو تمہاری سات پشتوں تک چلے۔ چڑیمار نے خوش ہو کر پوچھا مہاراج کی کیا آگیاں ہے۔ راجکمار نے کہا جیسے تم آپس میں جھگڑتے ہو ویسے ہی تم مجھ سے بھی جھگڑو۔

چڑیمار نے کہا کہیں پرجا راجاؤں سے جھگڑ سکتی ہے"

یہ سنکر راجہ ہنسی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور وہ سمجھ گیا کہ راجکمار بن کر میں اپنی خواہش نہیں پوری کر سکتا۔

اب راجکمار کا یہ شوق اتنا تیز ہو گیا کہ اُس نے طے کر لیا کہ چاہے جو ہو میں اسے پورا کر کے رہوں گا۔ چاہے مجھے اسکے کارن اپنا دیس اور راج پاٹ ہی کیوں نہ چھوڑنا پڑے۔

اسی دن آدھی رات رہے جب سارے محل میں سوتا پڑا تھا راجکمار ایک سپاہی کا بھیس بدل کر باہر نکلا۔ اور اپنے ہاتھ سے گھوڑے پر زین کس راتی رات کسی دور دراز کے دیس کو چل کھڑا ہوا۔

چلتے چلتے ایک شہر میں پہونچا جہاں کے بازاروں میں ایسی چہل پہل تھی اور لوگ ایسے ملنسار تھے کہ اسکا جی چاہا کہ یہیں رہ جاؤں اُس نے ایک اچھا سا مکان خریدا۔ اور وہاں ایک سوداگر بن کر رہنے لگا۔

پڑوس میں ایک کسان رہتا تھا جس کی ایک لڑکی تھی جس کا نام کنول تھا جو مور کی طرح البیلی اور ناگن کی ایسی چنچل تھی۔ ایک دن وہ اپنے کوٹھے پر آئی تو دیکھتی کیا ہے اس کے پڑوس والا مکان جہاں پہلے دن کو چمگادڑ اور رات کو بھوت رہتے تھے اب آدمیوں سے بسا معلوم ہوتا ہے۔ اُس نے اُچک کر جھانکا تو دیکھتی کیا ہے کہ کمرے میں پردے پڑے ہوئے ہیں۔

اُس نے کہا اہا یہاں تو ریشمی پردے پڑے ہوئے ہیں اور یہ کہکر اس طرف کو دگٹی اور چپکے چپکے جاکر پردہ اُٹھا کر اندر جھانکا تو دیکھتی کیا ہے کہ کوئی چادر تانے بے خبر سو رہا ہے اور اس کے پاس چوکی پر ایک کٹورے میں پانی بھرا رکھا ہے اور ایک تھالی میں پان پھول اور عطر رکھے ہیں۔ یہ دبے پاؤں اندر گئی اس نے کٹورے کا آدھا پانی پی لیا تھالی کے آدھے پان کھائے، شیشی کا آدھا عطر لگا لیا اور آدھے پھول ہاتھ میں لے کر اپنے گھر چلی آئی۔

سورج ڈوبنے پر راجکمار بنسی کی آنکھ کھلی تو دیکھتا کیا ہے کہ کوئی کٹورے کا آدھا پانی پی گیا ہے تھالی کے آدھے پان کھا گیا ہے۔ شیشی کا آدھا عطر لگا گیا ہے اور آدھے پھول لے گیا۔ راجکمار کی زندگی میں کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ کوئی اس طرح چوری چھپے آیا ہو اور اس کی چیزوں کو بگاڑ گیا ہو۔ اُس نے بچا ہوا پانی پیا اور بچے ہوئے پان کھائے بچا ہوا عطر لگایا اور بچے ہوئے پھول سونگھے تو اس کو ان میں ایسا مزا ملا جیسا آج تک ان چیزوں میں نہیں ملا تھا۔

دوسرے دن پھر وہی ہوا کہ کنول آئی اور آدھا پانی پی گئی آدھے پان کھائے آدھا عطر لگایا اور آدھے پھول ساتھ لئے اور لوٹنے لگی تو اُس نے دیکھا کہ سونے والے کا ہاتھ پٹی سے لٹک رہا ہے اور اُس کی اُنگلی پر ایک انگوٹھی چمک رہی ہے کنول نے اپنی اُنگلی کی انگوٹھی اُتار کر اُس کو پہنا دی اور اُس کی انگوٹھی خود پہن کر چلتی بنی۔ جب سورج ڈوبا اور راجہ بنسی کی آنکھ کھلی تو دیکھا آدھا پانی آدھے پان آدھا عطر اور آدھے پھول تو غائب ہی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ آج ہاتھ کی انگوٹھی بھی بدلی ہوئی ہے۔

راجہ بنسی نے سوچا کہ کچھ ہو اس چور کو ضرور پکڑنا چاہئے دوسرے دن جب سورج نکلا اور راجہ بنسی کی آنکھوں میں نیند بھرنے لگی تو اُس نے تلوار سے اپنی چھنگلیا کاٹ کر اس میں نمک مرچ بھر لیا کہ اس تکلیف سے نیند نہ آئے اور چادر تان کے سوتا بن گیا۔ جب دوپہر ہوئی تو دیکھتا کیا ہے کہ ایک لڑکی پری کی ایسی پھرتیلی مور کی ایسی البیلی اور ناگن کی ایسی چنچل چلی آرہی ہے۔

اس کے ہونٹ ایسے لال تھے جیسے طوطے کی چونچ اور آنکھیں ایسی بڑی بڑی تھیں جیسے کنول کے کٹورے وہ بلی کی طرح دبے پاؤں اندر آئی۔ اس نے چپکے سے آدھا پانی پیا، آدھے پان کھائے، آدھا عطر لگایا اور پھر اس کے سرہانے سے آدھے پھول اُٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ راجہ بنسی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

کنول نے ایک جھٹکا دیکر ہاتھ چھڑا لیا اور کود کر الگ کھڑی ہو گئی۔

راجکمار کو اس پر بڑی حیرت ہوئی۔ آج تک اس کے ساتھ کسی نے ایسا نہیں کیا تھا۔ راجکمار نے ذرا سختی سے کہا، "میں تم کو آگیاں دیتا ہوں کہ ادھر آؤ۔"

کنول، یہ سنکر بگڑ گئی اور کہنے لگی:

"مجھ پر کسی کا حکم نہیں چل سکتا۔"

اس کا بگڑنا تھا کہ راجکمار پر چھائی ہوئی گھٹا چھٹ گئی اور اندر خوشی کی لہریں اُٹھنے لگیں۔ اس نے منتیاں کر کے کنول کو روکا اور اسی دن سے کنول اس کی بیوی ہو گئی۔

راجکمار کے ماں باپ راجکمار کے کھو جانے سے بہت پریشان تھے ان کی بھوک پیاس جاتی رہی تھی اور دن رات ان کا یہی کام تھا کہ اپنے لڑکے کو یاد کر کر کے آٹھ آٹھ آنسو رویا کرتے تھے۔ بڑے بڑے پنڈت اور جوتشی بلائے گئے

اور ان کو راجکمار کی کنڈلی دکھائی گئی اور بہت پوجا پاٹ کیا گیا۔

راجکمار کی ماں نے کچھ اور سوچا۔ اُس نے اپنے دل میں کہا۔ ہو نہو راجکمار کسی خوبصورت لڑکی کے پھیر میں غائب ہوا ہے اور اس نے اپنے چکر میں اس کو ایسا پھنسا رکھا ہے کہ وہ اپنے ماں باپ کے راج پاٹ کو بھلائے بیٹھا ہے۔ یہ سوچ کر مہارانی نے بڑی بڑی کٹنیاں بلائیں اور اُن سے پوچھا تم کیا کیا کام کر سکتی ہو؟

ایک بولی "میں آسمان میں چکتی لگا سکتی ہوں"

دوسری نے کہا "میں اُڑتی چڑیا کے پر گن سکتی ہوں"

تیسری نے کہا "میں سیپی کے پیٹ سے موتی چرا کر لا سکتی ہوں"

جو سب سے بڑھی تھی چلا کر بولی "میں پرائی بہو بیٹیوں کو بہلا پھسلا کر لا سکتی ہوں"

رانی نے چوتھی کٹنی کو بہت پسند کیا اور اس کو اپنے راجکمار کی پہچان بتائی اور روپیہ پیسہ دیکر راجکمار کی کھوج میں بھیجدیا بڑھیا شہر شہر، گاؤں گاؤں، محلوں محلوں، جھونپڑوں جھونپڑوں، راجکمار کی کھوج میں گھومی گھومی پھری۔ چوہے کی طرح بڑے سے بڑے محل میں گھس جاتی۔ پرندوں کی طرح اونچے سے اونچے قلعہ میں پہونچ جاتی اور شہد کی مکھیوں کی طرح باغوں میں گھومتی آخر گھومتے گھومتے وہ اس دیس میں آئی جہاں راجکمار رہتا تھا اس نے ایک ایک کر کے سب گھر دیکھ ڈالے لیکن راجکمار کا گھر بچ رہا کیونکہ وہ صرف رات کو کھلتا تھا۔ بڑھیا نے جب بھی اس کو دیکھا اندر سے بند پایا۔ اس نے سوچا کہ کیسے لوگ ہیں جو گھر میں ایسے رہتے ہیں جیسے کوئی جیل خانے میں۔ اس نے پاس پڑوس والوں سے پوچھا کہ یہاں کون رہتا ہے لوگوں نے کہا یہاں ایک سوداگر بچہ رہتا ہے جو صرف رات کو باہر نکلتا ہے۔ یہ سنکر بڑھیا کھٹکی اور سوچی کہ ہو نہ ہو یہی راجکمار ہے۔

جب رات ہونے لگی تو بڑھیا ایک بھکارن بن کر دروازے کے سامنے بیٹھ رہی، رات گئے جب راجکمار باہر نکلا اور بڑھیا نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا تو پوری وہی صورت پائی جیسی مہارانی نے بتائی تھی۔ بڑھیا دیکھ کر خوش ہو گئی۔

دوسرے دن اس نے چوڑی والی کا بھیس بنایا اور رنگ برنگی چوڑیاں ایک ٹوکری میں رکھکر راجکمار کے گھر کی طرف آئی۔ جب رات ہوئی اور راجکمار باہر چلا گیا تب اُس نے دروازے کے سامنے آکر آواز لگائی۔

"لے چوڑی - لے رنگ برنگی چوڑی۔ لے سنہری روپہلی چوڑی"

کنول کو راجکمار کے گھر میں رہتے مہینوں بیت گئے تھے۔ لیکن اس کے دروازے پر کبھی کوئی سودا بیچنے نہیں آیا تھا کیونکہ رات کو جب یہ لوگ جاگتے تھے تو سودے والے اپنے اپنے گھر جا کر سو رہتے تھے۔ اس وقت کنول نے جیسے ہی چوڑی والی کی آواز سنی وہ دوڑتی ہوئی دروازے کے پاس آئی اور چوڑی والی کو بلا کر اندر لے گئی اور جھٹ سے چوڑی پہننے کے لئے اپنے ہاتھ کو بڑھیا کے سامنے بڑھا دیا۔ بڑھیا نے دیکھا کندن کا ہاتھ سونٹے کی طرح بلا چوڑی

کے ہے تب تو وہ ہاتھوں کو دیکھ کر ہنکاری اور کہنے لگی کہ تمھارے میاں تم کو بالکل نہیں چاہتے۔

کنول نے کہا: " واہ واہ وہ تو ہم سے بہت پریم کرتے ہیں"۔

بڑھیا نے کہا میں نہیں مانتی۔ اچھا یہ بتاؤ کہ تمھارے میاں تمھارا جھوٹا کھانا کھاتے ہیں اور جھوٹا پانی پیتے ہیں؟

کنول نے کہا " نہیں، ان کی تھالی اور کٹورا الگ رہتا ہے اور میرا الگ رہتا ہے"۔

بڑھیا بولی: " واہ جی کہاں پریم کرتے ہیں؟ تب جانوں کہ تم سے پریم کرتے ہیں کہ آج تم اُن کا جھوٹا کھاؤ اور وہ تمھارا جھوٹا کھائیں۔ کنول نے کہا " یہ بھی کوئی بڑی بات ہے؟ آج ہی اپنے میاں سے کہوں گی"۔

اس دن جب راجکمار اور کنول کھانا کھانے بیٹھے تو کنول نے کہا کہ آؤ آج ہم تمھارا جھوٹا پانی پئیں اور تم ہمارا جھوٹا پانی پیو، یہ سنتے ہی راجکمار کے کان کھڑے ہو گئے اور اُنھوں نے کہا: " کنول آج کیسی باتیں کر رہی ہو؟ کیا یہاں کوئی آیا تھا اور اُس نے تم کو کچھ سکھایا پڑھایا ہے"۔ کنول نے سمجھا کہ راجکمار اس طرح بات ٹالنا چاہتا ہے۔ اُس نے جھٹ پٹ کہا۔ نہیں کوئی نہیں آیا تھا۔ یہ میں خود سے چاہتی ہوں۔ " راجکمار نے اُسے سمجھایا کہ یہ نہ کرو لیکن اس سے جھگڑا نہیں ختم ہوا تب راجکمار نے اپنا کٹورا اُٹھا کر اپنے منھ سے لگایا اور اس طرح جھوٹ موٹ کے گھونٹ پئے جیسے پانی پی رہا ہو لیکن اس نے پانی نہیں پیا۔ پھر وہ کٹورا کنول کو دیدیا اور اس کے کٹورے کا پانی خود پی لیا۔ کنول خوش ہو گئی۔

بڑھیا اپنے جی میں خوش تھی کہ کنول نے راجکمار کے منھ کا جھوٹا پانی پی کر جان دیدی ہوگی۔ لیکن جب وہ دوسری رات کو سرمہ مِسّی لئے راجکمار کے گھر آئی تو دیکھتی کیا ہے کہ کنول جیتی جاگتی بیٹھی ہے اور اُسے دیکھتے ہی تالی بجا کر کہنے لگی کہ دیکھو میں کہتی تھی کہ میرے میاں مجھے چاہتے ہیں۔ کل میں نے ان کا جھوٹا پانی پیا اور اس نے میرا جھوٹا پانی پیا۔

بڑھیا نے کہا: " واہ یہ تو چھوٹی سی بات تھی۔ تب جانوں کہ تمھارے میاں تم کو چاہتے ہیں کہ تم ان کے منھ کا اُگال کھاؤ اور وہ تمھارا اُگال کھائیں"۔

کنول نے کہا: " اچھا۔ آج یہی ہوگا"۔

بڑھیا چلی گئی اور اسدن جب راجکمار آیا اور کھانا پینا ہو چکا تب دونوں پان کھا کر باتیں کرنے لگے ویسے ہی کنول نے کہا " تب جانوں کہ تم مجھ کو چاہتے ہو کہ تم میرا اُگال کھاؤ اور میں تمھارا اُگال کھاؤں"۔

اب تو راجکمار یہ سنکر بڑا چکر میں پڑا کہ یہ بات کیا ہے۔ کوئی نہ کوئی کنول کو سکھاتا پڑھاتا ضرور ہے۔ اس نے کنول سے پوچھا کہ سچ سچ بتاؤ کہ یہ باتیں کون بتاتا ہے۔

کنول نے اپنے دل میں کہا کہ میرا میاں مجھے ٹالنا چاہتا ہے اُس نے کہا: " یہاں رات کو مجھے کون سکھانے پڑھانے آئے گا۔ یہاں رات کو صرف چوہے بلّی آتے ہیں۔ ان کے سکھانے سے کوئی سیکھ لے تو سیکھ لے۔ راجکمار نے بہت سمجھایا لیکن کسی طرح وہ نہ مانی۔

آخر راجکمار نے اپنا اُگال اپنے ہاتھ میں لیا اور کنول سے کہا کہ لاؤ اپنا اُگال دو جب کنول نے اپنا اُگال دیا تو اُس نے وہ بھی اپنے ہاتھ میں لیا اور پھر اپنا اُگال آپ کھا لیا اور اس کا اُگال اُس کو دیدیا گیا۔ کنول سمجھی کہ اس نے ہماری بات مان لی اور خوش ہو گئی۔

دوسرے دن جب بڑھیا آئی اور اُس نے دیکھا کہ کنول جیتی جاگتی بیٹھی ہوئی ہے تو بہت گھبرائی کہ یہ کیا بات ہے کنول اس کو دیکھتے ہی ہنس پڑی اور کہنے لگی کہ میں کہتی نہ تھی کہ میرے میاں مجھ کو چاہتے ہیں۔ کل ہم نے ان کا اُگال کھایا اور اُنھوں نے میرا اُگال کھایا۔

بڑھیا نے کہا ”واہ یہ تو چھوٹی سی بات تھی تب جانوں کہ تمھارے میاں تم کو چاہتے ہیں کہ وہ تم کو اپنی ذات بتادیں“ بڑھیا چلی گئی۔ رات کو جب کھانا وانا کھا کر راجکمار اور کنول بیٹھ کر باتیں کرنے لگے تو کنول نے پوچھا کہ تمھاری ذات کیا ہے۔

یہ سنتے ہی راجکمار اُچھل پڑا اور بگڑ کر کہنے لگا دیکھو ایسی باتیں نہ کرو۔ نہیں تو ہم تم بچھڑ جائیں گے۔

کنول نے کہا: ”میں یہ کچھ نہیں سنتی۔ تم مجھے اپنی ذات بتادو“

راجکمار نے اس کی منتی کی گڑگڑایا۔ مگر کنول نے ایک نہ سنی۔ نہ ماننا تھا نہ مانی اور وہی رٹ لگاتی رہی کہ مجھے اپنی ذات بتاؤ، مجھے اپنی ذات بتاؤ۔

ایک دن سے دوسرا دن ہوا، کنول اٹوار کھٹوار لیکر بھوکی پیاسی ایک کونے میں پڑی رہی راجکمار نے اس کے سمجھانے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی بار بار کہا کہ یہ بات تم کو کسی دشمن نے سمجھائی ہے اور وہ چاہتا ہے کہ ہم تم بچھڑ جائیں مگر کنول کی ایک ہی رٹ تھی کہ مجھے اپنی ذات بتادو، مجھے اپنی ذات بتادو۔

راجکمار نے اس کے لئے رنگ برنگی کپڑے اور طرح طرح کے زیور خریدے۔ موتیوں کے ہار جس کے موتی لال کے انڈے کے برابر تھے اور یاقوت کے بندے جو طوطے کی زبان کی طرح لال تھے لاکر کنول کے سامنے رکھدئے۔ مگر وہ نہ ماننا تھی نہ مانی اور برابر یہی رٹ لگائے رہی کہ مجھے اپنی ذات بتادو۔ اپنی ذات بتادو۔

آخر راجکمار نے کہا میں اپنی ذات اس وقت بتاؤں گا جب میں کمر کمر پانی میں کھڑا ہوں۔ کنول نے کہا چاہے ندی میں کھڑے ہو کر بتاؤ چاہے سمندر میں لیکن مجھے اپنی ذات بتادو۔ میں بلا یہ جانے زندہ نہیں رہ سکتی“

دوسرے دن ڈولا منگوایا گیا۔ اس میں کنول بیٹھی اور گھوڑے پر ساتھ ہوئے راجکمار بنسی اور دونوں گھاٹ پر پہونچے۔ یہاں راجکمار نے کہا دیکھ کنول اب بھی مان جا۔ نہیں تو پچھتائے گی کنول بولی میں کچھ نہیں سنتی۔ راجکمار نے یہ سن کر غصہ سے کپڑے اُتارے اور کمر کمر پانی میں اُتر گیا۔ پھر کہا اب بھی مان جا۔ نہیں تو میرے تیرے بیچ میں سات سمندر ہوں گے۔ نہ تو وہاں جا سکے گی اور نہ پھر میں آسکوں گا۔ کنول بولی میں یہ کچھ نہیں سنتی، مجھے اپنی ذات بتادو۔ راجکمار

اکی یہ سنتے ہی تلملا گیا۔ اُس نے پانی میں ڈبکی لگائی اور پھر کالا چمکتا ہوا چہرا اور شعلے کی طرح لپ لپ کرتی زبان دریا سے نکال کر بولا :-

"یہ دیکھ میری ذات ۔ یہ دیکھ میری ذات "

پھر پھن اندر کر لیا جہاں راجکمار نے غوطہ لگایا تھا وہاں چھوٹے چھوٹے گھیرے پانی پر بنے اور دھیرے دھیرے کر کے مٹ گئے۔ راجکمار غائب ہو کر پھر باہر نہ آیا۔

جب راجکمار واپس نہ آیا۔ تب کنول کو معلوم ہوا کہ اُس نے کتنی بڑی غلطی کی۔ جیسے ساون بھادوں میں کالی گھٹائیں جھڑی لگا دیتی ہیں ویسے ہی کنول کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ جب روتے روتے اُسے کئی دن بیت گئے تو اُس کے جی میں آیا کہ ایسی زندگی سے موت بہتر ہے۔ وہ اُٹھ کر دریا کی طرف دوڑی اور کود پڑی۔ دو چار ڈبکیاں کھا کر بے ہوش ہو گئی ایک مچھلی یہ سب لیلا دیکھ رہی تھی اُسے کنول کی بپتا پر ترس آگیا۔ اُس نے کندن کو اپنی پیٹھ پر لا کر سات سمندر پار ناگ دیس پہونچا دیا۔

کنول کی جب آنکھ کھُلی تو دیکھتی کیا ہے کہ میں ایک بہت بڑے جنگل میں پڑی ہوں۔ جنگل کے پیڑوں پر پھل پھول تمام ہیں مگر پتی ایک بھی نہیں اور ڈالیاں سانپ کی طرح بل کھاتی آپس میں لپٹی ہوئی تھیں۔ کنول اُٹھ کر ایک طرف چلی۔ چلتے چلتے ایک آبادی کے باہر ایک کنوئیں کے پاس پہونچی۔ جہاں چار پانچ سندر سندر لڑکیاں پانی بھر رہی تھیں۔ کنول چلتے چلتے تھک کر چور ہو گئی تھی اور اس کا گلا پیاس سے سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا۔ اُس نے جگت کے پاس جا کر ایک لڑکی سے کہا "بہن مجھے پانی پلا دے"۔ اُس نے کہا "ہٹ تجھے اپنی پڑی ہو آج میرا راجکمار نہا رہا ہے جو برسوں کے بعد گھر آیا ہے پنڈت جی نے کہا ہے کہ جب تک وہ ایک سو ایک گھڑوں سے نہ نہائے گا ہم لوگوں سے مل جُل نہیں سکتا ہے۔ ہم سب چاہتے ہیں کہ جلدی سے وہ نہائے تو ہم اس سے ملیں جلیں"۔

کنول کے کان کھڑے ہوئے اُس نے پوچھا تمہارا راجکمار اتنے دنوں تک کہاں رہا۔ اُس نے جواب دیا :-

"اُسے ایک چالاک عورت نے اپنے جال میں پھانس رکھا تھا۔ اب ایک بڑھیا اُسے چھڑا کر لائی ہے"

کنول نے منتی کی کہ مجھے پانی پلا دو پیاس سے مری جا رہی ہوں۔ آخر ایک پانی والی کو ترس آیا اور اُس نے کہا "ادھر آ --- میں پانی پلا دوں"

کنول نے پانی پیتے میں اپنی انگوٹھی گھڑے میں ڈال دی پانی بھر کر سب لڑکیاں ایک ایک گگری سر پر اور ایک ایک کمر پر رکھ کے محل کی طرف چلیں۔ محل میں راجہ بنسی ایک سونے کی چوکی پر بیٹھا تھا۔ پانی بھرنے والیوں نے اپنے گھڑے لا کر رکھ دیئے اور ایک ایک کر کے راجکمار کے سر پر ڈالنے لگیں۔ ایک گھڑے سے انگوٹھی نکل کر راجکمار کی گود میں گری راجکمار نے اُسے دیکھتے ہی چھپا لیا اور کہا :- "آخر کمبخت آ پہونچی"

نہا دھو کر ہنسی ٹہلنے کے بہانے محل کے باہر نکلا اور ادھر اُدھر کنول کو دیکھنے لگا۔ دیکھا تو وہ ایک درخت سے لگی کھڑی رو رہی ہے اس کے کپڑے میلے ہیں بال اُلجھے ہیں اور پاؤں میں چھالے پڑے ہیں، اس بُری حالت میں دیکھ کر راجکمار کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اُنھوں نے پاس جاکر اپنی ہتھیلیوں سے کنول کے آنسو پونچھے۔ آنسو پونچھنے میں کنول کی آنکھوں کا کاجل ہتھیلیوں میں بھر گیا اور اُسے اس کی خبر نہ ہوئی۔

راجکمار نے کہا دیکھ کنول، آج میں اپنی ماں سے کہوں گا گھر میں جھاڑو دینے کو ایک عورت کو رکھ لو وہ پوچھے گی کون عورت ہے تو میں کہوں گا کہ مصیبت کی ماری کہیں باہر سے آگئی اور یہاں ماری ماری گھوم رہی ہے۔ تب وہ تم کو رکھ لیں گی۔

یہ سُن کر کنول کو تھوڑی سی ڈھارس ہوئی اور وہ راجکمار کے ساتھ ساتھ محل کے پھاٹک تک آئی اندر جاکر راجکمار نے جو کچھ کنول سے کہا تھا اپنی ماں سے کہا: ماں نے اپنے بیٹے کی خوشی دیکھ کر کنول کو نوکر رکھ لیا۔ لیکن راجکمار کی بہنوں نے راجکمار کی ہتھیلیوں میں کاجل بھرا دیکھ لیا اور کھٹک گئیں۔ جب دوسرا دن ہوا تو بہنوں نے ایک ڈلیا میں دھان نکالے اور ایک ایک گن کر کنول کو دئے اور کہا اس کو کوٹ لا مگر خبردار ایک چاول نہ ٹوٹے۔

کنول بچاری ڈلیا لئے باہر آئی اور ایک پیڑ کے نیچے بیٹھ کر رونے لگی، ادھر سے آنکلے راجہ ہنسی۔ اُنھوں نے اسے روتے دیکھ کر پوچھا کیا بات ہے۔ کنول نے سب حال کہا، یہ سُن کر راجکمار نے جنگل کی چڑیوں کو بلایا اور اُن کو حکم دیا کہ سب دھان کھٹک کر چاول باہر نکال دو چڑیوں نے بات کی بات میں کام پورا کر دیا اور کنول خوش خوش چاول کی ٹوکری لئے ہوئے اندر آئی۔

راجکمار کی بہنیں یہ دیکھ کر کنول سے کہنے لگیں:۔

"یہ تیرا کام نہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ کس کا کام ہے"

دوسرے دن راجکمار کی بہنوں نے کنول سے کہا دیکھ ہمارے بھیا کا بیاہ ہو رہا ہے ان کے رہنے کے لئے وہ سامنے والا کمرا جھاڑ بہار کر صاف کر دے۔

کنول جھاڑو لئے کمرے کی طرف گئی، وہاں دیکھتی کیا ہے کہ چھت میں بڑے بڑے سانپ لٹک رہے ہیں اور پھنکاریں مار مار کر آپس میں لڑ رہے ہیں۔

نیچے بڑے بڑے اجگر پڑے ہوئے ہیں اور کونوں میں بچھو اور کھنکھجورے رینگ رہے ہیں یہ دیکھ کر کنول ڈر کر بھاگ آئی اور ایک کونے میں بیٹھ کر رونے لگی ادھر سے آنکلے راجہ ہنسی اُنھوں نے جو اُسے روتے دیکھا تو پاس آکر پوچھا کیا بات ہے اُس نے سب قصہ کہہ سنایا۔ اُنھوں نے اپنی انگوٹھی اُتار کر کنول کو دی اور کہا اسے جاکر کمرے میں ڈال دو۔

کنول نے ایسا ہی کیا انگوٹھی دیکھتے ہی سب اجگر سانپ بچھو اور کھنکھجورے بلوں میں گھس گئے۔ کنول نے سب جھاڑ بہار کر صاف کیا اور راجکمار کی بہنوں سے آکر کہا کہ کمرہ صاف ہو گیا ہے۔

راجکمار کی بہنوں نے جاکر کمرہ دیکھا اسے صاف دیکھ کر حیرت میں آگئیں پھر کنول سے کہنے لگیں:

"یہ تیرا کام نہیں ہے ہم جانتے ہیں کہ یہ کس کا کام ہے"

ہوتے ہوتے راجکمار کی برات کا دن آگیا۔ بیاہ میں ہاتھی گھوڑے، شیر اور ریچھ سب ساتھ ساتھ تھے۔ خوب باجے گاجے تھے اور طرح طرح کی آتشبازیاں تھیں۔ راجکمار کی بہنوں نے کنول کو بلاکر پوچھا کہ تم راجکمار کو کتنا چاہتی ہو اس نے جواب دیا کہ ان کو اپنی جان سے زیادہ چاہتی ہوں، بہنوں نے کہا ہمارے یہاں رواج ہے کہ جو دولھا کو بہت چاہتا ہے اس کے ہاتھ کی دسوں انگلیوں میں کپڑا لپیٹ کر تیل چھڑک دیتے ہیں پھر اس میں آگ لگاکر مشعلچیوں کے ساتھ ساتھ دولھا کے گھوڑے کے آگے آگے رکھتے ہیں۔

بھولی کنول اس پر راضی ہوگئی اس کے ہاتھ کی دسوں انگلیوں پر کپڑا لپیٹا گیا۔ پھر ان پر گھی چھڑکا گیا اور ان میں آگ لگا دی گئی اور اسے راجکمار کے گھوڑے کے آگے کر دیا گیا جب برات چلی تو یہ بھی چلی۔ اتفاق سے اس کی انگلیوں سے اس کی ساڑھی میں آگ لگ گئی۔ اسے دیکھ کر کسی نے کہا:

"مشعلچن۔ دیکھ تیرے کپڑے جل رہے ہیں"

کنول اپنے دکھ میں ایسی کھوئی ہوئی تھی کہ اس نے سنا بھی نہیں پھر کسی نے کہا:

"مشعلچن دیکھ تیرے کپڑے جل رہے ہیں"

اب کنول چونکی اور چونک کر بولی:

"کپڑے کیا یہاں تن من سب جل رہا ہے" اس کی آواز سن کر راجکمار چونک پڑا اور گھوم کر اس کی طرف دیکھا تو دیکھتا کیا ہے کہ کنول کی دسوں انگلیاں مشعل بنی ہوئی ہیں اور اس کے بدن میں بھی آگ لگ چکی ہے۔

راجکمار نے جب کنول کو اس بری حالت میں دیکھا تو اس سے نہ رہا گیا اس نے ایک پھنکار ماری جس سے برات کے سارے چراغ مشعلیں اور بتیاں بجھ گئیں اور اندھیرا گھپ ہوگیا اس نے کنول کی بانہہ پکڑ کر اپنے گھوڑے پر بٹھالیا اور گھوڑے کو بھگاتا ہوا اپنے دیس سے نکل گیا۔ دیس کے باہر پہونچکر اس نے اپنے بال کاٹ ڈالے جس سے اس میں ناگ بننے کی طاقت نہیں رہی اور وہ معمولی آدمی بنکر کنول کے ساتھ آدمیوں میں رہنے لگا۔

حیات اللہ انصاری

(نیا ادب)

فلسفۂ مذہب اس کتاب کی اہمیت نام سے ظاہر ہے۔ اسے ملک کے نامور محقق جناب مقبول احمد صاحب نے تالیف کیا ہے۔ اصل قیمت عہ رعایتی ۱۲ر محصول علاوہ - مینجر نگار بک ایجنسی لکھنؤ

اخبار کمپنی کے عہدِ حکومت میں

ہر ملک کی حیاتِ ملی و قومی میں اخبارات ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں، ہمارا وطن بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہو اگرچہ ہندوستانی اخبارات یہاں کی رائے عامہ کے اتنے پرزور ترجمان نہیں ہیں جتنا مغرب کے یورپ میں اخبارات اُنیسویں صدی کے آغاز ہی میں بہت زور پکڑ چکے تھے اور ان کی بڑی وقعت تھی اسی بناء پر نپولین کہا کرتا تھا کہ "چار مخالف اخبار ایک لاکھ نیزوں سے زیادہ خطرناک ہیں" ہندوستان میں ایسے خوفناک حربے کی ابتدا اور نشو ونما کی تاریخ کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا لیکن قبل اس کے کہ ہندوستانی اخبارات پر قلم اُٹھایا جائے یہ نامناسب نہ ہوگا اگر مختصراً یہ بھی بتا دیا جائے کہ دنیا میں اخبارات کس طرح وجود میں آئے۔

جہاں تک معلوم ہو سکا ہے اطالیہ اخبارات کا مولد ہے" ایکٹا ڈای یرنا (Acta Diurna) جس میں روزمرہ کے واقعات کا ذکر ہوتا تھا اور جس کا حوالہ "سینکا" (Seneca) نے بھی اپنی تصانیف میں دیا ہے دنیا کا پہلا اخبار کہا جا سکتا ہے۔ یہ اطلاعات نہایت معتبر اور مستند ہوتی تھیں کیونکہ یہ حکومتِ روما کی طرف سے شایع کی جاتی تھیں لیکن جولیس سیزر کی وفات کے بعد یہ اخبار بند ہوگیا چامرس (Chalmers) کی تحقیق کے مطابق طرز جدید کا پہلا اخبار ۱۵۳۶ عیسوی میں نکلا۔ یہ ایک قلمی اخبار تھا اس کا مقصد اہلِ وینس کو وقت کے اہم سیاسی مسایل سے باخبر رکھنا تھا۔ اور ہر ماہ میں صرف ایکبار شایع ہوتا تھا سب سے پہلا انگریزی اخبار "دی ویکلی نیوز" ۲۳ر مئی ۱۶۲۲ء کو نکلا۔

ان ابتدائی اخبارات کے متعلق ایک مدبر اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کرتا ہے " یہ اخبارات مختصر اور بودے کاغذ کا ایک پُلندا ہوتے تھے۔ جن میں کبھی منگھڑت واقعات اور مشکوک قصوں کا ذکر ہوتا تھا یا لوگوں کی بیجا مدح وستایش کی جاتی تھی یا مخالفین پر فحش و رکیک حملے ہوتے تھے اُن کی اشاعت پوشیدہ طریقہ سے ہوتی تھی ان کا مطالعہ زیرِ لب ہوتا تھا اور ہاتھوں ہاتھ خفیہ طور پر ایک سے دوسرے تک پہونچتا تھا"

ہندوستان میں صورتِ حال بالکل مختلف تھی یہاں نہ ان کی صورت آغاز ہی اس درجہ شکستہ تھی اور نہ ان کو اپنی زندگی برقرار رکھنے کے لئے کوئی خفیہ راہ عمل اختیار کرنی پڑی۔

یورپ میں اخبار کے اجرا کے تقریباً ڈیڑھ سو برس بعد ہندوستان میں اس کا وجود ہوا اور اس عرصہ میں لوگوں کے زاویۂ نگاہ میں بین تبدیلی اور تغیر ہو چکا تھا۔

اٹھارھویں صدی کے اواخر میں ایسٹ انڈیا کمپنی ایک مستحکم سیاسی قوت بن چکی تھی انتظامی اُمور اور جدید تجارتی جہات کے لئے انگریزوں کی ایک کثیر تعداد ہندوستان آنے لگی۔

تینوں احاطوں کے صدر مقام کلکتہ، بمبئی اور مدراس میں انگریزوں کی آبادی روز بروز بڑھنے لگی یہ لازمی امر تھا کہ یہ نیا عنصر بہت دور رس نتائج اور اہم تبدیلیوں کا حامل ہوتا۔ سرزمین ہند میں نئے خیالات اور اداروں کی تخم ریزی ہونے لگی اخباری پریس انھیں اداروں میں ایک تھا اس کی ابتدا انفرادی مساعی اور ہمت کی رہین منت ہے، کمپنی نے اس سلسلہ میں کوئی پیشقدمی نہیں کی۔

سنہ ۱۷۶۸ء میں ایک شخص مسمی مسٹر بولٹس (Mr. Bolts) نے ایک اخباری مطبع قایم کرنے کی کوشش کی لیکن قبل اس کے کہ اس کے منصوبے عملی جامہ پہن سکیں فورٹ ولیم کی کونسل نے اس کو ہندوستان چھوڑنے کا حکم دیدیا کچھ عرصہ بعد ایک دوسرے شخص مسمی جے۔ اے ہکے (J. A. Heckey) نے ایک پریس قایم کیا جس کو پرنٹنگ (چھپائی) پر ایک رسالہ کلکتہ کے جیل میں ملگیا تھا وہ قرضہ کے عدم ادائیگی کے جرم میں ماخوذ تھا اس نے اس الزام کی تردید کی لیکن وہ اس قدر تند اور جھکی مزاج کا تھا کہ کوئی وکیل اس کے مقدمہ کی پیروی کرنے پر راضی نہ ہوتا تھا، بالآخر اس کے ہمنام دوست نے جو "تزک ولیم ہکے" کا مصنف بھی تھا اس کے مقدمہ کی پیروی کا بیڑہ اُٹھایا جسوقت وہ بحث کر رہا تھا، ہکے مجنونانہ انداز میں اُٹھ کھڑا ہوا اور چلا چلا کر کہنے لگا کہ اس وکیل کو کچھ نہیں آتا اور میں اپنے مقدمہ کی بحث اور پیروی خود کروں گا، اس سرعی ہیجان نے وکیل کو بہت صدمہ پہونچایا اور اُس نے مزید بحث اور پیروی سے انکار کر دیا۔ دوبارہ استدعا پر اس نے مقدمہ پھر اپنے ہاتھ میں لیا اور اپنے دوست کو بری کرا دیا۔

اپنی رہائی کے بعد ہکے نے کلکتہ میں ایک پریس قایم کیا اور سنہ ۱۷۸۰ء میں سب سے پہلا ہندوستانی اخبار بنگال گزٹ کے نام سے نکالا اس اخبار کے اب صرف دو نسخے موجود ہیں ایک وکٹوریہ میموریل کلکتہ میں ہے اور دوسرا برٹش میوزیم کے کتبخانہ میں۔ یہ اخبار ابتدا ہی سے بہت مقبول تھا اخبار ہندوستان میں بالکل ایک نئی چیز تھی اور اس لئے لوگ اس کا دلچسپی سے مطالعہ کرتے تھے، طنزیہ قصے اور کلکتہ کے مختلف اشخاص کو جو عرفیتیں دیجاتی تھیں پڑھنے والوں کی دلچسپی کو دوبالا کر دیتی تھیں۔

ایک شخص مسمی مسٹر ٹی ریٹا (Tiretta) پر جو کالے ہی کے تھے ان کی خود نمائی اور بیجا طمطراق کی وجہ سے سخت حملے ہوتے تھے اس زمانہ میں جب ہندوستان میں معدودے چند انگریز تھے گورنمنٹ ہاؤس کی

محفل رقص وسرود میں ہر شخص شریک ہوتا تھا، مسٹر ڈی ریٹا ایسے مواقع پر کبھی نہ چوکتے اگرچہ جون کا مہینہ اور دم گھٹنے والی رات ہی کیوں نہ ہوتی۔ یہ شخص موزوں قد وقامت کا تھا لیکن بدقسمتی سے ناک بہت بڑی تھی اخبار نے لکھا "نکلول" (Nosey jargon) نے سُرخ مخمل کے سوٹ میں اپنا سالانہ رقص دکھلایا" اس روز سے مسٹر ڈی ریٹا نکلول (Nosey jargon) کے نام سے پکارے جانے لگے۔

اس اخبار میں فحش حملے اور لوگوں کے متعلق بلاتفریق افترا پردازیاں ہونے لگیں اس کے اڈیٹر نے وارن ہسٹنگز پر بھی جو اسوقت گورنر جنرل تھا حملہ کرنے کی جرأت کی حکومت نے محسوس کیا کہ اس بڑھتی ہوئی وبا کا تدارک کرنا چاہئے اور سرکاری ڈاکخانہ سے اس اخبار کی اشاعت بند کردی پھر بھی اخبار کی اشاعت پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوا۔ کیونکہ حوالی کلکتہ میں بھی چپراسیوں کے ذریعہ اخبار پہونچانے کا انتظام کرلیا گیا آخر کار ہکی ایک مقدمہ کے سلسلہ میں گرفتار ہوگیا اور اُسے ہندوستان چھوڑنے کا حکم ہوا اس طرح وارن ہسٹنگز کے عہد حکومت میں اس اخبار کا گلا گھونٹ دیا گیا اور اس شرمناک طریقہ پر اس کا خاتمہ ہوگیا۔ گو اس جابرانہ طریقہ پر یہ اخبار بند کیا گیا تھا لیکن ابھی تک احتساب ونظارت نہیں قایم ہوئی تھی پریس کی کمزور ابتدا اور سُست نشوونما ابھی ان پابندیوں اور سختیوں کی متقاضی نہیں تھی۔

بنگال گزٹ کے امتناع نے مزید جرأت آزمائیوں کا سلسلہ بند نہیں کیا ۱۷۸۱ء سے ۱۸۵۷ء تک بہت سے انگریزی اخبار جاری ہوئے اِن اخبارات میں جو احاطہ بنگال میں اسوقت جاری تھے کلکتہ جرنل۔ بنگال ہرکارو جان بل کلکتہ کوریر۔ انگلشمین۔ ریفارمر اور فرنڈ آف انڈیا جس کی ادارت سیرام پور کے عیسائی مبلغین کرتے تھے قابل ذکر ہیں۔ ان اخباروں کے مالک و مدیر غیر سرکاری اشخاص تھے، حکومت بنگال کا اپنا ترجمان گورنمنٹ گزٹ الگ تھا دوسرے احاطوں بمبئی و مدارس کے اخباروں میں بمبئی ٹائمس بمبئی کوریر اور مدراس گزٹ قابل ذکر ہیں ان پُرانے اخبارات کے نسخے امپیریل لائبریری کلکتہ میں محفوظ ہیں اور مطالعہ کے لئے دلچسپ مواد فراہم کرتے ہیں صرف تھوڑے سے اشخاص کسی انگریزی اخبار کا چندہ دیسکتے تھے۔ جان بُل جیسے روزنامہ کا چندہ چونسٹھ روپیہ سالانہ اور آٹھ روپیہ ماہانہ ہوتا تھا۔ چار صفحات سے زیادہ پڑھنے کے قابل مواد نہ ہوتا تھا اور اس میں بھی زیادہ تر کلکتہ کے آس پاس کی خبریں درج ہوتی تھیں کبھی کبھی ایسٹ انڈیا کمپنی کی انتظامی پالیسی پر بھی رائے زنی ہوتی تھی اور گاہے گاہے انگریزی رسالوں اور جلوں کے اقتباسات بھی نکلتے رہتے تھے۔ یہ بیرونی انگریزی پرچے ان لوگوں کے پاس مستقل طور پر آتے رہتے تھے جو ان کے خریدنے کی استطاعت رکھتے تھے۔

اُنیسویں صدی کے اوایل میں اخبارات ذاتیات اور گالی گلوج میں بہت زیادہ حصہ لینے لگے ایک ڈیڑھ دوسرے اڈیٹر پر حملے کرتا تھا، اس وقت کے سب سے زیادہ مقبول اخبار کلکتہ جرنل نے معاصر اخبارات کے

محاسن و معائب پر رائے زنی کر کے اپنے سر مصیبت مول لی اور اپنی برائی اور فوقیت کا سکہ جمانا چاہا معاصر اخبارات کے اڈیٹروں نے جے ایس بکنگھم اڈیٹر کلکتہ جرنل کے خلاف نہایت گندہ اور فحش پروپگنڈا کرنا شروع کر دیا اس پر چار بیبیاں رکھنے کا الزام لگایا گیا اور مشہور تھا کہ اس کی ایک بیوی بمبئی پہونچ گئی ہے ریورنٹ برائس نے جو ایشیاٹک مرر کا اڈیٹر تھا بکنگھم پر نہایت بہیمانہ حملے کئے سنہ ۱۸۱۹ء میں کلکتہ جرنل نے اینگلیکن چرچ کی ایک میٹنگ کی کاروائی شایع کی اور اس سلسلہ میں کمپنی کے ایک کلرک مسمی ڈارول کا بھی حوالہ دیا اخبار کی اس معاندانہ نکتہ چینی نے ڈارول کو بہت صدمہ پہونچایا ایکروز شام کے وقت جب بکنگھم سیر و تفریح کے لئے جا رہا تھا اس سے ڈارول سے ملاقات ہوئی اس سے دریافت کیا گیا کہ کیا تم کلکتہ جرنل کے اڈیٹر ہو اس سوال کے ساتھ اس پر چند کوڑے بھی لگائے گئے بکنگھم نے اس کا جواب اپنی چابک سے دیا۔ ایک دوسرے موقع پر بکنگھم نے ایک شخص مسمی ڈاکٹر جیمسن کے بیک وقت تین عہدوں کے قبول کرنے پر شدید نکتہ چینی کی جیمسن کو یہ نکتہ چینی بہت ناگوار گزری اور اس نے اڈیٹر کو دویل (ڈیکلی) کی دعوت دی اس زمانہ میں (ڈیکلی) ڈوئل کا عام رواج تھا۔ ڈوئل سے انکار بزدلی کے مرادف خیال کیا جاتا تھا۔ درمیانی اشخاص نے معاملہ کو رفت و گزشت کرا دیا۔

ان حملوں اور جوابی حملوں کے علاوہ اخبار اشتہارات سے پُر ہوتے تھے ان اشتہاروں کا نرخ چار آنے فی سطر ہوتا تھا زیادہ تر نیلاموں اور قہوہ خانوں کے اشتہار ہوتے تھے جہاں ہر قسم کے فواکہات ملسکتے تھے یورپ سے آئی ہوئی نئی کتابوں کے بھی اشتہار دئے جاتے تھے کلیات بائرن گیمسٹر کے اعترافات اور ایک مجہول شخص کے اعترافات کے قسم کی کتابیں انگلش سوسائٹی میں بہت مقبول تھیں تھیٹر کی خبریں اور گھوڑ دوڑ کے اشتہار بہت نمایاں طور پر شایع کئے جاتے تھے۔ سال بھر لاٹریوں کا سلسلہ جاری رہتا اور لوگوں کے جوش و خروش کا باعث ہوتا تھا۔ اس کے اعلانات اخبارات کی خصوصیت تھے ان کے علاوہ زیادہ تر اشتہارات نقالی رقص اور ازدواجی رشتوں کے متعلق ہوتے تھے۔ یہ نقالی رقص نوجوانوں میں بہت عام تھا اور اکثر اس کا نتیجہ شادی کی صورت میں برآمد ہوتا تھا۔ ازدواجی رشتوں کے اشتہارات میں اس بات پر خاص طور پر زور دیا جاتا تھا کہ لڑکی کو کسی قسم کی جگر کی بیماری نہ ہو۔

اخباری پریس کی تاریخ میں ایک بات خاص طور پر یاد رکھنے کے قابل ہے ہندوستان کے انگریز صحافت نگار اپنے انگلستانی معاصرین کے نقش قدم پر چل رہے تھے انگلستان کا پریس جماعتی حملوں کا شکار ہو چکا تھا انیسویں صدی کے اوایل کے اخباروں کے افتتاحیہ مقالے دنگ اور توڑ، جھگڑوں سے پر نظر آتے ہیں۔ اڈیٹروں کی باہمی جنگ اکثر اخباروں کے افتتاحیوں سے آگے بڑھکر عدالت کے اکھاڑوں تک پہونچ جاتی تھی بیشتر اوقات "ڈوال" سے کام لیا جاتا سنہ ۱۸۲۱ء میں "لندن میگزین" اور "بلیک ڈڈ میگزین" کے اڈیٹروں کے درمیان ایک

یادگار "ڈول" لڑا گیا اخبار نویس خواہ وہ کسی جماعت کے حامی ہوتے، کسی حالت میں بھی محفوظ و مامون نہ تھے۔

یقیناً انگلستان میں بمقابلہ ہندوستان کے بہت زیادہ اخبار نکل رہے تھے اُنیسویں صدی کے ابتدائی تیس سال میں ہندوستان میں تیس اخبار سے زیادہ کا وجود نہ تھا برخلاف اس کے برطانیہ میں دوسو چون اخبار جاری تھے اور ان میں سے بعض کی صبح و شام دونوں وقت اشاعت ہوتی تھی، ہندوستان میں چندے اور ڈاک کے محصولات کی زیادتی کی بناء پر بہت کم لوگ مستقل طور پر اخبار خریدتے تھے اس کے برخلاف انگلستان میں ایک ایک اخبار کی اشاعت ہزاروں تک پہونچ گئی تھی۔

اس طرح انگریزی سوسائٹی سے ہندوستان اور اس کے باشندوں نے ایک نیا ادارہ حاصل کیا، ہندوستانیوں نے بھی ایسے آلہ سے فایدہ اُٹھانے میں کوتاہی نہیں کی جو ان کے خیالات اور شکایات کی ترجمانی کرے اس وقت کلکتہ میں ہندوستانیوں کا ایک بڑھتا ہوا گروہ تھا جس کو مغربی تعلیم سے بہت دلچسپی پیدا ہوگئی تھی۔ صدی کے ابتدائی بیس سال کے اندر بعض سربرآوردہ ہندوستانیوں اور انگریزوں کی کوششوں سے ودالیہ یا اینگلو انڈین کالج قایم ہوچکا تھا۔ مسٹر ڈیوڈ ہیر اور راجہ رام موہن رائے دونوں جماعتوں کے سرگروہ تھے ایسٹ انڈیا کمپنی بھی ہندوستانیوں کی تعلیم میں دلچسپی لینے لگی تھی اٹھارہ سو تیرہ عیسوی کے چارٹر ایکٹ کی اُس دفعہ کو جس میں ہندوستانیوں کی تعلیم کے لئے ایک لاکھ روپیہ سالانہ کی منظوری تھی عرصہ سے معرضِ التوا میں ڈال رکھا گیا تھا، اس حقیقت کے پیشِ نظر کہ مشنریوں نے ہندوستانیوں کی تعلیم کے لئے اسکول اور درسگاہیں قایم کرنا شروع کردی تھیں اور خود کمپنی اپنے بڑھتے ہوئے حدود اختیار کی بناء پر تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کی خدمات حاصل کرنے کی خواہشمند تھی، حکومت کی جانب سے ہندوستانیوں کی تعلیم کے متعلق کوئی مستقل طرزِ عمل اختیار کرنے میں کسی قسم کی تعویق برداشت نہ کی جاسکتی تھی، انگریز افسروں کی اکثریت اور ترقی پسند ہندوستانیوں کا گروہ انگریزی کو عدالتی زبان بنانے کے لئے بہت زور دے رہا تھا جیسا کہ بالآخر ۱۸۳۵ء میں ہوا۔ یہ ایک بالکل فطری اور قدرتی امر تھا کہ جس وقت ایسی تبدیلیاں رونما ہورہی تھیں اور تعلیم کے لئے اس قدر آسانیاں بہم پہونچائی جارہی تھیں اہلِ ہند صحافت کی طرف مایل ہوجاتے۔ سب سے پہلا ہندوستانی اخبار "درپن" تھا۔ لیکن اس کی ادارت سیرام پور کے عیسائی مبلغین کے ہاتھ میں تھی۔ اور اس لئے اس کو خالص ہندوستانی پرچہ نہیں کہہ سکتے۔ ۲۳ مئی ۱۸۱۸ء کو اسکا آغاز ہوا اور لارڈ ہسٹنگز نے جو اسوقت گورنر جنرل تھا اس کی نشو و نما اور ترقی میں بڑی مدد دی اس نے ہندوستانی پریس کی نشو و نما میں بڑی دلچسپی لی اور ان لوگوں کے خیالی خطرات سے متاثر نہ ہوا جو ایک آزاد ہندوستانی پریس کی موجودگی کو بہت مخدوش سمجھتے تھے، لیکن ہندوستانی صحافت کے پہلے رہنما راجہ رام موہن رائے تھے وہ اپنے

وقت کے سب سے بڑے ہندوستانی تھے اور ان کو بجا طور پر ہندوستانی قومیت کا بانی کہہ سکتے ہیں، سنہ ۱۸۲۱ء میں کلکتہ جرنل کی ایک اشاعت میں ہفتہ وار بنگالی پرچہ "سمبد کومودی" (Sumbad Kaumudi) کا کیفیت نامہ نکلا مس اس ڈی کالٹ (S. D. Collett) نے راجہ رام موہن رائے کی سوانحعمری میں اس اخبار کے متعلق لکھا ہے کہ "یہ ایک خالص ہندوستانی پرچہ تھا جس کو مقامی باشندے مقامی زبان میں نکالتے تھے" اس اخبار کو ہندوستانی (ورناکیولر) اخباروں کا پیشرو اور راجہ موصوف کو ان کا بانی کہنا چاہیے۔ اس اخبار کے دوش بدوش اور بھی کئی بنگالی اخبار نکلنا شروع ہوئے ان اخباروں میں اقتصادی ادبی اور سیاسی مضامین کی بھرمار ہوتی تھی۔ سمبد کومودی کی ایک اشاعت میں کلکتہ کے مجسٹریٹوں کے نام ایک اپیل بھی شایع کی گئی تھی جس میں ان سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ کلکتہ کے ہندو باشندگان کی جان کی حفاظت کے لئے عیسائی عمال کی بے لاگ گاڑیبانی کے انسداد کے لئے سخت ترین قوانین مرتب کریں جو نہایت لاپروائی سے اپنی گاڑیاں بھگاتے ہیں اور بلا امتیاز عمر و جنس راہگیروں پر منہ چلاتے ہیں۔

راجہ رام موہن رائے نے سنہ ۱۸۲۲ء میں ایک فارسی ہفتہ وار نکالا اور اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد ایک برہمنی میگزین جاری کیا۔ راجہ موصوف غیر متعصب "وسیع النظر" جماعت کے سرگروہ تھے اور ان ترجمانوں (آرگن) کے ذریعہ ہندو سماج کی خرابیوں پر نکتہ چینی کرتے تھے۔ اسوقت بنگال میں ستی کا عام رواج تھا راجہ ممدوح اور انکے ہمشرب اس کے نہایت پرجوش مخالف تھے لیکن متعصب اور تنگ نظر گروہ اکثریت میں تھا اور ترقی پسندوں کی مخالفت میں انھوں نے اپنا ترجمان "چندریکا" نکالا جو اسوقت کے تمام ہندو مذہبی اداروں کا علمبردار تھا۔ ان کی دیکھا دیکھی اور بھی بہت سے اخبار وجود میں آئے سنہ ۱۸۳۰ء میں صرف کلکتہ سے سولہ اخبار نکل رہے تھے دوسرے احاطوں اور کے صوبہ متحدہ میں جو اس وقت نشیبی صوبہ کہلاتا تھا (لوور پراونس) بھی صحافتی جرات آزمائیاں شروع ہو گئی تھیں۔

ہندوستانی (ورناکیولر) اخبارات نہایت آزادی کے ساتھ ہر مسئلہ پر اظہار رائے کرتے تھے یہاں تک کہ برطانیہ کی یورپی پالیسی پر بھی نکتہ چینی کرنے سے باز نہ آتے تھے اور کمپنی کی ہندوستانیوں کے ساتھ بدسلوکی کا نہایت طنزیہ طریقہ پر اعادہ کیا جاتا تھا۔ اس قسم کے مقالات سے انگریزوں کے احساسات کو چوٹ لگتی تھی اس لئے انکی یہ بے لگامی عرصہ تک جاری نہ رہ سکتی تھی انگلستان کا توری پریس، ہندوستانی پریس کی آزادی سلب کرنے کے لئے سب سے زیادہ ہنگامہ برپا کئے ہوئے تھا۔ اب ہم تاریخ صحافت و اخبار نویسی کے سب سے زیادہ اہم دور کے مطالعہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ یعنے احتساب و نظارت کا قیام۔

سنہ ۱۹۰۷ء کے قبل ہندوستانی پریس انگلستان کے قانون اہانت کے علاوہ کسی اور قانون کے ماتحت نہ تھا اس طرح ہندوستانی پریس انگریزی پریس کے ہمسطح تھا۔

گورنر جنرل "اجازت نامہ" ضبط کرسکتا تھا اس لئے نہیں کہ کمپنی کے حدود اقتدار میں پریس نہ چلایا جاسکے بلکہ اس لئے کہ کون انگریز ہندوستان میں سکونت پذیر ہے۔ انگریزوں کو ہندوستان میں سکونت کے لئے "اجازت نامہ" کی ضرورت ہوتی تھی اور کسی قابل اعتراض حرکت کی پاداش میں ہندوستان بدر کئے جاسکتے تھے۔ ہکے کے گزٹ کے امتناع و ضبطی میں اسی حربہ سے کام لیا گیا تھا اور اس کے اڈیٹر کو مجبوراً ہندوستان چھوڑنا پڑا تھا۔ سنہ ۱۷۹۱ء اور سنہ ۱۷۹۸ء کے درمیانی وقفہ میں عسکری واقعات پر نکتہ چینی کرنے کے جرم میں دو اڈیٹروں کی شدید گوشمالی ہوئی اور ایک فوجی افسر جو کپتانی کے عہدہ پر فایز تھا انگلستان واپس کردیا گیا اس کا جرم یہ تھا کہ اُس نے فوجی ملازمین کے نام ایک نہایت اشتعال انگیز پیغام شایع کیا تھا۔ سنہ ۱۷۹۵ء میں ایک شخص مسمی مسٹر میکلین صرف اس جُرم میں ہندوستان سے نکالا گیا کہ اس نے ایکسنج پر شدید نکتہ چینی کی تھی۔ کمپنی کے بعض برہم ملازمین نے ان ہی اخبارات میں اپنے غم و غصہ کا اظہار شروع کردیا تھا یہ "اقتدار اعلیٰ" کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ اب کمپنی کا سیادتی اقتدار بڑھتا جارہا تھا اور اسکے انتظامی شعبہ کے متعلق بے لگام نکتہ چینی کسی طرح برداشت نہ کی جاسکتی تھی کمپنی کو خوف تھا کہ ان حملوں سے پبلک کی نگاہوں میں اس کی وقعت کم ہوجائے گی۔

لارڈ ولزلی نے اخبارات کے لئے نہایت سخت قوانین مرتب کئے اور ان کی نگرانی کے لئے احتساب و نظارت قایم کیا ان قاعدوں کی رو سے ہر اڈیٹر اخبار کے نیچے اپنا نام لکھنے پر مجبور تھا اسکے لئے ضروری تھا اپنے نام و پتہ سے گورنمنٹ کو باخبر رکھے، اتوار کے دن کوئی اخبار نہ نکلتا تھا، ان قواعد کی خلاف ورزی اور نظارت کے احکام کی عدم پابندی کی پاداش میں اجازت نامہ ضبط کرلیا جاتا تھا، ان پابندیوں سے انگلستان کی برسرِ اقتدار جماعت کے رویہ کا اندازہ ہوتا ہے اس وقت وہاں ٹوری جماعت برسرِ اقتدار تھی۔ اور اس کو ہندوستان میں آزاد پریس کی ترقی سخت ناپسند تھی۔ اس کا عقیدہ تھا کہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کا قیام ہندوستانی عوام کی جہالت اور حکام کے اعمال کی علانیہ نکتہ چینی کی بندش ان دو ستونوں پر قایم ہے۔ سنہ ۱۸۰۱ء میں حکومت بنگال کے حکم سے ایک سرکاری پریس قایم کرنے اور ایک سرکاری اخبار کا خاکہ (پلان) طیار کیا گیا آخرالامر پریس قایم ہوا اور اخبار کا نام گورنمنٹ گزٹ رکھا گیا یہ کارروائی اسوقت کے اخبارات کی مخالفانہ نکتہ چینی کے رد کرنے کے لئے کی گئی تھی۔

سنہ ۱۸۰۱ء اور اس کے بعد وقتاً فوقتاً پریس کی آزادی سلب کرنے کے لئے مختلف ضابطے اور قاعدے بنتے رہے، عسکری احکامات اور جنگ کی خبریں اسوقت سے شایع ہونا بند ہوگئیں سنہ ۱۸۱۱ء میں پریسوں کے مالکوں کو اخبارات میں اپنا نام لکھنے کا حکم ہوا۔ سنہ ۱۸۱۳ء میں مزید قیود اور پابندیاں بڑھادی گئیں اخبارات اور ان کے ضمیموں کے تمام مسودوں کا چیف سکریٹری (معتمد خصوصی) کی نظر ثانی کے لئے پیش ہونا لازمی قرار دیا گیا

دستی اشتہارات و نوٹسوں کے مسودے بھی نظرثانی کے بغیر شایع نہ ہوسکتے تھے۔ سابق قاعدے اور قانون بدستور اپنی جگہ پر تھے بلکہ اب ان پر پہلے سے زیادہ عملدرآمد ہونے لگا تھا مسمی مسٹر ایڈمس (Adams) جو اسوقت احتساب و نظارت کے عہدہ پر فایز تھا، ٹوری رائے کا نہایت بیباک حامی تھا اس کی سختی کے ساتھ یہ رائے تھی کہ پریس کو پوری قوت کے ساتھ قابو میں رکھنا چاہیئے پریس کے احتساب و نظارت کی تاریخ میں اس کا بہت بڑا حصہ ہے۔

بمبئی اور مدراس کے احاطوں نے پریس کے قوانین کے لئے بھی بنگال کی خوشہ چینی کی جیسا کہ اس سے قبل وہ اور امور میں کیا کرتے تھے۔ مذکورۂ بالا احاطوں میں پریس سے متعلق بنگال ہی کے ایسی پابندیاں رائج تھیں۔ اڈیٹروں کو اکثر تنبیہ کی جاتی تھی اور بعضوں کو ہندوستان سے نکال بھی دیا جاتا تھا۔

مارکوئس آف ہسٹنگز نے جو سنہ ۱۸۱۳ء سے سنہ ۱۸۲۳ء تک کمپنی کے سیاہ و سپید کا مالک تھا نظارت و احتساب کو سنہ ۱۸۱۸ء ہی میں منسوخ کردیا اس کا خیال تھا کہ ایک آزاد پریس اچھی حکومت کے حق میں بہت حد تک ممد و معاون ثابت ہوگا کمپنی کی حکومت کا سب سے بڑا عیب اس کے عمال کی سستی و کاہلی تھی ایک شخص مسمی اسٹین ہوپ نے اپنے رسالہ ہندوستان میں "برطانوی پریس کے اثرات" میں لکھا ہے "حکومت مدراس کو معتمد عسکری سے کسی معمولی مراسلہ کا جواب حاصل کرنے میں اُسی قدر کاغذ روشنائی اور وقت صرف کرنا پڑتا تھا جتنا کہ لارڈ چانسلر کی عدالت کے کسی بہت بڑے مقدمہ کے تصفیہ میں ہوتا ہے"۔ پریس کی نکتہ چینی اور اعتراض سے معاملہ میں عجلت ہوسکتی تھی اس کے علاوہ ہسٹنگز کا ایک خیال اور بھی تھا۔ اسوقت تک یہ بے قاعدگی تھی کہ ہندوستانی اپنے قلم کو آزادی کے ساتھ استعمال کرسکتے تھے کیونکہ ان کو ملک بدر کئے جانے کا کوئی خوف نہ تھا اور ان کو ہندوستان میں رہنے کے لئے اجازت نامہ حاصل کرنے کی ضرورت نہ ہوتی تھی۔ اگرچہ پریس کو آزادی حاصل ہوگئی تھی تاہم اس کے معنی یہ ہرگز نہ تھے کہ جملہ قیود و پابندیاں ہٹادی گئی تھیں چند قاعدے ایسے بنادئے گئے تھے جن کی پابندی ہر اڈیٹر کے لئے لازمی تھی۔

نمبر ۱۔ کورٹ آف ڈائرکٹرس کی کارروائی گورنر جنرل کے احکام کونسل کے ممبر اور جج گستاخانہ و بےباکانہ نکتہ چینی سے بالاتر تھے۔ نمبر ۲ فضیحت آمیز واقعات اور ذاتیات بالکل ممنوع تھی نمبر ۳ ہندوستانیوں کے احساسات کا پاس و لحاظ لازمی تھا نمبر ۴۔ بیرونی رسالوں کے ایسے اقتباسات کا شیوع ممنوع قرار دیا گیا جن سے تنفر اور خوف و ہراس پیدا ہو۔

ان قوانین کے نفاذ سے پہلے عدالت عالیہ (سپریم کورٹ) میں انکی رجسٹری لازمی تھی۔

کورٹ آف ڈائرکٹرس کو لارڈ ہسٹنگز کا یہ اقدام پسند نہ آیا اور وہ لارڈ موصوف کے احکامات کو منسوخ کراکے از سر نو نظارت و احتساب قایم کرانا چاہتے تھے۔ چنانچہ ایک سرکاری مراسلہ کا مسودہ بھی طیار کیا گیا اور ۷ اپریل سنہ ۱۸۲۰ء کو وہ مراسلہ بورڈ آف کنٹرول کو اسواسطے ارسال کیا گیا کہ وہ اُس میں تحریر کردہ معروضات کے مطابق گورنر جنرل کے نام احکامات صادر کردے لیکن بورڈ مذکور نے اس کی تعمیل نہیں کی۔ جس سال نظارت و احتساب منسوخ کیا گیا کلکتہ

سے ایک اخبار کلکتہ جرنل نامی نکالا گیا اس کا مدیر ایک شخص مسمی مسٹر جے اس بکنگھم تھا۔ جس کا اوپر ذکر آچکا ہے احتساب ونظارت کی تاریخ میں جو حصہ اخبار مذکور اور اس کے مدیر نے لیا قابل یادگار ہے احتساب ونظارت کی منسوخی پر تمام احاطوں میں اظہار مسرت کیا گیا اگرچہ مدراس میں اسوقت بھی اس کا نفاذ تھا کلکتہ جرنل کے افتتاحی مقالوں میں گورنر جنرل کی خدمت میں ہدیہ تبریک پیش کیا گیا اور حکومت مدراس کے رویہ کی سخت مذمت کی گئی یہ اخبار ابتدا ہی سے بہت مقبول ہوگیا اور اس نے نہایت جرأت آموز رویہ اختیار کیا۔ اخبار کا کافی حصہ انفرادی، شکایات کے رفع کرنے کے لئے وقف تھا حکومت کے مختلف احکامات پر نکتہ چینی کرنے کے لئے تعداد میں مراسلے نکلنے لگے۔ ایک شخص مسمی کرنل رابنسن (Col: Robinson) نے جس نے اپنا اخباری نام "سیموئل سوبر سائیڈس" (Samuel Sober Sides) رکھ لیا تھا اشتعال انگیز مراسلات کا ایک سلسلہ شایع کیا جس کی پاداش میں اس کو اپنی فوجی ملازمت سے استعفا دیکر انگلستان واپس جانا پڑا اخبار کے اڈیٹر کو اس قسم کے مراسلات چھاپنے کی معذرت کرنی پڑی۔

مسٹر جے۔ اس بکنگھم نے اپنے سر دوسری مصیبت یہ لی کہ مسٹر ایلیٹ کی مدراس کی گورنری کی خبر کو چوڑے سیاہ حاشیہ کے ساتھ شایع کیا گویا یہ امر عمومی ماتم کا باعث تھا مدراس گورنمنٹ نے اس پر شدید نکتہ چینی کی اور حکومت بنگال نے بکنگھم کو معافی مانگنے پر مجبور کیا کلکتہ جرنل حکومت کی ہمدردی سے محروم ہوگیا مسٹر ایڈمس جو چیف سکریٹری کی حیثیت سے نظارت اور احتساب کے فرایض بھی انجام دیتے تھے جو اب سنیر ممبر کے مرتبہ پر پہونچ گئے تھے اس اخبار کے جانی دشمن تھے۔ سنہ ۱۸۲۳ء میں لارڈ ہسٹنگز اپنے عہدے سے سبکدوش ہوگئے اور ان کے منتخب جانشین لارڈ ام ہرسٹ کے پہونچنے تک گورنر جنرلی کے تمام فرایض بوجہ کونسل کے سنیر ممبر ہونے کے مسٹر ایڈمس کے سپرد ہوئے مسٹر ایڈمس نے اپنے عہدہ کی باگ ہاتھ میں لیتے ہی ایک شخص مسمی ریورنٹ ڈاکٹر برائس کا جس کا ذکر ایشیاٹک مرر کی ادارت اور بکنگھم کے سلسلہ میں آچکا ہے بحیثیت اسٹیشنری فراہم کرنے والی کمیٹی کے کلرک کا انتخاب کیا اس تقرر کا اعلان گورنمنٹ گزٹ کی ایک غیر معمولی اشاعت میں ہوا۔ یہ غیر معمولی اقدام تھا اور کلکتہ جرنل کے اڈیٹر نے اپنی اشاعت مورخہ ۸ فروری سنہ ۱۸۲۳ء میں اس پر نہایت طنزیہ رائے زنی کی اس مقالہ نے قائم مقام گورنر جنرل کو بہت مشتعل کر دیا اور ۱۲ فروری سنہ ۱۸۲۳ء کو مسٹر بکنگھم کا اجازت نامہ ضبط کر لیا گیا اور ان کو انگلستان واپس کر دیا گیا۔ یہ غیر متوقع مصیبت تھی اخبار مذکور کے کافی خریدار تھے اور مسٹر بکنگھم کا کام بھی بہت فروغ پر تھا اس کو اپنا کاروبار اپنے ایک ماتحت کے سپرد کر کے ہمیشہ کے لئے ہندوستان کو خیرباد کہنا پڑا کچھ عرصہ تک اخبار جاری رہا لیکن دوسرے اڈیٹر پر بھی عرصۂ حیات تنگ ہوگیا اور اس کے چلے جانے کے بعد پرچہ بند ہوگیا مسٹر بکنگھم کی مالی حالت بالکل خراب ہوگئی اس نے پریوی کونسل میں اپنے معاملہ کے متعلق ایک غیر جانبدارانہ تحقیقات کی درخواست دی کمیٹی مقرر ہوئی اور اس کی سفارشوں کی بموجب مسٹر بکنگھم کے نقصان کی تلافی بھی کر دی گئی، لیکن ہندوستان کی واپسی کی درخواست منظور نہ ہوئی۔

ایڈمس کی گورنمنٹ نے پریس کی آزادی کو محدود کرنے کے لئے مزید قاعدے بنائے لیکن نفاذ سے قبل انکی عدالت عالیہ (سپریم کورٹ) میں رجسٹری ہونا لازمی تھی سر فرانسس میکناٹن نے جو اسوقت تنہا قایم مقام جج تھے. شاکی جماعت کو اپنا محضر نامہ (میموریل) پیش کرنکی اجازت دی. معترضین میں پیش پیش راجہ رام موہن رائے تھے، دو عرضداشتیں پیش کی گئیں، دوسری عرضداشت کو جو بالعموم راجہ موصوف کے زورِ قلم کا نتیجہ سمجھی جاتی تھی مس کالیٹ نے ہندوستانی تاریخ کے ''ایریو پیگی ٹیکا'' کے نام سے موسوم کیا ہے سر فرانسس نے جدید قواعد کی تائید کی اور معترضین کے خلاف فیصلہ دیا۔ راجہ ممدوح اور اُن کے حلیفوں نے شاہی دربار میں اپیل کی ان کا اپیل انگریزی مضمون نویسی کا ایک نادر نمونہ تھا لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا، راجہ رام موہن رائے نے احتجاجی طور پر ''مراۃ الاخبار'' کی ادارت بند کردی ان کا یہ اقدام کلکتہ کے انگریزوں کو بہت ناگوار معلوم ہوا۔

لارڈ ام ہرسٹ نے حکومت کی باگڈور ہاتھ میں لیتے ہی کمپنی کے ملازمین کو پبلک پریس سے کسی قسم کا تعلق رکھنے کی ممانعت کردی لارڈ موصوف کے ہندوستان سے چلے جانے کے بعد ان کے جانشین لارڈ ولیم بنٹنک نے بھی وہی مروجہ طرزِ عمل اختیار کیا پریس کی آزادی اس سے زیادہ کبھی سلب نہیں ہوئی بنٹنک کے مالی ضابطوں اور بالخصوص ''نصف بھتے'' کی منسوخی نے فوجیوں میں سخت غم وغصہ اور اشتعال پیدا کردیا۔ مقالات کی بھرمار شروع ہوگئی اور بالآخر حکومت کو اُسے زبردستی بند کرنا پڑا گورنر جنرل نے تمام اخبارات کے نام احکامات صادر کردئے کہ ''بھتے'' کے مسئلہ پر مزید مضامین نہ قبول کئے جائیں کلکتہ جرنل کی ضبطی سے اڈیٹروں کی آنکھیں کھل چکی تھیں اور اس موضوع پر مزید مضامین نہیں نکلے۔

۱۸۳۵ء میں بنٹنک کی جگہ سر چارلس مٹکاف گورنر جنرل ہوا، پریس کی آزادی کی تاریخ میں اس کا نام خاص طور پر قابل یادگار ہے اس نے احتساب ونظارت کو یکقلم منسوخ کردیا اس خیال کا موجد لارڈ میکالے تھا جو ہندوستان میں گورنر جنرل کی کونسل کا سب سے پہلا مشیر قانونی (لاممبر) ہوکر آیا اور سر چارلس مٹکاف نے اس کو عملی جامہ پہنایا اس واقعہ کی یادگار منانے کے لئے کلکتہ میں ایک عظیم الشان ہال طیار کرایا گیا اور اس کا نام ''مٹکاف ہال'' رکھا گیا۔

کورٹ آف ڈائرکٹرس نے اس اقدام کو بہت ناپسند کیا گورنر جنرل کی کونسل کے بعض ممبروں کو شدید بدگمانیاں تھیں، انگلستان میں دارالعوام کی رائے بھی ایسے اقدام کے قطعاً مخالف تھی۔ ۱۸۱۱ء میں ایوان مذکور میں ہندوستانی پریس کی آزادی کے لئے بہت پرزور تقریریں ہوئی تھیں لیکن اب حالات بالکل بدل چکے تھے انگریزوں کو اپنے سامراجی مفاد ایک محکوم ملک میں آزاد پریس کے قیام کی بے آہنگی کا شعور بڑھتا جارہا تھا آزاد پریس اور آزادی لازم وملزوم چیزیں خیال کی جاتی تھیں۔

۱۸۵۷ء تک پریس آزاد رہے اس تاریخی سال میں ہندوستان کے افق پر بدامنی اور خوف وہراس کے

بادل چھانے لگے فوجوں میں بغاوت شروع ہوگئی اور حکومت نے خطرات کی بو باس پاتے ہی پریس کو قابو میں لانے کے لئے فوری اقدامات شروع کردئے۔

۱۸۵۷ء کے ایکٹ ۱۵ نے بغیر لائسنس حاصل کئے ہوئے پریس کے قیام و استعمال کو ممنوع قرار دیدیا حکومت اجازت نامہ دینے میں اختیاراتِ تمیزی سے کام لیتی تھی حکومت کو حق تھا کہ جسوقت بھی وہ چاہے اجازت نامہ منسوخ کردے اخباروں کی اشاعت کتابیں یا کسی قسم کی اشتعال انگیز تحریر ممنوع قرار دیجا سکتی تھی۔ یہ ایکٹ ہندوستانی (ورناکیولر) اور انگریزی دونوں پریسوں کے لئے تھا یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ابتک ہندوستانی (ورناکیولر) اور انگریزی پریس میں کوئی امتیاز نہیں تھا ۱۸۳۵ء کے ایکٹ سے پریسوں کو جو آزادی ملی تھی وہ دونوں کے لئے یکساں تھی اسی طرح جب آزادی چھین لی گئی تب بھی دونوں یکساں طور پر متاثر ہوئے۔

پریس کی تاریخ اپنی اوایل عمر میں واقعات اور حادثات سے خالی تھی اسکے سنِ شعور کے پہونچنے تک اسمیں گوناگونیت اور مد و جزر پیدا ہونے لگا۔ لیکن اسوقت یہ دور ہمارے موضوع سے خارج ہے۔

ذیل میں غیر آئینی دور کے ان احکام و قوام کا ضمیمہ درج ہے جو اخبارات کے متعلق وقتاً فوقتاً وضع ہوتے رہے

نمبر شمار	سال عیسوی و نام گورنر جنرل	قانون یا حکم	مقصد	اسباب جن میں حکم صادر ہوا یا قانون وضع کیا گیا	کیفیت
(۱)	۱۷۷۲-۸۶ لارڈ ہیسٹنگز	اجازت نامہ	اجراء اخبار	۱۷۷۳ء میں بروئے ریگولیشن ایکٹ گورنر جنرل و عدالت العالیہ کا تقرر ہوا۔ اس کے سات برس کے بعد حکومت نے اپنا گزٹ شایع کیا و نیز دو اردو اخبارات انگریزوں نے جاری کئے۔ کوئی خاص حکم یا قانون نہ تھا۔ +	(۱) گورنمنٹ بنگال گزٹ ۱۷۸۰ (۲) ، کلکتہ گزٹ ۱۷۸۴ (۳) ہکی گزٹ ۱۷۸۰ یہ دو برس کے بعد بند ہوگیا۔ (۴) [illegible] ٹائمس ۱۷۸۵
(۲)	۱۷۸۶-۹۳ کارنوالس	″	″		(۱) بمبئی ہیرلڈ ۱۷۸۹ء و بمبئی کوریر ۱۷۹۰ء ---

نمبر شمار	سال عیسوی و نام گورنر جنرل	قانون یا حکم	مقصد	اسباب جن میں حکم صادر ہوا یا قانون وضع کیا گیا	کیفیت
(۳)	۱۷۹۳-۹۸ سر جان شور	احکام	ہر اخبار سرکاری طور پر پہلے معائنہ ہولیتا تھا تب شایع کیا جاسکتا تھا بصورت خلاف ورزی سزا جلاوطنی تھی۔	اسوقت تک کوئی اخبار ملکی زبان میں جاری نہ تھا اور نہ کسی ہندوستانی نے کوئی اخبار جاری کیا تھا۔ مگر متعدد اہالیانِ مغرب اخبارات جاری کر رہے تھے۔ انگریزوں کے سامنے اس زمانہ میں دو بہت بڑی مہمیں	۱۷۹۱-۹۹ء تک متعدد انگریز و اہل یورپ ہندوستان سے بدر کر دئے گئے کسی سرکاری عملہ یا ملازم کے متعلق کوئی تنقید یا اعتراض جرم سمجھا جاتا تھا۔ بغیر کسی باضابطہ مقدمہ کے سزائیں دیجاتی تھیں۔
(۴)	۱۷۹۹-۱۸۰۴ ولزلی	〃	〃	تھیں (۱) نپولین ہندوستان پر حملہ کرنے کا ارادہ کر رہا تھا ٹیپو سلطان و افغانستان سے نپولین کی اعانت کے خطرات تھے جو ۱۷۹۹ء میں کم ہوئے۔ (۲) تیسری مرتبہ جنگ بھی چھڑ گئی تھی جو ۱۸۰۲ء میں ختم ہوئی	
(۵)	۱۸۱۸-۱۸۲۳ مارکوئیس ہیسٹنگ	〃	سر جان شور و ولزلی کے زمانہ میں جو سخت قوانین تھے وہ منسوخ کردئے گئے۔	نپولین کی شکست واٹرلو ۱۸۱۵ء کے بعد کوئی بیرونی حملہ کا خدشہ باقی نہیں رہگیا تھا اور ہندوستانیوں سے کسی قسم کا خطرہ اسوقت تک نہیں تھا، اس لئے اب ولزلی کے وضع کردہ قوانین کی ضرورت نہ تھی۔	(۱) ۱۸۱۸ء بنگالی زبان میں سب سے پہلا اخبار سماچار درپن جاری ہوا جسکی ادارت ایک مسیحی مشنری کے ہاتھوں میں تھی مقام اشاعت سیرام پور۔ (۲) ۱۸۲۲ء میں سب سے پہلا ہندوستانی اخبار ایک ہندوستانی کی زیر ادارت بمبئی سماچار نامی بمبئی سے جاری ہوا۔ متعدد دیگر انگریزوں نے بھی اخبارات جاری کئے۔

نمبر شمار	سال عیسوی و نام گورنر جنرل	قانون یا حکم	مقصد	اسباب جنہیں حکم صادر ہوا یا قانون وضع کیا گیا	کیفیت
(۶)	۱۸۲۰ ایڈم	خاص حکم	سلک بکنگھم نامی ایک سولین نے اپنے مضامین میں حکومت پر اعتراض کئے	مخض کو سزا دینے کے لحاظ حکم صادر ہوا اور وہ ملک بدر کر دیا گیا۔	ایڈم نے چند مہینوں تک بحالت غیر موجودگی لارڈ ہیسٹنگس کی قایم مقامی کی تھی۔
(۷)	۱۸۲۳ - ۲۸ لارڈ ایمہرسٹ	احکام	ہسٹنگس کے قوانین و احکام کی تقلید		
(۸)	۱۸۲۸ - ۳۴ ولیم بنٹنک	″		چونکہ اس دور حکومت میں کوئی بیرونی جنگ بدامنی نہ تھی اسلئے ملکی اصلاح کی جانب توجہ مبذول ہوگئی اس زمانہ میں اکثر درشت قوانین منسوخ کئے گئے	سنہ ۱۸۳۳ء میں لارڈ بنٹنک پہلے گورنر جنرل ہندوستان کے تسلیم کئے گئے اور بغرض مشورہ ایک کونسل قایم کی گئی۔
(۹)	۱۸۳۵ لارڈ میٹکاف	″	اخبارات و مطابع کیلئے نہایت ہمت افزا احکام صادر ہوئے	یہ دور مطابع کیلئے دور آزادی کہا جاتا ہے ایکسال کے دور حکومت میں میٹکاف نے اکثر اصلاحات کی کوششیں کیں	سنہ ۱۸۳۵ء میں بمبئی ٹائمس جاری ہوا
(۱۰)	....	....	....	....	۱۸۳۵ - ۵۷ تک کوئی خاص حکم یا قانون مطابع یا اخبار کے متعلق جاری نہیں ہوئے لارڈ میٹکاف کی ہمت افزائی کا یہ نتیجہ ہوا کہ تقریباً تمام بڑے شہروں میں مثلاً دہلی آگرہ دکو لیار و لاہور میں اخبارات جاری ہوگئے۔ پریس کے متعلق پہلا قانون تھا جو حکومت نے جاری کیا۔ اسکے پہلے محض احکام و ریگولیشن سے کام لیا گیا۔ گیگنگ ایکٹ صرف ایکسال تک جاری رہا پھر منسوخ کر دیا گیا۔ غدر کے بعد انگریزوں نے جو سزا دہی کی صورتیں اختیار کیں وہ اسدرجہ عبرت انگیز تھیں کہ مدتوں ہندوستانیوں کے دلوں پر ان کا رعب و خوف قایم رہا۔ بعد اختتام غدر ہندو اور مسلمان اخبارات میں اس امر کا مقابلہ رہا کہ کون حکومت کا زیادہ وفادار اور کاسہ لیس ہے اسلئے کسی خاص قانون کی مدتوں ضرورت محسوس نہیں ہوئی
(۱۱)	۱۸۵۸ لارڈ کیننگ	گیگنگ ایکٹ	زبان بندی	غدر ۱۸۵۷ء میں سرکار کو ضرورت محسوس ہوئی کہ عوام میں اخبارات و رسائل باغیانہ مضامین نہ اشاعت کریں اس لئے یہ قانون جاری کیا گیا۔	

(نوٹ) نمبر ۱ ضمیمہ اصل مضمون میں نہیں تھا۔ میں نے اس کو ذاتی محنت و تلاش سے فراہم کیا ہے۔ نمبر ۲۔ ترجمہ زیادہ تر آزاد ہے۔

مسٹر ادی۔ پی۔ بھٹناگر۔ پروفیسر الہ آباد یونیورسٹی۔

مترجمہ: سید محمد عبد العلیم ہاشمی۔ غازی پور۔

مکتوبات نیاز

بندہ نواز ، آپ کی مہربانیوں کا شکریہ ، لیکن

غنچہ تا شگفتن ہا برگ عافیت معلوم !

میں آپ کے احکام کی تعمیل فرض جانتا ہوں، لیکن سوال یہ ہے کہ زندگی کے اور فرائض مجھ سے کب ادا ہوتے ہیں کہ یہ ادا ہو سکے گا

آپ کو شاید معلوم نہیں کہ میری "طبع اندوہگیں" نے بہت سے احباب مجھ سے جدا کر دئے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ میرا یہ جواب آپ کو بھی مجھ سے متنفر کر دے۔ آپ کی محبت کی جو عظمت میرے دل میں ہے، اس کا اقتضاء تو یہ تھا کہ بغیر کسی پس و پیش کے آپ کے فرمان کے سامنے سر اطاعت خم کر دیتا، لیکن اس کا کیا علاج کہ مجھے اپنی ذات سے دشمنی بھی تو ہے اور وہ شاید آپ کی محبت سے زیادہ دیرینہ سال ہے۔ پھر وہ شخص جس نے خودکشی پر کمر باندھ لی ہو اسکی جان آپ کہاں تک بچائیں گے

دربغل دشنہ نہاں ساختہ غالب امروز

گزارید نہیں، بلکہ —— بگزارید کہ نامردہ تنہا ماند !

معاف فرمائیے ، آپ جس زاویہ سے دنیا کا مطالعہ کر رہے ہیں، وہ میرے زاویۂ نگاہ سے بہت مختلف ہے آپ کا زاویۂ حادّہ ہے یا منفرجہ ! یا اور میرا مستقیم یعنی یا تو آپ تفریط سے کام لیکر فشار کی انتہا کر دیں گے یا افراط کو مدنظر رکھکر حقیقت سے بھی روگردانی کرلیں گے لیکن میرے یہاں تو وہی ایک ۹۰ ڈگری والی نگاہ ہے۔ یعنی پہلے ایک رائے قایم کرنا اور پھر اسی کو سامنے رکھکر سیدھا راستہ اختیار کر لینا، خواہ وہ ترکستان جاتا ہو یا عربستان ! بالکل اسی قسم کا اختلاف میرے آپ کے درمیان اس معاملۂ خاص میں بھی ہے۔ آپ جہاں بین کی اس منزل پر ہیں، جہاں سوائے "گرگرا" کے اور کچھ ہاتھ نہیں آتا، میں فطرت انسانی کی لغزشوں کے لئے بھی تھوڑی سی جگہ سادہ چھوڑ دینا چاہتا ہوں۔ البتہ اگر آپ کی رائے میں وہ اصلاح کی حد

سے گزر گئے ہیں (جس سے میں متفق نہیں) تو بیشک مجبوری ہے، اور اس صورت میں مجھ سے کیا، سقراط و افلاطون سے بھی رائے لینے کی ضرورت نہیں۔ لیکن ایک بار پھر یہی عرض کروں گا کہ فیصلہ کرنے سے پہلے ایکبار اور غور کر لیجئے اور یہ سمجھ کر کہ انسان کی تمام تمنائیں پوری نہیں ہوا کرتیں اور پوری ہو بھی جائیں تو کوئی لطف نہیں!

کیا خوب! آپ کے خط کا جواب دینے میں مجھ سے ایک دن کی تاخیر ہو جائے تو میں نامعقول و بدتمیز، لیکن آپ میرے خط کا جواب کبھی نہ دیں تو آپ بدستور معقول و خوش تمیز بنے رہیں۔ کیا جونپور میں اسی قسم کی منطق پڑھائی جاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے وہاں کے قاضی اسی قسم کے استدلال سے مشہور ہوئے تھے!

میں جانتا ہوں کہ آپ کا خط، کوئی تفریحی چیز نہ تھی کہ میں اسے ہنس کر ٹال دیتا، بلکہ کاروبار سے متعلق تھا، آپ کی زندگی کی اس منزل سے تعلق رکھتا تھا، جس میں پیچھے مڑکر دیکھنے والا پتھر کا ہو جاتا ہے، لیکن ان تمام باتوں کی تحقیق کے لئے مجھے کچھ وقت تو ملنا چاہئے تھا۔

خیر، یہ تو جواب تھا آپ کی خفگی کا، اب اصل معاملہ کے متعلق بھی سن لیجئے۔ اول تو اُن سے کئی دن تک ملاقات نہ ہو سکی، باہر کسی کام سے گئے ہوئے تھے۔ کل واپس آئے تو گفتگو ہوئی۔ پہلے تو انھوں نے آپ کی پیشکش کو قابل توجہ ہی نہ سمجھا، لیکن جب میں نے تمام اعداد و شمار دکھائے تو انھوں نے بمشکل وعدہ کیا کہ وہ خود جاکر دیکھیں گے۔ اسلئے اب آپ ان کی آمد کا انتظار کیجئے۔ تاریخ کی تعیین انھوں نے ابھی تک نہیں کی ہے، لیکن میں اُن سے پوچھکر آپ کو مطلع کر دوں گا۔ جلدی نہ کیجئے ورنہ وہ بھڑک جائیں گے، نہایت سخت قسم کے "گرگ باراں دیدہ" انسان ہیں۔

یہ آپ نے کیا کہا کہ کل کی خبر نہیں کیا ہوگا۔ آپ کو خبر نہ ہو، مجھے تو ہے۔ صبح سورج نکلے گا اور شام کو ڈوب جائیگا۔ اسی کا نام کل تھا، اسی کا نام آج ہے اور اسی کو فردا کہیں گے! آپ کا ریشمی گدوں پر سونا، میرا بوریہ پر کروٹیں بدلنا ان دونوں میں کوئی چیز اس نظام کو بدل نہیں سکتی، جو آفتاب صبح کو طلوع ہوا ہے وہ شام کو غروب ضرور ہوگا اور دن کسی نہ کسی طرح کٹ ہی جائے گا۔

آپ دنیا کو اپنے نقطۂ نظر سے کیوں دیکھتے ہیں۔ آپ اس کی پوری گردی حیثیت کو سامنے رکھئے، جب تک ہم زندہ ہیں اس کے ساتھ گردش کرتے رہیں گے، ہمارے بعد جو آئیں گے وہ اسی چکر میں رہیں گے۔ یہ میں نے اس لئے عرض کیا کہ "بیم و رجا" کی زندگی میں جو تعطل پیدا ہو جاتا ہے، وہ مجھے پسند نہیں، عمل محض عمل کے لحاظ سے خود اپنی جگہ زندگی کا ثبوت ہے۔ یعنی اگر دم آنکھوں میں ہو تو بھی "ساغر و مینا" کو سامنے رہنا چاہئے۔ یہ تو آپ کی پہلی بات کا جواب ہوا اب دوسری بات لیجئے۔ آپ نے مسلم لیگ کی جس بڑی ہستی کا ذکر کیا ہے اس کے متعلق میں صرف یہ کہوں گا کہ جو کچھ وہ

کہتا ہے اسے نہ سنئے! بلکہ جو کچھ وہ کرتا ہے اسے دیکھئے۔ زبان پر نعرۂ آزادی اور ہاتھ میں برطانوی دامن لب پر ذکر پاک یزداں اور دل میں اہرمن!

پھر جناب یہ شراب، تو ہے نہیں کہ "یا غفور" کہکر آپ چڑھا جائیں اور کام چل جائے۔ یہ معاملہ "دار و رسن" کا ہے جہاں "انا الحق" کہے بغیر کچھ ہاتھ نہیں آسکتا۔

محمدؐ نے آزادی کا تخم بویا، علیؓ نے اسے پروان چڑھایا، لیکن آج محمد علی (جینا) کے نزدیک، اس کی حیثیت "سمر قند و بخارا" سے بھی کم ہے کہ بجائے "خال ہندو" کے "زلف چلیپا" پر قربان کر دینے کے لئے طیار ہے! پھر قیامت یہ ہے کہ اس واقعہ کو تاریخ اسلام میں بھی شامل کیا جائے گا اور ان بردہ فروشوں پر آپ کی اولاد فخر بھی کرے گی! معاذ اللہ!

کیا پوچھتے ہو ان کا کیا عالم ہے

رنگ کھلتا جائے ہے، جتنا کہ اُڑتا جائے ہے!

آپ کا پیام سنکر ہنس پڑے، لیکن ایک ایسی سوگوار ہنسی کے ساتھ کہ اس سے زیادہ رونا ممکن نہیں! میں نے زیادہ گفتگو مناسب نہیں سمجھی، لیکن سنا میں نے بھی یہی ہے کہ تعلقات کی نزاکت نے زیادہ خطرناک صورت اختیار کرلی ہے۔ صورت — "دل گرفتار و یار بے پروا" کی تو نہیں ہے، تاہم — "دیر سے ست کہ خاطرش بجا نیست" ابھی دیکھئے جائے کیا ہوتا ہے۔

خدا کے لئے کبھی تو کوئی غلطی کیا کرو۔ آخر انسان ہو خدا تو نہیں ہو۔ پھر اس ہوشیاری و چالاکی کے کیا معنے! سچ کہتا ہوں، بعض وقت یہ سوچکر میرا دم گھٹنے لگتا ہے کہ نہ میں تم کو کوئی مشورہ دے سکتا ہوں، نہ تم کسی کی مان سکتے ہو آئینہ میں ذرا اپنی صورت تو دیکھو، کیسی "روڑھی" ہوتی جاتی ہے۔ حماقتوں کے "بھولے پن" کا کوسوں پتہ نہیں ہر وقت تمھارے چہرہ سے ایک ایسے خطرہ کا سا احساس پیدا ہوتا رہتا ہے جیسے دشمن کے ہوائی جہاز بم برسانے ہی والے ہوں۔ لاحول ولا قوۃ! یہ بھی کوئی زندگی میں زندگی ہے کہ انسان نہ کسی کے دھوکہ میں آئے، نہ کوئی اسے بیوقوف بنا سکے۔

بولو، کب آؤ گے۔ واقعی مجھے تمھاری ضرورت ہے، میں جھوٹ نہیں بولتا اور بولوں بھی تو کس توقع پر؟

جناب من - جو شعر آپ نے لکھا ہے وہ غالب کا نہیں ہے، لیکن اگر آپ کو اسی پر اصرار ہے، تو غالب ہی کا سہی۔ بہر حال جس کا بھی ہو، بالکل لغو و مہمل ہے۔ آپ نے اس سے زیادہ کچھ پوچھا نہیں، اس لئے تفصیل میں کیوں پڑوں اور آپ پوچھیں بھی تو میں اس سے زیادہ کچھ نہ کہوں گا کہ مہمل ہے اور بلا دلیل مہمل ہے۔

خدا کے لئے کوئی اور مشغلہ اختیار کیجئے، یہ بالکل ذوق کی چیز ہے اور آپ منطق سے کام لیتے ہیں۔ عاقبت خراب ہونے کا تو اندیشہ نہیں، لیکن دماغ خراب ہو جانے کا ضرور ہے۔

آپ کے فایدہ کی بات

اگر حسب ذیل کتابیں آپ علحدہ علحدہ خرید فرمایئں تو حسب ذیل قیمت ادا کرنا پڑے گی اور محصول علاوہ بریں:

نگارستان	جمالستان	ترغیبات جنسی	شہاب کی سرگزشت	استفسار و جواب ہر سہ جلد
دو روپیہ	چار روپیہ	تین روپیہ	ایک روپیہ	نو روپیہ
معرکۂ سخن	مکتوبات نیاز	اردو شاعری	ہندی شاعری	میزان کل
ڈھائی روپیہ	ڈھائی روپیہ	دو روپیہ	ڈیڑھ روپیہ	ستائیس روپیہ آٹھ آنے

لیکن

اگر یہ تمام کتابیں ایک ساتھ طلب فرمائیں تو صرف بیس روپیہ میں ملجائیں گی اور محصول بھی ہمیں ادا کریں گے۔

مینجر نگار لکھنؤ

باب الاستفسار

سوق الکساد — علیٰ ہذا القیاس

(مولانا ابوالکمال اُمید امیٹھوی)

مُشتری کو، جوہری کو اندریں، سوق الکساد
ہست بیجا صیل کر دِرِ شاہوارم کردہ اند

۱۔ شعر مندرجۂ عنوان میں "سوق الکساد" کی ترکیب ایک معترض کے نزدیک محل نظر اور غلط ہے۔ اعتراض یہ ہے کہ صفت موصوف میں مطابقت ہونا چاہئے اور یہاں نہیں ہے، یعنی اسے "السوق الکساد" ہونا چاہئے۔ الف لام سوق پر بھی داخل ہونا چاہئے۔

میں کہتا ہوں کہ یہاں صفت و موصوف کی ترکیب ہی نہیں ہے، بلکہ ترکیب اضافی ہے، سوق مضاف، کساد مضاف الیہ۔

۲۔ یہی علامۂ عصر "علیٰ ہذالقیاس" کے املا کو بھی صحیح جانتا ہے اور دوسرے الف کو غیر ضروری سمجھتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ صحیح "علی ہذا القیاس" ہے۔

براہ نوازش استفسارات کے سلسلہ میں جواب تحریر فرمایئے اور مثالیں معہ دلیل بیان فرمایئے، تاکہ طرفین مستفید ہوسکیں ممکن تھا کہ میں زبانی آپ سے اس مسئلہ کو حل کرلیتا لیکن اس صورت میں معترض مطمئن نہ ہوتا۔

(نگار) "سوق الکساد" صفت و موصوف کی ترکیب ہی نہیں ہے بلکہ کھلی ہوئی ترکیب اضافی ہے۔ اگر یہ ترکیب توصیفی ہوتی تو "سوق کاسد" یا "السوق الکاسد" ہوتی۔ یہاں تو کساد بھی اسم ہے اور سوق بھی اسم۔

ہر چند شعراءِ فارسی نے "کساد" کو کبھی کبھی "کاسد" کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ مثلاً ظہوری کہتا ہے؛

شوقت نبرد بہ کارِ ما دست　　　　بازارِ رفوگراں کساد است

لیکن بہ حالتِ ترکیب کساد، کاسد کے معنے میں کبھی استعمال نہیں کیا گیا۔

عربی میں صفت و موصوف کے ساتھ الف لام کے استعمال کا قاعدہ یہ ہے کہ یا تو دونوں پر الف لام ہوگا جیسے رایت المرأۃ الحسناء (مینے ایک خوبصورت عورت دیکھی) یا کسی پر نہیں جیسے "جاءنی رجلٌ قبیحٌ" میرے پاس ایک بدصورت مرد آیا۔

ترکیب اضافی میں مضاف پر کبھی الف لام داخل نہ ہوگا اور مضاف الیہ معرّف باللام بھی ہو سکتا ہے، جیسے: "حُمرۃ العین" (آنکھ کی سُرخی) اور فرس زید (زید کا گھوڑا) لیکن فارسی والے اس کی بھی زیادہ پرواہ نہیں کرتے مثلاً خاقانی کا شعر ہے:

دنیاست کمینہ چاکرانش،　　　　در دار الحکم داورانش،

یا ایک اور شاعر کہتا ہے:

منت خدائے راکہ علی الرغم روزگار　　　　منصور گشت رایتِ خانِ بزرگوار

پہلے شعر میں حکم اور دوسرے شعر میں رغم مضاف ہے، لیکن الف لام دونوں پر داخل ہے۔ بات یہ ہے کہ ان دونوں شعروں میں پورے کلمۂ مرکب کو کلمۂ واحد خیال کر لیا گیا ہے، یعنی "دار الحکم" اور "علی الرغم" دونوں کو ایک کلمہ یا لفظ خیال کر کے مضاف بنایا گیا ہے اور اس لئے مضاف پر الف لام داخل کرنے کا اعتراض دفع ہوگیا۔

گو اس کا تعلق مسئلۂ زیر بحث سے نہیں لیکن مینے اس کا اظہار اس لئے کر دیا کہ آپ کا معترض الف لام کے باب میں بہت زیادہ سخت گیر معلوم ہوتا ہے، مبادا وہ فارسی کی اس قسم کی ترکیبوں پر بھی آیندہ اعتراض کی جرأت کرے۔

الغرض "سوق الکساد" کی ترکیب بالکل صحیح ہے اور معترض نے یا تو غلطی سے کساد کے معنے کاسد سمجھکر اس کو صفت و موصوف قرار دیا یا سرے سے وہ اس ترکیب کو سمجھے ہی نہیں۔

"سوق الکساد" کی ترکیب بالکل ایسی ہی ہے جیسے "نار الحب" (محبت کی آگ) اور اگر یہ صحیح ہے تو اسے بھی صحیح ہونا چاہئے۔ چند مثالیں عربی شعراء کے کلام سے ملاحظہ ہوں:

صلاح الدین لکھتا ہے:

یکفیک من ہولہ ان لست تبلغہ　　　　الا اذا ذُقت طعم الموت فی السفر

(قیامت کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ تو اس کے ہول کا خیال بھی نہیں کر سکتا سوائے اس کے کہ تو سفر میں موت کا مزہ چکھے)

اسی کا ایک شعر اور ہے:

واذا رایت بنیک فاعلم انہم قطعوا الیک مسافۃ الآجال

(جب تو اپنی اولاد کو دیکھے تو جان لے کہ انھوں نے موت کا راستہ تیری طرف بنا دیا ہے)

ابن ملیح لکھتا ہے:

طویت سماء المکرما ت وکورت شمس المدیح

(انعام و اکرام کے آسمان لپیٹ دئے گئے اور مدح و ثنا کا آفتاب تاریک ہوگیا)

ایک اور شاعر النجاوی کا شعر ہے:

ومن العجائب اننی فی لج بحر الجود راکب

(عجیب بات دیکھو کہ میں دریائے جود و کرم پہ چلا جا رہا ہوں)

ابوالمظفر مجدالدین کا شعر ہے:

لم القہ مذ لصاحبنا فحین بدا ، لناظری افترقنا فرقۃ الابد ،

(جب تک ہم وہ ساتھ ساتھ رہے کبھی میں نے اسے نہ دیکھا لیکن جب میری آنکھوں کے سامنے آیا تو ہمیشہ کے لئے جدا ہوگئے)

ان اشعار میں طعم الموت (موت کا مزہ)، مسافۃ الآجال (موت کا راستہ)۔ سماء المکرمات (انعام و اکرام کا آسمان) اور بحر الجود (عطاء و بخشش کا سمندر)۔ فرقۃ الابد (ہمیشہ کی جدائی) یہ سب ترکیبیں سوق الکساد کی قسم کی ہیں اور عربی میں بہ کثرت مستعمل ہیں۔

۲- علیٰ ہذا القیاس کا صحیح املا وہی ہے جو آپ بتاتے ہیں، یقیناً درمیان میں دو الف ہونا چاہئے۔ آپ اپنے دوست سے پوچھئے کہ اگر بجائے ہذا کے "ہذہٖ" ہو تو کیا وہ ہذا کی طرح ہذہٖ کی (ی) کو بھی اڑا دیں گے اور اسے بھی علےٰ ہذا القیاس لکھیں گے۔

الغرض آپ کا معترض دونوں باتوں میں غلطی پر ہے۔ انشا بھی غلط، املا بھی غلط!

تاریخ اسلامی ہند مع توقیت

کتابی شکل میں

نگار سائز کے ۲۴۴ صفحات پر۔ قیمت معہ محصول ۱۲؍

منیجر نگار لکھنؤ

کلام ماہر لکھنوی

(مسلسل)

تصوف۔ ماہر کے کلام میں متصوفانہ اشعار بھی کثرت سے ملتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

حسن قدرت کا تری ہو جلوہ گر تن میں مرے
ہوں ترا عاشق جو اپنا آپ ہی دیوانہ ہوں

جو آئینہ ہے وہ ترا صورت نما نہیں
یکتا وہ تو ہے جس کا کہیں دوسرا نہیں

مدام تشنۂ عرفان کردگار رہا
وہ مست ہوں کہ جو غفلت میں ہوشیار رہا

کیوں نہ فرقت میں بھی اب لطف ملیں وصلت کے
دل وہ پہلو میں ہے جس میں ہو محبت تیری

کس کس حجاب میں نظر آیا جمال دوست
کیا حسن بے حجاب میں دیدار عام ہے

کس طرح کہدوں یہ میں عشاق وحدت باز سے
نے تجھے کوئی صدا بھی تو تری آواز سے

دیکھیں بشر جو چشم بصیرت سے اک ذرا
ہر رگ دکھائے معرفت حق کی راہ کو

رنگ صانع کا ہر اک گل سے نمایاں دیکھا
سبزۂ باغ کو خضر رہ عرفاں دیکھا

باغ سے صنعت صانع کو نمایاں دیکھا
ہر رگ گل کو رہ منزل عرفاں دیکھا

جو دیکھتے ہیں تامل سے ہر رگ تن کو
وہ راہ معرفت کردگار سمجھے ہیں

نہاں وہ نظروں سے سمجھے ہیں جو کہ بینا ہیں
وہ کور ہیں جو تجھے آشکار سمجھے ہیں

ہے تعدد بھی بتوں کا اُسکی وحدت کی دلیل
کب خدائی کا سماں دیر برہمن میں نہیں

مذہبی عقیدت۔ ماہر نے اکثر اشعار میں اپنی مذہبی عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

مرسلوں میں بھی دم حشر یہ غل ہے تہ عرش
سب ہٹیں امت محبوب خدا آتی ہے

نبی نہ کیوں خم ہوں مثل خاتم اٹھائے ہیں سر پہ بار عالم
نہ کیوں تواضع سے ہوں کہ مہر نشان ہے پشت پر نگیں کا

میں لے کے نسخۂ اکسیر کیا کروں ماہر
جہاں میں خاک در بوتراب باقی ہے

ماہر کو قبر بھیجتی ہے یا ابو تراب
جلد آیئے فشار ہوا استخواں جلے

بنے ہیں دیدہ ہائے منتظر نقشِ قدم ماہر
زمیں بھی ہے یہ شایق مہدی ہادی کے مقدم کی

وسعتِ تخیل ۔ یہی وہ انفرادی رنگ ہے جس کا نمایاں طور پر ماہر کے کلام میں مظاہرہ ہوتا ہے۔ انھوں نے دنیا کی مختلف اور متنوع اشیاء پر مختلف طرح سے نظر کی ہے اور اُس کے جداگانہ پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اور اُس سے بوقلموں نتائج پیدا کئے ہیں۔

یوں تو بہت سے شعراء کے کلام میں جستہ جستہ اس طرح کا نمونہ ملتا ہے لیکن جس وسعت اور تجزیہ و تنوع کے ساتھ ماہر نے ہر شے کو دیکھا ہے وہ اُنہی کا حصہ ہے۔

پہلو جن پر وہ نظر ڈالتے ہیں اُن کی مختلف قسمیں ہوتی ہیں اخلاقی، فلسفی، نفسیاتی اور بعض بالکل شاعرانہ اور اسی میں تشبیہات کا ایک خزانہ ہے جو بڑی فیاضی کے ساتھ صرف کیا گیا ہے۔ میں اُن اشیاء کو حروفِ تہجی کی ترتیب سے درج کروں گا اور اُن میں سے ہر ہر پہلو کے متعلقہ اشعار کو الگ الگ پیش کروں گا۔

(۱) آبلہ: مثالِ آبلہ ادنیٰ کے دکھ سے دکھ ہے مجھے
دبے جو پاؤں سے کانٹا کھٹک سی سر میں ہے

کہتا ہوں یہ تپک پہ ہر اک آبلہ کی میں
دل کتنے دیگا اے مرے پروردگار دل

عجب نہیں اس اشارے سے وہ چلے آئیں
تپک تپک کے بلاتا ہے آبلہ دل کا

خارہائے دشت سے کھد وکلیں گے کب خبر
آبلے بھی بیٹھے جاتے ہیں مرے دل کی طرح

دشتِ وحشت نے بٹایا درد جب میرا کبھی
آبلے پا کے اپنے چھالے زبانِ خار میں

وحشی خجل ہیں پاؤں جو گھر سے نکال کے
شیشے ہیں آبلے عرق انفعال کے

(۲) آسیا: نہ جا صدائے فقیرانِ آسیا خو پر
یہ جتنا سیر ہوں اُتنا سوال کرتے ہیں

مستحقِ جان نہ تو سائل سرگرداں کو
آسیا کا جو بھرے پیٹ تو چکر میں رہے

ہیں سخت جاں رقیب سوا آسیا سے کیا
کوئی مرض نہیں ہے تو دورانِ سر تو ہو

(۳) آشیاں: نظرِ گلچیں کی کیوں پڑتی اُجڑتا کیوں مکاں میرا
چھپا لیتے جو برگِ نخل ملکر آشیاں میرا

وہیں سب ہمزباں ہیں، ہو رہا ہے کچھ بیاں میرا
چمن میں جس طرف اُجڑا پڑا ہے آشیاں میرا

ہوا پر دیکھکر تنکے، قفس میں میں یہ کہتا ہوں
کدھر ہو باغ والو، لٹ رہا ہے آشیاں میرا

قفس میں میں ہوں اں پھولوں بھری شاخیں گلستاں میں
عوض میرے لگاتی ہیں گلے سے آشیاں میرا

صیاد کچھ تو اہل قفس کا نشاں رہے
ہم ہوں نہ ہوں، چمن میں مگر آشیاں رہے

اُسی کو ہوش ہیں دیکھا اُجڑتے آنکھوں سے
جہاں ہیں تنکے چنے تھے جس آشیاں کے لئے

(۴) آفتاب: طلسم تھا کہ شعاعوں میں آفتاب آیا
ہزار ہاتھ پہ اک ساغرِ شراب آیا

کیوں شفق گوں ہو نہ رنگ حسن باغ آفتاب
ہیں شعاعیں موج صہبائے ایاغ آفتاب

ہیں شعاعیں یا نگاہوں ہیں پئے جاتی ہے صبح
دست نازک پر یہ کس کے ہے ایاغ آفتاب

دیدے اپنے دست نازک سے مجھی کو اے شعاع
گر نہیں ہاتھوں سے تھم سکتا چراغ آفتاب

خورشید کی طرح ہمہ تن میں جو داغ ہوں
سائے میں میرے خلق کو مشکل قیام ہے

وہ محو خواب ناز نہیں، نکلا ہے آفتاب
دکھلا رہا ہے آئینہ گردوں سحر نہیں

یہاں عربی کا یہ مصرع یاد کر لیجئے:- والشمس کالمرآۃ فی کف الاشل

(۵) آئینہ: جوہر سے آئینوں کا کلیجہ فگار ہے
پتھر میں کس نظر کا نشاں آشکار ہے

اف رے جذب دل اتر آئی شبیہ روئے دوست
میری نظروں سے جو آئینہ نے دیکھا سوئے دوست

آئینہ سامنے رکھکر بھی کھلا کچھ نہ تمھیں،
اپنے گھر میں رہے یا غیر کے تم گھر میں رہے

آئینہ لیکے ہاتھ میں غیروں پہ طعن ہے
خود گر پڑے جو حسن پہ اس کی خبر نہیں

صاف کر قلب تو ہو ضیق میں وسعت تجھکو
ایک آئینہ میں سو مردم محفل ٹھہرے

آئینہ لیکے بھی بڑھتی نہیں حیرت تیری
دیکھ تو دیکھ رہی ہے تجھے صورت تیری،

ان کو جب ہوتی ہے منظور نظر خود بینی
میری حیرت انھیں آئینہ دکھا آتی ہے

(۶) اسپند: مثل اسپند بھی دی دل نے نہ آواز مجھے
ایسے جلنے پہ اور اس ضبط پہ ہے ناز مجھے

ایک نالے نے فنا مجھ کو کیا مثل سپند
ڈھونڈھتی کیوں نہ نکلکر مری آواز مجھے

مرد غیروں کے لئے دل کو جلا دیتے ہیں
صاف اسپند یہ آتش پہ صدا دیتے ہیں

(۷) اشک: اشکوں سے کچھ سکون ہے مجھ پر گناہ کو
تھانا ہے لنگروں نے جہاز تباہ کو

کس طرح رونے میں لے آ ہے ہیں دیکھوں روئے دوست
آنسوؤں کے تار الجھے ہیں نگہ کے تار میں

کشتہ ہوئی ہے کوئی تو ایسی ہی آرزو
آنسو تڑپتے آتے ہیں چشم پر آب میں

کاندھا بدلتے آتے ہیں آنسو بھی سوئے چشم
جاتی ہے لاش قبر میں، لخت جگر نہیں،

بیجاں کریں گے عشق میں اشک رواں مجھے
لوٹیگا رہزنوں کی طرح کارواں مجھے

اشک ہر ایک مثال در غلطاں نکلا،
دل کے ویرانہ سے گنجینۂ پنہاں نکلا

آہ دل سے جوش اشک چشم حیراں ہو گیا
لو ہوا سے آب آئینہ میں طوفاں ہو گیا

مرے دامن کو رنگیں اشک خوں سے دوست ہوتے ہیں
محبت میں لٹیگا میرے ہاتھوں کارواں میرا

امنڈ آئے ہیں میری آنکھوں میں آنسو
حبابوں سے دریا بہا چاہتے ہیں،

ڈھل آئے ہیں آنکھوں سے مژگاں پہ آنسو — جہازوں کے لنگر پڑا چاہتے ہیں

وہی نکلے ہیں بنکر اشکہائے سرمہ آلودہ — بھرے تھے کوٹ کر موتی جو انکی چشم جادو میں

تری مژگاں نے کچھ ڈھلکا کے اشک سرمہ آلودہ — لگایا قفل بھی طرفہ طلسم چشم جادو میں

(۸) **اگر:** جیسے جلتا ہے اگر پردۂ خاکستر میں — چپکے چپکے یونہیں جلجاتے ہیں جلنے والے

وہ سلامت رہیں یارب کہ اگر کی صورت — دفن جو مجھکو مری خاک میں کردیتے ہیں،

(۹) **برق:** ابر میں برق کی یہ جلوہ گری کہتی ہے — کوئی بے چین ہے پردہ سے نکلنے کے لئے

(۱۰) **بگولہ:** کیا ہوا سایہ فقیروں کی جو تربت پر نہیں، — ہر بگولہ گنبد گور غریباں ہوگیا

دھوپ میں دشت نوردی کو جو نکلے وحشی — کھولکر چتر بگولے سر منزل ٹھہرے

مجھ سے وحشی کا جنازہ جو اُٹھا صحرا میں — کاندھا دینے کو بگولے سر منزل ٹھہرے

بگولے پیچھے ہیں سر کو کھولے — جنازہ آگے ہے مجھ حزیں کا،

(۱۱) **بو:** چمن دہر میں جمعیت خاطر ہے کسے — بوئے گل کو بھی جو دیکھا تو پریشاں دیکھا

برنگ بو ہوں نہ پوچھو مرے سفر کا حال — ہوا جدھر کی چلی اُس طرف روانہ ہوا

طایر بو کی طرح غیر سے بازو ہیں قوی، — جنبش موج ہوا ہے پر پرواز مجھے

زور بازو نے کیا تھا بوئے غنچہ جب مجھے — سو قفس تھے پر نہ اک بھی مانع پرواز تھا

(۱۲) **پرکار:** جامع مقام و کوچ کا پرکار دار ہوں — اک پاؤں ہے حضر میں مرا اک سفر میں ہے

(۱۳) **پیری:** بڑھاپا آتے ہی بیگانہ ہر یگانہ ہوا — سحر طلوع ہوئی قافلہ روانہ ہوا

فصل پیری میں کیوں نہ ہو دھڑکن — دل میں یہ ماتم جوانی ہے،

تصویر انقلاب زمانہ ہوں شیب میں — پاؤں میں ہے سکون حرکت جبکہ سر میں ہے

تاثیر ضعف عالم پیری کو دیکھنا — سایہ بھی بے عصا نہ چلا ہم جہاں چلے

تکلیف عدم جانے کی جب کرتی ہے پیری، — کس عجز سے کرتا ہوں "نہیں" سر کو ہلاکے

پیری میں روؤں کو نے عضو بدن کو میں — دل مرچکا ہے آنکھ کا لبریز جام ہے

شب شباب کٹی خوف روز پیری میں — تمام رات ہم اندیشۂ سحر میں رہے

عبث ہے ذکر اب کسی حسیں کا کہ پیری آئی شباب گزرا — علاقہ ناز و ادا سے اب کیا، وہ میں نہیں ہوں وہ دل نہیں ہے

عروق پیری میں جو عیاں ہیں نہیں ہیں دنیا کے سم نہاں ہیں — کہاں ہاتھوں کی جھریاں ہیں، ہزار ہا سانپ اک آستیں ہے

سب چل بسیں گی دل سے بڑھاپے میں حسرتیں — نکلیگا قافلہ بھی سرا سے سحر تو ہو،

(۱۴) **تسبیح:** حال رشتہ کا سرِ تسبیح سے آخر کھلا
کیوں نہ آتا اک زباں پر سو دلوں میں راز تھا

کہتے ہیں پھر کے دانۂ تسبیح وقت ذکر
کچھ ہو نہ نکلے ہاتھ سے دل انقلاب میں

مگر میں تسبیح کا ہوں دانہ جو اسکو کھونا تو اسکو پانا
ہزار پھر بار ہا زمانہ فراق دیکھا نہ ہمنشیں کا

صورت دانۂ تسبیح رہے گردش میں
گو سفر ہم نے کیا پر نہ وطن سے نکلے

صفت دانۂ تسبیح ہوں، کیونکر ہو سکون
چین اُس ہاتھ ملے پاؤں تو مرا دل ٹھہرے

(۱۵) **تصویر:** کوئی خوددار مصور سے کھنچا بیٹھا ہے
اب نہ کاغذ پہ گرے عکس تو کچھ دور نہیں

اُنکی تصویر کا کیوں رنگ نہ رہ رہ کے اُڑے
نچلے بیٹھیں کہیں بے چین یہ دستو نہیں،

ضعف سے ہوں ہمہ تن صورت تصویر ضعیف
رنگ کے ساتھ خود اُڑ جاؤں تو کچھ دور نہیں،

جن کی تصویر مرے پاس ہے کہدو اُن سے
آپ ہی اپنے سے تم دور ہو، ہم دور نہیں

تصویر کھنچ رہی ہے، نزاکت میں مست ہیں
کھنچ کر چلے کہاں سے کہاں کچھ خبر نہیں

ملگئے ہیں آج بے قابو جو وہ تقدیر سے
رنگ کیا کیا کر رہا ہے شوخیاں تصویر سے

خود بھی تصویر بنے ہو، یہ تماشا کیا ہے
مُنہ اُترتا ہی چلا جاتا ہے، نقشہ کیا ہے

مرغ تصویر ہوں، پوچھو نہ مری حسرت کو
پر تو ہیں بھی مگر آتی نہیں پرواز مجھے

(۱۶) **تگرگ:** واہ کیا خوب ہوا ختم سفر مثل تگرگ
ہمیں باقی نہ رہے جب سرِ منزل ٹھیرے

(۱۷) **جادہ:** خاکساروں کا سلوک اعجاز سے خالی نہیں
بے چلے جادہ رہا ہمراہی رہگیر میں

ہے کون مجھ غریب کی لے آکے جو خبر
پھیلائے پاؤں سوتے ہیں جادے بھی راہ میں

سیراب آبلوں سے نہ کس طرح میں کروں
جادے زبان خشک دکھاتے ہیں راہ میں

غربت ہماری ہے صفت جادۂ طریق،
صحرا میں جاکے بھی قدم اپنا وطن میں ہے

کس نے تھک کر راہ کو دیکھا تھا چشم یاس سے
صورت مدِ نگہ ہر جادۂ منزل میں ہے

(۱۸) **جرس:** عبث لب ہے نالاں جرس راہ میں،
کوئی قافلہ سے جدا ہو گیا،

(۱۹) **جگنو:** بعد مردن فصل باراں کا یہ احساں ہو گیا،
جگنوؤں سے قبر پہ میری چراغاں ہو گیا،

ذرا سے سن میں وہ ترجیح کس کے حسن کو دیں
فلک پہ نجم ہیں، جگنو ہیں اُن کے بستر پر

(۲۰) **حباب:** دیکھ مٹ جائے گا دم میں تو حبابوں کی طرح
بحر عالم میں جو سر بھولے سے بھی اُٹھ جائے گا

حباب آسا فلک کے دور میں مٹ کر یہ کہتا ہوں
کسی کا ذکر کیا ملتا نہیں مجھکو نشاں میرا

حباب بحر ہوں پوچھو نہ مجھ سے حال قسمت کا
یہ گردش ہے کہ جیتے سا تھ پھرتا ہے مکاں میرا

ہوائے منزوی خانۂ حباب ہوں میں
رہے گا گھر بھی نہ باقی جو میں روانہ ہوا

بحر جہاں میں ہوں میں ہوائے تہ حباب
گر میں نہ ہوں تو گھر کا بھی میرے نشاں نہو

جب بلند اپنا ہوا نام و نشاں آپ سے آپ
بنگیا مثل حبابوں کے مکاں آپ سے آپ

جب کچھ کھلا نہ حال طلسمات دہر کا
موجیں کلید بن گئیں قفل حباب میں

یہ حباب آکے سر آب خبر دیتے ہیں
دم جو لیتے ہیں زمانہ میں وہ سر دیتے ہیں

مسکن کسی کا مثل حباب رواں نہ ہو
نکلے بدن سے سانس تو گھر کا نشاں نہ ہو

روا روی کا جو غل تا بہ گوش آتا ہے
حباب بحر میں خانہ بدوش آتا ہے

آکے موجوں نے حبابوں کو طمانچہ مارا
اُن کا انجام یہ ہے جتنے ہوا سر میں رہے

دم بخود کیوں نہ رہوں دہر میں مانند حباب
سانس لیتا ہوں تو دم تن سے فنا ہوتا ہے

(باقی) ع - ن

چند سیاسی کتابیں

جدید دستور کا خاکہ :- از جناب زین العابدین احمد صاحب مترجمہ جناب شفیق الرحمٰن صاحب قدوائی بی - اے (جامعہ) یہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا ایک پمفلٹ ہے، جو موجودہ سیاسی گتھی کو سمجھنے کے لئے بہت ضروری ہے۔ قیمت ۲ر

دیہی جنس :- دیہی جنس اور دیہات کی نئی تعمیر پر ایسی کتاب جو دیہات سدھار کے کام کرنے والوں کے لئے مفید ہے۔ از جی - سی کمار پاپا صاحب - قیمت ۲ر

ہندوستان میں زراعت کا مسئلہ :- از زین العابدین مترجمہ مولوی شفیق الرحمٰن صاحب قدوائی بی - اے (جامعہ) اس مختصر سے پمفلٹ میں کاشتکاروں کی کثرت اور زمین کی قلت کسانوں کے افلاس اور اُنکے قرضے وغیرہ سے بحث کی گئی ہے۔ قیمت ۴ر

شہری آزادی :- اس کتاب میں بیرونی ممالک کی انجمنوں اور اُن کے شہری حقوق کا ذکر کرتے ہوئے اعداد و شمار سے بتایا گیا ہے کہ کس طرح موجودہ حکومت ہندوستانیوں کو اُن کے حقوق سے محروم کرنے کے درپے ہے جن سے اُن کی زندگی وابستہ ہے۔ قیمت ۴ر

منیجر نگار - لکھنو

تنوعات

روس میں پچھلی دفعہ سالانہ پریڈ کے وقت ہر سائکل سوار کے ساتھ ایک کتا بھی پایا جاتا تھا - گویا جنگ کے دوسرے ضروری اسلحہ کے ساتھ کتے کا رہنا بھی ضروری ہے - اور وہاں اس کی اہمیت اتنی بڑی ہے کہ روس سے کوئی کتا باہر جا ہی نہیں سکتا جب تک وہ فوجی خدمت کے ناقابل نہ سمجھ لیا جائے

گزشتہ سو سال کے اندر چھ لڑائیوں کا ایکدوسرے سے ریاضی کا عجیب و غریب تعلق پایا جاتا ہے یعنی ہر پچھلی لڑائی کے مختتم سال میں اس کے ہندسوں کو علحدہ علحدہ جمع کر دیجئے تو آیندہ لڑائی کے آغاز کا سال نکل آتا ہے ——— چین کی لڑائی سنہ ۱۸۳۹ء سے سنہ ۱۸۴۲ء تک جاری رہی - اب ۱۸۴۲ میں ۲، ۴، ۸ اور ۱ کے مجموعہ (۱۵) کو جوڑ دیجئے تو سنہ ۱۸۵۷ء ہو جائے گا، جب ہندوستان میں غدر ہوا ——— اب پھر دیکھئے کہ غدر ختم ہوا سنہ ۱۸۵۸ء میں. اس میں ۸، ۵، ۸، اور ۱ کے مجموعہ (۲۲) کو سنہ ۱۸۵۸ء میں جمع کیجئے تو ۱۸۸۰ ہو جائے گا اور یہی سال مصر کی لڑائی کا تھا ——— مصر کی لڑائی سنہ ۱۸۸۱ء میں ختم ہوئی - اس میں ۱، ۸، ۸، اور ۱ کے مجموعہ (۱۸) کو جمع کیجئے تو ۱۸۹۹ ہو گیا اور یہی سال جنوبی افریقہ کی لڑائی کا تھا - سنہ ۱۶۴۰ء سے انگریزوں کی سول وار شروع ہوئی بادشاہ قتل ہوا اور پہلی جمہوریت کرامول کی سیادت میں قایم ہوئی سنہ ۱۸۴۰ء میں یوروپ انقلابی سرگرمیوں کا شکار رہا اور زبردست قحط پڑا - اب دیکھئے سنہ ۱۹۴۰ء سے کس مصیبت کا آغاز ہوتا ہے

اظہار محبت کے خطوط میں سب سے زیادہ طویل خط وہ ہے جو اسوقت برطانیہ کے عجائب خانہ میں پایا جاتا ہے - یہ خط ملکۂ الزبتھ کے ایک درباری نے اپنی محبوبہ کو لکھا تھا - یہ خط چار سو باریک لکھے ہوئے صفحات کو محیط ہے اور موجودہ سائز کے تین تین سو صفحات کے چھ ناولوں کے برابر ہے ـــ غالباً اس کی شادی اپنی محبوبہ سے نہیں ہوئی، ورنہ ظاہر ہے کہ وہ تو باتوں ہی باتوں میں مار ڈالتا -

ـ امریکہ کا صدر لنکن بڑا حاضر جواب شخص تھا - ایک مرتبہ کسی ملک کا سفیر اس کے کمرہ میں ناگہاں داخل ہو گیا جہاں لنکن اپنا جوتا صاف کر رہا تھا -

اس نے حیران ہو کر پوچھا "کیا آپ اپنا جوتا صاف کر رہے ہیں"

لنکن نے جواب دیا "ہاں، لیکن کیا آپ دوسروں کے جوتے صاف کیا کرتے ہیں؟"

ایک سائنس داں نے نظریہ پیش کیا ہے کہ گوشت کا استعمال گلے کے اعصاب اور رگوں کی نرمی کو ضایع

کر دیتا ہے اس لئے گوشت کھانے والے اچھے گانے والے نہیں ہو سکتے۔ مثال کے طور پر وہ انگریزوں کو پیش کرتا ہے جو بہت گوشت کھاتے اور بہت خراب گانے والے ہیں برخلاف اٹلی والوں کے جو گوشت بہت کم کھاتے ہیں اور عمدہ گانے والے ہیں۔

اس نے ثبوت میں اس حقیقت کو بھی پیش کیا ہے کہ گانے والی چڑیاں جتنی ہیں سب گھاس پات کھاتی ہیں، برخلاف اس کے چیل، گدھ وغیرہ گوشت خوار طیور سب اس نعمت سے محروم ہیں۔

لڑکوں کی پیدائش جنگ کے وقت زیادہ ہوتی ہے یا اس کے بعد۔ پروفیسر مارسل تحقیق کے بعد اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ ہمیشہ جنگ ختم ہونے کے بعد لڑکوں کی پیدائش زیادہ ہو جاتی ہے، چنانچہ ۱۸۷۰ء کی لڑائی کے بعد جب ۱۸۹۰ء میں بیس سال کے نوجوانوں کی بھرتی شروع ہوئی ہے، تو ان کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ انتخاب مشکل ہو گیا۔ اس کا سبب پروفیسر مذکور نے یہ بتایا ہے کہ مردوں کی زیادتی انحطاط کی علامت ہے۔ جنگ کے زمانہ میں بہترین قوار کے مرد لڑائی کے میدانوں میں چلے جاتے ہیں اور صرف بیمار و کمزور آدمی رہ جاتے ہیں، جن سے بہ حالتِ امن مشکل سے عورتیں شادی کرنے پر راضی ہو سکتی ہیں۔ لیکن جنگ کی وجہ سے انھیں مجبوراً انھیں چھٹے ہوئے مردوں سے عقد کرنا پڑتا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لڑکے زیادہ پیدا ہو جاتے ہیں جو مردوں کے انحطاط کی علامت ہے۔

الاما میں عورتیں پاؤں میں کوئی زیور استعمال نہیں کر سکتیں۔

اُتاہ میں جوتے کی ایڑی کی اونچائی ڈیڑھ انچ سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔

بوسٹن میں ہر کتے کی ٹانگ دس انچ سے کم ہونا چاہئے۔

مسیسپی میں بغیر جوتوں کا فیتہ باندھے کوئی شخص باہر نہیں نکل سکتا۔

نیویارک اسٹیٹ میں کوئی شخص گھوڑے کے پاس چھتری نہیں کھول سکتا۔

امریکہ کے کسی اخبار نے ایک ڈرامائی انداز کی نہایت مختصر کہانی لکھنے کی لوگوں کو دعوت دی اور سب سے بہتر کہانی پر انعام مقرر کیا۔ اس مقابلہ میں ہزاروں نے حصہ لیا اور انعام ذیل کی کہانی کو ملا:۔

الونیا کو اپنے بھائی کا ایک تار ملا جو اس کے شوہر کے ساتھ افریقہ کے جنگل میں شیر کے شکار کے لئے گیا تھا۔ تار کے الفاظ یہ تھے:۔ "باب شیر کا شکار کھیلتے ہوئے مارا گیا۔" الونیا بہت رنجیدہ ہوئی اور فوراً تار دیا کہ "اُسے گھر بھیجدو"۔ تین ہفتہ کے بعد ایک بڑا بکس افریقہ سے پہونچا، جس کے اندر شیر تھا۔ الونیا نے پھر تار دیا کہ "شیر پہونچ گیا، تم سے غلطی ہوئی، باب کو بھیجو"۔ اس کا جواب آیا کہ: "غلطی نہیں ہوئی۔ باب، شیر کے اندر ہے"۔

نگار — اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۲۷ | فہرست مضامین مئی سنہ ۱۹۴۰ء | شمارہ ۵

ملاحظات ---------------------------- ۱
فنِ تحریر و صحافتِ عرب --------- جلیل الرحمٰن اعظمی ------ ۹
سوویٹ ادبیات میں "اشتراکی واقعیت" ------ ل۔ احمد ------ ۱۶
عندلیب شادانی و حسرت موہانی ------ اثر گلشن آبادی ------ ۲۲
معراجِ تمدن ------------ رام ------ ۲۸
کوڑھی بھکارن ------------ کشن پرشاد کول ------ ۳۲
عربوں کی سیاسی بیداری ------------ محمد عتیق صدیقی ------ ۴۱
مکتوباتِ نیاز ---------------------------- ۵۱
جرمنی کو ناکہ بندی سے شکست نہیں ہو سکتی ---------- ۵۴
باب الاستفسار ---------------------------- ۵۷
کشکول ---------------------------- ۶۱
تنوعات ---------------------------- ۶۴
مطبوعات موصولہ ---------------------------- ۶۵
منظومات ... آہر، احسان دانش، اثر سنزمی، بنی احمد، جگر، قیصر، امید ... ۶۶

ملاحظات

موجودہ جنگ — اور — برطانیہ کی سیاسی غلطیاں

عام طور پر ہر شخص یہی سوال کرتا ہے کہ اس لڑائی کا نتیجہ کیا ہوگا حالانکہ سوال کی صحیح صورت یہ ہونا چاہئے کہ "جنگ کا رُخ کیا ہے" یوں تو پیشین گوئی جو بھی ہو غیر یقینی چیز ہے، لیکن جنگ کے متعلق پیشین گوئی کرنا غیر یقینی بھی ہے اور خطرناک بھی۔ اس لئے لڑائی کے انجام پر کبھی غور نہ کیجئے بلکہ صرف یہ دیکھئے کہ اسوقت تک جو کچھ ہوا ہے اس کی نوعیت کیا ہے۔ اور اگر اس سلسلہ میں از خود کوئی منطقی نتیجہ سمجھ میں آجائے تو مجبوری ہے۔ آج کی صحبت میں ہم یہی بتانا چاہتے ہیں کہ گزشتہ آٹھ مہینے میں کیا کیا ہو چکا ہے اور اس کو دیکھکر فریقین میں سے کس کو کامیاب اور کس کو ناکام کہہ سکتے ہیں

اس زمانہ کی کسی جنگ پر تبصرہ کرنے کے لئے ہم کو یہ نہ دیکھنا چاہئے کہ کس فریق کے کتنے سپاہی ہلاک ہوئے، کتنے جہاز تباہ کئے گئے بلکہ صرف یہ غور کرنا چاہئے کہ سیاسی چالیں کس کی زیادہ کامیاب رہیں، کس کی گھاتیں زیادہ نتیجہ خیز ثابت ہوئیں اور وقت و موقعہ سے کس نے زیادہ فایدہ اُٹھایا

چونکہ یہ جنگ فی الحقیقت گزشتہ جنگ عظیم ہی کا تتمہ ہے، اس لئے مختصراً پہلے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ پچھلی لڑائی نے یوروپ کے نقشہ میں کیا کیا تغیرات پیدا کئے اور اس سے وہاں کی بین الاقوامی سیاست پر کیا اثر پڑا۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ پچھلی لڑائی میں ایک طرف جرمنی، آسٹریا، بلغاریہ اور ترکی تھے، دوسری طرف روس، فرانس، جرمنی اور اٹلی۔ اسی کے ساتھ آپ اس سے بھی واقف ہوں گے کہ سنہ ۱۴ء سے سنہ ۱۸ء تک جرمنی کو غیر معمولی کامیابیاں حاصل ہوئیں اور انھیں کامیابیوں کا نتیجہ وہ عہد نامہ تھا جو

عہد نامہ برسٹ لٹوسک (Brest Litovsk) کے نام سے موسوم ہے

اس معاہدہ میں ایک فریق روس تھا اور دوسرا جرمنی و ترکی و بلغاریہ۔ چونکہ دوران جنگ میں روس کے اندر اشتراکی انقلاب پیدا ہو گیا تھا (جسے جرمنی ہی نے زیادہ کامیاب بنایا تھا) اس لئے روس نے ہتھیار ڈالدئے اور جرمنی نے نہایت سخت شرائط صلح پیش کئے۔ ان شرایط کی رو سے، لتھونیا، لیٹویا، اسٹونیا، روسی پولینڈ، اور بالٹک کے بعض جزایر روس کے قبضہ سے نکل کر جرمنی و آسٹریا کو مل گئے اور اوکرائن، فن لینڈ اور جارجیا کی آزادی بھی روس کو تسلیم کرنا پڑی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ روس کی آبادی کا ۳۴ فی صدی حصہ، صنعتی اداروں کا ۵۴ فی صدی حصہ اور کوئلہ کی کانوں کا ۹۰ فیصدی اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ یہ معاہدہ ۳ مارچ ۱۹۱۸ء کو ہوا تھا

لیکن اس کے تقریباً ایک سال بعد ہی حالات کا رُخ بدلا اور جرمنی کو شکست ہوئی، اسی کا نتیجہ معاہدہ ورسائی (Versailles) ہے جس کو موجودہ جنگ کا ذمہ دار بتایا جاتا ہے۔ یہ معاہدہ ۲۸ جون ۱۹۱۹ء کو ہوا۔ اس معاہدہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ:

۱۔ آسٹریا ہنگری کی عظیم الشان سلطنت توڑ کر دو چھوٹی چھوٹی حکومتیں بنا دی گئیں، ایک آسٹریا (جس پر اب جرمنی قابض ہے) اور دوسری ہنگری

۲۔ آسٹریا ہنگری کا بہت بڑا علاقہ نکال کر ایک نئی حکومت زیکوسلوویکیا کے نام سے قایم کی گئی

۳۔ پولینڈ کی حکومت پھر قایم ہوئی اور رومانیا و سربیا (موجودہ یوگوسلویا) کے حدود کو بلغاریہ و ہنگری کے علاقے چھین کر اور زیادہ وسیع کر دیا گیا

۴۔ پولستانی کریڈور (Corridor) جرمنی سے لیکر پولینڈ میں شامل کر دیا گیا اور رائے عامہ حاصل کرنے کے بعد بالائی سلیشیا کا معدنی علاقہ بھی بعد کو پولینڈ میں شامل ہو گیا

۵۔ شمالی سلسوگ (Sleswig) ڈنمارک کو دیا گیا

۶۔ میمل لتھونیا کی نئی وضع کی ہوئی حکومت کو دیا گیا

۷۔ زیکوسلوویکیا کو ہمبرگ اور اسٹیٹن (Stettin) میں خاص حقوق دئے گئے

۸۔ بلجیم کو یوپن (Eupen) اور مالمڈی (Malmedy) کے اضلاع دئے گئے

۹۔ علاقہ سار کی معدنیں کوئلہ کی پندرہ سال کے لئے فرانس کو دیدی گئیں

۱۰۔ لورین کا بڑا حصہ جس میں لوہے کی کانیں ہیں اور الساک جس میں پوٹاشس کی معدنیں ہیں فرانس کو دیدیا گیا

۱۱۔ رائنولینڈ کا علاقہ بھی پندرہ سال کے لئے اتحادیین کو ملگیا

۱۲۔ جرمنی نو آبادیاں جو افریقہ میں پائی جاتی تھیں سب کی سب اس کے ہاتھ سے نکل گئیں اور اسی طرح بحر پاسفک کے جزایر بھی

بحری و بری افواج کو کم کر دینے اور زبردست تاوان جنگ ادا کرنے کی شرطیں ان کے علاوہ تھیں۔

ناروے کے بعد جرمنی مجبور ہے کہ سویڈن پر قبضہ کرے کیونکہ اتحادئین نے سرنگیں بچھا کر براہ بحر شمالی و بحر اٹلانٹک اسکی آمد و رفت سواحل ناروے تک دشوار کردی ہے اور اب رہ صرف بحر بالٹک ہے سویڈن ہو کر فوجی کمک پہونچا سکتا ہے علاوہ اس کے ناروے پر حملہ کرنے سے اس کا مقصود یہی سویڈن پر قبضہ کرنا ہے کیونکہ لوہے کی معدنیں یہیں پائی جاتی ہیں اور جرمنی انھیں سے سالانہ کثیر مقدار میں لوہا حاصل کیا کرتا ہے

اٹلی اس وقت جرمنی کا ہم آہنگ ہے اور ناروے کے حملہ کو حق بجانب ظاہر کرتا ہے۔ روس البتہ خاموش ہے اور یہ خاموشی بالکل اسی قسم کی ہے، جیسی جرمنی نے روس کے حملۂ فن لینڈ کے وقت اختیار کی تھی۔ لیکن وہ بے معنی نہ تھی نہ یہ بے معنی ہے، اُس خاموشی کا نتیجہ ڈنمارک و ناروے کو ہضم کرنے کی صورت میں ظاہر ہوا اور اس خاموشی کا نتیجہ ممکن ہے بلقان کی قطع و برید کی صورت میں رونما ہو

بہر حال وقت بہت نازک ہے اور اسوقت تک اتحادئین کا پوزیشن کمزور نظر آرہا ہے۔ اگر سوء اتفاق سے اس جنگ کا نتیجہ اتحادئین کی ناکامی کی صورت میں ظاہر ہوا تو اس میں شک نہیں کہ دُنیا کے لئے یہ نہایت تلخ تجربہ ہوگا

لیکن چونکہ محض آرزؤں سے تقدیریں نہیں بدلا کرتیں، اس لئے ہماری دُعائیں اتحادئین کے کچھ کام نہیں آسکتیں اگر خود انھیں کی پالیسی اور عسکری تنظیم لوہے کا جواب لوہے سے دینے کے لئے طیار نہیں۔

یورپ کا موجودہ نقشہ جس سے جرمنی اور روس کے موجودہ حدودِ سلطنت کا پتہ چلتا ہے:

آپ کو پہلو کے نقشہ سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ گزشتہ آٹھ مہینوں میں جرمنی وسطِ یورپ کے کتنے بڑے حصہ پر قابض ہو گیا ہے اور اگر اس لڑائی کا اختتام انھیں حدود پر ہوا تو یقیناً یورپ کی توازنِ قوت اور اس کے ادعائے جمہوریت کو ناقابلِ تلافی صدمہ پہونچے گا، لیکن سوال یہی ہے کہ کیا جنگ کی موجودہ رفتار اور اتحادئین کی عسکری پالیسی زمانہ کو پھر آٹھ مہینے پیچھے لوٹا سکتی ہے اور اگر اس کا امکان ہے تو غالباً وہ زمانہ کو سنہ ۱۹۱۴ء تک لوٹانے پر مجبور ہوگی اور اسکی اپنی خارجی پالیسی سے زیادہ داخلی پالیسی میں تغیر کرنا ہوگا اور شاید اس کی راہ کا سب سے بڑا سنگ گراں ہے۔

اس گفتگو میں بحث کا ایک اور پہلو قابل غور ہے۔ وہ یہ کہ برطانوی حکومت کی موجودہ پالیسی کیا واقعی صلح و امن پر قایم ہے، کیا وہ فی الحقیقت کوئی جارحانہ پہلو اس لئے اختیار کرنا نہیں چاہتی کہ اسے انسانیت کے ساتھ نہایت گہری ہمدردی ہے خواہ اس سے دشمن بھی

فایدہ کیوں نہ پہونچے، یا اسوقت کی بین الاقوامی سیاسی پیچیدگیاں جو غالبًا خود اسی کی پیدا کی ہوئی ہیں اُسے خطرناک وادی میں قدم رکھنے سے روکتی ہیں؟

یقینًا برطانیہ کے مدبرین وارکان وزارت کم ازکم اس قدر، تو سمجھتے ہی ہوں گے کہ اس لڑائی میں ان کی پوزیشن کیا ہے اور دشمن کی کیا، اسی کے ساتھ وہ اس سے بھی واقف ہوں گے کہ اگر وہ چھوٹی چھوٹی حکومتوں کی حفاظت کی ذمہ داری کو حسن وجوہ پورا نہیں کرسکتے تو اس کا سبب داخلی ہے یا خارجی، اس لئے ہم برطانوی حکومت کی موجودہ روش پر زیادہ سے زیادہ یہی نقد وتبصرہ کرسکتے ہیں کہ اگر اس کا سبب واقعی کوئی اندرونی کمزوری نہیں ہے تو اسے اپنی بیرونی پالیسی کو بھی مضبوط بنانا چاہئے اگر اسپین میں جمہوریت کی تباہیاں اور حبشہ میں فاسسٹی حکومت کی زیادتیاں اس کے ضمیر کو اجازت دے سکتی ہیں، لیکن اگر اس کا سبب کوئی اندرونی احساس ہے تو حکومت برطانیہ کو سمجھ لینا چاہئے کہ اب وہ زمانہ لوٹ کر نہیں آسکتا کہ پریسیڈنٹ ولسن کے چودہ نکاتِ صلح کو تسلیم کرنے کے بعد بھی عملًا اُن کو مردود قرار دیدیا جائے اور دُنیا بدستور ملوکیت کے چنگل میں پھنسی رہے

یہ جنگ حقیقتًا آخری معیار ہے جس پر کھوٹے کھرے کو ہمیشہ علٰحدہ علٰحدہ کردیا جاتا ہے اور اگر اتحادئین نازیت کی بلا کو دُنیا سے دور نہ کرسکے تو اس کا سبب صرف یہ ہوگا کہ اس کسوٹی پر کسے جانے کے بعد ان کی جمہوریت کا سونا کھوٹا نکلا

ہم کو یقین ہے کہ اس جنگ میں برطانیہ کو کامیابی حاصل ہو یا نہ ہو لیکن نازیت کو ضرور شکست ہوگی، لیکن یہ شکست نتیجہ ہوگی ایک ایسے زبردست انقلاب کا جو دنیا میں اکثر حکومتوں کی کارگاہ کو درہم برہم کرکے رکھدیگا اور سیاسی دسیسہ کاریوں کو ہمیشہ کے لئے ختم

گوشس نزدیک لبم آر کہ آوازے ہست !

ہندوستان کی موجودہ سیاسی فضا

بہت مکدر ہے۔ مسلم لیگ کی پاکستان والی اسکیم کے خلاف خود مسلمانوں نے جتنا اور جو کچھ اظہار خیال کیا ہے، وہ ایک سننے والے کان اور دیکھنے والی آنکھ کے لئے بہت کافی ہے، لیکن

گوش سخن شنو کجا ، دیدۂ اعتبار کو ؟

اس طفلانہ تحریک کے خلاف آزاد مسلم کانفرنس اپنا فیصلہ کرچکی ہے جسے جمہور مسلمین کا فیصلہ سمجھنا چاہئے، لیکن ہم جانتے ہیں کہ "مسٹر جینا اینڈ کو" کا "مقتضائے طبیعت" کیا ہے اور وہ کبھی اپنی ضد سے باز نہ آئیں گے۔ اس کے آگے نہ سوچنے کی ضرورت ہے نہ کہنے کی،

تو خود حدیث مفصل بخواں ازیں مجمل

لارڈ زٹلینڈ کا فیصلہ آپ کے سامنے موجود ہے، ہندوستان بدستور غلام بنا رہے گا اور صرف اس لئے کہ مسلم لیگ یہی چاہتی ہے۔ اس سے زیادہ کامیابی مسلم لیگ کی اور کیا ہوسکتی ہے !

ہفتہ وار جنگ

کے اجراء کا خیال ترک کردیا گیا، کیونکہ اسکی موافقت کرنے والا حلقہ، ان مصارف کو دیکھتے ہوئے جو میرے سامنے تھے تنگ ثابت ہوا لیکن کوشش کیجائیگی کہ خود نگار میں جنگ ومتعلقات جنگ پر ہر مہینے مفید مضامین شایع ہوتے رہیں چنانچہ اشاعت حاضرہ میں بھی علاوہ ملاحظات کے ایک دو مقالے آپ کو نظر آئے گا جس میں بتایا گیا ہے کہ ناکہ بندی سے جرمنی کو شکست دینے کا امکان بہت ضعیف ہے۔

"عربوں کی سیاسی بیداری" کا سلسلہ اسی قبیل کی چیز ہے جس کی آیندہ دو قسطیں بہت اہم ہیں۔ آیندہ مہینے سے روس اور اسکی اشتراکیت پر بھی ایک سلسلۂ مضامین شروع کیا جائے گا۔

فنِ تحریر و صحافتِ عرب

فنِ تحریر و صحافت کا رواج تہذیب و تمدن کے لئے پہلا سنگ بنیاد ہے۔ یہ ہر زمانہ میں علوم و معارف کا سرچشمہ رہا اور انسان کی ذہنی اور دماغی ترقی کے لئے ہمیشہ نمایاں خدمات انجام دیتا رہا۔ اُس نے نہ صرف قدماء کے نتائجِ افکار اور اُن کے علمی سرمایہ کو محفوظ رکھا بلکہ ہمارے لئے اس نے ایسے اسباب مہیا کر دئے جن سے ہم نہایت آسانی کے ساتھ اپنے دائرۂ معلومات کو وسعت دے سکتے ہیں۔

اگر دنیا اس فن سے محروم ہوتی تو قیاس نہیں کیا جا سکتا کہ انسان آج جہالت و وحشت کے کس تاریک گڑھے میں سرنگوں پڑا ہوتا۔ ہم میں چونکہ اس فن کا رواج کافی ہو چکا ہے اس لئے ہمیں اس کی اہمیت کا صحیح اندازہ نہیں ہوتا۔ لیکن اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ انسان نے جس قدر حیرت انگیز علوم و فنون ایجاد کئے ہیں، اُن سب میں نوشت و خواند کو جو اہمیت حاصل ہے کسی اور کو نہیں۔

فنِ تحریر تحریر ایک آرٹ ہے جس سے حروفِ مفردہ کی صورت اور ترتیب ظاہر ہوتی ہے، جو بغیر کسی اشارہ لفظی و معنوی اپنے مفہوم کو ادا کرتا ہے۔

تکوینِ عالم کے بعد انسان کے لئے باہم تبادلۂ خیالات کا وسیلہ صرف زبان تھی لیکن جب علوم و فنون کی ترقی ہوئی اور قوتِ حافظہ انسان کے اُس علمی سرمایہ کو محفوظ رکھنے سے قاصر رہی جو اُس نے اپنے بزرگوں سے روایت و سماعت کے ذریعہ حاصل کیا تھا، تو وہ تحریر و کتابت کا طریقہ معلوم کرنے پر مجبور ہوا۔ جس کی وجہ سے ہزاروں برس کے علوم و فنون وجود میں آ گئے۔

کاغذ کی ایجاد سے پہلے عموماً مکان کی دیواروں پر کتابت کی جاتی تھی لیکن جب کوئی زبردست قوم دوسری کمزور قوم کو جبراً قہراً اُن کے ملک سے نکال دیتی تھی تو وہ حسرت سے در و دیوار پر اپنے نقوش دیکھ کر رہ جاتے تھے۔ اسلئے لوگوں نے بعد میں مٹی کی خام سلوں، چوکوں اور ظروف پر لکھنا شروع کیا جن کو وہ آگ میں پکا لیتے تھے۔

اس قسم کا کُلّی ذخیرہ محکمۂ آثارِ قدیمہ نے پہلے مصر سے اُس کے بعد بابل سے بکثرت برآمد کیا۔ جس میں بڑا حصہ اینٹوں کا ہے، کُلّی دور کے ختم ہونے پر جب زمین سے معدنیات کا خزانہ نکل آیا تو لوہے، تانبے، سیسے اور پیتل کے

پتروں پر کتابت شروع ہوئی۔ جس کے ہزاروں نمونے اب بھی موجود ہیں۔

لیکن جب حضرت قلم نے فلزات کی تختیوں پر چلنے سے انکار کر دیا اور بجائے سنگلاخ زمین کے نرم زمین کی ضرورت پڑی تو حکماء مصر نے تقریباً پانچ ہزار برس قبل مسیح کاغذ ایجاد کیا اور رفتہ رفتہ کتابت کاغذ ہی پر ہونے لگی

فنِ تحریر کی تاریخ یہ عجیب بات ہے کہ فنِ تحریر نے ہماری تاریخی اور قومی روایات محفوظ رکھ کر ہمارے ہاتھوں تک پہونچا دی مگر خود اُس کی صحیح تاریخ آج تک معلوم نہ ہو سکی، پیدائش زبان کی طرح فنِ تحریر کے نشو و نما کا قصہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔

فنِ تحریر کے رواج نے کچھ ایسا حیرت انگیز انقلاب پیدا کر دیا ہے کہ لوگوں نے ایجاد تحریر کو انسانی طاقت سے بالاتر خیال کر کے اُسے خدا کی طرف منسوب کر دیا، ہر مذہب میں اس قسم کی روایات ملتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ فنِ تحریر الہام ربانی سے انسان کو سکھایا گیا۔

مسلمانوں کے یہاں بھی اس قسم کی روایات موجود ہیں جن سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے علامہ جلال الدین سیوطی نے اس قسم کی تمام روایات جو اس مبحث سے تعلق رکھتی ہیں۔ اپنی کتاب "المزہر" میں جمع کر دی ہیں۔

بہر حال اس سوال کا جواب کہ "فنِ تحریر" کی ابتدا کب اور کیونکر ہوئی؟ مشکل ہے۔ علامہ ابن ندیم کی روایت سے البتہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ[1] حضرت آدم نے پہلے اپنے "صحائف" کچی اینٹوں پر لکھے، پھر یہ اینٹیں آگ میں پکائی گئیں تاکہ یہ آسمانی ذخیرہ فنا ہونے سے محفوظ رہے۔ مگر حضرت آدم کا یہ گلی کتب خانہ طوفان نوح میں غرق ہو گیا۔ جس کا بعد میں کچھ پتہ نہ چل سکا۔

بعض محققین یورپ کی تصانیف سے البتہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ بابل کے بعض کھنڈرات سے اس قسم کے گلی کتب برآمد ہوئے ہیں جن کے موجد در اصل حضرت آدم تھے۔

اگر یہ روایات صحیح ہیں تو ظاہر ہے کہ فنِ تحریر دنیا میں اُسی وقت سے موجود ہے جب سے انسان کا وجود تسلیم کیا جاتا ہے مگر اب بھی یہ بات غور طلب رہ جاتی ہے کہ وہ تحریر جو انسان کے اولین دورِ حیات میں پائی جاتی تھی اُس کی شکل و صورت کیا تھی؟

یہ ظاہر ہے کہ موجودہ "فنِ تحریر" کی ایجاد ایکدم سے وجود میں نہیں آئی۔ بلکہ رفتہ رفتہ اپنے اس اعلیٰ مرتبہ کو پہونچی ہے تاریخ کی اوراق گردانی بھی یہی بتاتی ہے کہ شروع میں انسان نے انتہائی غور و فکر کے بعد نقاشی سے کام لیا اور حالات و جذبات کی ترجمانی کے لئے اُس نے ہزارہا تصویریں بنا ڈالیں، جس طرح آج کل بھی

---

[1] کتاب الفہرست لابن ندیم، مقالہ اول صفحہ ۴ مطبوعہ جرمنی

کارٹون وغیرہ سے بہت سے کام لئے جاتے ہیں - اس سادہ وقائع نگاری کو "دور صوری" کہتے ہیں -

بعد ازاں دنیا جیوں جیوں تہذیب و تمدن میں ترقی کرتی گئی اُسی قدر یہ جدت طرازی ناکافی ثابت ہوتی گئی - اس لئے مجبوراً انسان نے "حروف ہجا" ایجاد کئے اور اُن کی ترکیب سے الفاظ بننا شروع ہوئے - یہ زمانہ "دور حرفی" تھا، جس نے تصویر کشی کی زحمت کو بھی ختم کر دیا -

تصاویر کے ذریعہ سے جو خط جاری ہوا تھا اُس کا نام "خط ہیروغلیفی" تھا - بعد میں اُس کی دو قسمیں ہوگئیں "ہیراطیقی" (Heretic) جس کا تعلق مذہب سے تھا - دوسری قسم "دیموطیقی" (Teotonic) اُس کا تعلق عام کتابت سے تھا -

کچھ عرصہ کے بعد ان دونوں قسموں کی بھی دو قسمیں ہوگئیں - ایڈوگرافک (Ideographic) یعنی خیالات کا ظاہر کرنے والا - جس سے تصویر کی جسامت روز بروز کم ہوتی گئی اور خط رواں ہوتا گیا - دوسری قسم فونک (Phonic) یعنی کاشف الصوت جس کی وجہ سے اُبھری، دُہری آوازوں کے الفاظ جداگانہ لکھے جانے لگے اس آخری قسم سے "حروف ہجا" کی اصلیت وابستہ ہے -

"حروف ہجا" کی ایجاد ہوتے ہی خطِ عبرانی، سریانی، نبطی اور حمیری بہت سے خطوط پیدا ہوگئے اور اپنے اپنے زمانہ میں کچھ نہ کچھ اصلاح کے بعد ترقی کرتے رہے، یہاں تک کہ عربوں نے "خط کوفی" ایجاد کیا اور خطِ کوفی سے موجودہ "خطِ نسخ" تیار ہوا - یہ ہے فنِ تحریر کی مختصر تاریخ -

حروف ہجا حروف ہجا کی تعداد اٹھائیس ہے لیکن اگر "لام الف" کا اضافہ کر دیا جائے تو کل اُنتیس ہو جاتے ہیں - یہ دراصل چوتھی صدی عیسوی کا اضافہ ہے، علماء ادب نے حروف ہجا کی ترتیب مندرجۂ ذیل رکھی ہے -

ابجد، ہوز، حطی، کلمن، سعفص، قرشت، ثخذ، ظغس - یہ ترتیب بچوں کی تعلیم کے لئے قائم کی گئی تھی - ابن مقلہ نے سہولت کے خیال سے اس قدیم ترتیب کو بدل دیا، اُس نے تمام حروف کو علٰحدہ علٰحدہ لکھا اور باہم امتیاز پیدا کرنے کے لئے اُن پر نقطے بھی لگا دئے

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ "حروف ہجا" کے موجد "فنیقی" ہیں مگر انھیں خود اس بات کا اعتراف ہے کہ انھوں نے اہل مصر سے سیکھا ہے پر ہم جب مصر کا بابل عروج سے مقابلہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہاں مصر سے ہزاروں برس پہلے فنِ تحریر آخری منزل طے کر چکا تھا اس اعتبار سے اہل بابل کو سب پر تفوق حاصل ہے -

اہل بابل کے متعلق یہ بات مشہور ہے کہ درحقیقت وہ قوم عاد یعنی "عرب" کے ابتدائی باشندے تھے - اس لئے اہل عرب ہی "حروف ہجا" کے جو "فنِ تحریر" کے لئے "اجزائے لاتیجزیٰ" ہیں موجد قرار پاتے

ہیں اور یہ قوم عرب کا اتنا بڑا کارنامہ ہے جس پر وہ جس قدر بھی فخر کریں کم ہے۔

شانِ تحریر سریانی، عبرانی اور عربی خطوط دائیں جانب سے لکھے جاتے ہیں جو عین فطرت کے مطابق ہے اس لئے کہ حرکتِ طبعی دائیں جانب سے بائیں جانب کی طرف ہوتی ہے۔ لیکن ہندی، قبطی، رومی اور مغربی اقوام میں کتابت کا رواج بائیں جانب سے دائیں جانب ہوتا ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ خون کا دوران قلب سے شروع ہوتا ہے جو بائیں جانب ہے۔

عربوں میں فنِ تحریر کے اسبابِ ترقی فنِ تحریر، تہذیب و تمدن کے لئے ایک لازمی چیز ہے، اسلام سے پہلے دولِ عرب یمن، حیرہ اور شام، تمدن و تحضر سے خالی نہیں لیکن افسوس ہے کہ ان اقوام متمدنہ کے کسی مکتوب سے ہمیں واقفیت نہیں۔ تاریخ سے دولت حیرہ کے صرف ایک کاتب "عدی بن زید" کا پتہ چلتا ہے، زمانہ جاہلیت کے مکتوبات بھی ہم تک نہیں پہونچے، اس لئے ہم صحیح طور پر نہیں بتا سکتے کہ اُن کا طرز تحریر کیا تھا، لیکن عام طور سے عرب خطِ نبطی اور سریانی میں لکھا کرتے تھے۔

عہدِ اسلام کے اوایل میں لوگ فنِ تحریر سے زیادہ واقف نہ تھے، آنحضرت صلعم چونکہ خود امی تھے اس لئے نزولِ وحی کا سلسلہ شروع ہونے پر اُنھیں کاتبوں کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اتفاق سے اُسی زمانہ میں غزوۂ بدر ہوا، قیدیوں میں ستر اشخاص ایسے تھے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ رسول خدا نے ان قیدیوں کو رہا کر دینے کا وعدہ کیا بشرطیکہ ان میں سے ہر ایک دس دس مسلمانوں کو لکھنا سکھا دیوے، اس طرح تھوڑے ہی عرصہ کے بعد مسلمانوں میں اس فن سے واقفیت رکھنے والے سات سو کاتبوں کا معتدبہ اضافہ ہوگیا۔

یہ گویا "فنِ تحریر" کا پہلا مدرسہ تھا جو مدینہ منورہ میں قایم ہوا اس دور کے کاتبوں میں زید بن ثابت، عبداللہ بن الزبیر، سعد بن العاص اور عبدالرحمٰن بن الحارث خاص شہرت کے مالک تھے جنھوں نے مصاحف عثمانی بھی لکھے تھے۔

خلافت راشدہ میں جب فتوحات کا دائرہ وسیع ہوگیا اور تمدن نے غیر معمولی ترقی کی تو ایک ربع صدی کے اندر سیکڑوں کاتب اور منشی پیدا ہو گئے۔

عہد بنی اُمیہ میں فنِ تحریر نے اور ترقی کی اور وہ بجائے خود ایک مستقل فن بن گیا۔ یوں تو ہر لکھنے والے کو کاتب کہہ سکتے ہیں لیکن جب اُس نے ایک مستقل فن کی صورت اختیار کر لی، تو لفظ "کاتب" سے ایک خاص قسم کی قابلیت رکھنے والا شخص مراد ہونے لگا۔ جیسا کہ مفسر، محدث، فقیہہ وغیرہ سے ایک خاص علم کا ماہر مراد ہوتا ہے۔

اس عہد میں ایسے ماہرِ فن، کاتبین کی تعداد اچھی خاصی گزری ہے جن میں سے "عبدالحمید بن یحییٰ" بہت

مشہور کاتب گزرا ہے، جو ایک خاص طرز کا موجد بھی تھا۔ اس کو فنِ تحریر کا اُستادِ اول مانا جاتا ہے اور اُس کا نام بطور ضرب المثل مشہور ہے۔

خلافت بنی اُمیہ کے زوال کے بعد جب اسلامی حکومت عباسیوں کے قبضہ میں آئی تو اس عہد میں علوم و فنون کے ساتھ ہی ساتھ فنِ تحریر نے بھی غیر معمولی ترقی کی۔

"ابو العباس سفاح" کے عہد میں جو دولت عباسیہ کا بانی تھا "ضحاک بن عجلان" شامی ایک نامور خوشنویس گزرا ہے جس نے قدیم رسم الخط میں بہت کچھ اصلاح کی، اُس کے بعد خلیفہ "منصور عباسی" کے زمانہ میں "اسحاق بن حماد" ایک مشہور خطاط پیدا ہوا، اُس نے ضحاک کے اصلاح کردہ رسم الخط میں اور بھی خوبصورتی پیدا کی پھر خلیفہ "مہدی عباسی" کے زمانہ میں "خلیل ابن احمد" نحوی، ایک نامور فاضل پیدا ہوا جس نے قدیم رسم الخط پر سب سے زیادہ توجہ کی اور تکمیل کے درجہ تک پہونچا دیا۔

خط کوفی کچھ عرصہ کے بعد علامہ "علی بن حمزہ" کسائی نے اس فن پر خصوصیت کے ساتھ توجہ کی اور خلیل نحوی ہی کے اصلاح کردہ رسم الخط میں حسنِ کتابت کی ایسی شان پیدا کر دی جس سے اس کو عام مقبولیت حاصل ہوگئی، اُس کے اصلاح کردہ رسم الخط کو "کوفہ" والوں نے بہت سراہا اس لئے اُس کا نام "خطِ کوفی" پڑ گیا۔

کسائی نے ۱۸۲ھ میں انتقال کیا۔ وہ خلیفہ "مامون الرشید" کا اُستاد تھا۔ مامون کو قدیم خطاطوں کی لکھی ہوئی وصلیاں جمع کرنے کا بہت شوق تھا، اُس کی لائبریری میں عہد قدیم کے جملہ خطوں کے نمونے موجود تھے۔

خطِ نسخ باوجود اِن تمام ترقیوں کے زمانہ کو "ابن مقلہ" کی شدید ضرورت تھی، اِس فخرِ روزگار کاتب کا نام "ابو علی محمد بن علی" تھا۔ لقب "ابن مقلہ" تھا۔ اُس کی ولادت ۲۷۲ھ میں ہوئی۔ عالمِ شباب میں تکمیل علوم و فنون کے بعد جب اقبال یاور ہوا تو خلیفہ "القاہر باللہ" عباسی کا وزیر مقرر ہوا، اور جب ادبار آیا تو ہاتھ کے ساتھ زبان بھی کاٹ ڈالی گئی اور قید کر دیا گیا۔ اسی حالت میں ۳۲۹ھ میں انتقال کر گیا۔

اُس کے زمانہ تک گو "خط کوفی" میں غیر معمولی ترقی ہو چکی تھی مگر اس خط میں نمایاں شان اور دلفریبی "ابن مقلہ" ہی کا حصہ تھا۔ اُس نے کسائی اور متاخرین کی وصلیوں سے فایدہ اُٹھا کر ۳۱۰ھ میں "خطِ نسخ" ایجاد کیا جس نے تمام قدیم رسم الخط کو مٹا کر اپنا سکہ جما دیا۔

موجودہ حرکات و سکنات زبر، زیر، پیش، جزم، تشدید اور تنوین، ابن مقلہ ہی کی ایجاد ہیں۔ رفتہ رفتہ ان حرکات و سکنات کا رواج عام ہوتا گیا، حتیٰ کہ اب ان کا پورا لحاظ رکھا جاتا ہے اور اس قسم کی غلطی طباعت کا بڑا نقص سمجھی جاتی ہے۔

اسلامی دنیا میں ابن مقلہ کا ایجاد کردہ "خطِ نسخ" اس قدر مقبول ہوا جس نے قدیم رسم الخط پر قلم پھیر دیا۔

اُس کا انتہائی کمال یہ تھا کہ جب اُس کا دایاں ہاتھ کاٹ ڈالا گیا تو وہ کہنی میں کھپچی باندھ کر لکھا کرتا تھا، اس حال میں بھی اُس نے جو کچھ لکھا تھا وہ بجائے خود لاجواب تھا۔

ابن بوّاب

ابن مقلہ کی وفات سے تقریباً چوراسی سال بعد ایک اور نامور کاتب "ابوالحسن علی" پیدا ہوا اس کا باپ "ہلال" امیر بویہ کے دروازہ پر چوکیدار تھا، اسی نسبت سے وہ "ابن بوّاب" کے لقب سے مشہور ہوا۔ یہ کس کو خبر تھی کہ بعد میں "ابن ہلال" آسمان شہرت پر بدرکامل بنکر چمکے گا اور دنیا اُس کے نور سے جگمگا اُٹھے گی۔

ابن بوّاب دراصل ابن مقلہ کا معنوی شاگرد تھا اس لئے کہ اُس کو سمسانی اور محمد بن آسد سے شرفِ تلمذ حاصل تھا جو ابن مقلہ کے شاگرد رشید تھے، اسی وجہ سے ابتدا میں اُس کی بھی شانِ تحریر ابن مقلہ کی جیسی تھی لیکن بعد میں اُس نے خطِ نسخ میں جو خامیاں رہ گئیں تھیں اُن کی اصلاح کی اور اُس میں وہ حسن پیدا کیا جو سب پر فوقیت لے گیا۔

ابن خلکان اور امام یافعی کا متفقہ فیصلہ ہے کہ متقدمین اور متاخرین میں سے کوئی کاتب ابن بوّاب کے مرتبہ کو نہیں پہونچا۔ ابن مقلہ اگرچہ خطِ نسخ کا موجد ہے لیکن اُس کی تہذیب اور حسن وجمال کا سہرا ابن بوّاب ہی کے سر رہا۔

یہ مشہور روزگار خطاط ۴۱۳ھ میں فوت ہوا آج دنیا میں جہاں سے جہاں تک "خطِ نسخ" جاری ہے وہ سب طفیل ہے ابن مقلہ اور ابن بواب کی کوششوں کا۔ سچ تو یہ ہے کہ دنیائے عرب پر ان دونوں کاتبوں کا ایک ایسا احسان ہے جس کو وہ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

صحافت

زمانۂ جاہلیت میں نہ کوئی علم مدون ہوا اور نہ کوئی کتاب تصنیف کی گئی، عربوں کی سب سے قدیم کتاب "قرآن پاک" ہے۔ کچھ معاہدات و فرامین اور وہ خطوط بھی آنحضرت صلعم کے زمانہ میں جمع کرلئے گئے تھے جو آپ نے مختلف سلاطین و امراء کے پاس روانہ فرمائے تھے۔

خلفاء راشدین کے عہد میں اسی تحریری ذخیرہ کے اندر "احادیث" کا کچھ اور اضافہ ہوا، لیکن کسی قسم کی تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع نہیں ہوا۔ اُسوقت سوائے "کتاب اللہ" کے کسی اور کتاب کا وجود نہیں تھا

عہد بنی اُمیہ میں سب سے پہلے "عبید بن شریہ" نے قدماء کی تاریخ پر ایک کتاب تصنیف کی جس کا نام تھا۔ "کتاب الملوک و اخبار الماضیین" افسوس ہے کہ یہ کتاب ضایع ہوگئی جس کا اب کہیں پتہ نہیں۔

عبید بن شریہ کے بعد عہد اموی میں اور بڑے بڑے اہل قلم اور فنِ صحافت کے ماہر پیدا ہوئے جو ہمیشہ سلاطین و امراء کے دربار سے وابستہ ہوتے تھے اور اُمور مملکت میں ہمیشہ ان کی طرف سے قوم و ملک کے

سامنے پروپیگنڈہ کرتے رہتے تھے۔ "عبد الحمید بن یحیٰ" جس کا پہلے بھی ذکر آچکا ہے اس دور کا آخری صاحب قلم اور فنِ صحافت کا ماہر اُستاد تھا۔

ابو مسلم خراسانی نے جب بنو عباس کے لئے پروپیگنڈہ شروع کیا تو عبد الحمید نے دور اموی کے آخری تاجدار "مروان" کی طرف سے اُس کو ایک طویل خط لکھا اور مروان سے کہا کہ میں نے ابو مسلم خراسانی کو ایسا خط لکھدیا ہے کہ جب وہ اُسے پڑھے گا تو اُس کی ساری تدبیریں بیکار ہو جائیں گی۔ لیکن یہ خط جب ابو مسلم کے پاس پہونچا تو اُس نے بغیر پڑھے جلوا ڈالا اور مروان کو لکھ بھیجا:-

محا السیف الستار البلاغۃ وانتحیٰ،
علیک لیوث الغاب من کلِ جانب

دورِ عباسیہ میں بے شمار علماء و فضلاء، بڑے بڑے اہلِ قلم اور فنِ صحافت کے ماہر پیدا ہوئے تصنیف و تالیف کا باقاعدہ محکمہ قایم ہوا۔ جس میں علوم شرعیہ اور علوم لسانیہ پر بہت سی کتابیں تصنیف کی گئیں۔ علم تاریخ کی بھی تدوین ہوئی، علوم یونانی کے بھی ترجمے کئے گئے اور علوم عقلیہ و نقلیہ کی ہزارہا کتابیں تصنیف ہوگئیں جو آجتک ہمارے لئے سرمایۂ صد افتخار ہیں۔

جلیل الرحمٰن اعظمی

"نگار" کے پُرانے پرچے

نگار کے مندرجۂ ذیل پرچے دفتر میں موجود ہیں جن کی دو دو تین تین کاپیاں دفتر میں رہ گئی ہیں جن اصحاب کو ضرورت ہو طلب کرلیں۔ قیمتیں وہی ہیں جو سامنے درج ہیں:-

(سنہ ۲۶ء) جنوری ۵ر — (سنہ ۳۰ء) مئی ۴ر — (سنہ ۳۱ء) جولائی تا دسمبر ۴ر فی پرچہ (سنہ ۳۲ء) جنوری ۱۲ر فروری تا دسمبر (علاوہ اپریل، اگست و اکتوبر) ۴ر فی پرچہ — (سنہ ۳۳ء) فروری و جولائی ۴ر فی پرچہ۔ اکتوبر ۵ر، (سنہ ۳۶ء) جنوری ۱۲ر — فروری تا دسمبر (علاوہ مئی تا اکتوبر) ۵ر فی پرچہ — (سنہ ۳۷ء) جنوری عہ ۔ مارچ اگست ۶ر فی پرچہ — (سنہ ۳۹ء) پورا فایل صہ ر۔

منیجر نگار لکھنؤ

سوویٹ ادبیات میں اشتراکی "واقعیت"

یہ سلسلۂ مضامین خود روسی مصنفین کے مضامین سے ماخوذ ہے۔ ممکن ہے اس مطالعے سے ہمارے "پرانے اسکول" کے ادیب "واقعیت نگاری" کا منشا سمجھ سکیں اور "نئے لکھنے والے" محسوس کر سکیں کہ خود سوویٹ مصنف بھی اپنے پرانے ادب کو ترک نہیں کر سکا اور اسوقت وہ جو کر رہا ہے "انقلاب" کے بعد کر رہا ہے۔ قبل انقلاب اُس کی حالت بھی ہماری موجودہ حالت سے مختلف نہ تھی۔

ل - احمد

بورژوا[1] طبقے کا پرانا عقیدہ تھا کہ پرولتاریا[2] جماعت تخریب تو کر سکتی ہے لیکن تعمیر کی اہل نہیں۔ لیکن روس کے پہلے پنجسالہ پلان کی کامیابی نے اس روایتی عقیدے کو غلط ثابت کر دیا ہے۔

چنانچہ ۱۹۳۳ء میں سنٹرل کمیٹی اور سنٹرل کنٹرول کمیٹی کے عام اجلاس میں اسٹالن نے اپنی رپورٹ پیش کرتے ہوئے کہا کہ :-

"پنجسالہ پلان کے نتائج نے ثابت کر دیا ہے کہ محنتی طبقہ نئی تعمیر کا اُسی قدر اہل ہے جتنا کہ پرانی عمارت کو ڈھا دینے کا۔"

ہمیشہ سے بورژوا طبقہ اس خیال و عقیدہ پر اڑا ہوا تھا کہ محنتی طبقہ اقتصادی اور حرفتی تخلیق ہی کی استعداد سے محروم نہیں بلکہ وہ کلچر، صناعت اور ادب میں بھی کوئی تخلیقی اہلیت نہیں دکھا سکتا۔ لیکن اس "روایتی" عقیدے کے باوجود محنتی طبقے نے (کسانوں مزدوروں ہی میں سے) اپنی سولہ سال کی ڈکٹیٹری کے زمانے میں بہت سے اہل قلم اور ادیب پیدا کر دکھائے ہیں اور سوویٹ یونین میں ایک نیا ادب جو متمول ہونے کے ساتھ متنوع بھی ہے، پیدا ہو گیا ہے یہ ادب پرانے "انقلابی" ادب اور نئے بورژوا ادب، دونوں سے بالکل مختلف اور جداگانہ ہے۔ انقلاب سے قبل روس کا ادب یعنے اُس بورژوا روس کا ادب جس میں "سرفیت" (کسانوں کی موروثی غلامی) جاری تھی، اگر دیکھا جائے گا اور اُس زمانے کے مصنفوں کی کتابوں پر سے رائے قایم کی جائے گی تو صاف نظر آئے گا کہ وہ ادب حکمراں

---

[1] و [2] Bourgeois یعنے سرمایہ دار جماعتیں اور Prolitaria یعنے محنتی جماعتیں۔

جماعت کے عندیات کا ترجمان ہے۔ یہ صناعت ادب اگرچہ حکمراں طبقوں کی پالیسی پوری کرتی تھی، لیکن اس کے اندر بورژوا طبقے کی فنا بھی جھلکتی تھی۔ کیونکہ قبل انقلاب کا یہ بورژوا ادب آخری حد تک قنوطی (Pessimistic) ہوگیا تھا۔ اس ادب کو مستقبل پر مطلق عقیدہ نہ رہ گیا تھا۔ وہ انسانیت کے صرف منفی پہلو کو دیکھ سکتا تھا اور اس ادب کی یہی خصوصیت تھی جس کے باعث قبل انقلاب کے ذہین طبقے میں سب سے زیادہ محبوب شاعر (Leonidandreyev) سمجھا جاتا تھا۔

انقلاب سے پہلے کا اشرافی (Aristocratic) اور بورژوا ادب زندگی سے کس قدر مایوس تھا، اس کے جواب میں (Pablok) کا ایک شعر سنا دینا کافی ہے:

"بیس سال کی عمر میں، میں ایک روغن کی ہوئی لاش تھا"

یہ وہ ادب تھا جس کے اندر حقیقی اور زندہ جذبات کی جگہ ایک نہایت مصنوعی و مردہ احساسات پیش کئے جاتے تھے اور ادیب ان احساسات کو بیان کرنے میں "زندگی" کو بھلا دینا چاہتا تھا۔ عندیات کے اعتبار سے یہ ادب روز بروز دیوالیا ہوتا جا رہا تھا: (V. Brysov) مختصر یہ کہتا ہے کہ اُس نے:

"بہتوں سے غداری کی" اور اس نے "میدان جنگ میں جھنڈے کو چھوڑ دیا"

ایسے بورژوا ادب میں جس کا کوئی نصب العین نہ ہو، جو زندگی سے رشتہ توڑ چکا ہو، جو بناوٹی احساسات کا ادب ہو، اُس ادب میں اگر خلاف "واقعیت" صناعت کو اتنی زبردست قبولیت ملجائے تو حیرت کی بات نہیں۔

قبل انقلاب کا بورژوا ادب "واقعاتی مرقعوں" کا مذاق اُڑاتا تھا۔ اور اُس ادب کے روایت پرست یہ تعلیم دے رہے تھے کہ دُنیا کا بیان اس طرح ہونا چاہئے کہ اُس کی فہم دشوار ہو۔ چنانچہ ایک مبہم قسم کی بعید المعانی انشاء وجود میں آرہی تھی۔

لیکن اس مسموم ماحول میں چند اہل قلم ایسے بھی تھے جن کے ادب کی جڑیں محنت کش اور مظلوم انسانوں کی زندگی کے اندر پھیل رہی تھیں اور جو آیندہ ایک بہتر زندگانی پالینے کی جد وجہد میں لگے ہوئے تھے۔ ان پرولتاری مصنفوں میں سب سے پہلا نام میکسم گورکی کا ہے۔ ان چند ادیبوں نے اُسوقت بھی وہ ادب پیش کیا جو سمجھ میں آتا تھا، جو عوام سے قریب تر تھا اور سچے احساسات کی بنا پر زندگی کے تجربوں سے مالا مال تھا۔

سوویٹ ادب، طبقاتی جد و جہد کے ماحول میں پھلا پھولا اور طاقتور بنا۔ اور انقلاب کے ابتدائی سالوں میں بہت سے اہل قلم اپنے ادب کو اُن خیالات و عقائد کے خلاف صرف کرنے میں لگے رہے جو انقلاب کے لئے مضرت رساں تھے۔ ادب کے اندر یہ طبقاتی جنگ تو ہنوز جاری ہے۔ مگر اب مزدوروں کا یہ دشمن کھل کے سامنے نہیں آتا، بلکہ ادب کے اندر مار آستین بن گیا ہے۔ حال ہی میں شاعر (Zabolodka) نے ظریفانہ اشعار میں

اشتراکی تعمیری زراعت کا مضحکہ اُسی طرح اُڑایا ہے جیسے زمیندار طبقہ (Kulak) اُڑاتا تھا۔ اسٹالن نے ایسے اہل قلم کو "اندر ہی اندر (خون) چوسنے والا" کہا ہے۔ لیکن ایسی مثالیں بہت کم ہیں۔ کیونکہ اب حالات واسباب پرولتاریا کے زیادہ موافق ہو گئے ہیں۔

سوویٹ طاقت کے وجود میں آنے کے بعد سے، مزدوروں اور کسانوں کی جماعتوں میں اہلِ قلم کی بڑی تعداد پیدا ہو گئی اور ہو رہی ہے۔ علاوہ بریں ذہین طبقے کے اُن اہلِ قلم کی بڑی تعداد جو کسی پارٹی میں شامل نہ تھے اشتراکی تعمیر کی جدوجہد میں شریک ہو گئی ہے۔

C. P. S. U. کی مرکزی کمیٹی ادبی پیداوار کی طرف سے کسی وقت غافل نہیں رہتی اور اُسے ہر امکانی مدد پہونچاتی رہتی ہے اور یہی مقصد ہے کہ کمیٹی نے سوویٹ اہلِ قلم کی تنظیم کو بھی اشتراکی تعمیر کے کام میں ضروری قرار دیا، اور مصنفین کی ایک "یونین" قایم کر دی۔

چنانچہ آج سوویٹ مصنفین کی بہت بڑی تعداد اس کوشش میں لگی ہوئی ہے کہ ان کی دماغی وقلمی پیداوار نئے سماج کی تعمیر میں کار آمد ثابت ہو اور سوویٹ ادب کو محنتی جماعتوں اور اشتراکیت کے اعلیٰ اصول سے جو تعلق حاصل ہے، اُس نے اس ادب میں ایک شدید قسم کی زندگی پیدا کر دی ہے۔ چنانچہ قبل انقلاب کے ادب سے اس نئے ادب کا جب کبھی مقابلہ کیا جائے گا تو اس کی یہ خصوصیت نمایاں نظر آئے گی کہ اس کے اندر زندگی کے ساتھ ایک خاص نشوونما کی اہلیت بھی پائی جاتی ہے۔

ایک بلند پایہ سوویٹ ادیب اس حقیقت پر فخر کرتا ہے کہ اُس کے ادب میں لکھوکھا مزدوروں اور کسانوں کے ولولوں اور آرزوؤں کا، اُن کی جدوجہد اور فتحمندیوں کا، اظہار ہے۔ سوویٹ ادب "زندگی" کا جتنا پیاسا ہے، اس کا اندازہ کرسکنا دشوار ہے۔ اُس کی ہر گھڑی زندگی پر رہتی ہے اور وہ ہر وقت زندگی سے سبق لیتا رہتا ہے اور کسی سوویٹ مصنف کا قلم ایسے موضوع پر نہیں چلتا جس کی نوعیت اشتراکی نہ ہو یا اُس موضوع پر اس کا مطالعہ کامل نہ ہو۔

اور یہ مصنف زندگی کا یہ علم خود اُس زندگی میں شامل ہو کر حاصل کرتے ہیں۔ تعمیری کاموں میں، زراعت میں فیکٹریوں اور کارخانوں میں، کام کرکے یہ علم حاصل کیا جاتا ہے اور سوویٹ ادب کے اس قدر بشاش اور زندہ دل ہونے کا راز یہی ہے کہ لکھنے والا اُس جمِ غفیر کی زندگی سے رشتہ جوڑ لیتا ہے جو اپنی زندگی کو نئے سرے سے منظم کر رہا ہے

اس پرولتاریا ادب کی خاص خصوصیت یہ ہے کہ وہ زندگی کے رجائی (Optimistic) پہلو کو دیکھتا ہے اور اس طرح یہ دنیا کے حزنی ادب کی مشکلوں کو بھی حل کر دیتا ہے۔ مثال کے طور پر موت ہی کے مسئلہ کو لیجئے کہ پچھلے زمانے کے ادب میں اس سوال نے بے حد مایوسی کا اظہار کرایا ہے اور کبھی ختم نہ ہونے والی آہ وزاری نے زندگی کو بے معنے ٹھیرا دیا ہے۔ موت ہی کا ڈر تھا کہ ٹالسٹائی سا زندگی کا پجاری انسان، دنیا کی خوشیوں کو تیاگ کر

گوشہ نشین ہو گیا!

سوویٹ ادب اس بات کو مانتا ہے کہ مرنے والے کی موت اس کے دوستوں عزیزوں کے لئے واقعی رنجدہ ہے، کیونکہ یہ فطرت ہے، لیکن موت اس کے سامنے ایک جدوجہد کی صورت میں آتی ہے۔ اس ادب کی نظر میں ایک ایسی موت جو نوعِ انسان کے لئے جلد سے جلد مسرت حاصل کرنے کی فکر میں لاحق ہو وہ ایک "ذہین موت" ہوگی! اور ایسی موت، موت نہیں زندگی کا اثبات ہے! تصدیقِ حیات کی ایک علامت ہے! اس بات کی علامت ہے کہ زندگی کے لئے بہترین نظام کو ممکن العمل بنا لینے کی کوششوں کو چند در چند کر دیا جائے۔

چنانچہ فیدیئیف کے ناول میں حامی انقلاب جماعت کا بہت بڑا حصہ سائبریا میں اسی نصب العین پر قربان ہو جاتا ہے۔ وشنفسکی کی کتاب (Optimistic tragedy) یا کولڈ دنوف کی (Post script) بھی اسی ذیل کی تصانیف ہیں۔

سوویٹ ادب کا مقصود یہ ہے کہ اشتراکی مسئلے کے حل میں صناعت ادب کار آمد ثابت ہو۔ چنانچہ اسی مقصود کے تحت سوویٹ ادب کی "واقعیت نگاری" انتہا کو پہونچ چکی ہے۔ اس اشتراکی واقعیت نگاری کو اس "واقعیت" سے مماثل سمجھنا ایک غلطی ہوگی جو فقید المثال اور منفرد باتیں پیش کرتی ہے۔ اشتراکی "واقعیت" اپنے ہیرو کو اسی کے ماحول میں پیش کرتی ہے اور دکھاتی ہے کہ افراد کی حرکت و عمل تاریخ کو بدل دینے میں کس درجہ موثر ہو سکتی ہے۔

ایسی کامیاب تصانیف میں شلوخوف کا ناول (Quite Don) روس میں سول وار کا زمانہ پیش کرتا ہے۔ اسی کا دوسرا ناول (Soil upturned) "سب ل" کھیتی کا ماحول پیش کرتا ہے۔ مزدوروں کے اندر "اشتراکی مقابلہ" یعنے سبقت لے جانے کی کوشش کا پورا مرقع کٹائیف کے ناول (Time forward) میں نظر آتا ہے۔ اور بھی بہت سی تصانیف ہیں جو اسی قسم کے ماحول اور حالات کی تصویریں کھینچتی ہیں۔

نیا سوویٹ ادب تاریخی موضوع کو بھی نہایت خوشی کے ساتھ قبول کرتا ہے۔ مگر ماضی کو وہ عوام کے نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے جن کے خیالات و نظریات کا وہ حامل ہے! سوویٹ مصنف جب تاریخ کا مطالعہ کرتا ہے تو اس کے سامنے اُس زمانہ کے جفاکش عوام کی حالت اور اُن طبقوں کا "سماجی منصب" بھی آتا ہے۔ اس کے برخلاف بورژوا ادب بالعموم اس پہلو کی طرف سے آنکھیں بند رکھتا ہے۔

حال میں جو تاریخی ناول شایع ہوئے ہیں، اُن میں (Tolstoy) کا "پیٹر اول" پیرو توئی کا "سیما" اور السوولیف کا "کمپلیٹ اُدرہال" بہترین سمجھے جاتے ہیں۔ آخر الذکر کے اندر قبل انقلاب روسی بیڑے کی حالت کا نقشہ دکھایا گیا ہے۔

"اشتراکی واقعیت نگاری" جسے سوویٹ ادب قایم کر رہا ہے، وہ اُنیسویں صدی کی "واقعیت نگاری" سے بالکل جدا چیز ہے میکسیم گورکی کی باریک بین نظر نے اِس فرق کو جس طرح دیکھا، وہ اُس نے انشاپردازوں کے مجمع سے گفتگو کے دوران میں ان لفظوں میں پیش کیا تھا:۔

"اُنیسویں صدی کی واقعیت نگاری تنقیدی تھی جس کا مقصد سماجی خرابیوں پر طعنہ زنی کرنا یا عیب دکھانا تھا، اسکے آگے وہ کوئی قطعی بات پیش نہ کرتی تھی۔ اشتراکی واقعیت نگاری کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ قطعی اور اثباتی پہلو کو پیش کرتی ہے، اور ہماری واقعیت نگاری کا قطعی اور اثباتی ہونا اُسے سوویٹ زندگی کے عیبوں کے خلاف جد وجہد سے باز نہیں رکھتا!"

چنانچہ سوویٹ ادب اعلےٰ اشتراکی عندیوں پر مبنی ہے اور یہ عندئے حقیقی صورت اختیار کر رہے ہیں۔ سوویٹ ادب حقیقی اور سچے ہیرو پیدا کرتا ہے، جو پُرانے ادب کے ہیرو کی طرح محض اخلاقی نظریات کے پتلے یا صرف معدوم کرنے والے ہیرو نہیں ہوتے بلکہ وہ خود "معمار" ہوتے ہیں، خلاق ہوتے ہیں، ایسے لوگ ہوتے ہیں جو ایک ایسی سماج کو منظم کر رہا ہے جس کے کردار، خیالات کی اُپج اور دولتمندی کا ثبوت ہوتے ہیں۔

بایں ہمہ، سوویٹ روس کے لکھنے والوں میں بورژوا مصنفین کی طرح اعلےٰ و ادنےٰ، قوی و کمزور لکھنے والے بھی ہیں۔ لیکن چونکہ سوویٹ مصنف کا رشتہ محنتی عوام اور اشتراکی حقیقتوں سے ہوتا ہے اور ہر سوویٹ مصنف ان حقیقتوں کے اظہار کی کوشش کرتا ہے، اس لئے کسی درجے کا بھی مصنف ہو اس کے اندر "نیا" ہونے کا وصف ضرور ہوتا ہے! لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ سوویٹ مصنف ادبی مشکلات سے دوچار نہیں ہوتا اور اُس کا کام سہل ہے۔

دنیا کے "روایتی" ادب میں بالعموم بادشاہ، اشراف، بورژوا، یا انفرادیت پرست (Individualist) ذہین انسان ہیرو ہوتا ہے، لیکن سوویٹ ادب کا ہیرو ایک بالکل ہی نئی ہستی ہے (کوئی مزدور یا کسان ہے جسنے استحصال بالجبر کی جھول اُتار پھینکی ہے) اور یہ حقیقت ہر سوویٹ مصنف سے ایک ایسا "نیا" کردار پیدا کرنے کا تقاضا کرتی ہے جس کی مثال پہلے سے موجود نہیں۔ چنانچہ یہی وہ خصوصیت ہے جو سوویٹ ادب کو "نیا ادب" بناتی ہے۔ سوویٹ ادب محض اس بنا پر "نیا" نہیں کہ اس کے اندر انشاء و بیان کی ندرت یا فنکاری ہے، بلکہ وہ "نیا" ہے اس لئے کہ اس میں نیا نظری و موضوعی مسالا ہے جو اس وقت تک کی تاریخ ادب میں مفقود تھا۔ اس ادب کے کرداروں سے دنیا اسوقت تک ناواقف تھی۔

سوویٹ ادب اپنے عیبوں یا کمیوں کی طرف سے بھی آنکھیں بند نہیں رکھتا۔ بولشویک "خود تنقیدی" بھی سوویٹ ادب میں اتنی ہی ضروری شرط ہے جتنی دوسرے کاموں میں سوویٹ ادب کی بڑی کمی یہ سمجھی جا رہی ہے کہ

وہ ابھی تک سوویٹ زندگی کے دوش بدوش چلنے سے عاری ہے، وہ سوویٹ تعمیر اور اشتراکی کاموں کے ہیرو کو پوری طرح صناعانہ تکمیل کے ساتھ نہیں دکھا سکا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھنا چاہئے کہ سوویٹ زندگی جتنی تیز رو ہے انکا ادب اس کا ساتھ نہیں دیتا۔ سوویٹ مصنفوں کو احساس ہے کہ ابھی تک ان کے ادب میں "ذہین طبقے" (Intelligensia) کے ہیرو کو بڑی جگہ ملی ہوئی ہے، حالانکہ اصل زندگی یعنے تعمیری کاموں میں طبقاتی جنگ میں، "سب مل" مزدور اور کسان چھایا ہوا ہے۔ زندگی کی دوڑ میں محنتی طبقہ جو کارخانے اور فیکٹریاں قایم کر رہا ہے، "سب مل" کسان جو زراعت کر رہا ہے، آگے آگے ہے، اور یہی لوگ ہیں جو زندگی کی سب اچھی چیزیں پیدا کر رہے اور دنیا کو روٹی کھلاتے اور کپڑا پہناتے ہیں، جو اپنے اعلےٰ واشرف کام کے بارے میں زبان بھی نہیں کھولتے۔ یہ لوگ نئی زندگی کے ڈھالنے والے ہیں اور یہی سچے ہیرو ہو سکتے ہیں۔

"سب مل"، زراعت کے (Shokmor Kemm) کی آل یونین کانگرس میں اسٹالن نے اسی بات پر زور دیکر کہا تھا کہ :-

"یہ نئی زندگی کو پیدا کرنے والے ہی اصل ہیرو ہیں ——— ہمارے ادب میں انھیں کو جگہ ملنا چاہئے"۔

سوویٹ کسان مزدور اپنے ادیبوں اور انشار پردازوں سے یہ مطالبہ کر رہا ہے کہ دوسرے پنجسالہ پروگرام میں یہ کمی باقی نہ رہنا چاہئے ——— چونکہ اشتراکی تعمیر کے عندئے سوویٹ ادب کے ملہم ہیں اس لئے یہ ادب ان جفاکش انسانوں کا محبوب بن گیا ہے اور حق یہ ہے کہ وہ اس محبت کا مستحق بھی ہے۔ کیونکہ سوویٹ ادب نکمے آدمیوں کا ادب نہیں بلکہ ایک ایسا ادب ہے جو اشتراکی تعمیر میں اپنا پورا فرض ادا کر رہا ہے۔

آل یونین کمیونسٹ پارٹی نے اپنی سترھویں کانگرس میں اپنی کامیابیوں اور اپنے کاموں کے نتیجوں کا جائزہ لیکر دوسری پنجسالہ اسکیم اور اُس کے اقتصادی و کلچری پروگرام پر تصدیق کی مہر لگا کر پھر ایکدفعہ لینن کے اُصول کی روشنی و ہدایت میں آیندہ کی فتح و کامیابی کا راستہ دکھا دیا ہے ——— اس عظیم الشان اور مشترک کام کی انجام دہی اور اسکی اہمیت کو سمجھ کر اپنا فرض ادا کرنے میں، سوویٹ مصنف کو وہ ولولہ مل جاتا ہے جو "سب مل" اسپرٹ اور اشتراکی تخلیق کا ولولہ ہے، اور جو پارٹی اور اُس کے مقتدر لیڈر اسٹالن کی بلند خیالیوں سے حاصل ہوتا ہے۔

سوویٹ ادب اپنے پڑھنے والوں کو شخصی ملکیت اور انانیت پر فتح پالینے کے لئے طیار کرتا ہے، استحصال بالجبر کے پنجے سے نکلی ہوئی انسانیت کو برادرانہ اتحاد کے نام پر، ملکیت اور انانیت کے شعور کو زیر کر لینے کے لئے طیار کرتا ہے۔

نئی فتوحات کا یہ زمانہ یعنی سوویٹ یونین کے میدانوں میں مقام رکھنے کا زمانہ، بلاشبہ سوویٹ ادب کے لئے بھی نئی فتوحات کا زمانہ ہوگا۔

ل۔ احمد

عندلیب شادانی و حسرت موہانی

جناب پروفیسر عندلیب شادانی نے مولانا حسرت موہانی کے کلام پر بعض اعتراضات کئے ہیں، جو میرے نزدیک بالکل غلط ہیں۔ میں اس مضمون میں انھیں پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں۔

مولانا کا شعر ہے:

یوں شکرِ جور کرتے ہیں تیرے اداشناس،　　گویا وہ جانتے ہی نہیں ہیں گلا ہے کیا

اس پر جناب شادانی کا اعتراض یہ ہے کہ فعل حال جب مثبت سے منفی بنایا جاتا ہے تو اس کے آخر سے "ہے" "ہوں" اور "ہیں" کو گرا دیتے ہیں اور اس کے پہلے علامت نفی لگا دیتے ہیں۔ شادانی صاحب نے اس قاعدہ کو کلیہ کی حیثیت سے پیش کیا ہے حالانکہ حقیقت صرف اتنی ہے کہ منفی حالت میں ہے اور ہیں وغیرہ کا حذف کر دینا جائز ہے ضروری نہیں۔ چنانچہ تمام اساتذہ کے کلام نظم و نثر سے اس کا ثبوت ملتا ہے، یہاں تک کہ بعض غزلوں کی ردیف ہی "نہیں ہے" یا "نہیں ہیں" ہے۔ میر کی ایک غزل کا شعر اسی زمین میں ملاحظہ ہو:

مری آنکھوں میں قدر ہستی نہیں ہے　　پسند ایک، دم کی یہ مستی نہیں ہے

میر انیس فرماتے ہیں:

کی عرض میرے جسم پہ جس وقت تک ہے سر　　ممکن نہیں ہے یہ کہ بڑھے فوج بد گہر

شادانی صاحب کے اُصول کے مطابق میر کی غزل کی ردیف ہی غلط ہے، اور میر انیس نے بھی نہیں کے بعد ہے کا استعمال غلط کیا ہے۔

حسرتیں وقفِ طرب ہیں آرزو محوِ سرور　　بخت نے کھولا ہے روئے شوق پر بابِ نشاط

شادانی صاحب کا اعتراض ہے "حسرتیں" جمع اور "آرزو" واحد لکھنا درست نہیں۔ اس اعتراض کا سبب یہ ہے کہ معترض نے ہیں کا فاعل آرزو کو بھی قرار دیا ہے، حالانکہ ایسی صورت میں آرزو کا فعل "ہے" محذوف مانا جائیگا یعنی نثر کرنے پر صورت یہ ہوگی کہ "حسرتیں وقفِ طرب ہیں، آرزو محوِ سرور ہے۔

سب آئے پر اک تو نہ آیا نہ آیا — تیرا دیر دیکھا کیے راستہ ہم (مولانا حسرت)

اعتراض :- مصرعۂ ثانی محل نظر ہے اگر اس کی نثر کی جائے تو یہ ہوگی "ہم دیر تیرا راستہ دیکھا کئے" مگر اردو میں اس طرح نہیں بولتے "دیر تک راستہ دیکھا کئے" یا "بہت دیر راستہ دیکھا کئے" کہنا چاہیئے تنہا "دیر" صحیح نہیں۔

اس وقت کے محاورہ کے لحاظ سے اعتراض درست ہے، لیکن حسرت نے اکثر جگہ اساتذۂ قدیم کے تتبع میں اس قسم کی ترکیبوں کو جائز قرار دیا ہے۔

میر کا شعر ہے:

خوش سرانجام تھے وے جلد جو ہشیار ہوئے — ہمتو اے ہمنفساں دیر خبردار ہوئے

جھوٹ ہر چند نہیں یار کی گفتار کے بیچ — دیر لیکن ہے قیامت ابھی دیدار کے بیچ

ملا ہتو نہ وہ ملنا تھا اس کا — نہ ہم سے دیر آنکھ اس کی ملا کی

مایوس دل کو پھر سے وہ شوریدہ کر چلے — بیدار سارے فتنۂ خوابیدہ کر چلے (مولانا حسرت)

ترا ناز بھول بیٹھا مری سب نیازمندی — بغرور دلربائی بیقین دل پسندی (")

"سب" اور "سارا" پر اعتراض ہے لیکن یہ وہ نکتہ ہے کہ پروفیسر صاحب کے علاوہ کسی نے اس کا لحاظ نہیں کیا!

جب یہ نہ ہو تو کیوں نہ ہو دنیا و دیں خراب — سارے لگاؤ رہتے ہیں دل کی لگی کے ساتھ (داغ)

مجھے ساری (سب) بلائیں ہجر کی شب دیکھنی ہوگی — جگا دے لیکے چٹکی درد دل جس وقت غافل ہوں (")

ہوا مذکور نام اس کا کہ آنسو بہہ چلے منھ پر — ہمارے کام سارے (سب) دیدۂ تر ہی ڈبوتا ہے (میر)

حسن کی تاثیر پہ غالب نہ آسکتا تھا علم — اتنی نادانی جہاں کے سارے (سب) داناؤں میں تھی (اقبال)

آبلہ پہلے پڑا پھر زخم اس کے بعد داغ — مختصر یہ ہے یونہیں سب (سارا) گھر ہمارا جل گیا (عزیز لکھنوی)

شام ہو یا کہ سحر یاد انھیں کی رکھنی، — دن ہو یا رات ہمیں ذکر انھیں کا کرنا (حسرت)

اعتراض یہ ہے کہ: "یا" اور "کہ" کی یکجائی صحیح نہیں کیونکہ دونوں ہم معنی ہیں۔ اس کے جواب میں اقبال کے چند اشعار پیش کرتا ہوں:

نہ تھا اگر تو شریک محفل، قصور تیرا ہے یا کہ میرا — مرا طریقہ نہیں کہ رکھ لوں کسی کی خاطر مئے شبانہ!

دل ہو غلام خرد یا کہ امام خرد، — سالک رہ ہوشیار! سخت ہے یہ مرحلہ

میں کیسے سمجھتا کہ تو ہے یا کہ نہیں ہے — ہر دم متغیر ہیں خرد کے نظریات

محبت نے کی دل میں وہ آگ روشن — کہ ہم ہو گئے جسم خاکی سے نوری

لفظ "جسم" پر اعتراض ہے اور ارشاد ہے کہ "زندہ انسان پر مطلق جسم کا اطلاق صحیح نہیں" حالانکہ اساتذہ نے جسم

کا استعمال اس معنی میں کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

جسم سے نکلی تو پہونچی کعبۂ مقصود کو ــــ بے لباسی بن گئی ہے جامۂ احرام روح (خواجہ وزیر)
مبتلائے درد کوئی عضو ہو روتی ہے آنکھ ــــ کس قدر ہمدرد سارے جسم میں ہوتی ہے آنکھ

خود جناب پروفیسر صاحب کا شعر ہے:

کیا مرے خواب میں بھی آنیکا قدغن ہے تمہیں ــــ قید ہے جسم تو کیا روح بھی آزاد نہیں،

آگئی کس کے جمال عرق آلود کی یاد ــــ رات بھر ہجر میں گنتے رہے تارے عاشق (مولانا حسرت)

اعتراض یہ ہے کہ "جمال عرق آلود" کی ترکیب معنوی اعتبار سے محض مہمل ہے پسینہ چہرے پر آتا ہے جمال پر نہیں یہاں "جمال" سے "شخص جمیل" مراد لینا بھی ممکن نہیں کیونکہ "کس" اس کے منافی ہے "جمال" کی جگہ چہرہ۔ عارض رُخ کوئی لفظ ہونا چاہئے۔

عرض ہے کہ "جمال" سے یہاں مجازاً چہرہ ہی مراد ہے۔ اس لئے غلط نہیں۔

شوق لقائے یار میں مرتے تو ہو مگر ــــ حسرت جو نقد جان نہ ٹھہرے بہائے ناز
اک طرفہ بیخودی کا ہے عالم کہ عشق میں ــــ تکلیف آج کل ہے نہ راحت ہے آجکل
مجھکو معلوم ہے پیمانۂ مئے میں ساقی، ــــ تو نے جو کچھ کہ مری آنکھ بچاکر چھوڑا

پہلے شعر میں اعتراض، اعلانِ نون پر ہے، دوسرے شعر میں (ہے آجکل) پر اور تیسرے میں (کہ) پر۔ اس کے جواب میں خود شادانی صاحب کے دو شعر پیش کرتا ہوں۔ فرماتے ہیں:

دل کا خون آنکھوں میں کھنچ آئے تو کیا اسکا علاج ــــ نالہ روکا تھا کہ یہ پردہ درِ راز نہ ہو،

پہلے مصرعہ میں خون کا اعلان نون ضروری تھا اور دوسرے مصرعہ میں "یہ" بالکل بیکار ہے صرف اتنا کہنا کافی تھا "نالہ روکا تھا کہ پردہ در راز نہ ہو" لیکن صرف مصرعہ پورا کرنے کے لئے "یہ" اضافہ کیا گیا۔ نون غنہ بہت آسانی سے یوں دور ہو سکتا تھا: "خونِ دل آنکھوں میں کھنچ آئے تو کیا اس کا علاج"

شادانی صاحب کا دوسرا شعر ملاحظہ ہو:

ہو کے مایوس بھی ہم جیتے ہیں ہاں ہم جیتے ہیں ــــ وائے وہ زیست اجل پر بھی جسے ناز نہ ہو

پہلے مصرعہ میں بقول پروفیسر صاحب ہم جیتے ہیں کی تکرار غلط ہے۔ اور "ہم" تو بجر سے دامن چھڑا چکا ہے۔

شاید وہ یاد کرتے ہیں مجھکو کہ آج کل ــــ تکلیفِ اضطراب کی شدت ہے آجکل

روح نے پائی ہے تکلیف جدائی سے نجات ــــ آپ کی یاد کو سرمایۂ راحت کرکے

اعتراض یہ ہے کہ "تکلیف" عربی لفظ ہے اور اس کے لغوی معنی ہیں "طاقت سے زیادہ کام لینا" اور فارسی

میں مطلق "کام لینا" کے معنی میں آتا ہے لیکن اُردو میں اس کے معنی ہیں دُکھ، رنج، ایذا، مصیبت، بپتا، دشواری۔ ان معنوں میں اگر استعمال ہو تو "تکلیف" اُردو کا لفظ ہے مذکورہ بالا اشعار میں بمعنی "ایذا" استعمال ہوا ہے لہذا "تکلیف اضطراب" اور "تکلیف جدائی" کی ترکیب غلط ہے۔

حسرت نے تکلیف کا استعمال اس کے اصل معنی میں کیا ہے۔ اُردو کے مستعملہ معنی کے لحاظ سے نہیں کیا۔

اک جو لے دیکے مجھے شیوۂ یاری آیا — وہ بھی کچھ کام نہ خدمت میں تمھاری آیا (حسرت)

اعتراض۔ "یاری" فارسی لفظ ہے اور فارسی میں بمعنی "مدد و نصرت" مستعمل ہے ظاہر ہے کہ اس شعر میں یاری بمعنی مدد و نصرت استعمال نہیں ہوا۔ لہذا "شیوۂ یاری" کی ترکیب نادرست ہے۔

اس کے جواب میں میرؔ کا شعر ملاحظہ ہو:

واں سے خشم و عتاب ناز و ادا، — یاں سے اخلاص و دوستی، یاری،

ناز بردار الم لکھا ہے نامہ میں مرے — اس سراپا ناز کی مضموں نگاری دیکھئے (حسرت)

اعتراض۔ ناز بردار فارسی میں مستعمل نہیں فارسی کا محاورہ نازکشیدن ہے اس لئے ناز بردار الم کی ترکیب معیوب ہے۔

اس کے جواب میں دیگر اساتذہ کے اشعار ملاحظہ ہوں:

ناز بردار لب ہے جاں جب سے — تیرے خط کی خبر کو باقی ہے (میر)

ناز بردار جنوں حسن حسیناں کیوں نہیں — شمع کے سر پہ ہے روشن داغ سودا دیکھئے (زکی دہلوی تلمیذ غالب)

وصل کی جب سے گئی ہے چھوڑ دلداری مجھے — ہجر کی کرنی پڑی ہے ناز برداری مجھے (میر)

اُردو زبان کا یہ مسلمہ قاعدہ ہے کہ جب کسی کا نام لیکر خطاب کرتے ہیں تو پھر اس کے لئے "آپ" کا استعمال نہیں کرتے حسب اقتضائے سن و مرتبہ "تو" یا "تم" کہتے ہیں مثلاً:

اصغر! تم کلکتے کب جاؤ گے؟ - یا - اصغر! تو کلکتہ کب جائے گا؟

حسرت! جفائے یار کو سمجھا جو تو وفا — آئینِ اشتیاق میں یہ بھی روا ہے کیا

تم سے گدا کو اس شہہ خوباں کی آرزو — حسرت! یہ اور کیا ہے جو دیوانگی نہیں

یہ کوئی نہ کہے گا! کہ اصغر! آپ کلکتہ کب جائیں گے؟ اظہار احترام مقصود ہو تو پہلے نام کے ساتھ ایک لفظ اور بڑھا دیتے ہیں تب "آپ" کا استعمال کرتے ہیں مثلاً اصغر صاحب! آپ کلکتہ کب جائیں گے۔ لیکن "بادشاہ" متغزلین مشرق کے مطلق العنان بادشاہوں کی طرح کسی آئین کے پابند نہیں۔ ان کی زبان قانون ہے چند مثالیں ملاحظہ ہوں

کچھ کچھ اس راز کی ہم کو بھی خبر ہے حسرت — آپ جاتے ہیں جو روزانہ سرِ شام کہیں

حال کھل جائے گا بیتابیِ دل کا حسرت — بار بار آپ انھیں شوق سے دیکھا نہ کریں

حسرت! اس کوچہ کا پھیرا روز روز اچھا نہیں — رنگ لائے گی کسی دن یہ گدائی آپ کی،

نہاں نہ ہو کرم یار میں ستم حسرت — بہت نہ کیجئے اظہار شادمانی کا

مجرد نام کے ساتھ خطاب ہے تو "کیجئے" کی جگہ "کرو" یا "کر" چاہئے" اس کے جواب میں دیگر اساتذہ کے اشعار ملاحظہ ہوں :-

(۱) وفا وہ کریں داغ یہ کس نے مانا — مگر آج کا زعم باطل یہی ہے، (داغ)

(۲) یہ داغ قدح خوار کے کیا جی میں سمائی — سنتے ہیں کئے بیٹھے ہیں وہ رات سے توبہ "

(۳) داغ پھر جھانک تانک کرتے ہیں، — اب گھرے اب پھنسے کہیں نہ کہیں "

جلال آنکھ سے آنسو نہیں نکلتے جواب — جگر کا خون کیا ہے اُسے چھپاتے ہو (جلال لکھنوی)

(۴) کہئے ہزاروں ناز تھے جس دل پہ اے جلال — دل کیا ہوا وہ آپ کا وہ ناز کیا ہوئے "

بند کر دیگا لب یار کو بوسوں کا ہجوم، — آج بھی ہم سے جو وہ بر سر انکار آیا، (حسرت)

عمر کیجئے صرف یاد گیسو و رخسار میں — یوں بسر لیجائے لیل و نہار انتظار

پھر کہئے کس امید پہ ہم زندگی کریں — جب آپ التفات ذرا بھی نہ کیجئے

کامیابی جلد ہوگی آکے پابوس امید — کھینچ ڈالیں اور رنج انتظار اکی برس

تیری خوشبو کے بعد روح مری — گل جنت بھی ہو تو بو نہ کرے

کب بر آئے گی سکون جانِ مضطر کی امید — کب بسر آئے گا یارب یہ زمان اضطراب

ہجر ساقی میں بھلا کس کو خوش آئیگی شراب — ہمنشینو! طلب ساغر و مینا ہے عبث

بادۂ عیش سے مینائے تمنا رنگیں، — ساغرِ شوق مئے ذوق سے گلنار آیا

کچھ نہیں شوق جبہ و دستار — دل سرِ ساغر و سبو نہ کرے

میں اس بت بدخو کی اس آن پہ مرتا ہوں — کھینچا نہ کبھی جس نے اندوہِ پشیمانی،

لگی ہیں راہِ تمنا میں سیکڑوں آنکھیں — کہ ناز جلوہ کرے تیری خوش خرامی کا

پروفیسر صاحب کو ان تصرفات پر اعتراض ہے۔ ممکن ہے وہ حضرات جو تاریخ اُردو سے واقف نہیں وہ عندلیب صاحب کی نکتہ رسی کی داد دیں لیکن جو بالغ نظر ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ بات انھوں نے اپنے ذہن سے نہیں پیدا کی ہیں بلکہ بہت پہلے آزاد مرحوم "آب حیات" میں اس کا ذکر کر چکے ہیں ملاحظہ فرمایئے :-

"ایک زبان کے محاورے کو دوسری زبان میں ترجمہ کرنا جایز نہیں۔ مگر ان دونوں زبانوں میں ایسا اتحاد ہوگیا کہ یہ فرق بھی اُٹھ گیا اور اپنے کار آمد خیالوں کے ادا کرنے کے لئے دلپذیر اور پسندیدہ محاورات جو فارسی میں

دیکھیے انھیں کبھی بجنسہ اور کبھی ترجمہ کر کے لے لیا "برآمدن" اور "بسر آمدن" ہندی میں اس کا ترجمہ لفظی ڈھونڈیں تو نہیں ہے۔ مگر اہل زبان نے نہایت خوبصورتی کے ساتھ تضمین کر لیا۔ سودا نے کس خوبصورتی سے کہا"

اس دل کی تف آہ سے کب شعلہ بر آئے — بجلی کو دم سرد سے جس کے حذر آئے
افعی کو یہ طاقت ہے کہ اس سے بسر آئے — وہ زلف سیاہ اپنی اگر لہر پہ آئے

یہ تو آزاد مرحوم کی عبارت تھی اس کے بعد تمام اساتذہ کے وہ اشعار پیش کئے ہیں جن میں محاورہ تصرف کر کے لیا گیا یا علیٰ حالہ لکھا گیا ہے چند اشعار درج کرتا ہوں:

(۱) خوش نمی آید — مجھے اچھا نہیں لگتا۔

ناکامیِ صد حسرت خوش لگتی نہیں ورنہ — اب جی سے گزر جانا کچھ کام نہیں رکھتا (میر)

بو کردن = سونگھنا۔ (سودا)

دیکھوں نہ کبھی گل کو ترے منھ کے میں ہوتے — سنبل کے سوا زلف تری بو نہ کروں میں

گوش کردن = سننا۔ (سودا)

کب اسکو گوش کرے تھا جہاں میں اہلِ کمال — یہ سنگ ریزہ ہوا ہے درِ عدن مجھ سے

زنجیر کردن = قید کرنا

سودا زدہ دل ہے تو یہ تدبیر کریں گے — اس زلف گرہ گیر سے زنجیر کریں گے

ایسے کافی تصرفات کا ذکر آزاد نے کیا ہے۔ اس کے علاوہ بھی میر صاحب نے کافی اشعار اس قسم کے تصرفات سے ساتھ لکھے ہیں:

چمن کا نام سنا تھا وے نہ دیکھا ہائے — جہاں میں میں نے قفس ہی میں زندگانی کی
اب چاند بھی لگا ہے تیرے سے جلوے کرنے — شب ہائے ماہ چندے تجھکو چھپا رکھیں گے
ایذا بھی کھینچ چکئے جو ہفتے عشرے کی ہو — اس طرح مرتے رہیئے اے میر آہ تا چند
ہجراں میں اسکی زندگی کرنا بھلا نہ تھا — کوتاہی یہ ہوئی نہ اِس عمرِ دراز سے
زمانہ ہجر کا آسان کیا بسر آیا — ہزار مرتبہ دل کو مرے جگر آیا
کیونکر سب عمر صعوبت میں کٹی تیری میر — اپنا جینا تو کوئی دن ہمیں دشوار آیا

غرض اس قسم کی مثالیں بکثرت موجود ہیں زیادہ سے زیادہ پروفیسر صاحب یہ فرما سکتے ہیں کہ اب یہ سب متروک ہیں۔ لیکن متروکات کا استعمال اپنی خوشی پر ہے۔

اثر گلشن آبادی

معراجِ تمدن

متذکرہ عنوان سے ایک مقالہ گزشتہ دسمبر کے نگار میں میری طرف سے شایع ہوا تھا۔ اُس سے قبل دو مقالے میرے فاضل دوست گلاب چند کے قلم سے نگار کے صفحات کی زینت بن چکے تھے۔ میں نے اپنے مضمون میں اشتراکیت اور جمہوریت۔ دونوں کے سیاسی۔ مجلسی اور معاشی پہلوؤں پر مختصراً بحث کی تھی جس سے متاثر ہوکر انھوں نے ایک کھلا خط فروری کے نگار میں شایع کرایا ہے۔ جواب الجواب کے قائل آپ نہیں ہیں، شاید اسی لئے جواب الجواب کی زحمت آپ نے گوارا بھی نہیں کی۔ بلکہ اصل موضوع سے ہٹ کر اشتراکیت اور اُس کے مداحوں کو کوسنے کے علاوہ سوویٹ روس کے خلاف پست الزامات اور مبہم شبہات کا اظہار کرکے اپنی بیچارگی کا ثبوت دیا ہے۔ جوشِ رقابت میں پست سے پست الفاظ استعمال کرنے سے گریز نہیں کیا۔

آپ کا گزشتہ اسلوب بیان۔ عالمانہ اور محققانہ انداز تحریر دیکھ کر سیاسیات کا ہر غیر جانبدار طالب علم آپ کو سیاسی تعصب سے پاک سمجھنے پر مجبور تھا۔ لیکن ایک ہی نشتر سے فاسد مواد بہنا شروع ہوگیا اور آپ اپنے اصلی روپ یعنی روس کے خلاف زرخرید مبلّغ کی صورت میں ظاہر ہوگئے۔

آپ کو شکایت ہے کہ ننانوے فیصدی اشتراکی علمی حیثیت سے بہت پست ہوتے ہیں اور بغیر کافی تعلیم حاصل کئے معلّمانہ انداز گفتگو اختیار کرلیتے ہیں۔ کیا یہی طرزِ نگارش اظہار فضل وکمال کی علامت ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اشتراکیت میں اکثریت غریب اور محنت کش طبقہ پر مشتمل ہوتی ہے۔ کوئی اشتراکی اعلےٰ تعلیم یافتہ نہیں ہوتا۔ اگر ہو بھی تو نمائش اور ظاہرداری سے گریز کرتا ہے۔

اعلےٰ تعلیم کا مفہوم متعین کرنے میں میرے اور آپ کے درمیان بنیادی اختلاف ہے۔ دارالعلوم کی اعزازی ڈگریاں ہی عالم متبحر ہونے کی کافی دلیل نہیں ہوتی۔ اس کے لئے ایک دردمند دل نازک احساس۔ اور بین الاقوامی صورتِ حالات سے ہمہ گیر واقفیت کی ضرورت ہے۔ ایسی تعلیم جو انسان کے دل اور دماغ کو مفلوج اور ماؤف بنادے زندگی کے حقایق کا آئینہ دار بنانے کی بجائے اُس میں قومیت اور وطنیت کے لحاظ سے اجنبیت سی پیدا کردے۔ تعلیم نہیں میرے نزدیک مہذّب قزاقی ہے۔ اگر میں مبالغہ سے کام نہیں لیتا۔ تو یہ اعلےٰ تعلیم یافتہ گروہ سیرت و

صورت دونوں حیثیت سے قطعی الگ شے بن گئی ہے، جس کو نہ ہندوستانی کہہ سکتے ہیں اور نہ یوروپین بلکہ ایک تیسری ہی مخلوق ہے جس کا کوئی نام ابھی تک نہیں رکھا گیا۔

آپ کا بیان ہے کہ گارنر کا خواب جمہوریت آج تک شرمندۂ تعبیر نہیں ہوا۔ حتے کہ امریکہ، فرانس اور برطانیہ کی ریاستیں بھی صحیح معنوں میں جمہوری ریاستیں نہیں ہیں۔ گویا اس لحاظ سے آپ ایک ایسی چیز کا ذکر کر رہے ہیں، جو ابھی تک دنیائے تخیل سے عالم وجود میں نہیں آئی۔ جمہوریت کا مفہوم آپ کے خیال کے مطابق یہ ہے کہ حکومت کا ہر کام عوام کی مرضی سے عوام کے فایدہ کے لئے اور عوام کے ہاتھوں سرانجام پائے۔ جمہوریت بیک وقت ایک سیاسی نظام بھی ہے۔ معاشری اصلاح بھی اور مذہبی تخیل بھی۔

لیکن اشتراکیت، اصلاح کا ایسا قدم اُٹھانا چاہتی ہے کہ پھر کسی اصلاح کی گنجایش نہ رہے۔ آپ رائج الوقت نظام سے مطمئن بھی ہیں۔ اس کی تخریب بھی گوارا نہیں کرتے۔ صرف موجودہ اقتصادی و سیاسی انتشار سے عارضی نجات حاصل کرنے کے لئے اس میں تھوڑی سی ترمیم چاہتے ہیں۔ آپ بھی جانتے ہیں کہ براہ راست عوام حکومتی کارروائیوں میں حصہ نہیں لے سکتے۔ اُن کو صرف اپنے نمایندے منتخب کرنے کا اختیار ہے اور تا وقتیکہ انتخاب کرنے والی جماعت کو اتنا علم و شعور نہ ہو کہ وہ اچھی طرح حکومت اور انتخاب کے معنی کو سمجھ سکے، عام رائے دہندگی ایک لایعنی چیز ہے۔ عام رائے دہندگی کے لئے عام تعلیم لازمی شرط ہونی چاہئے۔ اشتراکیت چونکہ عوام کو جاہل اور عام تعلیم سے محروم رکھنا چاہتی ہے، ناقابل قبول ہے اور اسی ہمہ گیر واقفیت پر آپ دوسروں کو جاہل سمجھ رہے ہیں، حالانکہ اشتراکیت کا اولین پروگرام نہ صرف عام تعلیم بلکہ عام سیاسی تربیت بھی ہے۔

واقعی کارل اور انجلس کو سمجھنے والے اشتراکیوں کی تعداد قلیل ہے، لیکن جمہوریت کے نغمہ سراؤں میں کتنے ہیں جو آپ کی طرح گارنر اور روسیو کو جانتے ہیں۔ کتنے ہندو ہیں، جو ویدوں کی تفسیر کر سکتے ہیں۔ کتنے مسلمان قرآن شریف کے حافظ ہیں؟ فلسفۂ عدم تشدد کے بانی مہاتما گاندھی ابھی تک عدم تشدد کا صحیح مفہوم اپنے تخیل میں متعین نہیں کر سکے۔ ہری جن کا مقالہ افتتاحیہ عدم تشدد کی نت نئی تاویلات سے مزین ہوتا ہے۔

کسی نظریہ یا اُصول کی پیروی کے لئے یہ لازم نہیں کہ پیروی کرنے والے اُس کے موجد کے شجرۂ نسب سے بھی واقف ہوں۔ ایک گنوار بھی اپنے ذاتی نفع و نقصان کا اندازہ کر سکتا ہے۔ گو اشتراکیت ایک خالص اقتصادی مسئلہ ہے۔ تاہم وہ عوام کے مجلسی، سیاسی، اور مذہبی حقوق کا کفیل و ضامن بھی ہے۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ اس کا دائرۂ اثر اور حلقۂ عمل وسیع سے وسیع تر نہ ہوتا جائے۔

نفس اشتراکیت پر آپ نے صرف دو جزئی اور سطحی اعتراض کئے ہیں اول اعتراض یہ ہے کہ انسان کبھی اس منزل تک نہیں پہونچ سکتا کہ اُسے ریاست کی ضرورت باقی نہ رہے۔ ساری دنیا بیک وقت فلسفۂ کارل مارکس

کی معتقد نہیں ہو سکتی۔

میری عرض یہ ہے کہ ریاست بجائے خود کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس کی ضرورت صرف اس لئے ہے کہ باقی ضروریات کی کفیل ہو سکے۔ اگر دیگر ضروریات بغیر اس کے پوری ہو سکیں۔ تو اس کی حاجت باقی نہیں رہتی۔ برعکس اسکے ذاتی ملکیت جھگڑے کی بنیاد ہے، کیونکہ ہر شخص اپنی ریاست پر قانع نہیں رہتا یہیں سے انفرادی مقابلے کا پیہم سلسلہ جاری ہو جاتا ہے اور انسان ایک دوسرے پر غالب آنے کی کوشش میں انسانی اوصاف کو چھوڑ کر درندگی و وحشت پر اتر آتا ہے۔

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ ساری دنیا بیک وقت فلسفۂ کارل مارکس کی معتقد نہیں ہو سکتی۔ یہ اپنی طرز کا قطعی اعتراض ہے۔ اس طفلانہ استدلال کی بغیر کسی احساس خجالت کے آپ مندرجۂ ذیل الفاظ میں تردید بھی کر دیتے ہیں۔

(Labour Legislation) کی ہمہ گیری دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔ آمدنی اور سرمایہ پر ٹیکس۔ بڑھاپے اور علالت کا بیمہ۔ جسمانی خطرات اور نقصانات کے لئے تاوان وغیرہ سب اسی مقصود کے ذریعے ہیں۔ اور جب ہم سب تدریجاً اشتراکیت کی طرف گامزن ہوں تو محض اصطلاح پر جھگڑنا کہاں کی دانشمندی ہے؟ میں صرف اتنا اضافہ کر دیتا ہوں۔ کہ ابھی کل تک اشتراکیت کا نام لینا بھی اس ملک میں مسلح بغاوت کے مترادف تھا، جمہوری دستور العمل میں جتنی زیادہ اشتراکی اصطلاحات رائج کی جاویں گی، اقتصادی مشکلات کا حل اتنا ہی نزدیک تر ہوتا جائے گا۔

یہ اعتراض کہ پست کاموں سے ذہنی پستی پیدا ہوتی ہے اس لئے بلند و پست کی تفریق کو مٹایا نہیں جا سکتا لغو ہے۔ کیونکہ جسمانی مشقت اور شب و روز کی مصروفیت سے ذہنی پستی پیدا نہیں ہوتی۔ بلکہ دوسروں کی محنت کے سہارے عیاشی اور تنعم پسندی کی زندگی بسر کرنا اخلاقی انحطاط اور ذہنی خلفشار کا موجب ہوتا ہے۔ شہر اور دیہات میں جنس عصمت کی ارزانی و گرانی کا بین تفاوت اس کا مظہر ہے۔ اگر خوش رفتار اور خوش گفتار ہونا ہی مہذب ہونے کی دلیل ہے تو یہ اوصاف حسن فروش طبقہ میں بافراط ہوتے ہیں۔ شعبۂ منتظمہ کے معاوضہ میں امتیاز سے طبقہ بندی شروع ہوتی ہے۔ اعلے اور ادنے کا خیال اسی طبقہ بندی کی پیداوار ہے۔

روس کے متعلق آپ کی ہمہ دانی جمہوری ممالک کے منظم پراپاگنڈا پر مشتمل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہاں نہ شخصی املاک رکھنے کی اجازت ہے اور نہ عوام پر بزور حکومت کی جاتی ہے۔ فروری کے نگار کے مقالہ افتتاحیہ میں ذیل کے الفاظ آپ کے شکوک کی تردید کر دیتے ہیں۔ " روس کے جنرل سکریٹری جنرل ڈیمی ٹروف نے ایک تقریر کے دوران میں کہا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ ہم بظاہر اشتراکی اصول سے ہٹتے ہوئے نظر آئیں۔ لیکن یہی ہماری

ترکیب ہوگی۔ جس کے ذریعہ سے اشتراکی مقاصد کو پورا کیا جائے گا۔"

کسی ملک کا سیاسی انقلاب سیاسیات عالم پر اثر انداز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ انقلاب روس کے بعد عوام کو احساس ہوا کہ جمہوری طرزِ حکومت نہ تو عوام کے مفاد کی پرواہ کرتا ہے اور نہ اکثریت کو مطمئن رکھ سکتا ہے۔ جرمنی اور روس میں تقریباً بیک وقت شہنشاہیت کا خاتمہ کیا گیا، اسی دورِ اضطراب میں نازیت و فسطائیت ظہور میں آئے۔ یعنی ہٹلر و مسولینی نے اشتراکیت کی متجانس اصطلاحات سے معاشری توازن قائم کرنے کی کوشش کی لیکن برائی کی جڑ یعنی نظام سرمایہ داری اور شخصی مقابلہ پھر بھی جاری رہا۔ مشین کی بنی ہوئی اشیاء کی نکاسی اور خام پیداوار کی طلب کے لئے منڈیوں کی ضرورت بری طرح محسوس ہوئی۔ اٹلی نے حبشہ اور البانیہ پر قبضہ کر لیا اور جرمنی نے آسٹریا زیکوسلوویکیا اور پولینڈ پر۔ روس پر بھی فن لینڈ کی آزادی سلب کرنے کا الزام عاید کیا جا سکتا ہے۔ لیکن روس کا یہ اقدام توسیع مملکت کے لئے نہیں بلکہ حفاظت خود اختیاری کے لئے ہے۔

آپ کا یہ فرمانا کہ "کوئی حکومت محض اچھے اصول بنا کر کامیاب اور دوسروں کے لئے قابل تقلید نہیں ہو سکتی" عجیب منطق ہے۔ حالانکہ اچھے اصول وہی ہوتے ہیں جو قابل عمل ہوتے ہیں۔

"رام"

چند سیاسی کتابیں

جدید دستور کا خاکہ:۔ از جناب زین العابدین احمد صاحب مترجمہ جناب شفیق الرحمٰن صاحب قدوائی بی۔ اے (جامعہ) یہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا ایک پمفلٹ ہے، جو موجودہ سیاسی گتھی کو سمجھنے کے لئے بہت ضروری ہے۔ قیمت ۲ر

دیہی جنس:۔ دیہی جنس اور دیہات کی نئی تعمیر پر ایسی کتاب جو دیہات سدھار کے کام کرنے والوں کے لئے مفید ہے۔ از جی۔ سی کمار پاسا صاحب۔ قیمت ۲ر

ہندوستان میں زراعت کا مسئلہ:۔ از زین العابدین مترجمہ مولوی شفیق الرحمٰن صاحب قدوائی بی۔ اے (جامعہ) اس مختصر سے پمفلٹ میں کاشتکاروں کی کثرت اور زمین کی قلت کسانوں کے افلاس اور اُن کے قرضے وغیرہ سے بحث کی گئی ہے۔ قیمت ۴ر

شہری آزادی:۔ اس کتاب میں بیرونی ممالک کی انجمنوں اور اُن کے شہری حقوق کا ذکر کرتے ہوئے اعداد و شمار سے بتایا گیا ہے کہ کس طرح موجودہ حکومت ہندوستانیوں کو اُن کے حقوق سے محروم کرنے کے درپے ہے جن سے اُن کی زندگی وابستہ ہے۔ قیمت ۴ر

منیجر نگار لکھنؤ

کوڑھی بھکارن

حال کی بات ہے۔ بہت زمانہ نہیں گزرا، اودھ کے ایک ضلع میں ایک بزرگ تھے کہ زمانہ کا رنگ دیکھے ہوئے دیسے اب کم دکھائی دیں گے۔ قوم کے ہندو تھے اور پیشہ وکالت تھا، عمر ساٹھ باسٹھ برس کی ہوگی۔ آدمی دبلے پتلے تھے لیکن بدن میں سکت بہت تھی رنگ سرخ و سپید تھا چہرہ سے شرافت و متانت ٹپکتی تھی، بردبار لیکن خوش مزاج معلوم ہوتے تھے گو اپنے ضلع کے وکیلوں میں اُن کا درجہ سب سے اونچا تھا اور آمدنی کافی تھی ویسے بھی گھر سے خوشحال تھے لیکن وضع سیدھی سادی اور رہنا سہنا معمولی تھا۔ کروفر سے اُنھیں کوئی سروکار نہ تھا۔ عام طور سے کھادی کی دھوتی، کُرتہ اور اُس پر جاکٹ پہنتے تھے۔ کچہری کے وقت پائجامہ اور اچکن پہن لیا کرتے تھے۔ مہماں نوازی میں خاص لطف آتا تھا۔ آئے دن عزیز۔ دوست۔ احباب اُن کے مہمان ہوا کرتے تھے۔ خاطر مدارات میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی جاتی تھی۔ سادھو سنتوں کی صحبت کا شوق تھا۔ ایک دو ہفتوں نہیں بلکہ مہینوں مہمان رہتے تھے۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں انھیں کے ساتھ ساتھ۔ ہردوار۔ رشی کیش بلکہ جمنوتری اور گنگوتری تک کا دھاوا لگ جاتا تھا۔ جڑی بوٹیوں کی بھی تلاش رہا کرتی تھی۔ بیسیوں نسخے معلوم تھے اور ہومیوپیتھک علاج میں بھی دخل رکھتے تھے۔ غریب غربا یا دوست احباب میں جس کسی کو جسوقت ضرورت ہو علاج اور تیمار داری کے لئے حاضر تھے۔ آمدنی کا کافی حصہ خیرات اور غریبوں کی امداد میں صرف ہوتا تھا۔ موکلوں سے گھر پر صبح اور کچہری میں دوپہر کو بات چیت کرتے تھے شام کو کبھی دفتر میں نہیں بیٹھتے تھے۔ لیکن کوئی عزیز دوست یا مریض اگر آدھی رات کو بھی بلا بھیجتا تو دوڑے چلے جاتے۔ بالعموم شام کو ہوا خوری کے لئے ٹہلنے جایا کرتے۔ راستہ میں فقیر۔ بھکارن۔ لنگڑے۔ لولے۔ اپاہج اگر پیسے کا سوال کرتے تو کچھ نہ کچھ جیب سے نکال کر ضرور دیدیتے۔ اگر کسی کو زیادہ قابل رحم دیکھتے تو گھر ساتھ لے جاتے۔ کھانا کھلاتے اوڑھنے پہننے کو کپڑا کمبل دیدیتے۔ یا بازار ہی میں دوکان سے پوری اور مٹھائی خرید کر کھلا دیتے۔ دماغ سلجھا ہوا تھا اُس پر تعلیم کی جلا تھی پوجا پاٹ یا کسی اور ایسے ڈھکوسلے کے قریب نہیں جاتے تھے، نہ چھوت چھات کے قایل تھے، لیکن دل میں کچھ ایسا درد پایا تھا کہ اس سے بےچین رہتے اور اس درد کی دوا ڈھونڈا کرتے تھے۔ ایک دن شام کے وقت وکیل صاحب ٹہل کر واپسی پر بازار سے گزر رہے تھے۔ چوراہے کے قریب سڑک پر پٹڑی اور نالی کے لگ بھگ

دیکھا کہ ایک کوڑھی بھکارن بے کسی کی حالت میں پڑی روٹی کے دو ٹکڑوں کا سوال کر رہی ہے۔ قدم وہیں ٹھٹک گئے اور اُس کی حالت زار پر ایک نگاہ ڈالی۔ بھکارن ادھیڑ عمر اور بھاری بدن کی عورت تھی، رنگ کوئلہ کا سا کالا، سر گھٹا ہوا، چھاتیاں ڈھلی ہوئی، ایک ہاتھ پر سوجن تھی لیکن جھریاں پڑی تھیں، اُنگلیاں آدھے سے زیادہ کٹ کر گر گئی تھیں۔ اُنگلیوں اور ہاتھ پر سپید داغ تھے۔ دوسرے ہاتھ کی بھی کم وبیش یہی کیفیت تھی، گو اُس کی اُنگلیاں ثابت معلوم ہوتی تھیں لیکن پوریں اور ناخن اس کے بھی گھس گئے تھے۔ ایک ٹانگ صحیح و سالم تھی دوسری اس طرح سوجی ہوئی جیسے فیل پا، پنڈلی اور جانگھ پر بڑے بڑے زخم تھے اور کوڑھ ٹپکتا تھا تمام بدن پر تیل کی مالش کی ہوئی تھی۔ لیکن زمین پر پڑے پڑے آدھے جسم پر دھول جم گئی تھی جس نے سیاہی کی چمک کو دھندلا کر دیا تھا تاہم اسکے زخم تیل کی مالش اور ہرے ہونے کی وجہ سے اس طرح چمک رہے تھے کہ جیسے چولھے یا بھٹی میں انگارے دہکتے ہوں سارا بدن ننگا تھا۔ صرف کمر اور کولھوں کے گرد ایک بالکے سے ٹاٹ کا میلا کچیلا چیتھڑا لپٹا ہوا تھا اور اُس پر سوت کی ایک ڈوری کسی ہوئی تھی۔ ہاں سر پر ایک کنٹوپ بھی تھا جو کمر کے چیتھڑے سے کم میلا کچیلا نہ تھا، خدا کی مارے ترائی ہوئی آنکھیں نیم باز تھیں۔ ہر دو منٹ بعد آدھے دھڑ کو اُٹھاتی، ہاتھوں سے زمین ٹٹولتی دو ٹکڑے روٹی کا سوال نہایت دردناک لہجہ میں کرتی اور پھر کراہتی ہوئی مردہ ہو کر زمین پر پڑ جاتی۔ وکیل صاحب کو اس کی یہ حالت دیکھکر دل پر چوٹ لگی اور ترس آیا۔ بولے

وکیل صاحب ۔ لے مائی (پیسہ سامنے ڈال کر) یہ پیسہ لے۔

بھکارن ۔ (زمین ٹٹول کر اور پیسہ اُٹھا کر) لا بابا! اللہ تیرا بھلا کرے گا۔ اس اندھی اپاہج کا دو ٹکڑے روٹی کا سوال ہے۔ اللہ جانتا ہے دو روز سے ایک دانہ بھی اناج کا جو منھ میں گیا ہو۔

وکیل صاحب ۔ اچھا یہیں بیٹھی رہ ۔ روٹی بھی ملجائے گی۔

بھکارن ۔ جگ جگ جیو بابا جگ جگ جیو۔ ایسے مائی کے لال کہاں جو اس اندھی اپاہج کو دو ٹکڑے روٹی دیں اللہ تمھارا بھلا کرے گا۔

وکیل صاحب ۔ یہیں بیٹھی رہنا، روٹی ابھی آتی ہے (یہ کہکر وکیل صاحب نان بائی کی دوکان کی طرف بڑھ گئے)

بھکارن ۔ اچھا بابا بیٹھی ہوں (یہ کہکر بھکارن پھر اپنے دو ٹکڑوں روٹی کی صدا لگانے لگی) پانچ ہی منٹ بعد وکیل صاحب ایک پیالے میں شوربا اور چار چپاتیاں ہاتھ میں لے آئے۔

وکیل صاحب ۔ لے مائی، روٹی لے کھالے۔

بھکارن ۔ لاؤ بابا، لاؤ۔ بھوکی کی آتما تمھیں دعا دے گی۔ اللہ تمھارا بھلا کرے گا۔

وکیل صاحب نے چپاتیاں اور شوربے کا پیالا بھکارن کے سامنے رکھدیا اُس نے ہاتھ سے ٹٹولا اور چپ لگائے

بیٹھی رہی۔ وکیل صاحب نے کہا مائی کھالے اب کیا سوچتی ہے۔ بھکارن بولی کہ بابا روٹیاں ان انگلیوں سے ٹوٹیں گی نہیں۔ ٹکڑے کر دو تو اٹھا کر کھالوں گی"۔ وکیل صاحب نے روٹیوں کو توڑ کر ٹکڑے کر دے۔ تب وہ ایک ایک ٹکڑا اٹھا کر کھانے لگی۔ وکیل صاحب کچھ سوچ میں کھڑے اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔ برابر ہی سوداگری کی ایک دوکان تھی۔ دوکاندار ایک سیٹھ جی تھے جو وکیل صاحب کے جان پہچان اور موکل بھی تھے وہ یہ سب تماشا دیکھ رہے تھے بولے "وکیل صاحب کھڑے کب تک رہیے گا۔ آیئے بیٹھ جائیے۔ مجھے حکم دیجئے کیا چاہتے ہیں"

وکیل صاحب - اہا سیٹھ جی۔ بندگی، معاف کیجئے گا میں نے آپ کی طرف دھیان نہیں کیا، ہاں بیٹھا جاتا ہوں یہ سوچ رہا تھا کہ اس بھکارن کو ایک کلھڑ میں پانی بھی لا دیتا۔

سیٹھ جی - آپ بیٹھیں آپ نہ تکلیف کریں۔ پانی میں ابھی منگوائے دیتا ہوں۔ جگو جگو ارے چل۔ بازار سے ایک بدھنا لے کر ٹھنڈا پینے کا پانی لے آ (نوکر پانی لینے گیا اور سیٹھ جی اور وکیل صاحب میں باتیں ہونے لگیں)

وکیل صاحب - کہئے سیٹھ جی مزاج تو اچھا ہے۔

سیٹھ جی - دیا ہے آپ کی مہاراج۔ بال بچے تو سب اچھے ہیں۔

وکیل صاحب - شکر ہے۔ سب خیریت ہے۔ اور کہئے سب کاروبار اچھا چلا جاتا ہے۔

سیٹھ جی - ہاں چلا ہی جاتا ہے۔ مہاراج۔ زمانہ کا رنگ دیکھتے ہوئے، غنیمت ہے بہت غنیمت ہے.....
وکیل صاحب پھر وہ زمین کا معاملہ ویسا ہی کا ویسا رہ گیا آپ نے کچھ دھیان نہیں دیا۔

وکیل صاحب - ارے بھائی، اونے پونے مل جل کر طے کر لو، عدالت میں جانے سے کس کا بھلا ہوگا۔

سیٹھ جی - اجی تو فریق ثانی بھی مانے۔ اب تو عدالت جائے بغیر کام چلتا نہیں۔ نالش دائر کر دیجئے۔

وکیل صاحب - آپ کی مرضی۔ تو صبح کاغذات لے کر آیئے گا۔ بات چیت ہو جائے گی۔

سیٹھ جی - جو حکم۔

جگو - پانی لے آیا حضور۔

وکیل صاحب - اس بھکارن کے سامنے رکھ دو (بھکارن سے مخاطب ہو کر) کیوں مائی پیٹ بھرا۔ یہ لو پانی رکھا ہے پی لو۔

بھکارن - (پانی اُٹھا کر) ہاں بابا۔ پیٹ بھر گیا۔ میری آتما دعا دیتی ہے۔ اللہ تمہارا بھلا کرے گا۔ اندھی لولی کی خبر لی۔ جگ جگ جیو، اللہ بھلا کرے گا۔

وکیل صاحب - تمہارے ان زخموں میں درد بھی ہوتا ہے۔

بھکارن - ہاں۔ بابا۔ ٹیستے رہتے ہیں۔ تڑختے رہتے ہیں۔

وکیل صاحب ۔ توتم اسپتال کیوں نہیں چلی جاتیں ۔ وہاں علاج ہو جائے گا، ہم تمھیں اسپتال پہونچا دیں؟

بھکارن ۔ ارے بابا۔ اس کا علاج تو اب اللہ ہی کرے گا اور کوئی نہیں کر سکتا۔ اسپتال میں کب تک پڑی رہونگی۔

سیٹھ جی ۔ اجی یہ کبھی نہیں جانے والی اسپتال کو تو یہ لوگ جیل سمجھتے ہیں۔

وکیل صاحب ۔ (بھکارن سے) اچھا تو ہم تمھیں دوا دیں، دوا کروگی؟

بھکارن ۔ ہاں، بابا کرلوں گی ۔ پر دوا سے کچھ ہوتا نہیں ۔

وکیل صاحب ۔ (سیٹھ جی سے) میرے پاس ایک بوٹی ہے ۔ آزمائی ہوئی ۔ دو تین آدمیوں کو فایدہ ہوا ہے کمال کی دوا ہے ۔

سیٹھ جی ۔ ہاں مہاراج آپ تو ساتوں و دیا ندھان ہو ۔ ایسے غریب پرور لوگ اب کہاں ۔

وکیل صاحب ۔ واہ سیٹھ جی ۔ آپ تو شاعری کرنے لگے ۔ اچھا تو اب چلدئے میں اس کے لئے کل دوا لادونگا اگر مجھے ذرا دیر ہو تو اسے ٹھرائے رکھئے گا چلی نہ جائے ۔

سیٹھ جی ۔ آپ اطمینان رکھئے ۔ اُس کی چار چھ آنے روز کی شام کو یہاں سے آمدنی ہوتی ہے ۔ چھوڑ کر کہاں جائیگی

دوسرے روز شام کو وکیل صاحب حسب وعدہ سیٹھ جی کی دوکان پر پھر آئے اور نوکر کے ہاتھوں کھانا پانی دوا سب ساتھ لیتے آئے ۔ بھکارن بھی حسب معمول وہیں پڑی اپنے دو ٹکڑے روٹی کی صدا لگا رہی تھی ۔ وکیل صاحب نے پہلے تو اُسے کھانا کھلوایا ۔ پانی پلوایا ۔ پھر وہیں دوکان کے آگے والے برآمدے کے پتھر کے فرش پر اطمینان سے بیٹھ کر اس کوڑھی بھکارن کے زخم اور ٹانگ گرم پانی سے دھوئی ۔ جڑی بوٹی کی کوئی لیپ ساتھ لائے تھے وہ خود ہاتھوں سے اُس کے زخموں پر لگائی ۔ بھکارن نے سیکڑوں دعائیں دیں اور پھر تھوڑی دیر اطمینان سے چپ لگائے پڑی رہی وکیل صاحب سیٹھ جی کی دوکان پر بیٹھ کر صابن سے اپنے ہاتھ دھونے لگے ۔

سیٹھ جی ۔ دھن ہے مہاراج دھن ہے ۔ اب ایسے راج رشی کہاں دیکھنے میں آتے ہیں ۔

وکیل صاحب ۔ سیٹھ جی آپ پھر وہی کل کی سی شاعری کرنے لگے ۔ پانچ منٹ دوکان پر بیٹھنے دیجئے گا یا نہیں

سیٹھ جی ۔ مہاراج آپ خوشامد سمجھتے ہیں مگر میں تو سچ کہتا ہوں کہ ہم نے تو ایسے سخی داتا اور دیالو دیکھے نہیں ۔

وکیل صاحب ۔ سیٹھ جی کوئی کسی کو نہیں دیتا ۔ ہر شخص اپنی تقدیر کا کھاتا ہے ۔

سیٹھ جی ۔ پر ایک بات ہے وکیل صاحب ۔ راہ چلتے ایسے بھکاری اور بیراگیوں کو پیسہ دینا کہ جنھوں نے بھیک مانگنا ہی اپنا پیشہ کرلیا ہے ۔ ہمیں تو کچھ ٹھیک نہیں معلوم ہوتا اس میں تو بڑی دھوکا دھڑی ہوتی ہے ۔ میں اس لولی اپاہج کو نہیں کہہ رہا ہوں ۔ یہ تو خیر ٹھیک ہے ۔ پر آپ تو راہ چلتے سدا برت بانٹتے ہیں ۔ پھر اب آج کل کے زمانہ میں تو یتیم خانے، محتاج خانے، کوڑھی خانے سب ہی قایم ہوگئے ہیں ۔ ہماری رائے میں تو جو خیرات کرنی ہو

انہیں کے ذریعہ سے کرے۔

وکیل صاحب ۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ جو کچھ بن پڑتا ہے چندہ میں بھی دیتا رہتا ہوں پر سیٹھ جی اس سے تسکین نہیں ہوتی۔ اول تو دولت کا نشہ آدمی کو ویسے ہی بہت رہتا ہے پھر جب دروازے پر لوگ ہاتھ پھیلائے کھڑے رہتے ہیں اور ہاتھ اٹھا کر دینے کی عادت پڑ جاتی ہے تو آدمی کا گھمنڈ اور بڑھ جاتا ہے لیکن اگر آپ دکھ درد اور دلدر کی دنیا میں جائے اور اس سے دو چار ہوئیے تو گردن جھک جاتی ہے اور ایشور یاد آتا ہے پھر اگر اپنے سے کچھ خدمت بن پڑے تو دل کو بڑی ڈھارس ہوتی ہے۔

سیٹھ جی ۔ مہاراج بڑے آدمیوں کی بڑی باتیں، یہ تو ہمارے کچھ سمجھ میں آتا نہیں، پر یہ آپ کے صابن سے ہاتھ دھونے سے ہماری بھی تسکین نہیں ہوتی۔ میں لائسول (ایک دوا کا نام ہے) کی شیشی کھولے دیتا ہوں مہربانی کر کے اس سے ہاتھ دھو ڈالیں۔ یہ چھوت کی بیماری ہے، اگر کہیں لگ لگا گئی تو غضب ہو جائے گا۔

وکیل صاحب ۔ سیٹھ جی کیا وہم کی باتیں کرتے ہو۔ ان ڈھکوسلوں سے کیا ہوتا ہے۔ صابن سے ہاتھ دھو لئے، کافی ہے۔ اچھا اب چلدئے۔ دیکھئے گاہک آئے ہیں، اُن کی سنئے ان باتوں میں خواہ مخواہ نقصان ہوگا۔

یہ کہکر وکیل صاحب چلدئے۔

چار پانچ روز بعد سیٹھ جی اپنے مقدمہ کی ضرورت اور عدالت کے کام سے وکیل صاحب کے دفتر میں صبح حاضر ہوئے۔ وکیل صاحب نے توجہ کر کے اس کا کام آدھ گھنٹے میں نبٹا دیا، سیٹھ جی اُٹھ کھڑے ہوئے اور چلنے لگے۔ لیکن ابھی دروازے تک پہونچے نہیں تھے کہ کچھ یاد آیا واپس ہوئے اور بولے :۔

سیٹھ جی ۔ یہ لیجئے وکیل صاحب میں بھول ہی گیا تھا آپ کو ایک ضروری خبر سنانی تھی۔ وہ آپ کی مریض بیچاری کوڑھی بھکارن کل رات کو گزر گئی۔

وکیل ۔ ہیں کیا ہوا۔ بیچاری مر گئی!

سیٹھ جی ۔ ہاں آپ کے یہاں آتے ہوئے میں پہلے دوکان چلا گیا تھا تو وہاں دیکھا کہ وہ بیچاری مری پڑی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ رات کو سردی کھا گئی، یا فالج گر گیا معلوم نہیں کیا ہوا۔ جہاں وہ پڑی ہے ایک دس گیارہ برس کا لڑکا کھڑا رو رہا تھا وہ ایک اور فقیر بھی تھا اُسی کے محلہ کا۔ جب رات کو بہت دیر ہو گئی اور وہ اپنی جھونپڑی میں نہیں پہونچی تو اس کا یہ نواسہ اور وہ آدمی اسے دیکھنے نکلے۔ یہاں اُسے مردہ پڑا پایا۔

وکیل صاحب ۔ اچھا ہوا بیچاری عذاب سے چھوٹی۔

سیٹھ جی ۔ اُن کے محلے کا فقیر جو اس کے پاس کھڑا تھا چنگی کے جمعدار سے کہہ رہا تھا کہ اس کو اٹھوا کر کہیں پھکوا دو تو میں نے کہا ایسا مت کرو، اس کے کفن اور مٹی دینے کا کچھ نہ کچھ انتظام کروا دیا جائے گا، سو میں نے سوچا کہ آپ سے کہہ دوں

وکیل صاحب - ضرور ضرور - آپ نے بہت اچھا کیا جو مجھ سے کہدیا (جیب سے روپیہ نکال کر) یہ لیجئے چار روپیہ تو جیب میں پڑے ہیں - لیتے جائیے - اگر اور ضرورت ہوگی تو پھر دیدوں گا -

سیٹھ جی - پانچ سات روپیہ میں سب کام ہو جائے گا - دو روپیہ میں دیدوں گا - ہمارے برابر میں شیخ جی کی دوکان ہے کچھ وہ دیدیں گے، ہو ہی جائے گا -

وکیل صاحب - تو پھر تکلیف کرکے آپ اس کا کچھ انتظام کرا دیجئے میں بھی کچہری جاتے ہوئے اُدھر سے ہوتا جاؤں گا -

وکیل صاحب کچہری جاتے ہوئے جب سیٹھ جی کی دوکان پر پہونچے تو دیکھا کہ اُس بھکارن پر ایک ٹاٹ کسی نے ڈالدیا ہے - ایک لڑکا اُس کے برابر بیٹھا ہوا رو رہا ہے اور دوسرا فقیر بھی موجود ہے - معلوم ہوا کہ شیخ جی اور دو ایک اور دوکانداروں نے چندہ کرکے دس روپیہ کی سبیل کرلی ہے اور بھکارن کے مٹی دینے کا انتظام اُسی فقیر کے ذریعہ سے کرایا جا رہا ہے - وکیل صاحب کا اطمینان ہوگیا اور وہ کچہری چلے گئے -

پانچ سات روز بعد ایک دن شام کو وکیل صاحب پھر بازار سے گزر رہے تھے - جب سیٹھ جی کی دوکان کے قریب پہونچے تو سیٹھ جی نے دور ہی سے بڑے تپاک سے سلام کیا اور بولے -

سیٹھ جی - وکیل صاحب، ذرا ادھر تشریف لائیگا آپ سے ایک بات کہنی ہے -

وکیل صاحب - کہئے کیا بات ہے ؟

سیٹھ جی - اجی بڑے مزے کی خبر آپ کو سنانی ہے - آپ سنکر بڑے خوش ہوں گے وہ کوڑھی بھکارن جو مرگئی تھی اور جس کے مٹی دینے کے لئے ہم نے اور آپ نے چندہ کیا تھا وہ پھر جی گئی -

وکیل صاحب - جی گئی کیا معنی ؟

سیٹھ جی - (ہنسکر) اجی وہ جیتی جاگتی، اچھی خاصی، چلتی پھرتی موجود ہے -

وکیل صاحب - کیا باتیں کرتے ہو، سیٹھ جی، کچھ دھوکا ہوا ہوگا -

سیٹھ جی - دھوکا تو ہوا ہی مہاراج اور دھوکا بھی کیسا دھوکا -

وکیل صاحب - واقعی ؟ تم سے کس نے کہا ؟ کس نے دیکھا ؟

سیٹھ جی - اجی، میرا شوفر خود اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا ہے - وہ اُسی کے محلہ میں رہتی ہے - اب اُس نے ادھر کا آنا جانا چھوڑ دیا اب صدر ہی کی طرف دو ٹکڑے روٹی کی صدا لگاتی ہے -

وکیل صاحب - میری تو کچھ سمجھ میں آیا نہیں -

سیٹھ جی - وہ دیکھئے موٹر آگیا - ابھی اپنے شوفر سے آپ کو سب حال سنوائے دیتا ہوں (موٹر آکر کھڑا ہوا)، اے میاں رمضان، ذرا وکیل صاحب کو اُس بھکارن کا حال تو سنادو -

شوفر - حضور میں اُسے یہاں پڑا دیکھا کرتا تھا۔ پھر معلوم ہوا کہ مرگئی۔ لیکن تیسرے ہی دن دیکھتا کیا ہوں کہ صدر بازار میں سڑک پر بڑی دو ٹکڑے روٹی کی صدا لگا رہی ہے۔ پہلے تو میں سمجھا کہ دھوکا ہوا۔ پھر قریب سے جا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہی ہے۔ وہیں بستی ہی میں رہتی ہے۔ اُس کا تو بڑا کارخانہ ہے۔ ایک نان بائی کی دوکان ہے۔ ایک کباڑ خانہ ہے۔ کئی نوکر چاکر ہیں۔ نصیبن نام ہے۔ آس پاس کے لوگ سب جانتے ہیں۔ مجھے یہ سب معلوم ہو کر بڑا تعجب ہوا تو میں نے سیٹھ جی سے آکر کہا۔

وکیل صاحب - تم ہمیں وہاں لیجا کر اُسے دکھا سکتے ہو۔

شوفر - ضرور، ابھی چلیں حضور۔

وکیل صاحب - کیوں بھئی سیٹھ جی چلو ذرا دیکھ آئیں۔ موٹر تو ہے ہی دس منٹ لگیں گے۔ چلتے ہو۔

سیٹھ جی - چلئے، ابھی چلئے۔

وکیل صاحب - تمہاری دوکان کا کچھ ہرج تو نہیں ہوگا۔

سیٹھ جی - نہیں ہرج کیا ہوگا، لڑکا موجود ہے، چلئے سوار ہوئیے۔

سیٹھ جی اور وکیل صاحب موٹر پر سوار ہو کر روانہ ہوئے۔ صدر بازار پہونچے تو موٹر نان بائی کی دوکان پر جا کر ٹھہری۔ دوکان پر ایک نگاہ ڈالی تو دیکھا کہ کچھ لنگڑے، لولے، فقیر، بھکاری تو دوکان کے اندر بیٹھے شوربا چپاتی کھا رہے ہیں اور کچھ دوکان کے سامنے بھیڑ لگائے کھڑے ہیں۔ کئی آدمی دوکان میں کام کر رہے ہیں۔ کوئی آٹا گوندھ رہا ہے۔ کوئی روٹی بنا رہا ہے۔ کوئی گاہکوں کو کھلا رہا ہے۔ کوئی پیسے لیتا جاتا اور شوربا چپاتی دیتا جاتا ہے۔ پھر آگے چلکر گلی میں دوکان کے پیچھے ایک بڑے پُرانے ٹوٹے پھوٹے کچے پکے مکان میں پہونچے جس میں کئی ایک تنگ و تاریک کوٹھریاں اور کمرے تھے۔ کئی دالان تھے اور صحن بہت وسیع تھا۔ کوٹھریوں میں دال، آٹے اور مسالے کی بوریاں چنی ہوئی لگی تھیں۔ گھی کے کنستر الگ رکھے تھے۔ ہر طرح اور وضع کے پُرانے کپڑے، ٹوپیاں، جوتے، لحاف، کمل گدّے، لکڑیاں۔ لاٹھیاں وغیرہ سب ہی کباڑ خانہ جمع تھا۔ ایک تخت پر بی نصیبن یعنی وہی کوڑھی بھکارن بڑے رعب داب سے بیٹھی تھی۔ اُس کا بدن اسوقت نسبتاً صاف ستھرا تھا۔ ایک سپید چادر تمام بدن پر لپیٹے ہوئے تھی، آنکھیں کھُلی اور چمک رہی تھیں۔ جو لوگ مکان میں چل پھر رہے تھے اُن کو تحکمانہ لہجہ میں ہدایتیں کر رہی تھی، وکیل صاحب کو دیکھتے ہی اُس کا ہاتھ بلا ارادہ اُٹھ گیا اور بولی -

بھکارن - وکیل صاحب - سلام

وکیل صاحب - کہو بی نصیبن - تم تو مرگئیں تھیں پھر جی اُٹھیں -

بھکارن - وکیل صاحب - اللہ ہی مارتا ہے اللہ ہی جلاتا ہے - اُس کا عجب کارخانہ ہے -

وکیل صاحب ۔ مگر تم نے تو حد کردی ۔ دھوکا دھڑی بھی تو کیسی ۔

بھکارن ۔ بابا پیٹ سب کچھ کراتا ہے ۔ یہ تو اللہ کی مرضی ہے ۔ اور دنیا کا چلن ہے ، تم بھی وہی کرتے ہو میں بھی وہی کرتے ہوں ، تم کچہری اور عدالت میں سیاہ کو سپید اور سپید کو سیاہ کرکے دکھاتے ہو، میں کوچہ و بازار میں بازی گری کرتی ہوں ۔ فرق صرف اتنا ہے کہ تمھارا کارخانہ بڑا اور اُجلا ہے ، میری دوکانداری نیچ اور میلی کچیلی ہے ورنہ مکاری تو ہم سب کا چلن ہے ۔ دنیا کا چلن ہے ۔ پیٹ بڑا مکار بابا ! پیٹ بڑا مکار !

وکیل صاحب ۔ بی نصیبن وکالت کا روپیہ بڑی گاڑھی کمائی کا روپیہ ہوتا ہے ۔ بڑی دماغ سوزی کرنی پڑتی ہے ، تب چار ٹکے ملتے ہیں ۔

بھکارن ۔ تو بابا ہمیں کیا مُفت میں ملجاتا ہے ۔ جلتے تپتے جیٹھ کی دھوپ اور لُو لگتی ہے ۔ جلتی زمین پر پڑے رہتے ہیں ۔ برسات میں پانی کیچڑ میں بھیگتے اور جاڑے میں ننگے بدن ٹھٹھرتے ہیں ۔ دن بھر چیختے چیختے گلا لگ جاتا اور زبان تھک جاتی ہے ۔ تب کہیں چار پیسے پیدا کرتے اور دو ٹکڑے روٹی کے نصیب ہوتے ہیں ۔ اوپر سے تم جھوٹا اور مکار بتاتے ہو ۔ نہ تم مکار نہ ہم مکار ۔ بس پیٹ بڑا مکار ! بابا ! پیٹ بڑا مکار ۔ وکیل صاحب نے یہ سب کچھ سنا ۔ لمحہ بھر کے لئے اُن کی گردن جھک گئی اور چُپ رہگئے ۔ پھر بولے :۔

"تو تمھارا تو یہ سب اتنا بڑا کارخانہ ہے تم یہ ڈھونگ کیوں رچتی ہو "

بھکارن ۔ بلا مشقت کئے بیٹھے بیٹھے روٹیاں توڑنی حرام ہے اور بابا یہ سب کارخانہ میرا تھوڑی ہے یہ تو بھائی بندوں کا ہے ۔ مجھسے چلائے جانے کو کہتے ہیں ، میں چلائے جاتی ہوں اس میں سب کا بھلا ہوتا ہے ، اللہ میرا بھی بھلا کرے گا ۔ یہ سمجھو کہ سیکڑوں لولے ، اپاہج ، ننگے بھوکے ، اندھے دھوندے روز یہاں سے اپنا پیٹ پالتے ہیں ۔ دونوں وقت پیٹ بھر شوربا چپاتی اور صبح چائے اور کلیچے اور یہ سب پانچ پیسے میں ۔ وکیل صاحب بازار میں تین چار آنہ سے کم میں پیٹ بھرنا مشکل ہے یہاں آدھے داموں میں کام چلتا ہے ۔ اسی طرح کپڑا لتا مل جاتا ہے ۔

وکیل صاحب ۔ بہت سے ایسے بھی آتے ہوں گے جو پورے دام دے سکتے ہیں لیکن آدھے داموں لیجاتے ہیں ۔

بھکارن ۔ ہاں ۔ شاید ۔ سو یہ کہاں نہیں ہوتا ۔ تمھارے بھنڈاروں ، آشرموں ، اور یتیم خانوں میں کیا نہیں ہوتا

وکیل صاحب ، یہ دنیا فرشتوں کی نہیں آدمیوں کی ہے ۔ آدمی کچھ بنا ہی ایسا ہے کہ گناہ کرنا اور پھر توبہ کرنا ۔ توبہ کرکے پھر گناہ کرنا اور گناہ کرکے پھر اپنے دامن کے داغوں اور دھبوں کو دھونے کی کوشش کرنا جو یہ نہیں کرتا اُس کی حالت البتہ افسوس کے قابل ہے ۔ ہم تو بس اتنا جانتے ہیں کہ نیکی کر اور دریا میں ڈال ۔ ہم اور آپ کچھ خدائی فوجدار تو ہیں نہیں کہ خدا کی خدائی کو بھی نکلا نہ بیٹھنے دیں ۔ رہا جھوٹ اور فریب تو بابا میں تو پہلے ہی کہہ چکی کہ پیٹ بڑا مکار ! بابا پیٹ بڑا مکار !

وکیل صاحب - سچ کہتی ہو بی نصیبن!

بھکارن - وکیل صاحب آپ نے جو اُس دن دوا لگادی تھی اُس سے فایدہ معلوم ہوتا ہے، اگر اور دیدو، لگالوں گی، بھلا ہوگا۔

وکیل صاحب - تو کسی کو ہمارے گھر بھیجدینا، دوا بھیجدیں گے۔ اچھا جاتے ہیں۔

بھکارن - اللہ بھلا کرے گا۔ وکیل صاحب آئے ہو تو کچھ غریب غربا کو دیتے بھی جاؤ۔

وکیل صاحب نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور دو روپئے نکال کر بی نصیبن کے ہاتھ رکھے۔

بھکارن - جگ جُگ جیو، بابا، جُگ جگ جیو - ایسے سخی داتا نہیں دیکھے - اللہ بھلا کریگا بابا، اللہ بھلا کریگا۔

جب وکیل صاحب چلنے لگے تو سیٹھ جی جو سب باتیں کھڑے سن رہے تھے اور یہ تماشہ دیکھ رہے تھے حیرت زدہ ہو کر بولے :-

" آخر سیدھے پن کی بھی کوئی حد ہوتی ہے، وکیل صاحب۔ آپ تو اندھیر کرتے ہیں۔

وکیل - بھائی تم سمجھے نہیں - یہ اس سے کہیں زیادہ کی مستحق ہے - میرے پاس اور کچھ تھا ہی نہیں!

کشن پرشاد کول

آپ کے فایدہ کی بات

اگر حسب ذیل کتابیں آپ علٰحدہ علٰحدہ خرید فرمائیں تو حسب ذیل قیمت ادا کرنا پڑے گی اور محصول علاوہ بریں:

نگارستان - دو روپیہ
جمالستان - چار روپیہ
ترغیبات جنسی - تین روپیہ
شہاب کی سرگزشت - ایک روپیہ
استفسار و جواب ہر سہ جلد - نو روپیہ
معرکۂ سخن - ڈھائی روپیہ
مکتوبات نیاز - ڈھائی روپیہ
اُردو شاعری - دو روپیہ
ہندی شاعری - ڈیڑھ روپیہ
میزان کل - ستائیس روپیہ آٹھ آنے

لیکن

اگر یہ تمام کتابیں ایک ساتھ طلب فرمائیں تو صرف بیش روپیہ میں ملجائیں گی اور محصول بھی ہمیں ادا کریں گے۔

منیجر نگار لکھنؤ

عربوں کی سیاسی بیداری

۱۸۰۰ء سے ۱۹۱۴ء تک

عربوں کی قومی تحریک وسیاسی بیداری کے متعلق اردو کیا انگریزی میں بھی کوئی مستقل تالیف نہیں ملتی۔ اس کا ایک سبب تو مغربی سیاست کی مصلحت اندیشی ہے اور دوسرے یہ کہ ان ذرائع تک دسترس بھی مشکل ہے جن سے اس تحریک کی صحیح تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے۔

عربی لٹریچر میں جو کچھ موجود تھا اس کا بڑا حصہ تو ضائع کر دیا گیا اور کچھ حصہ اُن لیڈروں کے خاندانوں کے پاس محفوظ چلا آ رہا ہے جنھوں نے اس سیاسی انقلاب میں کام کیا تھا۔

جارج انطاکی ایک شامی عیسائی کو اتفاق سے برسوں کی محنت وکاوش کے بعد یہ پوشیدہ کاغذات ہاتھ آئے اور اس نے ایک مستقل تصنیف اس موضوع پر پیش کی جس کا نام "بیداری عرب" Arab Awakening ہے۔ یہ سلسلہ مضامین اس کتاب سے اخذ واقتباس کا نتیجہ ہے جو تین حصوں پر مشتمل ہوگا۔ پہلا حصہ جو اس اشاعت میں درج کیا جا رہا ہے ان حالات وواقعات پر مشتمل ہے جو ۱۸۰۰ء سے ۱۹۱۴ء تک عربستان میں ظاہر ہوئے۔ دوسرے حصہ میں دورانِ جنگ کی عرب سیاست سے بحث کی جائے گی اور تیسرا حصہ جو نہایت اہم حصہ ہے "عرب سیاست بعد از جنگ" سے متعلق ہے۔

مجھے امید ہے کہ یہ سلسلہ مضامین جو اردو میں بالکل نئی چیز ہے دلچسپی کے ساتھ پڑھا جائے گا، کیونکہ جب تک خود ہمیں عربوں کی سیاست کا تدریجی ارتقاء نہ معلوم ہو، ہم شرق ادنیٰ کی سیاسی پیچیدگیوں کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے۔ — نیاز

---

(۱)

عربوں کی قومی تحریک مصریوں کے دورِ اقتدار کے ساتھ شروع ہوتی ہے یا اُن کے نکلنے کے بعد؟ اس کا فیصلہ ذرا دشوار ہے۔ یوں تو ایک تحریک مصریوں کی آمد سے پہلے ہی ملک میں شروع ہو چکی تھی جس نے بہت جلد منظم عسکری صورت اختیار کر لی تھی اور عرب صوبوں میں بڑی حد تک سلطان کی خلافت کو بھی خطرہ میں ڈال دیا تھا۔ یہ تھی وہابی تحریک لیکن یہ کوئی سیاسی چیز نہ تھی بلکہ خالص مذہبی تھی۔ اس تحریک کا سر کچلنے کے لئے سلطان نے محمد علی پاشا والیٔ مصر کو ۱۸۱۱ء میں مجبور کیا۔ محمد علی نے اپنے بیٹے ابراہیم پاشا کی قیادت میں ایک فوج روانہ کی اور کئی سال کی مسلسل کوششوں کے بعد محمد علی کو کامیابی نصیب ہوئی۔

سلطان نے ۱۷۹۹ء میں ایک فوج نپولین کے حملوں کا مقابلہ کرنے کے لئے مرتب کی تھی اور محمد علی کو بھی اس فوج کا ایک افسر مقرر کیا تھا۔ نپولین نے اس فوج کو تو بہ آسانی پسپا کر دیا، لیکن اس شکست نے محمد علی کی ترقی کے لئے دروازے کھول دیئے۔ دو سال کے بعد جب فرانسیسی فوجوں نے مصر خالی کیا تو محمد علی وہاں پوری فوج کا افسر اعلیٰ تھا۔ اس موقعہ سے اُس نے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور خوب خوب سیاسی و عسکری جوہر دکھلائے۔ ۱۸۰۵ء میں وہ مصر کا فوجی بادشاہ بن بیٹھا۔ وہابی تحریک کے مقابلہ میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد اُس کے ذہن میں 'عرب حکومت' کے قیام کا تصور پیدا ہوا۔ شام پر تسلط ہو جانے کے بعد اُس نے اپنے اس خیال کی تبلیغ شروع کی۔ اس کے بھی بہت کافی شواہد موجود ہیں کہ محمد علی خلافت کا بھی خواب دیکھ رہا تھا۔

'عرب حکومت' کی تحریک کے سلسلہ میں محمد علی اور ابراہیم پاشا کے لئے سب سے بڑی دشواری یہ تھی کہ وہ عرب نہ تھے۔ ابراہیم پاشا نے تو کچھ عربی سیکھ بھی لی تھی مگر محمد علی عربی زبان سے بالکل ناآشنا تھا۔ باپ بیٹے کے دماغ میں مستقبل کی حکومت کا یکساں تخیل نہ تھا۔ اس خیال سے تو دونوں متفق تھے کہ تمام عرب صوبوں کی ایک متحدہ حکومت بنائی جائے اور وہاں اُن کے خاندان کی حکومت ہو لیکن وہ یہ بھی جانتے تھے کہ یہ خواب اُس وقت تک شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا جب تک عربوں میں عملی طور پر اُن کے ساتھ ہمدردی نہ پیدا ہو۔ محمد علی عربوں سے قطعًا مانوس نہ تھا۔ وہ عربی ہونا بھی پسند نہ کرتا تھا۔ برخلاف اس کے ابراہیم کو اس کا پورا احساس تھا کہ اگر اُس کے باپ کی حکومت کی بنیادیں عرب قوم کی تجدید کے خیال پر استوار ہوں تو پائیدار ہوں گی۔ چنانچہ ابراہیم نے اپنی گورنری کے ابتدائی دو سال میں پوری طرح عرب قومیت کے خیالات کی تبلیغ شروع کر دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عربوں میں وہ بہت جلد ہر دلعزیز ہو گیا۔

لیکن ابراہیم پاشا کی حکومت کا یہ دور زیادہ عرصہ تک قایم نہ رہ سکا۔ مشرقی ایشیا میں ابراہیم پاشا کے بڑھتے ہوئے دقار نے ایک طرف یورپ کی طاقتوں کو اور دوسری طرف سلطان کو خائف کر دیا۔ انھیں حالات نے محمد علی کو فوجی طاقت بڑھانے پر مجبور کیا۔ ابراہیم پاشا بھی اپنے باپ کے حکم کی تعمیل کے لئے مجبور تھا۔ اُس نے جبریہ فوجی بھرتی شروع کی اور ملک پر طرح طرح کے نئے ٹیکس لگائے، جس کی وجہ سے ایک طرف اُس نے اپنی ہر دلعزیزی کھوئی اور دوسری طرف لوگوں کے دلوں میں اُس کی حکومت کی طرف سے بے اعتمادی پیدا ہونے لگی۔ چنانچہ آٹھ سال بعد جب ابراہیم نکالا گیا تو اُس کا ایک بھی خیر خواہ یا ہمدرد وہاں نہ تھا۔

یوں تو محمد علی کی ناکامی کے بہت سے اسباب تھے مگر اصل سبب پامرسٹون کی مخالفت تھی۔ پامرسٹون اپنے ایک خط مورخہ ۱۲ر مارچ ۱۸۳۳ء میں لکھتے ہیں:

> "اُس (محمد علی) کا مقصد تمام عربی بولنے والی قوموں کی ایک متحدہ حکومت کا قیام ہے۔ یوں تو اس میں کوئی ایسی خرابی نہیں، مگر ترکوں کا اقتدار اس سے عرب میں ختم ہو جائیگا اور یہ کوئی اچھی بات نہیں کیونکہ ہندوستان کے راستے کا بہترین محافظ ترک ہے۔"

ابراہیم پاشا کی روادارانہ دورِ حکومت نے عیسائی مبلغین کے لئے بڑی آسانیاں پیدا کر دی تھیں۔ اس سلسلہ میں فرانسیسی اور امریکی مبلغین کے ادارے قابلِ ذکر ہیں، جو آگے چلکر قومی تحریک کا گہوارہ بننے والے تھے۔ ملک کی تعلیمی اور ادبی ترقی انھیں کی مرہونِ منت ہے۔ ۱۸۳۰ء میں چار قابلِ ذکر باتیں ہوئیں۔ اول تو بیروت میں ایک کالج کھولا گیا جس نے آگے چل کر بہت بڑی یونیورسٹی کی شکل اختیار کر لی۔ دوسرے امریکی مبلغین نے اپنا پریس مالٹا سے بیروت منتقل کیا۔ تیسرے مسٹر ایلی اسمتھ اور اُن کی بیوی نے لڑکیوں کا ایک اسکول کھولا۔ چوتھے خود ابراہیم پاشا نے لڑکوں کی ابتدائی تعلیم کے لئے مدرسے کھولے۔ ابراہیم پاشا کی اسکیم تو زیادہ عرصہ تک نہ چل سکی اور مصریوں کے اخراج کے ساتھ وہ اسکیم بھی ختم ہو گئی مگر اُس نے ملک میں عمومًا اور مسلمانوں میں خصوصًا انقلاب پیدا کر دیا۔

(۲)

سنہ ۱۸۴۰ء میں مصریوں کے اخراج کے وقت ملک کی جو سیاسی حالت تھی اس پر ایک طائرانہ نظر ڈال لینا ضروری ہے۔ ملک میں ہر طرف بے اطمینانی کی لہریں دوڑ رہی تھیں۔ ابراہیم پاشا نے عیسائیوں کے ساتھ جو غیر معمولی مراعتیں کی تھیں، مسلمانوں دروزی مسلمانوں اور عیسائیوں میں سخت منافرت پیدا کر دی تھی۔ جس سے یورپ کی تمام طاقتوں نے خاص کر انگلستان نے پورا فائدہ اٹھایا۔

سنہ ۱۸۴۲ء میں سلطان نے ان حالات کے پیش نظر انتظامی امور میں تبدیلیاں کیں۔ لبنان کو دو اضلاع میں تقسیم کیا گیا۔ ایک میں عیسائیوں اور دوسرے میں دروزیوں کی آبادی تھی۔ مگر اس تقسیم نے صورت حالات کو بد سے بدتر بنا دیا دوسری طرف فرانس اور انگلستان لبنان میں اپنا اپنا اثر بڑھانے کے لئے کوشاں تھے۔ اس چیز نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ فرانس نے عیسائیوں کی اور انگلستان نے دروزیوں کی پشت پناہی شروع کی۔ چنانچہ سنہ ۱۸۴۵ء میں فساد ہوا اور دونوں نے خوب داد بہیمیت دی۔

اس کے بعد یورپ کی قوتوں نے فلسطین کا رخ کیا جہاں اُس وقت مختلف عیسائی فرقوں میں مقامات مقدسہ کے تحفظ کا اعزاز حاصل کرنے کے سلسلہ میں کشمکش جاری تھی۔ یہاں بھی یورپی طاقتوں نے اپنی عیارانہ سیاست کے خوب خوب جوہر دکھائے۔ جس کا نتیجہ آگے چل کر جنگ کریمیا کی شکل میں ظاہر ہوا۔ اس جنگ کے اختتام پر سلطان نے اپنی عیسائی رعایا کو بہت کافی حقوق عطا کئے۔

یوں تو ملک میں امن و امان قایم ہو گیا مگر اب بھی دو طاقتیں ایسی موجود تھیں جن سے ہر وقت خانہ جنگی کا خطرہ لگا رہتا تھا۔ ایک تو عیسائی کسانوں کی جماعت تھی جو جاگیردارانہ نظام سے عاجز آ چکی تھی اور اپنی گردن سے غلامی کا جوا اُتار پھینکنے کے لئے مضطرب تھی۔ (یہ جاگیردار بھی عیسائی ہی تھے) دوسری طرف عیسائی پیشواؤں کا گروہ تھا جو اُن حقوق سے مطمئن نہ تھا جو سلطان نے عطا کئے تھے۔ ان دونوں گروہوں کے مفاد میں یوں تو کوئی چیز بھی جنس مشترک کا درجہ نہ رکھتی تھی مگر چونکہ دونوں کا مقابلہ ایک ہی حریف سے تھا اس لئے وہ متحد ہو گئے۔ مگر آگے چل کر ان مذہبی پیشواؤں نے اپنی فطرت کے عین مطابق ان کو غلط راہ پر لگا دیا۔ جس وقت سنہ ۱۸۶۱ء میں کاشتکاروں اور جاگیرداروں کے درمیان لبنان میں فساد شروع ہوا تو ان مذہبی پیشواؤں نے اُس کا رُخ بدل کر اُس فساد کو فرقہ وارانہ رنگ دیدیا اور پھر تو اس فرقہ وارانہ فساد کی آگ لبنان سے دمشق تک پہونچ گئی جو شام کی تاریخ کا سب سے بڑا فرقہ وارانہ فساد تھا۔

فساد کے اختتام پر سلطان نے اپنے قابل وزیر فواد پاشا کو روانہ کیا۔ جنھوں نے بڑی قابلیت کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیئے۔ اس موقعہ پر یورپ کی طاقتوں کے نمایندے بھی وہاں موجود تھے، ان لوگوں کے مشورہ سے لبنان کی حکومت کے لئے ایک نیا خاکہ تیار کیا گیا۔ شام کو دو حصوں میں تقسیم کر کے لبنان کو علحدہ کر دیا گیا۔ شام کا تعلق مرکزی حکومت سے ہو گیا اور لبنان کے لئے ایک مشاورتی کونسل بنائی گئی اور وہاں کا گورنر ایک عیسائی مقرر کیا گیا۔ بین الاقوامی سیاست پر اس کا یہ اثر پڑا کہ یورپ کی قوتوں کو شام کی سیاست میں دخل اندازی کا موقعہ مل گیا جس سے وہ پورے پچاس سال تک فایدہ اُٹھاتے رہے۔ اس سے قطع نظر، سنہ ۱۸۶۰ء کا حادثہ شام کی تاریخ میں اُنیسویں صدی کا سب سے بڑا واقعہ ہے جس نے اہل ملک کے دماغوں کو جھنجھوڑ کر بیدار کر دیا اور پورا احساس پیدا ہو گیا کہ ملک کی غلامی و اخلاقی پستی کا اصل سبب فرقہ وارانہ تعصب اور قومی جہالت ہے۔

اس دور میں دو قابل ذکر ہستیاں پیدا ہوئیں، ایک ناسف یازجی اور دوسرے بطرس بستانی۔ عربوں کی قومی اور ذہنی زندگی کی تشکیل میں ان کا بہت بڑا حصہ تھا۔ یہ دونوں عیسائی تھے۔

ناسف یازجی سنہ ۱۸۰۰ء میں لبنان کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ اُن کا تعلق ایک غریب گھرانے سے تھا۔ گاؤں کے مکتبوں میں

میں اُن دنوں جو ناقص تعلیم رائج تھی ان کو بھی ملی۔ تحصیل علم کے شوق میں گھر سے باہر نکلے۔ خانقاہوں کے کتب خانوں میں جو قلمی کتابیں ملیں اُن کو پڑھا، اکثر کتابوں کی نقل بھی کی جو آج تک اُن کے گھرانے میں محفوظ ہیں۔

دو سال تک ایک خانقاہ کے سکریٹری رہے، پھر لبنان کے امیر بشیر کی ملازمت اختیار کی۔ سنہ ۱۸۴۰ء میں ابراہیم پاشا کے اخراج کے ساتھ امیر کو جلا وطن کیا گیا تو یہ بھی ملازمت سے برطرف ہوئے۔ کچھ دنوں کے بعد امریکی مبلغین نے اپنے شعبۂ تصنیف و تالیف کے لئے اُن کی خدمات حاصل کرلیں۔ سنہ ۱۸۷۱ء میں اُن کا انتقال ہوا۔ عربی زبان سے ناسف یازجی کو عشق تھا اور اپنی پوری زندگی اسی زبان کی توسیع و اشاعت پر صرف کردی۔ اُن کا ایمان تھا کہ عربوں کی نجات کی واحد شکل یہی ہے کہ عربی زبان اور عربی تمدن کا احیاء ہو۔ ناسف یازجی مسلمانوں اور عیسائیوں کو مخاطب کرکے کہتے کہ عربی زبان تم دونوں کی مشترکہ وراثت ہے اور اسی چیز کو تم لوگ دائمی اتحاد کا سنگِ بنیاد بناؤ۔

پطرس بستانی سنہ ۱۸۱۹ء میں لبنان کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق ایک کھاتے پیتے گھرانے سے تھا، اس لئے تعلیم بھی اُن کو بہتر قسم کی نصیب ہوئی۔ عربی کے علاوہ دوسری زبانیں بھی اُن کو سکھائی گئیں۔ سنہ ۱۸۴۰ء میں بیروت آئے۔ یہاں مسٹر ایلی اسمتھ اور اُن کی بیوی سے ملاقات ہوئی۔ کچھ دنوں بعد اُن کو اُستادوں کی ٹریننگ کے کالج میں جگہ مل گئی۔ اساتذہ اور طلبہ دونوں کے لئے پطرس بستانی نے بے حد مفید کتابیں تصنیف کیں۔ عربی زبان کا ایک لغت بھی انھوں نے مرتب کیا جو محیط المحیط کے نام سے دو جلدوں میں شایع ہوا ہے۔ بعد میں اسی لغت کی ضخامت کم کرکے طلباء کے استعمال کے لئے قطر المحیط کے نام سے شایع کیا۔ عربی زبان کی انسائیکلوپیڈیا بھی پطرس بستانی نے مرتب کرنی شروع کی تھی جس کی چھ جلدیں اُن کے انتقال کے وقت تک شایع ہوئی تھیں۔

عربی زبان کا پہلا ہفتہ وار اخبار بھی پطرس بستانی نے نفیر سوریہ کے نام سے جاری کیا۔ سنہ ۱۸۶۰ء کے قتل و غارت نے مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان تعصب اور نفرت کی خلیج بہت وسیع کردی تھی۔ اس اخبار کا مقصد اُسی خلیج کا پر کرنا تھا۔ پطرس بستانی نے اسی تخیل کے پیش نظر ایک اسکول بھی نیشنل اسکول کے نام سے کھولا اور ایک پندرہ روزہ رسالہ بھی جاری کیا اس کا بھی مقصد تعصب کا ازالہ اور قومیت کے جذبہ کو بیدار کرنا تھا۔ اس رسالہ کے سرورق پر لکھا رہتا:

"حب الوطنی جزو ایمان ہے"

ناسف یازجی اور پطرس بستانی نے ایک ادبی انجمن بھی قایم کی جو صرف شام ہی میں نہیں بلکہ پورے عرب میں اپنے طرز کی پہلی انجمن تھی۔ اُس کی دیکھا دیکھی ملک میں اور بھی ادبی انجمنیں بنائی گئی ہیں اُن میں سب سے زیادہ اہم وہ انجمن تھی جو سنہ ۱۸۴۷ء میں بنائی گئی۔ اس کی دو خصوصیتیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ اس کے تمام ممبر عرب تھے اور دوسرے یہ کہ اس کے ممبروں میں عیسائی و مسلمان بھی شامل تھے۔ پہلی انجمن کے قیام کے وقت تو فرقہ وارانہ تعصب بہت تھا اسی وجہ سے مسلمان اُس انجمن سے علحدہ رہے لیکن رفتہ رفتہ تعصبات کی بندشیں ڈھیلی پڑتی گئیں۔ بالآخر مسلمانوں نے خود یہ تجویز پیش کی کہ اگر عیسائی مبلغین کا اثر اُس انجمن سے دور کردیا جائے تو وہ شرکت کریں گے۔ چنانچہ سنہ ۱۸۵۷ء میں ایک سوسائٹی سیرین سائنٹفک سوسائٹی کے نام سے قایم ہوئی۔ شام کی تاریخ میں عموماً اور ۴۵۰ برس کے عثمانی دور میں خصوصاً کوئی ایسا پلیٹ فارم نہیں بنا تھا جس پر عیسائی اور مسلمان کسی مشترکہ مقصد کے لئے جمع ہوتے۔

(۴۳)

سیرین پروٹسٹنٹ کالج کے تعلیم یافتہ پانچ نوجوان خفیہ طور پر ایک جگہ جمع ہوئے۔ اور باضابطہ انجمن کی بنیاد ڈالی گئی۔ یہ

قصہ سلطان عبدالحمید کے دورِ خلافت کی ابتدا سے پورے ایک سال پیشتر کا ہے۔ اسی خفیہ انجمن نے پہلی بار منظم طریقے پر عربی قومی تحریک شروع کی۔ یہ سب کے سب عیسائی تھے مگر پہلے ہی دن ان لوگوں نے محسوس کیا کہ مسلمانوں اور دروزیوں کو بھی اس انجمن میں شامل کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ چند ہی دنوں میں ملک کے بائیس اور روشن خیال اصحاب اس خفیہ جماعت میں شامل ہو گئے اب یہ قومی انجمن تھی جس میں مسلمان اور عیسائی سب شامل تھے۔ اُنھیں دنوں یورپی انداز کی فری میسنری بھی شام میں نئی نئی شروع ہوئی تھی۔ اس خفیہ انجمن نے اپنے ایک ممبر کی مدد سے اس نوزائیدہ فری میسن لاج کو بھی اپنی تحریک کا ہمدرد بنا لیا۔

اس انجمن کا مرکز بیروت تھا اور اس کی شاخیں دمشق، طرابلس وغیرہ میں پھیلی ہوئی تھیں۔ اس انجمن کا مطمح نظر واضح انداز میں انقلابی تھا۔ ابتدا میں تو یہ انجمن نشستند و گفتند و برخاستند کے آگے نہ بڑھ سکی، خفیہ جلسے ہوتے، ممبر آپس میں تبادلۂ خیال کرتے یا کچھ اسکیمیں مرتب کرتے۔ یہ سلسلہ کئی سال تک جاری رہا۔ بالآخر کانا پھوسی کی سازشوں کے بعد ان لوگوں نے محسوس کیا کہ اب وسیع پیمانے پر کام شروع کرنا چاہیے۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ موثر طریقہ ان لوگوں نے یہ سوچا کہ بڑے بڑے اشتہار ہاتھ سے لکھ کر شہر کی دیواروں پر چسپاں کیے جائیں۔ ترکی دورِ استبداد میں کوئی دوسرا موثر طریقہ ممکن بھی نہ تھا۔ ان نوجوان سازش کرنے والوں نے بڑی تیزی کے ساتھ اپنا کام شروع کیا۔ اشتہار کا مضمون مرتب کر کے رات رات بھر وہ لوگ خط بگاڑ بگاڑ کر اُن کی نقلیں کرتے اور رات کے آخری حصہ میں گوند کی شیشیاں جیب میں ڈال کر شہر کے مختلف حصوں میں جا کر جتنے اشتہارات چسپاں کر سکتے کرتے۔ صبح کے وقت اُن اشتہارات کے گرد سیکڑوں انسانوں کا مجمع ہوتا۔ ایک شخص بہ آوازِ بلند اُس کا مضمون مجمع کو پڑھ کر سناتا۔ یہاں تک کہ پولیس موقعہ پر آجاتی اور اشتہار کو نوچ کر دو چار بے قصور راہ چلتوں کو گرفتار کر لیتی۔ بیروت میں ان اشتہاروں کا چرچا ختم نہ ہونے پایا تھا کہ دمشق، طرابلس سے بھی اسی طرح کے اشتہارات کی اطلاع موصول ہوئی۔ لوگ آپس میں بیٹھ کر ہر جگہ اُن اشتہارات کی شانِ نزول کے متعلق قیاس آرائیاں کرتے۔ انجمن کے ممبر بھی اپنے راز کو چھپائے ہوئے ان حلقوں میں کرید کرید کے بحث کرتے وہ اس کا بھی غور سے مطالعہ کرتے کہ عوام پر ان اشتہارات کا کیا اثر پڑا ہے اور انھیں تاثرات کی روشنی میں وہ دوسرا اشتہار مرتب کرتے

ان اشتہارات میں ترکی حکومت کی بری طرح دھجیاں اُڑائی جاتیں اور عربوں کو بغاوت کی ترغیب بھی دیجاتی۔ شام اور قسطنطنیہ دونوں جگہ کے حکام سخت پریشانی میں مبتلا تھے۔ سلطان نے دارالخلافت سے اپنے چند معتمد جاسوسوں کو اس کی تفتیش کیلئے روانہ کیا۔ بہت سے گھروں کی تلاشی ہوئی، سیکڑوں بے قصور انسانوں کو صرف شبہ پر قید کیا گیا۔ عام طور سے مشہور تھا کہ شام کے گورنر مدحت پاشا کو اس تحریک سے گہرا تعلق ہے کچھ لوگ اس سلسلہ میں بہت آگے بڑھ جاتے اور کہتے کہ جس طرح مصر میں محمد علی نے اپنے خاندان کی حکومت قایم کی ہے اسی طرح مدحت پاشا شام میں اپنے خاندان کی حکومت قایم کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن جہاں تک واقعات کا تعلق ہے، مدحت پاشا کو اس انجمن کا کوئی علم نہ تھا، بلکہ اُن کے واپس بلائے جانے کے تین چار سال بعد تک یہ انجمن قایم رہی۔ جب سلطان عبدالحمید کا استبداد ناقابلِ برداشت ہو گیا تو انجمن کے ممبروں نے اپنی کارروائی کو ختم کرنا ہی مناسب سمجھا اور اس کی تمام کارروائیاں ضایع کر دی گئیں اور بیشتر ممبر ہجرت کر کے مصر چلے گئے۔ عوام کو یا حکومت کو اس انجمن کے کسی ممبر کے متعلق کوئی علم نہ ہو سکا۔

اس انجمن کے متعلق اگر کہیں کوئی ریکارڈ مل سکتا ہے تو صرف لندن کے ریکارڈ آفس میں، وہ بھی صرف مراسلات کی شکل میں جو وقتاً فوقتاً برطانوی قونصل نے روانہ کیے تھے۔ اس سلسلے میں پہلا تار جو برطانوی قونصل نے ۲۸ جون ۱۸۸۰ء کو

روانہ کیا تھا، اس کا مضمون حسب ذیل ہے :

"بیروت میں انقلابی اشتہارات چسپاں کئے گئے ہیں۔ اُن کا مصنف مدحت کو سمجھا جارہا ہے۔ تفصیل آئندہ ڈاک سے"

اس کے ساتھ ہی کچھ اور مراسلات ہیں جو بیروت اور دمشق کے برطانوی قونصلوں نے روانہ کئے تھے۔ سب سے زیادہ اہم مراسلہ بیروت کے قونصل کا ہے، جس کے ساتھ تین اشتہارات بھی منسلک کئے گئے تھے۔ ان میں ایک تو اصلی اشتہار ہے جو پولیس کے پہونچنے سے پہلے ہی کسی نے اُڑا دیا تھا اور دو مختلف اشتہاروں کی نقلیں ہیں۔

پہلا اشتہار جو ۳ جولائی ۱۸۸۰ء کے مراسلہ کے ساتھ منسلک ہے۔ وہ بہت مختصر اور کم دلچسپ ہے۔ یہ سب سے پہلا اشتہار ہے جس کی اطلاع برطانوی قونصل جنرل کو ہوئی مگر یہ خفیہ انجمن کا پہلا اشتہار نہیں ہے کیونکہ اس میں خود کسی پہلے اشتہار کا حوالہ موجود ہے۔ اس اشتہار میں اہل شام کو ترکوں کے مظالم کے باوجود اُن کی گراں خوابی پر ملامت کی گئی ہے۔ نیز یہ بھی بتلایا گیا ہے کہ عربوں کی نااتفاقی نے آج ان لوگوں کو یورپ کی حکومتوں کی خواہشات کا شکار بنا دیا ہے۔ اسی اشتہار میں "عربی غرور" کا واسطہ دلا کر اپیل کی گئی ہے کہ اپنے کل اختلافات کو ختم کرکے پوری قوم ظالموں کے مقابلہ کے لئے متحد ہو جائے۔

ان مراسلات کے ساتھ دوسرے اشتہارات جو منسلک ہیں ان میں اور زیادہ تلخی کے ساتھ ترکوں کو برا بھلا کہا گیا ہے۔ ایک اشتہار جو ۳۱ دسمبر ۱۸۸۰ء کی شب میں چسپاں کیا گیا وہ بیحد اہم ہے، کیونکہ اس میں عربوں کے سیاسی مطالبات درج ہیں جو پہلے پہل عوام کے سامنے پیش کئے گئے۔ اسی اشتہار میں اس کا بھی اعلان کیا گیا ہے کہ اس انجمن کے ممبر تمام ملک میں پھیلے ہوئے ہیں اور ان مطالبات کو حاصل کرنے کے سلسلہ میں اگر ضرورت ہوئی تو تلوار اُٹھانے سے بھی دریغ نہ کیا جائے گا۔

اس اشتہار میں حسب ذیل مطالبات درج ہیں :

(۱) شام اور لبنان کو آزاد کیا جائے اور پہلے کی طرح متحد کر دیا جائے۔

(۲) عربی زبان کو سرکاری زبان تسلیم کیا جائے۔

(۳) سنسر ختم کیا جائے اور اظہار خیال نیز تحصیل علم پر کوئی پابندی عاید نہ ہو

(۴) مقامی فوجی خدمات کے لئے صرف مقامی لوگوں کو بھرتی کیا جائے۔

ان مطالبات کے متعلق یہاں پر چند باتیں جان لینا ضروری ہے۔ شام اور لبنان کو ۱۸۶۴ء میں تقسیم کیا گیا تھا جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ اس تقسیم کی وجہ سے شام اور لبنان کا سیاسی ڈھانچا ایک دوسرے سے بہت مختلف ہو گیا تھا اور یہ چیز عرب قومیت کے احیاء کی راہ میں سنگ گراں بن رہی تھی۔

دوسرا مطالبہ بھی کافی اہم تھا۔ شام میں عربی زبان کی جگہ ترکی زبان نے لے لی تھی۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ سب جتنے سرکاری افسر تھے وہ سب ترکی تھے اور وہ عربی سے بالکل نابلد تھے چنانچہ سرکاری دفاتر میں عام طور پر ترکی زبان رائج تھی۔

حکومت نے غیر ملکی کتابوں کا داخلہ قطعاً ممنوع قرار دیا تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ تعلیم عام نہ ہونے پائے۔ عربوں میں قومی بیداری تعلیمی ترقی کے ساتھ پیدا ہوئی تھی اس لئے حکومت نے بھی مناسب سمجھا کہ پہلے جڑ ہی پر کاری ضرب لگائی جائے تاکہ شاخیں خود بخود خشک ہو جائیں۔ اسی سلسلہ میں تحریر و تقریر کی آزادی بھی بالکل سلب کر لی گئی۔

(۴)

اُنیسویں صدی کے آخر میں ایک قابل ذکر ہستی منظر عام پر نمودار ہوئی جس نے بڑی حد تک قومی تحریک کا رخ ہی بدل دیا اُس نے لیڈر شپ عیسائیوں کے ہاتھ سے لیکر مسلمانوں کو سونپ دی۔ یہ ہستی عبدالرحمان کواکبی کی تھی۔ اُن کا تعلق شام کے ایک قدیم خاندان سے تھا۔ ۱۸۴۹ء میں پیدا ہوئے۔ مقامی مسلم کالج میں تعلیم پائی۔ اخبار نویس اور وکیل کی حیثیت سے زندگی کے میدان میں قدم رکھا۔

کچھ دنوں کے بعد سیاسی تحریک میں حصہ لینا شروع کیا اسی سلسلہ میں گرفتار ہوئے۔ ۱۸۹۸ء میں رہائی کے بعد مصر ہجرت کر کے چلے گئے کچھ دنوں مصر میں قیام کرنے کے بعد عالم اسلامی کی سیاحت کے لئے نکلے۔ سمالی لینڈ، زنجبار اور یمن ہوتے ہوئے مکہ پہونچے جہاں چند روز قیام کیا اور پھر قاہرہ واپس آ گئے۔ ۱۹۰۳ء میں یکایک ۵۴ سال کی عمر میں انتقال ہوا۔

ان کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا، جس میں مسلمان، عیسائی اور یہودی سب ہی شامل تھے۔ غریبوں سے اُنکو خاص لگاؤ تھا۔ چنانچہ ایک دفتر اُنھوں نے کھول رکھا تھا جہاں غریبوں کو بلاقیمت قانونی مشورہ دیا جاتا۔ یہی وجہ تھی کہ عام طور سے وہ "غریبوں کے باپ" کے نام سے مشہور تھے۔

کواکبی نے ایک کتاب "ام القرہ" کے نام سے لکھی اور اس کتاب میں بڑے دلچسپ انداز سے خلافت کے مسئلہ پر روشنی ڈالی۔ اس کتاب نے مسلمانوں کی سیاسی زندگی میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ سیاسی تحریک کی باگ ڈور جو عیسائی ہاتھوں سے نکل کر مسلمانوں کے ہاتھوں میں آئی اس میں بھی اس کتاب کا بہت بڑا حصہ تھا۔

نوجوان ترک اور نوجوان عرب

(۱)

۲۴ر جولائی ۱۹۰۸ء کو ترکی میں ایک سیاسی انقلاب ظہور پذیر ہوا اور اُس کے ساتھ ہی سلطان عبدالحمید نے اپنی رعایا کو ایک نیا دستور عطا کیا۔ دوسرے ہی دن سنسر کا سلسلہ ختم کر دیا گیا، سیاسی قیدی رہا کر دئے گئے اور جاسوسوں کی فوج جو تین لاکھ افراد پر مشتمل تھی معطل کر دی گئی۔

یہ انقلاب انجمن اتحاد و ترقی نے کیا تھا جس میں ترکوں کے ساتھ عرب بھی شریک تھے چنانچہ دستور کے نفاذ کے وقت ترکوں کے ساتھ عربوں نے بھی بہت خوشی کا اظہار کیا۔ شریف حسین جن کو سلطان نے قسطنطنیہ بلا کر نظر بند کر دیا تھا، اتحاد و ترقی نے ان کو شریف مکہ کے عہدہ پر معمور کیا۔ سلطان نے اس کی مخالفت کی اور کہا کہ شریف حسین مدینہ پہونچنے کے بعد بجائے خود ایک مستقل خطرہ بن جائے گا مگر اُن کی بات نہ سنی گئی اور شریف حسین حجاز کے لئے روانہ ہو گئے۔

انقلاب کے بعد جب ملک میں امن و امان قایم ہوا تو نئے دستور کے مطابق عام انتخابات عمل میں آئے۔ اس موقعہ پر عربوں کی آنکھیں کھل گئیں۔ پارلیمنٹ میں ۱۵۰ ترک اور صرف ۶۰ عرب منتخب ہوئے اگرچہ عربوں کی آبادی نصف سے زاید تھی اور سینٹ (Senate) جس کے ممبروں کو خود سلطان نے نامزد کیا تھا اس کے ۴۰ ممبروں میں صرف ۳ عرب ممبر نامزد ہوئے۔ انقلاب سے پہلے اور اُس کے بعد ترکوں نے عربوں سے جو عہد و پیمان کیا تھا، یہ تھی اُس کی پہلی قسط۔

اس تلخ تجربہ نے عربوں کو اندرونی کارروائی کے لئے مجبور کیا۔ متعدد خفیہ سیاسی ادارے تیزی کے ساتھ ملک میں قایم ہوئے جن میں سے اکثر کا حکومت کو اخیر وقت تک کوئی علم نہ ہو سکا۔ ان تمام انجمنوں کے مقاصد ایک دوسرے سے مختلف نہ تھے بلکہ انمیں ایک حد تک اتحاد بھی تھا۔ ان انجمنوں کے بعض ممبروں کو دوران جنگ میں قتل کر دیا گیا۔ ۱۹۱۱ء میں ایک انجمن اُن مسلمان طلبہ نے قایم کی جو پیرس میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ اس انجمن نے بہت زیادہ نمایاں کام انجام دئے۔ پہلے دو سال میں اسکا مرکز پیرس ہی رہا لیکن ۱۹۱۳ء میں اُس کا دفتر دمشق میں قایم ہوا اور اُس کی شاخیں تمام ملک میں پھیل گئیں۔ یہاں عیسائیوں نے بھی اس میں کافی دلچسپی لی۔ اس انجمن کا صحیح راز حکومت کو اخیر وقت تک نہ معلوم ہو سکا۔ اس کے ایک ممبر کو حکومت نے گرفتار کیا اور جس قدر اذیتیں دیجا سکتی تھیں اُس کو دی گئیں مگر اُس نے اپنا راز ظاہر نہ کیا۔ جب مصیبتیں ناقابل برداشت ہوئیں تو اُس نے خودکشی کر لی۔

۱۹۱۲ء میں ایک سیاسی ادارہ عرب کو ترکی حکومت سے علحدہ کرنے کے لئے بیروت میں قایم کیا گیا۔ اسکا نام دستور ساز کمیٹی تھا اور یہ کمیٹی ۸۶ ممبروں پر مشتمل تھی جس میں عیسائی اور مسلمان سب ہی شامل تھے۔ اس کمیٹی نے ملکی دستور کا ایک خاکہ تیار کیا اور وسط فروری ۱۳ء میں ملک کے سامنے اُس کو پیش کیا گیا، جس کی حمایت میں شام اور عراق کے تمام شہروں میں جلسے اور مظاہرے ہوئے۔ یہ تحریک اتحاد و ترقی والوں کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ چنانچہ ۸ اپریل ۱۳ء کو جبکہ اس کمیٹی کا جلسہ ہو رہا تھا پولیس نے اُس کے غیر قانونی ہونے کا اعلان کیا اس حکم نے ملک میں اس سرے سے لیکر اُس سرے تک آگ لگا دی۔ بیروت میں دوسرے دن مکمل ہڑتال ہوئی اور اخباروں نے اس خبر کو سیاہ حاشیوں میں شایع کیا۔ حکومت نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ تحریک کے سربرآوردہ لیڈروں کو گرفتار کیا اور ملک کے بہت سے اخبار بند کر دئے۔ لیکن تحریک رک نہ سکی اور شام سے نکل کر عرب کے دوسرے صوبوں میں بھی پھیل گئی۔ مجبوراً حکومت نے اعلان کیا کہ دستور ساز کمیٹی کے مطالبات عنقریب پورے کئے جائیں گے۔ اس کے بعد ہی لیڈروں کو بھی رہا کر دیا گیا اور تحریک ختم ہو گئی۔

۵ مئی ۱۳ء کو سرکاری طور پر ایک اعلان شایع کیا گیا اس میں اصلاحات کا ذکر ضرور تھا مگر عرب مطالبات اُس سے پورے نہیں ہوتے تھے بلکہ بعض اعتبار سے تو عربوں کو جو حقوق حاصل تھے وہ بھی چھین لئے گئے تھے۔

اب تحریک کا مرکز پھر پیرس منتقل ہوا۔ عام طور پر تحریک کے لیڈروں کا خیال تھا کہ اب وسیع پیمانے پر پروپگنڈے کا کام شروع کیا جائے مگر صورت حالات سے معلوم ہوتا تھا کہ ترکی حکومت کسی طرح بھی اب اس کو چلنے نہیں دیگی چنانچہ ایک ایسے غیر جانبدار ملک کی تلاش ہوئی جس پر ترکوں کا کوئی اثر نہ پڑ سکے اور اس سلسلہ میں پیرس کو منتخب کیا گیا۔ اس وقت ان لوگوں کے پیش نظر ایک کانفرنس کی تجویز تھی جس میں تمام عرب صوبوں کے نمایندے شرکت کریں اس تجویز کی تائید کم و بیش ملک کی تمام انجمنوں نے کی اور اُس کے انتظامات پوری قوت کے ساتھ شروع کر دئے گئے۔

بالآخر ۱۸ جون ۱۳ء کو کانفرنس کا افتتاح پیرس میں ہوا۔ ملک کے ۲۴ بڑے بڑے لیڈر اس اجتماع میں شریک تھے۔ اتحاد و ترقی نے پہلے تو کانفرنس کے ممبروں کو توڑنے کی کوشش کی اور جب کوئی کامیابی کی شکل نظر نہ آئی تو فرانس کی حکومت پر اُس نے زور ڈالا کہ کانفرنس پیرس میں نہ منعقد ہو سکے اور جب اس میں بھی ناکامی ہوئی تو اتحاد و ترقی کے سکریٹری کو پیرس روانہ کیا گیا کہ وہ کانفرنس کے ممبروں سے مصالحت کی گفت و شنید کرے، اُس نے اپنا مشن بڑی کامیابی کے ساتھ

پورا کیا، اور کانفرنس کے عرب ممبر خوشی خوشی واپس لوٹے۔ لیکن جب سرکاری اعلان شایع ہوا تو وہ امیدوں کے سراسر خلاف تھا اور اُس وقت کانفرنس کے ممبروں کی سمجھ میں آیا کہ یہ تمام شاطرانہ چالیں کانفرنس کو ختم کرنے کے لئے چلی گئی تھیں۔

(۲)

ایشیا میں سلطان کے مقبوضات تو ۱۹۱۴ء میں وہی تھے جو اُن کے تخت نشین ہونے کے وقت اُن کو ورثتاً ملے تھے۔ لیکن جزیرہ نمائے عرب میں برطانیہ کا اثر برابر بڑھ رہا تھا۔ حکومت ہند نے عرب سرداروں سے کئی معاہدے بھی کئے تھے۔ عدن کے اردگرد کی نو چھوٹی چھوٹی ریاستیں بھی برطانیہ کی حفاظت میں آگئی تھیں اور مسقط و بحرین سے بھی حکومت ہند نے معاہدہ کر لیا تھا۔ ان حالات نے قدرتاً حکومت ہند کے اقتدار کو بڑھا دیا۔ یمن میں بھی سلطان عبدالحمید کے لئے سخت مصیبت کا سامنا تھا۔ ۱۸۹۱ء میں وہاں شدید بےچینی پیدا ہوئی جس کو دبانے کے لئے پایۂ تخت سے ایک فوجی دستہ روانہ کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی۔ ابھی اس طرف سے پورا اطمینان نہ ہوا تھا کہ ۱۹۰۴ء میں پھر وہاں بغاوت شروع ہوئی۔ اس کی قیادت امام یحییٰ کر رہے تھے ——— پر امام کا قبضہ ہو گیا جو ایک سال تک جاری رہا۔ ۱۹۱۱ء میں دوبارہ امام یحییٰ کا پر قبضہ ہوا۔ اس مرتبہ سلطان نے عاجز آ کر امام سے مصالحت کر لی، اس کامیابی نے یمن میں امام یحییٰ کا اقتدار بہت بڑھا دیا۔

یمن کے شمال میں اسیریا کا صوبہ تھا وہاں سید محمد ابن علی ادریسی کا زور بڑھ رہا تھا۔ سنہ ۱۹۰۹ء میں اُس نے سلطان کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ امام یحییٰ اُس کی پشت پناہی کر رہے تھے، مگر اُس کو شکست ہوئی۔ دوسری مرتبہ اُس نے پھر بغاوت کی اس مرتبہ اطالوی امداد اُس کے ساتھ تھی۔ ابکی بار وہ پہاڑی علاقہ کا مالک بن بیٹھا۔

حجاز میں بھی اب سلطان کا اثر بہت کم ہو گیا تھا۔ شریف مکہ کے عہدہ پر شریف حسین کے تقرر نے سلطان کے لئے ایک مستقل مصیبت پیدا کر دی تھی۔ حجاز میں اب شریف حسین کا اس قدر اقتدار پیدا ہو گیا تھا کہ سلطان، شریف حسین کو اُس کے عہدہ سے معزول کرنے کی ہمت نہ کر سکا۔

(۳)

حجاز میں شریف حسین کے بعد دوسری اہم شخصیت خود اس کے بڑے لڑکے امیر عبداللہ کی تھی۔ شریف حسین کی جلاوطنی کے زمانہ میں اُس کو ترکوں کے ساتھ رہنے کا بہت کافی موقعہ ملا تھا اور اسوقت وہ عثمانی پارلیمنٹ کا ممبر بھی تھا عبداللہ تیز، جلد باز اور اپنے اوپر بھروسہ کرنے والا انسان تھا۔ اپنے باپ سے دوراندیشی کا بھی کچھ حصہ اُس نے پایا تھا۔ وہ ہمت کے ساتھ لارڈ کچنر کے پاس انگلستان کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے گیا۔ یہ قصہ فروری ۱۹۱۴ء کے پہلے ہفتہ کا ہے۔ کچنر اُسوقت مصر میں برطانوی ایجنٹ تھا۔ ان دونوں کی گفتگو رونلڈ اسٹورس کی موجودگی میں

ہوئی جو اُسوقت برطانوی ایجنسی کے محکمۂ مشرقیات کے سکریٹری تھے۔ عبداللہ نے وضاحت سے ساتھ گفتگو کی، اور یہ بھی بتلا دیا کہ اتحاد و ترقی والے اُس کے باپ کو شریف مکہ کے عہدہ سے معزول کرنے کی فکر میں ہیں اور اگر ان لوگوں نے ایسا کیا تو وہ حجاز میں ترکوں کے خلاف قطعاً بغاوت کرے گا۔ عبداللہ نے پرکارانہ انداز سے دوران گفتگو میں اس کا بھی اندازہ لگانے کی پوری کوشش کی کہ بغاوت کی صورت میں انگلستان کا کیا رویہ ہوگا۔ کچنر نے بھی در پردہ یہ ظاہر کیا کہ برطانیہ اور ترکی کے تعلقات چونکہ دوستانہ ہیں، اس لئے عبداللہ کا ساتھ انگلستان شاید ہی دے سکے مگر اُس نے کوئی قطعی بات نہیں کہی۔ کچنر نے یہ بھی محسوس کیا کہ اس کا مخاطب کچھ اور باتیں بھی کہنا چاہتا ہے مگر پہلی ملاقات میں اُن کا اظہار وہ مناسب نہیں سمجھتا۔ چنانچہ کچنر نے دوسرے دن رونالڈ اسٹورس کو باز دید کے لئے بھیجا۔

عبداللہ نے اپنے ارادے، عرب لیڈروں کے خیالات اور حجاز کی پوری صورت حال صاف اور واضح انداز میں رونلڈ اسٹورس کے سامنے کھول کر رکھدی۔ آخر میں پھر اُس نے انگلستان کے رویہ کے متعلق سوال کیا اور یہ بھی دریافت کیا کہ انگریز اس کے لئے کچھ مشین گنیں فراہم کر سکتے ہیں یا نہیں؟ اسٹورس نے بھی وہی کہا جو کچنر نے کہا تھا۔

ظاہرا تو اس گفتگو کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا مگر آنے والے واقعات پر یہ ملاقات بہت زیادہ اثر انداز ہوئی۔ اس گفتگو نے کم از کم کچنر کی تو آنکھیں کھولدیں۔ ایک طرف اُس کو عربوں اور ترکوں کے تعلقات کی صحیح حقیقت معلوم ہوئی اور دوسری طرف عربوں کے جذبۂ آزادی کا صحیح اندازہ بھی اس کو ہوگیا۔

(باقی)

حصۂ دوم : عربوں کی سیاست دورانِ جنگ میں

تیسرا حصہ : عربوں کی سیاست بعد از جنگ

محمد عتیق صدیقی

فلسفۂ مذہب

اس کتاب کی اہمیت نام سے ظاہر ہے۔ اسے ملک کے نامور محقق جناب مقبول احمد صاحب نے تالیف کیا ہے۔ اصل قیمت عہ ر رعایتی ۱۲ ار محصول علاوہ۔ منیجر نگار بک ایجنسی لکھنؤ

مکتوبات نیاز

مکرمی ۔

زحمت تو ہوگی، لیکن میرا بڑا کام نکل جائے اگر آپ سلام صاحب کو فوراً میرے پاس روانہ کرادیں ۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ "وسے برندش" قسم کے انسان ہیں اور جب کبھی وہ سفر کرنا چاہتے ہیں تو ریل ہمیشہ وقت سے پہلے چھوٹ جاتی ہے ۔

وہ وعدہ کریں بھی تو یقین نہ کیجئے بلکہ اپنے آدمی سے کہئے کہ کشاں کشاں انھیں اسٹیشن تک لیجائے بلکہ ممکن ہو تو گاڑی میں بٹھانے کے بعد دروازہ کو بھی مقفل کرادے، اور جب تک ریل کی رفتار کافی تیز نہ ہو جائے، دیکھتا رہے کہ کہیں کھڑکی سے باہر کودنے کی کوشش تو نہیں کرتے ۔

میں روز ایک خط بھیجتا ہوں اور وہ روز وہاں سے لکھ بھیجتے ہیں کہ آرہا ہوں لیکن میں جانتا ہوں کہ قیامت کا آنا برحق ہو یا نہ ہو لیکن ان کا نہ آنا ضرور برحق ہے ۔ اس لئے مجبور ہو کر آپ کو تکلیف دے رہا ہوں ۔

اُن کے نہ آنے سے جتنا حرج ہو رہا ہے، اس کا اندازہ آپ میری اس بیتابی سے اچھی طرح کرسکتے ہیں ۔

جناب کی تحریر تقضائے مبرم کی طرح پہونچی اور اسی وقت میں نے تعمیل ارشاد بھی کردی لیکن اگر ناگوار نہ ہو تو یہ بتا دیجئے کہ اس تدبیر سے آپ نے کیا فائدہ سوچا ہے ۔ بفرض محال اگر وہ آپ کی خواہش کے مطابق تحریر دے بھی دیں، تو اس کی پابندی کی ضمانت کیا ہے ۔ جس کام کا آغاز ہی بے اعتمادی ہو ۔ اس کا انجام معلوم !

اگر یہ سب کچھ بربنائے احتیاط ہے، تو میری رائے میں یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص زہر کھا کر مرجانے کے لئے تو طیار ہو، لیکن شرط یہ قرار دے کہ پہلے تریاق مہیا کردو ۔ تریاق کی فکر ہو تو زہر کھانا ہی کیا ضرور ہے ۔

اگر آپ کو اُن کی طرف سے بد عہدی کا اندیشہ ہے تو میری رائے میں یہ رشتہ مناسب نہیں ۔ ٹوٹنے والے دل کہیں دستاویز و تحریر سے جڑا کرتے ہیں

گرامی عزیز

غزل دیکھی، یوں آپ کا جی خوش کرنے کے لئے کہئے تو تعریف کر دوں، لیکن میری رائے میں آپ کی غزل کا ایک شعر بھی صحیح رنگ تغزل نہیں رکھتا۔ آپ اس باب میں میری رہنمائی و ہدایت چاہتے ہیں، لیکن میں کیونکر سمجھاؤں کہ تغزل کس چیز کا نام ہے اور اس کا صحیح معیار کیا ہے۔

ذوقؔ کا شعر ہے :-

ساتھ آہ کے شب، دل سے وہ پیکاں نکل آیا تھا کام تو مشکل مگر آساں نکل آیا

فن کے لحاظ سے اس میں کوئی خامی نہیں، لیکن شعریت یا تغزل سے اسے کیا واسطہ؟ اسی "دل سے پیکان نکلنے" کو میرؔ اس طرح کہتا ہے :-

سب ہوئے نادم پئے تدبیر ہو، جاناں سمیت تیر تو نکلا مرے سینہ سے لیکن جاں سمیت

آپ ان دونوں میں کوئی فرق محسوس کرتے ہیں یا نہیں؟ اگر میرؔ کا شعر آپ کے دل پر کوئی اثر چھوڑ جاتا ہے تو غور کیجئے کہ کیوں؟ اسی چیز کا نام تغزل ہے۔ لیکن اگر آپ کو ذوقؔ کا شعر زیادہ اچھا معلوم ہوتا ہے، تو پھر آپ کو کسی رہبری و ہدایت کی ضرورت نہیں، آپ آزاد ہیں جو چاہے کہئے اور جو چاہے کیجئے۔

ذوقؔ کی ایک مشہور غزل ہے۔ "قایل ہوتا۔ مقابل ہوتا" قابل کا قافیہ انھوں نے اس طرح نظم کیا ہے

سینۂ چرخ میں ہر اختر اگر دل ہے تو کیا، ایک دل ہوتا مگر درد کے قابل ہوتا،

دوسرا مصرعہ بہت پاکیزہ ہے، لیکن پہلے مصرعہ کے سینۂ چرخ اور اخترؔ نے شعر کو تغزل سے علحدہ کر دیا۔ اسی قافیہ میں شہیدیؔ کا شعر سنئے :

اس کے الطاف تو ہیں عام شہیدیؔ سب پر تجھ سے کیا ضد تھی اگر تو کسی قابل ہوتا

ذوقؔ کے سارے دیوان پر بھاری ہے۔

افسوس ہے کہ شعر کا صحیح ذوق بالکل خدا کی دین ہے اور کوشش کرکے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ پھر یہ کیا ضرور ہے کہ ہر شخص شعر بھی ضرور کہے۔ شاعر ہونا کوئی بڑی عمدہ بات نہیں جس پر آپ کو رشک آئے۔ لیکن اگر آپ اس مشغلہ کو ترک کرنا نہیں چاہتے تو غزلوں کا خیال چھوڑ دیجئے، اور بہت سے اصناف سخن ہیں اُن کا تجربہ کیجئے۔

بندہ نواز، مکرمت نامہ کا شکریہ۔ آپ نے جن محبت بھرے الفاظ سے مجھے یاد کیا ہے، انکی قوت کو محسوس کرتا ہوں لیکن

یہی بات میں جو کہتا تو نہ اعتبار ہوتا

اور سچ پوچھئے تو سوال اعتماد و بے اعتمادی کا بھی نہیں بلکہ اس بات کا ہے کہ

زشبنم بخیہ نتواں کرد چاکِ دامنِ گُل را

اس سے زیادہ بدقسمتی اور کیا ہو سکتی ہے۔

شعراء کہا کرتے ہیں کہ درد حد سے گزر کر دوا ہو جاتا ہے، یہاں دوائیں حد سے گزر کر درد بن گئی ہیں۔ پھر آپ کیوں اپنی محبت رائگاں کریں

زمین شور سنبل بر نیارد!

کس قدر تکلیف ہوئی مجھے یہ سنکر کہ آپ اِدھر سے گزرے بھی اور واپس بھی گئے! یہ میں جانتا ہوں کہ مجھ سے ملنا نہ ضروریات زندگی میں داخل ہے نہ نشاطِ زندگی میں، لیکن کم از کم آپ کے لئے معیارِ انسانیت ضرور تھا" آپ کے لئے" اس لئے کہ آپ اپنے آپ کو مجھ سے زیادہ انسان سمجھتے ہیں۔

خیر، میں یہ تو پوچھ نہیں سکتا کہ سفر کا مقصد کیا تھا، لیکن اس قدر بتا دینے میں کیا حرج ہے کہ آیندہ کب جانے کا مقصد ہے۔ مجھے آپ سے بعض باتیں نہایت ضروری کرنا ہیں، چاہتا ہوں کہ اسٹیشن ہی پر مل کر کہہ لوں جو کچھ کہنا ہے، یوں تو میں لکھوں گا نہیں اور لکھوں بھی تو آپ جواب کب دیتے ہیں۔

خط پہونچا۔ کیا بتاؤں ان کا کیا حال ہے۔ کسی اُستاد کا یہ شعر تم نے سُنا ہوگا

پڑی توسنِ عشق کی ٹاپ رے
ارے باپ رے، باپ رے، باپ رے

بس یہی عالم ہے ــــ کل تشریف لائے تھے، نہایت بدحواس و پریشاں حال، میں نے قصداً کوئی ذکر نہیں چھیڑا، ورنہ رو پڑتے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ چند دن کے لئے تم اپنے پاس بلالو۔ شاید سنبھل جائیں۔

مکرمی ۔ میں آپ کی رائے سے تو متفق ہوں، لیکن تدبیرِ عمل کی راہ سے نہیں۔ یعنی یہ تو ضرور چاہتا ہوں کہ اُن کو ہموار کرکے یہ کام کیا جائے، لیکن ہموار کرنے کی جو صورت آپ نے سوچی ہے وہ میرے نزدیک صحیح نہیں۔

آپ جانتے ہیں وہ نہایت خاموش بلکہ گُھنّا انسان ہے، ایک عمر گزرنے کے بعد بھی میں یہ نہ سمجھ سکا کہ جب وہ خفا ہوتا ہے تو مُسکراتا کیوں ہے، اسلئے اس کے دل میں گھر کرنا تو مشکل ہے، خدا معلوم کیا سوچتا ہے کس ادھیڑ بن میں لگا رہتا ہے۔

ایسے انسانوں کے متعلق میرا تجربہ یہ ہے کہ جبتک انکے دماغ کو کوئی سخت ضرب نہ پہونچائی جائے انکی زبان نہیں کُھلتی اسلئے زیادہ مناسب یہ ہے کہ بجائے صلح و آشتی کے آپ شروع ہی سے معاندانہ پہلو اختیار کیجئے اور اس کو یقین دلایئے کہ اس نزاع میں آپ کی ہمدردیاں دوسرے فریق کے ساتھ ہیں، یہ بات چونکہ اسکی توقع کے خلاف ہوگی، اسلئے وہ گھبرا جائیگا اور ہو سکتا ہے کہ شکوہ و شکایت کے سلسلہ میں دل کی بات زبان پر آجائے۔ مجھے بھی انکے ساتھ پوری ہمدردی ہے لیکن پہلے یہ تو اطمینان ہو جائے کہ وہ کس قسم کی دشمنی کو دوستی سمجھتا ہے!

جرمنی کو ناکہ بندی سے شکست نہیں ہو سکتی

یہ خیال کہ جرمنی کی شکست کا باعث ناکہ بندی ہو گی درست نہیں۔ اس سلسلہ میں آپ سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ پولستان کے قبضہ سے جرمنی کو کتنا فایدہ پہونچا۔

پہلی ستمبر کو نازی افواج نے مغرب اور شمال اور جنوب کی طرف سے پولینڈ پر حملہ کیا اور ۱۷ کو روس نے مشرق کی طرف سے اور بارہ دن بعد ۲۹ ستمبر کو دونوں نے پولینڈ کو آپس میں بانٹ لیا۔ اس سے قبل بھی تین بار پولینڈ کی تقسیم ہو چکی ہے (سنہ ۱۷۷۲ء - سنہ ۱۷۹۲ء - سنہ ۱۷۹۵ء) اب چوتھی مرتبہ پھر قوی پڑوسیوں نے اس کے حصے کر لئے اور فرق صرف اتنا ہے کہ پچھلی تقسیموں میں آسٹریا بھی شریک ہوتا تھا اور اس مرتبہ چونکہ جرمنی اسے پہلے ہی ہضم کر چکا ہے اس لئے اسے کوئی حصہ نہیں ملا۔

اس مرتبہ جرمنی کو پولینڈ میں جتنا کچھ ملا ہے وہ اس سے پہلے کبھی نہ ملا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ گلیشیا کا حصہ جس میں پٹرول کے چشمے پائے جاتے ہیں جرمنی کو نہیں ملا لیکن یوں سب سے زیادہ زرخیز حصہ اسی کے ہاتھ آیا ہے۔

پولینڈ کا رقبہ ۱۵۰۰۰۰ مربع میل ہے۔ اس میں سے ۵۵۰۰۰ مربع میل کا رقبہ جرمنی کو ملا اور ۹۵۰۰۰ میل روس کو لیکن آبادی کی تقسیم میں دو کرور دس لاکھ آدمی جرمنی کے حصہ میں آئے اور ایک کرور چالیس لاکھ روس کے حصہ میں

جرمنی کے مقبوضہ حصہ میں مختلف قوموں کی آبادی کا تناسب یہ ہے:-

پولستانی ۱۸۰۰۰۰۰ — یہودی ۱۷۰۰۰۰۰ — جرمن ۸۰۰۰۰۰ — اوکرانی ۲۰۰۰۰۰ —

روسی تقریباً ۶۰۰۰۰

روس کے مقبوضہ حصہ میں اس تناسب کی صورت یہ ہے:-

پولستانی ۴۵۰۰۰۰۰ — اوکرانی ۶۰۰۰۰۰۰ — سفید روسی ۲۰۰۰۰۰۰ — یہودی ۱۵۰۰۰۰۰-

جرمن ۹۵۰۰۰ — روسی وزیکی ۱۲۵۰۰۰

اس میں شک نہیں کہ اس مرتبہ بھی روس کو پولینڈ کا بڑا رقبہ ملگیا لیکن زیادہ آباد حصہ جس میں بڑے بڑے شہر، اور خاص خاص صنعت گاہیں شامل ہیں جرمنی ہی کے حصہ میں آیا۔ یعنی پولستان کے دس بڑے شہروں میں سے آٹھ جرمنی کو ملے اور صرف دو روس کو۔ بہترین زراعتی زمین، بڑے بڑے فارم، لوہے، کپڑے کے کارخانے اور کوئلہ کی معدنیں سب جرمنی ہی کے ہاتھ آئی ہیں۔

لڑائی سے پہلے پولستان میں ۳۲ لاکھ زراعتی فارم پائے جاتے تھے جن میں نصف سے کچھ کم یعنی ۱۴ لاکھ فارم جرمنی کو ملے لیکن بہت زیادہ ترقی یافتہ و زرخیز زمینیں ۶۰ فی صدی کے حساب سے ہاتھ آئیں جو اب ریاستہائے بالٹک سے ہجرت کرنے والے جرمنوں کو دیجا رہی ہیں۔

قابل کاشت زمینوں، جنگلوں اور مویشیوں کی جو تقسیم ان دونوں کے درمیان ہوئی ہے اس کی تفصیل یہ ہے :-

	قابل کاشت زمین	چراگاہیں	جنگل
جرمنی =	ایک کرور ۹۰ لاکھ ایکڑ	۴۰ لاکھ ایکڑ	ایک کرور ایکڑ
روس =	تین کرور ۱۰ لاکھ ایکڑ	×	ایک کرور ۵۰ لاکھ ایکڑ

علاوہ اس کے جانوروں میں ۱۲۰۰۰ گھوڑے - ۴۰ لاکھ گائیں - ۴۰ لاکھ سور اور ۷ لاکھ بھیڑیں بھی جرمنی کے ہاتھ آئیں۔

اس میں شک نہیں کہ جس حد تک رقبہ و کاشت کا تعلق ہے، روس کو جرمنی سے زیادہ ملا ہے، لیکن اس کو سب سے بڑا فایدہ کوئلہ کی معدنوں اور صنعت گاہوں سے ہوا ہے جن میں روس کا حصہ بہت کم ہے۔

کوئلہ کی پیداوار کے لحاظ سے پولستان کا دنیا میں ساتواں نمبر ہے۔ یہاں تین اضلاع میں ستر کوئلہ کی معدنیں ہیں جہاں ۶۵ ہزار کان کن کام کرتے ہیں اور تین کرور ٹن سے زیادہ کوئلہ سالانہ یہاں سے نکلتا ہے اور اب ان تمام معدنوں پر جرمنی کا قبضہ ہے۔ جنگ کے دوران میں اندیشہ تھا کہ پولستانی فوجیں ان معدنوں میں پانی بھر کے بیکار کر دیں گی، لیکن جرمنی نے حملہ کرتے ہی سب سے پہلے ان معدنوں کا محاصرہ کر لیا تاکہ وہ پانی بھر کے خراب نہ کر دی جائیں اور اس طرح تمام کانیں جوں کی توں جرمنی کے ہاتھ آگئیں۔

پولستان میں نمک کی کانیں بھی بہت بڑی بڑی ہیں، یہ بھی سب کی سب اچھی حالت میں جرمنی کو ملگئیں اور وہاں برابر کام جاری ہے۔

پٹرول کے چشمے البتہ روس کے ہاتھ آئے۔ یہاں سے سالانہ پانچ لاکھ ٹن پٹرول نکلتا ہے لیکن گزشتہ جنگ سے قبل دس لاکھ ٹن پٹرول یہاں سے نکلتا تھا اور اب بھی اتنا ہی بلکہ اس سے زیادہ نکل سکتا ہے

اگر انتظام معقول ہو۔

سیمنٹ، کاغذ، چمڑا اور ربر کے چند کارخانوں کے علاوہ باقی سب کارخانے (یعنی تقریباً ۹۰ فیصدی) جرمنی کے ہاتھ آئے اور اس طرح نہ صرف لوہے و فولاد کے کارخانے بلکہ اور صنعتی ادارے بھی جرمنی کو مل گئے۔ پولینڈ کا کارخانہ Wspolnota Interesow دنیا کے بہت بڑے آہنی کارخانوں میں شمار ہوتا ہے اسی طرح Katowice کا کارخانہ بھی دھات صاف کرنے کا نہایت عظیم الشان و ترقی یافتہ کارخانہ ہے۔ جہاں ۲۰ ہزار مزدور، ۵ ہزار عہدہ دار اور سیکڑوں انجنیر و ماہرین فن کام کرتے ہیں اور جرمن خوب ل نے حملہ کے پہلے ہی دن ان پر قبضہ کر لیا تھا۔ الغرض پولستان کے جست، سیسہ، ٹین، لوہے وغیرہ کے تمام کارخانے جرمنی کو مل گئے۔ یہ معلوم ہونا چاہئے کہ جست کی پیداوار میں پولستان کا نمبر پانچواں ہے اور گزشتہ جنگ سے پہلے تقریباً دو لاکھ ٹن جست یہاں سے نکلتا تھا۔

پولستان کے پارچہ بافی، ادویہ سازی اور مشین ڈھالنے کے کارخانے بھی زیادہ تر جرمنی ہی کو ملے۔ روس کو الکحل، شکر، تماکو اور لکڑی کے کارخانے زیادہ ملے ہیں۔

پولستان میں تین شہر پارچہ بافی کے بڑے بڑے مرکز تھے ان میں سے دو مرکز جرمنی کو ملے ہیں، اسی طرح دوا سازی اور برقی اینیاء کے کارخانے بھی زیادہ تر جرمنی کے ہاتھ آئے ہیں، چمڑے کی صنعت گاہیں دونوں میں برابر برابر تقسیم ہو گئی ہیں لیکن کاغذ کے کارخانے زیادہ تر جرمنی کو ملے ہیں۔ طیارہ سازی اور اسلحہ سازی کے کارخانے بھی اکثر جرمنی کے ہاتھ آئے اور اس طرح پولستان کے تمام صنعتی اداروں میں سے ایک لاکھ ۸۰ ہزار جرمن کو ملے اور ۲۷ ہزار روس کو۔

اب اس حقیقت کو سامنے رکھ کر دیکھئے کہ جرمن کو خام پیداوار کی فراہمی پولستان ہی کی طرف سے کتنی ہو رہی ہے، اور اس میں اگر آپ روس بلقان اور بالٹک کی ریاستوں کو بھی شامل کر لیں تو یہ کہنا غالباً غلط نہ ہو گا کہ ناکہ بندی سے جرمنی کو اس وقت تک زیادہ سے زیادہ دس فیصدی نقصان پہونچا ہے جو ان ذخایر کو دیکھتے ہوئے جو جرمنی میں عرصہ سے جمع کئے جا رہے ہیں، کچھ نہیں ہے، اور اتحادیین کا یہ خیال کہ وہ صرف ناکہ بندی سے جرمنی کو شکست دے سکتے ہیں، درست نہیں ہے۔

تاریخ اسلامی ہند مع توقیت

کتابی شکل میں

نگار سائز کے ۲۴۴ صفحات پر۔ قیمت معہ محصول ۱۲؍ ۔ منیجر نگار لکھنؤ

باب الاستفسار

کلام مومن

(جناب محمد یحییٰ صاحب - بھاگلپور)

اس سے قبل کلام مومن کے مشکل اشعار پر نگار میں جتنا حصہ شایع ہوا ہے، اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مستفسرین نے ترتیب کو پیش نظر رکھا تھا جو بہت مفید بات تھی اس لئے میں اسی سلسلہ کو قایم رکھتے ہوئے گزشتہ استفسار متعلقہ کے بعد والے اشعار پیش کرتا ہوں۔ آیندہ جو صاحب استفسار فرمائیں وہ اس کا لحاظ رکھیں تو بہتر ہے، کیونکہ اسکے بعد آخر میں ایک کتاب طیار ہو جائے گی۔

حل طلب اشعار ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:-

۱- یہ کاہ رُبا سے بھی ہیں کم اے کششِ دل، مذکور کچھ ایسا پس چلمن ہے ہمارا

اس میں ہیں کا فاعل کون سا لفظ ہے۔ شعر میں موجود نہیں ہے۔

۲- تفریح نہ کیونکر ہو، ہوا آ نہیں سکتی گویا درِ دلدار نشیمن ہے ہمارا

ہوا کا نہ آنا باعثِ تکلیف ہوا کرتا ہے یا باعث تفریح۔

۳- گر پاس ہے لوگوں کا تو آجا کہ قلق سے ہے لاش کہیں اور کہیں مدفن ہے ہمارا

پہلے مصرعہ کا تعلق دوسرے مصرعہ سے سمجھ میں نہیں آیا۔ لاش و مدفن کا تفرقہ اور لوگوں کا پاس دونوں باتیں بے ربط سی معلوم ہوتی ہیں۔

۴- چشمۂ حیواں بنا اس کے لبوں کی شرم سے پانی پانی بسکہ اعجازِ مسیحا ہو گیا

۵- بیوفائی ہے سرشت اسکی سو وہ ہم میں کہاں ہم مزاجی کے سبب سے غیر اپنا ہو گیا

مومن اور غیر میں ہم مزاجی کیونکر ہو گئی جبکہ ایک بیوفا ہے اور دوسرا نہیں۔

۶- رو دیا اس نے جو میری لاغری کو دیکھ کر قطرۂ اشک ندامت مجھ کو دریا ہو گیا

۷ - میں تو دیوانہ تھا اس کی عقل کو کیا ہو گیا قیس کہتا ہے مجھے ناصح کو سودا ہو گیا

دوسرا مصرعہ سمجھ میں نہیں آیا۔

۸ - یہ کس سے ہو کہ ان لطفوں پہ گستاخی نہ ہو غیر ہمسا کب ہوا ہر چند ہمسا ہو گیا"

دوسرے مصرعہ میں ہمسا دو جگہ آیا ہے لیکن مفہوم کے لحاظ سے ان میں کیا فرق ہے۔

۹ - کیا اشکِ غیر تھا کہ تحمل نہ ہو سکا میں جانگر حریفِ تغافل نہ ہو سکا

۱۰ - اس نے جو دل کو منہ نہ لگایا دو نیم ہے یہ جامِ جم ہوا قدحِ مل نہ ہو سکا

۱۱ - کہتے ہیں گلشن اپنی گلی اس کے دم سے تھی دشمن جو ہم ترانۂ بلبل نہ ہو سکا

۱۲ - وہ عکسِ زلف چشمِ عدو میں پڑا نہ ہو نظارہ مجھ سے جانبِ سنبل نہ ہو سکا

۱۳ - تنگی وہی رہی دلِ صد چاک کی ہوا یہ غنچہ پاش پاش مگر گل نہ ہو سکا

۱۴ - یہ ضعف ہے تو دم سے بھی کب تک چلا گیا خود رفتگی کے صدمہ سے غش مجھ کو آگیا

۱۵ - جلتی ہے جانِ آتشِ حسن پوش دیکھ کر چلمن سے شعلہ رد کوئی جلوہ دکھا گیا

۱۶ - بوئے سمن سے شاد تھے اغیارِ بے تمیز اس گل کو اعتبارِ نسیم و صبا گیا

۱۷ - وہ ہنسے سن کے نالۂ بلبل کا مجھے رونا ہے خندۂ گل کا

۱۸ - دردِ شانہ سے ترا مجو نزاکت خوش ہے کہ میں ہمدوش ہوں گو غیر بھی ہمدوش ہوا

(نگار) ۱ - میں سمجھتا ہوں کہ اس شعر میں ہیں غلط ہے اس کی جگہ ہے ہونا چاہئے۔ اس کا فاعل یہ ہے جو کششِ دل کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ معشوق پسِ چلمن بیٹھکر ہماری کششِ دل پر طعنہ زن ہو کہ اس میں تو کاہ رُبائی سی بھی کشش نہیں، ورنہ یہ چلمن کہیں پڑی رہ سکتی تھی، آپ اُٹھ جاتی۔

۲ - ہوا نہ آسکنے سے مومن کو صرف اس وجہ سے تفریح ہے کہ ان کا نشیمن، بھی معشوق کے گھر سے مشابہ ہو گیا۔ یعنی کسی طرح وہاں ہوا تک نہیں جا سکتی اسی طرح ان کے نشیمن میں بھی ہوا کا گزر نہیں۔ دونوں جگہ معنی کا فرق ضرور ہے، لیکن مومن لفظی مناسبت ہی سے لطف حاصل کرنا چاہتا ہے۔

۳ - اگر لوگوں کا لحاظ ہے تو بھی میرے مدفن پر آنے میں کیا حرج ہے کیونکہ فرطِ قلق سے میری لاش وہاں موجود ہی نہیں۔ ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لاش و مدفن کا تفرقہ تمہارے آنے سے مٹ جائے گا اور یہی ایک بات ایسی تھی جس کا لحاظ تھا۔

۴ - جس چیز کو دنیا چشمۂ حیواں کہتی ہے وہ فی الحقیقت اعجازِ مسیحا ہے جو محبوب کے لبوں کے اعجاز کو دیکھ کر

شرم سے پانی پانی ہوگیا۔ مدعا یہ کہنا ہے کہ اس کے لبوں کا اعجاز، مسیحا کے اعجاز اور آبِ حیواں کی جاں بخشی سے کہیں بڑھا چڑھا ہے۔

۵۔ دوسرے مصرعہ کا تعلق محبوب سے ہے اور اسی کی ہم مزاجی غیر سے دکھائی گئی ہے۔ مومن کو اس سے کوئی تعلق نہیں۔

۶۔ لاغری کی یہ حد ہے کہ ایک قطرۂ اشک بھی ڈبو دینے کے لئے دریا کا حکم رکھتا ہے۔

۷۔ دوسرے مصرعہ کے دو ٹکڑے یوں کیجئے:۔

قیس کہتا ہے مجھے ۔۔ ناصح کو سودا ہوگیا

یعنی ناصح مجھے قیس کہتا ہے اور یہ اس کا سودا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ قیس کو مجھ سے کیا نسبت!

۸۔ یہ ممکن نہیں کہ تم کسی پر مہربان ہو اور وہ گستاخ نہ ہو جائے لیکن مومن اپنے آپ کو اس سے مستثنیٰ سمجھتا ہے اور غیر کے مقابلہ میں اپنا امتیاز اس طرح ظاہر کرتا ہے کہ ہر چند غیر موردِ الطاف ہونے میں تو ہم سا ہوگیا لیکن ضبط و تحمل میں وہ ہمسا نہ ہو سکا، یعنی وہ گستاخ ہوگیا اور میں نے یہ غلطی کبھی نہیں کی۔

۹۔ محبوب کا تغافل کوئی رشکِ غیر تو تھا نہیں کہ متحمل نہ ہو سکتا۔ میں تو جان بوجھ کر متحمل نہ ہوا۔ مدعا یہ کہنا ہے کہ میں تمہارے تغافل کو تو برداشت کر سکتا ہوں لیکن رشکِ غیر کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ یعنی اگر تم مجھ سے تغافل کرتے ہو تو کرو لیکن غیر سے بھی التفات نہ رکھو کہ اس کی برداشت مجھ میں نہیں ہے۔

دوسرے مصرعہ میں ہو سکا بجائے ہوا کے استعمال ہوا ہے۔ کیونکہ جا نکر کے بعد ہو سکا کا کوئی موقعہ نہیں۔

۱۰۔ چونکہ اس نے دل کو منہ نہ لگایا اس لئے دو نیم ہوگیا۔ اگر وہ منہ لگاتا تو قدحِ شراب بن جاتا لیکن اب صرف جامِ جم ہو کر رہ گیا۔ اس میں ایک پہلو یہ بھی ہے کہ میرا دل وہ ہے کہ دو نیم ہونے کے بعد جامِ جم بن جاتا ہے۔

۱۱۔ محبوب کہتا ہے کہ میری گلی دشمن کی وجہ سے گلشن بنی ہوئی تھی، حالانکہ اس کو ہم ترانۂ بلبل ہونے کا بھی سلیقہ حاصل نہ تھا۔ یعنی وہ بلبل کے برابر بھی نالہ نہ کر سکتا تھا۔

۱۲۔ مومن سنبل کی طرف نہ دیکھ سکا اور اس کی توجیہہ یہ کرتا ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں ہوا کہ چشمِ عدو میں عکسِ زلفِ یار پڑا ہو۔ اور اس کا اثر مجھ پر یہ ہوا ہو کہ سنبل کی طرف نہ دیکھ سکوں انتہائی رشک و احساسِ رشک کو ظاہر کیا گیا ہے۔

۱۳۔ پہلے مصرعہ میں ہوا کا تعلق دوسرے مصرعہ سے ہے، یعنی یہ غنچہ پاش پاش ہوا مگر گل نہ ہو سکا۔ دل کی تنگی باوجود چاک چاک ہو جانے کے بھی وہی باقی ہے۔

۱۴۔ پہلے مصرعہ میں چلا گیا، "چلا جائے گا" کی جگہ استعمال ہوا ہے۔ یعنی جب "خود رفتگی" کے صدمہ سے

مجھ کو غش آجاتا ہے تو دم سے کیونکر چلا جائے گا۔ اس شعر کی بنیاد "خود رفتگی" پر قائم ہے جس میں چلنے کا مفہوم پنہاں ہے۔

۱۵- چلمن کے پیچھے سے کسی شعلہ رُو کے جلوہ کو مومن "آتشِ خس پوش" سے تعبیر کرتا ہے۔

۱۶- نسیم و صبا تو اس گُل (محبوب) کی خوشبو کو لے گئیں لیکن بے تمیز اغیار نے اس خوشبو کو بُوئے سمن سمجھا اس لئے اب نسیم و صبا کا بھی اعتبار گیا کہ وہ کیوں بوئے محبوب کو ایسے بدتمیز تک لے گئیں۔

۱۷- اُن کی سخت دلی کا یہ عالم ہے کہ بلبل کی آہ و زاری پر بھی ہنسی آتی ہے اور یہاں خندۂ گل کے انجام کو دیکھ کر اس پر بھی رونا آتا ہے۔

۱۸- شانہ میں درد دونوں کے ہے، مومن کے بھی اور محبوب کے بھی۔ لیکن فرق یہ ہے کہ محبوب کے شانہ میں درد اس لئے ہوا کہ وہ غیر سے ہمدوش ہوا تھا اور مومن کے شانہ پر اتفاقاً کسی وجہ سے درد پیدا ہوگیا۔ لیکن مومن خوش ہے کیونکہ اس طرح وہ محبوب کا ہمدوش تو ہوگیا۔ دوسرے مصرعہ میں پہلے "ہمدوش" کے معنے ہمسر یا برابر ہونے کے ہے اور دوسرے ہمدوش کے معنے ہم بغل ہونے کے ہیں۔

Fjord

(جناب کریم اللہ خاں صاحب - علی گڈھ)

آجکل جرمنی اور ناروے کی جنگ میں لفظ (Fyord) بعض مقامات کے نام کے ساتھ اکثر و بیشتر ملحق دیکھا جاتا ہے۔ اس کا تلفظ و ترجمہ کیا ہے۔

(نگار) اس کا تلفظ فیورڈ (Fyord) ہے ترجمہ کے لئے ہماری زبان میں کوئی لفظ موجود نہیں سوائے اس کے کہ بجنسہ اسی لفظ کو لے لیا جائے۔ اس سے مراد سمندر کا وہ محدود و تنگ حصہ ہے جو اونچی اونچی چٹانوں سے گھرا ہو۔ چونکہ ناروے کے سواحل پر پہاڑ ہی پہاڑ ہیں اس لئے وہاں اکثر جگہ فیورڈ بن گئے ہیں۔ یہ فی الاصل وہ وادیاں ہیں جو Glaciers (برف کے چشموں یا دریاؤں) سے کٹ کٹ کر بنتی ہیں۔ ان وادیوں اور دوسری وادیوں میں یہ فرق ہوتا ہے کہ ان کی شکل ل اور معمولی دریاؤں کی وادیاں V شکل کی ہوتی ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ برف کا وزن سیدھا عمودی خط میں ساحل کو کاٹتا ہے اور پانی میں اتنا وزن نہیں ہوتا کہ وہ عمودی خط میں ساحل کو کاٹے۔ یہی چھوٹی چھوٹی گہری وادیاں فیورڈ کہلاتی ہیں جہاں سمندر کافی گہرا ہوتا ہے، اور چاروں طرف چٹانوں کی وجہ سے جہاز آسانی کے ساتھ ان میں چھپ سکتے ہیں۔

کشکول

سنسر کا دفتر جب گزشتہ جنگ شروع ہوئی تو سنسر کے دفتر میں صرف ۱۷۰ آدمی کام کرتے تھے لیکن ۱۸ء تک ان کی تعداد پانچ ہزار ہو گئی تھی جو رات دن پارسلوں اور خطوں کی جانچ میں مصروف رہتے تھے۔

اس جنگ کے آغاز ہی میں تین ہزار آدمیوں کی خدمات حاصل کی گئی ہیں جو مرموز تحریروں (Code letters) اور غیر مرئی روشنائیوں (Invisible Inks) کی جانچ کیا کرتے ہیں۔ یہاں کے اسٹاف میں زندگی کے ہر شعبہ کا انسان پایا جاتا ہے یعنی اسکول کے اساتذہ، یونیورسٹیوں کے پروفیسر، ارباب کلیسا، قانون پیشہ لوگ، ساہوکار غرض سبھی یہاں موجود ہیں جن کو ان کی خدمت کا معاوضہ ۳۵۰ پونڈ سالانہ کے حساب سے ملتا ہے۔

لیورپول اور دوسرے بڑے بڑے مرکزی مقامات پر پانچ ٹن یا ۱۴۰ من سے زیادہ وزنی ڈاک کے تھیلے روزانہ جانچے جاتے ہیں اور ستمبر سے اسوقت تک ایک کرور پونڈ سے زیادہ قیمت کی ممنوع اشیاء ڈاک میں برآمد ہو چکی ہیں۔

خطوں کے جانچنے والے سب کے سب مرموز تحریروں اور غیر مرئی روشنائیوں کے ماہر ہیں لیکن پھر بھی بعض بعض تحریروں پر انھیں گھنٹوں صرف کرنا پڑتے ہیں۔ کیونکہ اگر کسی پیغام کے الفاظ پڑھ بھی لئے جائیں تو یہ معلوم کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ اس پیغام کا حقیقی مفہوم کیا ہے۔

خبر رسانی کے لئے لوگ عجیب و غریب طریقے استعمال کرتے ہیں۔ بعض ٹکٹ کے نیچے اپنا پیغام درج کر دیتے ہیں، محض کسی فہرست کے صفحات پر چند چھوٹے چھوٹے سوراخوں سے اپنا مدعا ظاہر کر دیتے ہیں۔

اکثر و بیشتر خطوط کو کھولکر ان کی تصویر لے لیجاتی ہے اور پھر انھیں لفافہ میں اس طرح رکھدیا جاتا ہے کہ مکتوب الیہ کو شبہ نہ ہو۔ اس کی ترکیب یہ ہے کہ لفافہ کے ایک کنارہ پر نہایت باریک دھار کے اوزار سے شگاف کر دیتے ہیں اور پھر خط اس کے اندر رکھ کر ایک خاص قسم کی گوند سے چپکا دیتے ہیں اور کوئی نشان کھولے جانے کا باقی نہیں رہتا لفافہ کے اندر سے خط نکالنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ ٹکٹ علٰحدہ کر کے اُسی جگہ دندانے دار شگاف دے لیتے

ہیں اور تار ڈالکر وہیں سے خط نکال لیتے ہیں۔ جب پڑھ لیتے ہیں تو پھر خط کو اندر رکھ کر شگاف جوڑ دیتے ہیں اور ٹکٹ چسپاں کر دیتے ہیں۔ تصویر کے کیمرے سے بھی سنسر کرنے میں بڑی مدد ملجاتی ہے، کیونکہ بہت سی ایسی باتیں جو نگاہ کو نظر نہیں آتیں، فوٹو کی پلیٹ پر نمایاں ہو جاتی ہیں۔ مثلاً کبھی ایسا ہوتا ہے کہ خط میں حرف ایک حرف پر نہایت باریک سا سوراخ ہوتا ہے جس سے مکتوب الیہ کو معلوم ہو سکتا ہے کہ اس خط کے ظاہری الفاظ کا حقیقی مفہوم کیا ہے پھر یہ سوراخ نگاہ کو تو نظر نہیں آتا، لیکن فوٹو سے اس کا پتہ چل جاتا ہے۔

غیر مرئی روشنائی کا استعمال، جاسوسی کی دنیا میں بہت قدیم چیز ہے، لیکن اب اس نے بالکل علمی صورت اختیار کر لی ہے اور ان روشنائیوں کو ابھارنے کے مختلف طریقے رائج ہیں۔ بعض خطوط ایسے سامنے آتے ہیں جو بظاہر کسی شبہ کی گنجائش نہیں رکھتے، لیکن جب انھیں دواؤں کے پانی میں ڈالا جاتا ہے تو بین السطور میں غیر مرئی روشنائی سے کچھ اور عبارت نظر آتی ہے۔ پھر یہی نہیں کیا جاتا کہ اس عبارت کو پڑھکر خط ضایع کر دیا جائے بلکہ نمایاں ہونے والی عبارت کو پھر اس کی اصلی حالت پر لاکر مکتوب الیہ کو روانہ کر دیا جاتا ہے، تاکہ انکی باہمی مراسلت سے مزید اطلاعات حاصل ہو سکیں۔

پارسلوں کے ذریعہ سے جو چیزیں بھیجی جاتی ہیں ان کی جانچ بڑی دشوار ہے، پارسل کے ڈورے اور اوپر کے کاغذ سے لیکر اندر تک بیسیوں چیزیں ایسی ہیں جن کے ذریعہ سے خبر رسانی ہو سکتی ہے۔ مثلاً ایک فلم ٹین کے اندر بند کر کے بھیجا جا رہا ہے جس میں بظاہر کوئی بات شبہ کی نہیں معلوم ہوتی، لیکن جس وقت کھولکر اس کے سلولائڈ کا فوٹو لیا جاتا ہے تو کنارے کنارے کچھ لکیریں سی نظر آتی ہیں جو درحقیقت مرموز پیغام ہے۔ جوتے کی ایڑیوں، صابونوں، چاکلٹ کی ٹکیوں، بکسوں کے جوڑوں، کتاب کی دفتیوں، قمیصوں کے بٹنوں اور گیندوں کے اندر بھی یہ پوشیدہ پیغامات پائے گئے ہیں۔

ایک شخص پر جاسوس ہونے کا شبہ تھا لیکن اس کے اسباب میں کوئی چیز ایسی نہ ملی جس سے اس شبہ کو تقویت پہونچتی، اتفاق سے اس کے کنگھے کو خوردبین سے دیکھا گیا تو اس کے دانتوں پر کچھ نشانات نظر آئے جو فی الحقیقت پیغام تھے۔

۶۰ لاکھ پونڈ روزانہ کہاں جاتا ہے

کئی مہینے ہوئے لارڈ سائمن نے کہا تھا کہ اس جنگ میں برطانیہ کو روزانہ ۶۰ لاکھ پونڈ خرچ کرنا پڑ رہا ہے۔ یعنی تقریباً سوا سات کرور روپیہ۔ لیکن یہ روپیہ کہاں جاتا ہے اس کی تفصیل ملاحظہ ہو:۔

رائفل	۸ پونڈ
۱۶ انچ دہانے کی بحری توپ	۴۵ ہزار پونڈ

جنگی جہاز (۳۵۰۰۰ ٹن)	۸۱ لاکھ ۲۴ ہزار پونڈ
ویکر مشین گن	۲۰۰ پونڈ
آبدوز (۱۰۹۰ ٹن)	۳۴۹۷۵۰ پونڈ
ٹینک (۳۵ ٹن)	۴۵ ہزار پونڈ
۴٫۷ انچ دہانے کی توپ	۲۰۱۵ پونڈ
۴٫۷ انچ کا پھٹنے والا گولہ	۶ پونڈ
بڑا بمبار ہوائی جہاز	۲۰ ہزار پونڈ
لیوس گن	۶۰ پونڈ
غبارہ کی چھتری	۶۰ پونڈ

اشتہار کا ایک نیا طریقہ یورپ کے ایک اخبار میں اشتہار شایع ہوتا ہے کہ "ایک لکھ پتی کو ایسی ہی صفات کی بیوی چاہیے جو فلاں ناول کی ہیروئن میں پائی جاتی ہیں"۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۴۸ گھنٹے کے اندر اس ناول کی لاکھوں کاپیاں فروخت ہو گئیں۔

پیرس میں جوانی کا معیار تم جوان ہو اگر روزانہ چاکولٹ کا ایک پیکٹ پورے لطف کے ساتھ کھا سکتے ہو لیکن تم کم جوان ہو اگر تم یہ کہو کہ "چاکولٹ مضرت رساں چیز ہے"

تم جوان ہو اگر تمھیں ایسے فلم یا ایسا لٹریچر پسند ہے جو تمھیں رونے پر مجبور کر دے، لیکن تم جوان ہو اگر تم سب سے پہلے ایک آدمی کی آنکھیں دیکھتے ہو، لیکن تم کم جوان ہو اگر تمھاری نگاہ پہلے اس کے ہاتھوں پر پڑتی ہے۔

تم جوان ہو اگر تم لوگوں سے اپنی ذہانت کی داد چاہتے ہو، لیکن کم جوان ہو اگر اپنے حُسن کی داد چاہتے ہو

ایک ڈاکٹر کی فیس اس وقت تک سب سے بڑی فیس جو کسی ڈاکٹر کو دی گئی۔ وہ تھی جو انگلستان کے ایک ڈاکٹر ڈمس ڈیل (Dimsdale) روس کی ملکہ کیتھرائن دوم نے ادا کی۔

ملکہ نے اس ڈاکٹر کو چیچک کا ٹیکہ لینے کے لئے روس بلایا تھا اور اس کا معاوضہ اس نے یہ دیا:

۹۰۰۰ پونڈ فیس — ۱۸۰۰ پونڈ مصارف سفر — ۴۵۰ پونڈ سالانہ کی پنشن۔

کھانے کا اندازہ میلوں سے ستاروں کی دوری "نوری سال" سے معلوم کی جاتی ہے اور ایک بوسہ کا وقفہ فلم کی طوالت سے، لیکن ہوائی جہازوں میں کھانے کا اندازہ

میلوں سے کیا جاتا ہے، چنانچہ ایک نصف اُبلے ہوئے انڈے کا آرڈر دیا جائے تو اسکے طیار ہونے، سامنے آنے اور کھانے میں ۵ میل طے ہو جاتے ہیں، اسی طرح ہلکے ناشتہ میں ۱۰۰ میل کا فاصلہ طے ہو جاتا ہے، اس لئے اگر ہوائی جہاز پر ۵۰ میل کے کھانے کا آرڈر دیا جائے گا تو آپ کو صرف ایک ابلا ہوا انڈا ملے گا اور سو میل کے آرڈر پر ہلکا ناشتہ۔

ہیرا اور اسلحہ سازی

عام طور پر ہیرے کو صرف زیب و آرایش کی چیز سمجھا جاتا ہے، حالانکہ اگر اس کا وجود نہ ہو تو بعض مہیب آلات جنگ طیار ہی نہ ہو سکیں۔ جن دھاتوں سے آلات حرب طیار کئے جاتے ہیں وہ خاص طور سے نہایت سخت طیار کی جاتی ہیں اور ان کے کاٹنے کے لئے جن اوزاروں کی ضرورت ہوتی ہے ان کی دھار بغیر ہیرے کی مدد کے بن ہی نہیں سکتی۔ یہ ہیرا ہی ہے جس کی مدد سے ٹینک اور جنگی جہاز طیار ہوتے ہیں۔ پٹرول کی فراہمی بھی بہت کچھ ہیرے پر منحصر ہے، کیونکہ بعض چٹانیں اتنی سخت آجاتی ہیں کہ بغیر ہیرے کی مدد کے ان کو کاٹا ہی نہیں جا سکتا۔ اس وقت دنیا میں جتنی معدنیں ہیرے کی ہیں، ان میں سے دو تہائی ہیرا، آلات بنانے کے کام آرہا ہے۔

ایک جرمن لیڈر کی دُعا

اے خدا اگر ہماری مدد نہیں کرتا تو نہ کر، لیکن کم از کم یہی کر کہ ہمارے دشمنوں کو مدد نہ دے۔ مدعا یہ کہ جرمنی کا مخالفت صرف اسی وقت کامیاب ہو سکتا ہے جب کوئی غیبی امداد اسے پہونچے ورنہ یوں ممکن نہیں۔

تنوعات

اٹلی میں باہر سونا لیجانے کی ممانعت ہے۔ خفیہ فروشوں نے یہ ترکیب کی کہ سونے کی کھونٹیاں اس قسم کی طیار کرائیں جیسی ریل کے فرسٹ کلاس ڈبوں میں لگائی جاتی ہیں اور ان پر نکل کی پالش کرادی۔ ریل میں بیٹھنے کے بعد اس کی کھونٹیوں کو علٰحدہ کر لیا اور یہ کھونٹیاں لگا دیں۔ مقصود یہ تھا کہ جب اٹلی کی سرحد سے نکل جائیں تو سونے کی کھونٹیاں نکال لیں اور اصلی کھونٹیاں لگا دیں۔

گٹھیا اور اسی قسم کے امراض کا علاج شہد کی مکھیوں کے ڈنک سے، عہد قدیم کے انسان کو بھی معلوم تھا ——— اگر انسان کے جسم سے تمام نمک نکال لیا جائے تو ۸ گھنٹے سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتا ——— زمین کا سب سے زیادہ گہرا سوراخ وہ ہے جو کیلیفورنیا میں پایا جاتا ہے، یہ پٹرول کا کنواں ہے جو ۱۵۰۰۴ فٹ گہرا ہے۔

مطبوعات موصولہ

کلام الملوک حیدر آباد میں ایک انجمن "مجلس اشاعت دکنی مخطوطات" کے نام سے قایم ہے جس کو نواب سالار جنگ بہادر کی سرپرستی حاصل ہے۔ اس انجمن کا مقصود یہ ہے کہ ولی کے معاصرین اور ان سے پہلے کے شعراء و صاحبان تصنیف کے غیر مطبوعہ کلام کو شایع کیا جائے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں جو کتابیں شایع ہوئی ہیں، انھیں میں سے ایک "کلام الملوک" ہے۔

اس میں بہمنی، عادل شاہی اور قطب شاہی بادشاہوں کا فارسی کلام نہایت محنت و کاوش سے یکجا کر دیا گیا ہے اور مغربی انداز تحقیق و ترتیب کو سامنے رکھ کر یہ مجموعہ شایع کیا گیا ہے۔ میر سعادت علی رضوی ایم۔ اے نے جو اس انجمن کے شریک معتمد ہیں اس مجموعہ کو ترتیب دیا ہے اور ایک مختصر مقدمہ لکھ کر بتایا ہے کہ انھوں نے اس مجموعہ کی ترتیب میں کن کن کتابوں سے مدد لی ہے اور ساتھ ہی ساتھ ان پر تاریخی انتقاد بھی کیا ہے۔

اس قسم کے جواہر ریزے نواب سالار جنگ بہادر کے کتب خانہ میں بکثرت پائے جاتے ہیں اور یقیناً انجمن کی خوش نصیبی ہے کہ اس کو ایسے خوش ذوق نادر کتب خانہ رکھنے والے امیر کی سرپرستی حاصل ہو سکی۔

جن بادشاہوں کا کلام دیا گیا ہے ان کی تصویریں بھی شامل کر دی گئی ہے اور ان کا شجرۂ نسب بھی معہ مختصر حالات کے دیدیا گیا ہے۔ اس لئے کتاب کی اہمیت و دلچسپی بہت بڑھ گئی ہے۔ کتابت و طباعت نہایت پاکیزہ ہے اور کاغذ "آرٹ پیپر" استعمال کیا گیا ہے۔

اس مجموعہ میں حسب ذیل بادشاہوں کا کلام پایا جاتا ہے:۔

(بہمنی خاندان) سلطان محمد ثانی (یہ سلطان حسن گنگو بہمنی کا پوتا تھا) سنہ ۷۸۰ھ ۔ سنہ ۷۹۹ھ ۔
سلطان فیروز شاہ بہمنی (سنہ ۸۰۰ھ ۔ سنہ ۸۲۵ھ)

(عادل شاہی خاندان) یوسف عادل شاہ (سنہ ۸۹۵ھ ۔ سنہ ۹۱۶ھ) ۔ اسماعیل عادل شاہ (سنہ ۹۱۶ھ ۔ سنہ ۹۴۱ھ)
ابراہیم عادل شاہ ثانی (سنہ ۹۸۸ھ ۔ سنہ ۱۰۳۷ھ)

(قطب شاہی خاندان) یار قلی جمشید قطب شاہ (سنہ ۹۵۰ھ ۔ سنہ ۹۵۷ھ) ۔ محمد قلی قطب شاہ (سنہ ۹۸۸ھ ۔ سنہ ۱۰۲۰ھ)۔

—— سلطان محمد قطب شاہ (سنہ ۱۰۲۰ھ - سنہ ۱۰۳۵ھ)

سب سے زیادہ کلام سلطان محمد قطب شاہ کا ہے جو اس خاندان میں اپنے علم و فضل اور ذوق مطالعہ کے لحاظ سے بہت مشہور فرمانروا گزرا ہے۔ دوسرے بادشاہوں کا کلام چند اشعار سے زیادہ نہیں ہے، نمونتاً بعض اشعار ملاحظہ ہوں :-

سلطان فیروز شاہ بہمنی (تخلص عروجی و فیروزی)

بہ قطع راہ محبت مخور فریب امید | کہ غایت ابدش ابتدائے فرسنگ ست

یوسف عادل شاہ (تخلص یوسف)

تا بارِ غم عشق کشد قافلۂ ما | گلہا شگفد ہر طرف از مرحلۂ ما
ما مسئلۂ نقہ نہ دانیم چو یوسف | آساں شدہ از عشق بتاں مسئلۂ ما

اسماعیل عادل شاہ (تخلص وفائی) :-

شب ہجر جز گریہ کارے ندارم | بجز دیدۂ اشکبارے ندارم
ازاں با غمش خو گرفتم وفائی | کہ غیر از غمش غمگسارے ندارم

یار قلی جمشید قطب شاہ (تخلص جمشید) :

آنانکہ با خدنگ جفائے تو خو کنند | تیرے نہ خوردہ تیرِ دگر آرزو کنند

سلطان محمد قلی قطب شاہ (تخلص قطب شہ)

با شمع مگو گرمیِ دیوانۂ خود را | کاتش زند از رشکِ تو پروانۂ خود را
حرفے ز لبِ یار شنیدیم شنیدیم | صد شکر کہ ایں بادہ چشیدیم چشیدیم
گہے تغافل و گاہے سلام می سوزد | چہ گویمت کہ دلم را کدام می سوزد

سلطان محمد قطب شاہ (تخلص ظل اللہ)

کارِ من و دل ہمیں بہ یار ست | ما را بہ کسے دگر چہ کار ست
ہر دست بدامنے ست در خورد | دستِ من و دامنِ نگار ست
خوش شوی اے دل خوش کہ کارت را نکو خواہیم ساخت | یار اگر با ما نہ سازد با بہ او خواہیم ساخت
تبے دارم کہ از لعلش شراب زندگی بارد | ز گلبرگِ رخِ رنگینش آب زندگی بارد
چو برخیزی ز روئے ناز از بالینِ زیبائی | ز چشمانت ہمہ مستیِ خواب زندگی بارد

ملنے کا پتہ :- سب رس کتاب گھر خیریت آباد حیدرآباد دکن

طوطی نامہ یہ کتاب بھی "مجلس اشاعت دکنی مخطوطات" نے شایع کی ہے اور اس کے مرتب بھی میر سعادت علی رضوی ام۔ اے ہیں۔ یہ مثنوی غواصی کی ہے جو ولی سے بہت پہلے ابراہیم قطب شاہ کے زمانہ میں پیدا ہوا، جس نے محمد قلی قطب شاہ کے زمانے میں مثنوی سیف الملوک بدیع الجمال لکھنا شروع کی اور سلطان عبداللہ کے عہد میں طوطی نامہ لکھا (۱۰۴۹ھ) یہ شاہی دربار کا ملک الشعرا تھا اور بڑی عزت و مرتبت اس نے حاصل کی تھی طوطی نامہ اسی کی مثنوی ہے جسے فارسی زبان سے اس نے دکنی زبان میں منتقل کیا۔ اس فسانہ کا اصل ماخذ سنسکرت کی کتاب شوکا شپ تتی جس کے ترجمے دنیا کی مختلف زبانوں میں ہوئے ہیں۔

اس کے مقدمے میں تمام متعلقہ مسایل سے بسیط بحث کرکے طوطی نامہ کی شاعرانہ حیثیت اور عہد غواصی کی زبان پر بھی گفتگو کی گئی ہے۔

اس کی طباعت وکتابت بھی نہایت نفیس ہے اور آرٹ پیپر پر چھاپی گئی ہے۔

سیف الملوک و بدیع الجمال یہ بھی غواصی کی مثنوی ہے اور انھیں خصوصیات کی حامل ہے جو طوطی نامہ میں پائی جاتی ہیں۔

پھول بن ابن نشاطی کی مشہور مثنوی ہے اور عبدالقادر سروری ام۔ اے۔ نے مرتب کی ہے۔ پہلے دکن میں اُردو مثنوی کے ارتقاء سے بحث کی گئی ہے اور پھر ابن نشاطی کے حالات لکھکر مثنوی کا قصہ نہایت تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ آخر میں مثنوی پھول بن ہے اس کی طباعت وکتابت میں بھی خاص اہتمام سے کام لیا گیا ہے۔

قصۂ بے نظیر صنعتی کی مثنوی ہے جو محمد عادل شاہ کے زمانہ کا شاعر تھا۔ یہ مثنوی پھول بن سے پہلے کی ہے اور گیارھویں صدی کے وسط میں لکھی گئی تھی۔ اس کی ترتیب بھی عبدالقادر سروری نے کی ہے۔

اُردو مثنوی کا ارتقا جناب عبدالقادر سروری ام۔ اے کی تصنیف ہے جس میں ابتدا سے اسوقت تک مثنوی کے تدریجی ارتقاء پر بحث کی گئی ہے۔ فہرست مضامین یہ ہے:

مثنوی کا درجہ اصناف شعر میں — اُردو مثنوی کے اولین نمونے — طویل تر مثنویاں — قدیم مثنوی کا سنہرا زمانہ۔ بیجاپور کی مثنویاں — گولکنڈہ کی مثنویاں — مغلیہ عہد کی مثنویاں — دور متوسط کی ابتدائی مثنویاں — دور متوسط میں مثنوی کی ترقی — مثنوی دور جدید میں۔

کتاب بہت مفید وکارآمد ہے۔

ملنے کا پتہ :- سب رس کتاب گھر خیرت آباد حیدرآباد دکن اور قیمت ۱۲ء

مرقع سخن چوتھی جلد

اس سے پہلے کی تین جلدوں میں عہد حاضر سے پہلے کے شعراء کا حال درج کیا گیا تھا اس مجموعہ میں جامعۂ عثمانیہ دکن کے چھبیس فارغ التحصیل شعراء کا ذکر کیا گیا ہے اور ان کے کلام کا انتخاب دیا گیا ہے، جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حیدرآباد کا موجودہ دور شعر و شاعری میں کتنی ترقی کر رہا ہے۔

کتاب مجلد شایع ہوئی ہے اور سب رس کتاب گھر سے مل سکتی ہے۔

تاریخ گولکنڈہ

مولفۂ جناب عبد المجید صدیقی ام اے، ال، ال، بی استاد تاریخ جامعۂ عثمانیہ۔ علاوہ مقدمہ کے کتاب پانچ حصوں پر منقسم ہے۔ پہلے حصہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ دکن کے اس حصہ میں سلطنت کا آغاز کیونکر ہوا، دوسرے حصہ میں اس کے استحکام اور تیسرے میں اس کے عروج سے بحث کی گئی ہے۔ چوتھا حصہ زوال سے متعلق ہے اور پانچویں میں گولکنڈہ کی تمدنی، سیاسی و علمی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ عمارات و سلاطین قطب شاہی کی گیارہ تصاویر بھی شامل ہیں۔ کتاب بہت مفید ہے اور تاریخ دکن سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ قیمت ہے ملنے کا پتہ سب رس کتاب گھر خیریت آباد حیدرآباد دکن

افی جینیا

جرمنی کے مشہور شاعر گوئٹے کے ایک ڈرامہ کا ترجمہ ہے جس کا نام افی جینیا ہے یہ فسانہ یونانی تاریخ کے خرافیات سے متعلق ہے جس کو اس نام سے جناب دبیر حیدرآبادی نے اردو میں پیش کیا ہے قیمت ۱۰؍ ہے اور ملنے کا پتہ محبوب پورہ حیدرآباد دکن۔

اردو دانی پہلا حصہ

اس زمانہ میں پڑھنے سے زیادہ پڑھانا محنت و ذہانت چاہتا ہے اور اس لئے فن تعلیم کو آج کل بڑی اہمیت دیجاتی ہے۔ اردو سکھانے کی یہ پہلی کتاب محمد اظہر الدین صاحب مدرس مدرسہ خیریت آباد نے اسی فنی حیثیت سے لکھی ہے۔ قیمت ۲؍ ہے اور ملنے کا پتہ سب رس کتاب گھر حیدرآباد دکن ہے

اردو کے قاعدے

نمبر ۱ و نمبر ۲ و نمبر ۳۔ صاحبزادہ سعید الظفر خانصاحب سابق وزیر تعلیم بھوپال کے مرتب کئے ہوئے ہیں اور دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جدید اصول تعلیم کے لحاظ سے ان میں ترتیب و تدریج کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ ایک کتاب صاحبزادہ صاحب کی

مدرس کا قاعدہ نما

بھی ہے جس میں مدرسوں کو ہدایتیں کی گئی ہیں کہ انھیں چھوٹے بچوں کی حروف شناسی اور حرفوں کے جوڑ پیوند کو سمجھانے کے لئے کیا طریقے اختیار کرنا چاہئے۔ ایک تیسری کتاب اس سلسلہ کی

اردو سکھانے کا آسان طریقہ

بھی ہے اس میں صاحبزادہ صاحب نے بڑی عمر کے لوگوں کو پڑھانے کے طریقے بتائے ہیں۔ بظاہر یہ سٹ بہت مفید معلوم ہوتا ہے اور مکتبہ جامعۂ ملیہ دہلی سے ۔؍ میں مل سکتا ہے۔

اُردو سکھانے کا سٹ جامعہ ملیہ کا

مذکورۂ بالا سٹ کے ساتھ جامعۂ ملیہ نے اپنا مرتب کیا ہوا سٹ بھی ریویو کے لئے بھیجا ہے، اس میں یہ کتابیں ہیں:

ہندوستانی قاعدہ — ہندوستانی کی پہلی کتاب — اُردو پڑھنے کا قاعدہ — حرف کا قاعدہ۔

بچوں کا قاعدہ — رہنمائے قاعدہ — آسان قاعدہ — نئی کتاب۔

یہ تمام کتابیں طریق الصوت کے اُصول پر لکھی گئی ہے اور نفسیاتی حیثیت سے بچوں کے لئے زیادہ قابلِ قبول ہیں۔ لیکن میں دیکھتا ہوں کہ یہ کتابیں اسی وقت زیادہ مفید ثابت ہو سکتی ہیں، جب ان کے پڑھانے والے ملک میں پیدا ہو جائیں اور چونکہ جامعہ ملیہ کا ٹریننگ کالج اس کمی کو بھی پورا کر رہا ہے اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ جامعہ ملیہ کی یہ کوشش "کار آگہانہ" طریقہ سے جاری ہے جس سے ملک میں تعلیم کی عام ترویج کو بہت فایدہ پہونچے گا۔

تذکرۂ وقار

اس کتاب میں مولوی محمد امین زبیری نے نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین خاں کے حالات قلمبند کئے ہیں۔ نواب وقار الملک، سر سید کے خاص اعوان و انصار میں سے تھے اور نواب محسن الملک کے بعد، ام۔ اے۔ او کالج میں سکریٹری کی خدمات بھی انھوں نے عرصہ تک انجام دی تھیں۔

اس تصنیف کے تین حصے ہیں، ایک حصہ میں ان کی قیام حیدر آباد کے زمانہ کے حالات درج ہیں، دوسرے میں سکریٹری شپ ام۔ اے۔ او کالج کے عہد کا حال بیان کیا گیا ہے اور تیسرے حصہ میں ان کے زمانۂ آخریں کے مشاغل سے بحث کی گئی ہے۔

کتاب اپنی ترتیب و تہذیب اور فراہمی مواد کے لحاظ سے سیرت نگاری کا بہت اچھا نمونہ ہے اور اس کے مصنف چونکہ اس نوع کی تصانیف کا دیرینہ تجربہ رکھتے ہیں اس لئے بحث کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جو فرو گزاشت ہو گیا ہو۔ عبارت بہت صاف و شگفتہ ہے اور طباعت و کتابت نہایت پسندیدہ۔ قیمت درج نہیں ہے اور نہ ملنے کا پتہ لیکن غالباً کتب خانہ مسلم یونیورسٹی سے دستیاب ہو سکے گی۔

حیاتِ سلطانی

یہ تصنیف بھی مولوی محمد امین صاحب زبیری کی ہے جس میں نواب سلطان جہاں بیگم فرمانروائے بھوپال کے سوانح حیات درج کئے گئے ہیں۔ چونکہ مولوی صاحب موصوف کو عرصہ تک نواب سلطان جہاں بیگم کے حضور میں باریابی کا موقعہ حاصل رہا ہے اس لئے ان سے زیادہ موزوں کوئی دوسرا شخص اس تصنیف کا ہو ہی نہ سکتا تھا۔

اس کتاب میں نواب سلطان جہاں بیگم کی زندگی کے تمام پہلوؤں سے بحث کی گئی ہے اور نہایت صحت و خوبی کے ساتھ۔ بھوپال کے نسائی دورِ حکومت میں نواب سلطان جہاں بیگم کو گل سر سبد کی حیثیت حاصل ہے اور اسی خصوصیت کو پیشِ نظر رکھکر اس کتاب کو تصنیف کیا گیا ہے۔ جابجا تصاویر بھی پائی جاتی ہے جنھوں نے ظاہری

حیثیت سے بھی اُس کتاب کو بہت دلچسپ بنا دیا ہے۔ قیمت درج نہیں ہے۔ ملنے کا پتہ غالباً مسلم یونیورسٹی ہوگا۔

دیوانِ انیق مولانا محمد یعقوب انیق صدیقی مرحوم کے نعتیہ کلام کا مجموعہ ہے۔ جناب انیق جونپور کے ایک صاحب علم خاندان کے فاضل بزرگ تھے اور تصوف کا اچھا ذوق رکھتے تھے۔ آپ نہایت اچھے خطیب بھی تھے اور اُردو، ہندی، فارسی و عربی زبانوں میں بے تکلف شعر کہتے تھے۔ اس نعتیہ مجموعہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو ذات نبوی سے واقعی غیر معمولی محبت تھی اور بعض اشعار سے ان کے اس شغف کا پتہ چلتا ہے۔

فن شعر میں نعت گوئی "پوچ گوئی" سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی، لیکن کلام انیق میں بعض اشعار ایسے بھی ملتے ہیں جو واقعی شعر بھی ہیں اور نعت بھی۔ کتابت وطباعت، بہت معمولی ہے، قیمت درج نہیں ہے۔ دفتر طارق جونپور سے خط وکتابت کی جائے۔

بغداد کا جوہری ایک ناول ہے جناب اشرف صبوحی دہلوی کا، جسے انھوں نے انگریزی سے ترجمہ کیا ہے، لیکن اس خوبی کے ساتھ کہ ترجمہ معلوم ہی نہیں ہوتا۔ جناب پروفیسر مرزا محمد سعید صاحب نے اس کی تمہید لکھی ہے اور صبوحی صاحب کی اس محنت وکاوش کی نہایت اچھے الفاظ میں داد دی ہے۔ قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ کتب خانہ علم وادب دہلی۔

دوشیزۂ صحرا یہ ترجمہ ہے مس جون کونکوسٹ کے انگریزی ناول کا۔ یہ قصہ عرب کی سرزمین سے تعلق رکھتا ہے جس میں عربوں کی تمام خصوصیات کو نہایت خوبی سے پیش کیا گیا ہے۔ جناب صادق الخیری ام۔ اے نے ترجمہ کرنے میں اس کا بڑا خیال رکھا ہے کہ وہ ترجمہ نہ معلوم ہو۔ قیمت عہ اور ملنے کا پتہ کتب خانۂ علم وادب دہلی۔

مسلمانانِ ہند کی حیاتِ سیاسی یہ کتاب جناب محمد مرزا دہلوی کی کاوش کا نتیجہ ہے اور موضوع نام سے ظاہر ہے، لیکن مقصود غالباً مسلم لیگ کی تاریخ کو خوشنما الفاظ میں پیش کرنا اور اس کے وجود کی اچھی تعبیر کرنا ہے۔ جس حد تک فراہمی واقعات کا تعلق ہے کتاب کے اچھے ہونے میں شک نہیں لیکن استخراج نتایج کے لحاظ سے مجھے اس سے جا بجا اختلاف ہے۔ فاضل مصنف کا آخر میں ایک جگہ یہ ظاہر کرنا کہ ہندوستان کی تمام مسلم جماعتوں میں صرف مسلم لیگ ہی کو تعمیری لائحۂ عمل پیش کرنے کا فخر حاصل ہے، ایسا عجیب وغریب انکشاف ہے جس پر جتنی حیرت کیجائے کم ہے۔ اس کی قیمت عہ اور ملنے کا پتہ، کتب خانۂ علم وادب ہے۔

باسی پھول مجموعہ ہے جناب علی عباس حسینی کے تیرہ افسانوں کا جسے مکتبۂ اُردو لاہور نے شایع کیا ہے

جناب عباس حسینی کے فسانے ملک میں عام طور پر بہت مقبول ہیں اور غالباً یہ افسانے بھی مختلف رسایل میں شایع ہو چکے ہوں گے۔ قیمت عہ

ہندو ادیب

جناب ناظر کاکوروی نے اس کتاب میں شرح و بسط کے ساتھ بتایا ہے کہ ہندو اہل قلم نے اُردو کی ترویج و ترقی میں اسوقت تک کتنا حصہ لیا ہے اور اس سلسلہ میں ان کو جتنے واقعات و حالات مل سکے ہیں وہ سب ایک جگہ اکٹھا کر دئے ہیں۔ اس زمانہ میں جبکہ ہندی و اُردو کا مسئلہ ملکی سوال بنکر رہ گیا ہے اس کتاب کی اشاعت بہت برمحل ہے اور امید ہے کہ اس کا مطالعہ ہندو مسلمانوں دونوں کے لئے بہت مفید ثابت ہوگا۔ قیمت عہ اور ملنے کا پتہ انوار بک ڈپو لکھنو۔

سلطان محمود غزنوی

ترجمہ ہے مولوی محمد حبیب صاحب پروفیسر تاریخ مسلم یونیورسٹی کے ایک انگریزی مقالہ کا جو انھوں نے سلطان محمود غزنوی کے حالات پر تبصرہ کی حیثیت سے لکھا تھا۔ پروفیسر حبیب چونکہ مسلم الثبوت مورخ ہیں اس لئے اصل مقالہ کے متعلق کچھ کہنا بیکار ہے، رہا ترجمہ سو اس کی خوبی کا بھی اس لئے اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ترجمہ معلوم ہی نہیں ہوتا۔ یہ کتاب ہندوستانی اکاڈیمی نے شایع کی ہے اور ایک روپیہ میں ملسکتی ہے۔

حسین ابن علی

اس کتاب میں جناب نکہت شاہجہاں پوری نے نفسیاتی حیثیت سے حسینؑ کی ہستی پر نگاہ ڈالی ہے اور اسی سلسلہ میں بعض ان ایرادات کا بھی جواب دیا گیا ہے جو واقعۂ کربلا کے سلسلہ میں آپ پر عاید کئے جاتے ہیں۔ گو کتاب مختصر ہے لیکن قوتِ بیان و زورِ استدلال کے لحاظ سے جامع حیثیت رکھتی ہے گو اس باب میں کوئی قاطع فیصلہ نہ اس وقت تک ہوا ہے نہ ہو سکے گا۔ کیونکہ مذہب والے اپنے اکابر کو انسان کی حیثیت سے دیکھنے کے عادی نہیں اور یہیں پر آکر انتقادی قوت سپر ڈالدیا کرتی ہے۔ بہرحال کتاب کافی محبت و ارادت کے ساتھ لکھی گئی ہے اور مجموعی حیثیت سے خوب ہے۔ قیمت ۸ر ہے اور ملنے کا پتہ شیخ غلام علی اینڈ سنز کشمیری بازار لاہور

پسِ پردہ

چندر بھوشن سنگھ صاحب کے چند افسانوں کا مجموعہ ہے اور خوب ہے۔ زبان، پلاٹ اور اندازِ بیان سب میں کافی دلکشی پائی جاتی ہے اور ان کے مطالعہ سے ہم کو سوسائٹی کے بہت سے مسایل پر غور کرنے کا موقعہ ملتا ہے۔ ہلکا سا مزاح بھی کہیں کہیں پایا جاتا ہے جس نے ان افسانوں میں اور زیادہ جان ڈالدی ہے۔

یہ مجموعہ ۱۲ر میں ٹھاکر ابھیراج سنگھ وکیل جونپور سے ملسکتا ہے۔

خبطی

ناول ہے محمد علی صاحب واحدی کا جو فی الحال طالب علم ہیں اور جنھوں نے طالب علمانہ زندگی ہی سے اس کا پلاٹ پیدا کیا ہے۔ ہرچند واحدی صاحب ایک ذہین طالب علم ہیں اور ادب کا ذوق بھی رکھتے ہیں لیکن میں نہیں کہ سکتا کہ اُن کو اس کتاب کی اشاعت پر کس چیز نے مجبور کیا۔ مشق و مطالعہ کے زمانہ میں شہرت کی طلب کوئی اچھا جذبہ نہیں، اگر وہ تعلیم سے فارغ ہو کے اور اپنی تحریر میں پختگی پیدا کرنے کے بعد یہ جسارت کرتے

تو زیادہ موزوں ہوتا۔ اس کی قیمت ۸ رہے اور ملنے کا پتہ انوار بک ڈپو لکھنؤ۔

جوئبار جناب بھیم سین صاحب ظفر ملتانی کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ جناب ظفر ابھی نو عمر ہیں لیکن نظموں سے کافی پختگی خیال ظاہر ہوتی ہے۔

اس مجموعہ میں غزلیں بھی ہیں اور نظمیں بھی اور دونوں اعتنا کے قابل ہیں، معلوم ہوتا ہے ظفر صاحب فطرتاً شاعر پیدا ہوئے ہیں اور ان کا مطالعۂ عالم وہی نزاکت رکھتا ہے جو ایک فطری شاعر کے مطالعہ میں پایا جانا چاہئے اگر ظفر صاحب کی مشق جاری رہی تو ایک وقت آئے گا کہ اُردو کے اچھا کہنے والوں میں ان کا شمار ہوگا۔ اس مجموعہ کی قیمت ۱۲ر ہے اور ملنے کا پتہ قصرِ اُردو۔ ملتان چھاؤنی۔

آزادی کی نظمیں انجمن ترقی پسند مصنفین کی طرف سے حلقۂ ادب مال روڈ لکھنؤ نے اس کتاب کو شایع کیا ہے اور سبطِ حسن صاحب اس کے مرتب ہیں، اس میں تقریباً تیس شعراء ماضی وحال کی وہ نظمیں یکجا کر دی گئی ہیں جو وطن کے جذبۂ آزادی یا سامراجی حکومت کی طرف سے جذبۂ بیزاری سے متعلق ہیں۔

میرے خیال میں یہ پہلا مجموعہ ہے جو اس نقطۂ نظر کو سامنے رکھ کر اُردو میں شایع کیا گیا ہے، قیمت ایک روپیہ ہے

دار السلام جناب ذاکر لکھنوی کے چند سلاموں کا مجموعہ ہے اور خوب ہے۔ جناب ذاکر، حضرت آرزو لکھنوی کے شاگرد ہیں اور انھوں نے اپنے اُستاد کے سادہ وسلیس لیکن پر معنی رنگ کو ان سلاموں میں پوری طرح نباہنے کی کوشش کی ہے۔

یہ مجموعہ ۶ر میں شائننگ بک ڈپو امین الدولہ پارک لکھنؤ سے مل سکتا ہے۔

محبت کے افسانے مختصر سا مجموعہ ہے الطاف حسین رشدی (بیاور) کے چند عشقیہ مقالوں کا جو انھوں نے پورے جوشِ شباب۔ کے ساتھ لکھے ہیں۔ گو جناب رشدی نو عمر ہیں، لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ان کے اندر "عشق کہن سال" پنہاں ہے، خدا خیر کرے۔

یہ مجموعہ محمد سعید خاں آزاد سے جامع مسجد بیاور (راجپوتانہ) کے پتہ پر مل سکتا ہے۔

قول احسن دفتر امت مسلمہ امرتسر نے یہ رسالہ شایع کیا ہے جس سے مقصود مسلمانوں کی فرقہ بندی کو مٹا کر ایک مرکز پر لانا ہے۔ اس میں تمام استدلات کلام مجید سے پیش کئے گئے ہیں۔ قیمت ۲ر ہے۔

برق وباراں مجموعہ ہے جناب برق کرمانی کی قومی وملی نظموں کا، جن میں سے کوئی اس وقت تک میری نگاہ سے نہ گزری۔ معلوم نہیں رسائل وجرائد میں ان کی اشاعت ہوئی ہے یا نہیں۔

تمام نظمیں انقلاب انگیز جذبات سے لبریز ہیں اور اسی جوش و ولولہ کے ساتھ لکھی گئی ہیں، جو ایک جانباز مخلص انقلابی کے دل میں پایا جانا چاہئے۔

زبان و شاعری کے لحاظ سے ان میں سے بہت سی باتیں ایسی پائی جاتی ہیں جن کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ یہ نوجوان بلکہ کمسن شاعر کیونکر اس پختہ کارانہ اسلوب بیان پر قادر ہو سکا۔

میں سمجھتا ہوں کہ صرف اُردو ادب کے موجودہ طوفان خیز رجحانات کی تاریخ مرتب کیجائے گی تو "برق و باراں" کے ذکر سے اس کے صفحات خالی نہ ہوں گے اور شمیم کرمانی کا نام بھی قلمی مجاہدین کی فہرست میں نمایاں طور پر نظر آئے گا۔

یہ مجموعہ مجلد شایع ہوا ہے اور کتابت و طباعت کے لحاظ سے بھی پسندیدہ ہے اور ایک خصوصیت اس مجموعہ کی جو مجھے بہت پسند آئی یہ ہے کہ اس میں کسی کا "مقدمہ" شامل نہیں ہے۔

قیمت ایک روپیہ ہے اور ملنے کا پتہ انڈین بُک ڈپو لکھنؤ

شمیم سخن

ہٹور ضلع بستی میں ایک بزم ادب قایم ہے اور یہاں ایک عقد کی تقریب میں ایک مشاعرہ ہوا تھا اور ساتھ ہی ساتھ "مساہرہ" بھی، یعنی غزلوں کے ساتھ سہرے بھی سنائے گئے تھے ——

سید شبیہ الحسن صاحب رضوی نے انھیں غزلوں اور سہروں کو ایک مقدمہ اور روئداد کے ساتھ کتابی صورت میں شایع کیا ہے۔ پہلے پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی کا تعارف ہے اور اس کے بعد "حکایات بیگانہ" کے عنوان سے شبیہ الحسن صاحب نے اُردو ہندی کی بحث چھیڑی ہے جو کافی دلچسپ ہے۔ اس کے بعد رُوئداد مشاعرہ بیان کی ہے، جسے کلام شعراء پر ایک سرسری تبصرہ کہنا چاہئے اور آخر میں سہرے اور غزلیں درج کردی ہیں۔ قیمت ۴ر ہے اور ملنے کا پتہ ۱۳۱ ۔ مارلین کورٹ علی گڈھ۔

انڈین میوزک

اس کتاب کے مولف جناب ام۔ محتشم ہیں، جو علمی و عملی دونوں حیثیتوں سے موسیقی کے بہت دلدادہ ہیں۔ انھوں نے یہ کتاب بڑی محنت سے مرتب کی ہے اور تمام مبادیات نہایت سہل و صاف الفاظ میں بیان کئے ہیں۔

پندرہ مشہور و متداول راگوں کا نوٹیشن بھی دیا ہے اور تال کو بھی اچھی طرح سمجھایا ہے۔ ہارمونیم سیکھنے والوں کے لئے بھی نہایت مفید نقشے اس میں پائے جاتے ہیں اور سب سے بڑی خوبی جس سے اس قسم کی اردو کتابیں خالی ہوتی ہیں، اس کی طباعت و کتابت ہے۔ یہ کتاب مجلد، نہایت عمدہ کاغذ پر بہترین اہتمام کے ساتھ شایع کی گئی ہے۔ قیمت درج نہیں ہے۔

ملنے کا پتہ یہ ہے:۔

میوزک پبلشنگ ہاؤس، لکھنؤ

علم

معنی و لفظ کے پیچوں میں الجھنے والو!
تم نے سمجھا ہی نہیں علم کا منشا و مقام

کششِ نقش و دوائر پہ تمھاری ہے نگاہ
تم نے کاغذ کے تراشوں کو بنایا ہے امام

علم کو تم نے لکیروں میں کیا ہے محدود
تم پرستار ہو اعداد کے، نقطوں کے غلام

اصطلاحات کے جادو کا اثر ہے تم پر
ایک ہی شے کی بنائی ہیں، بہت سی اقسام

تم نے الفاظ کو برتا ہے کھلونوں کی طرح
تم نے تخئیل سے تعمیر کئے ہیں اصنام

اُن پہ تم علم و بصیرت کا سمجھتے ہو مدار
وہ مسایل جو بہت دن سے ہیں مشہورِ عوام

علم ہے منزلِ عرفان و ہدایت کا چراغ
علم ہے معرفتِ النفس و آفاق کا نام

علم سے تربیتِ فکر و نظر ہوتی ہے
علم فطرت کی صدا، علم خودی کا پیغام

علم سے رمزِ حقایق کی گرہ کھلتی ہے
علم کی زد میں لرزتے ہیں شکوک و اوہام

علم بے چین بھی کرتا ہے بہ عنوانِ عمل
علم آرام بھی دیتا ہے بشکلِ الہام

علم ہر غیب کے پردے کو بناتا ہے شہود
علم مستقبل و ماضی میں ہے اک ربطِ تمام

علم ہے گلکدۂ جذب و یقیں کی خوشبو
علم سے فکر و تصور کا معطر ہے مشام

علم ہے مرہمِ دل، علم ہے تسکینِ ضمیر
علم سب کچھ ہے اگر اُس سے لیا جائے کام

علم سے رومی و عطار نے پایا تھا فروغ
علم نے فکرِ غزالی کو بنایا تھا امام

علم ہے فقر میں بھی رتبۂ شاہی سے بلند
اُس کی تقدیر! جسے علم کا حاصل ہو مقام

"ربِّ زدنی" کی صدا، علم کی آوازِ جرس
علم کے رہبر و رہرو پہ ٹھہرنا ہے حرام

علم ہے نور، جہالت ہے بھیانک ظلمت
علم ہے صبحِ چمن، جہل ہے مرگھٹ کی شام

علم بے سوزِ یقیں کیا ہے؟ حجابِ اکبر
اس میں منطق ہو کہ سائنس ہو یا علم کلام

علم بے جذبِ خودی کچھ نہیں جز مکر و فریب
جس طرح جوہرِ شمشیر سے خالی ہو نیام

ماہر القادری

جرعۂ آخریں

پھر آؤ مقدر کو بیدار کر لیں نگاہوں سے روحوں کو سرشار کر لیں
لبوں کو کہیں رہ نہ جائے شکایت پھر آؤ محبت کا اظہار کر لیں
اِدھر آؤ اِک بار پھر پیار کر لیں

ہوائیں خنک راگ گاتی اٹھی ہیں ہری کونپلیں کسمساتی اُٹھی ہیں
چراغوں پہ چھائی ہوئی ہے اُداسی فضائیں مگر مسکراتی اُٹھی ہیں،
اِدھر آؤ اک بار پھر پیار کر لیں

اُبھرتا ہے یوں تیرگی سے اُجالا، کوئی جیسے لے ڈوبتے میں سنبھالا
در و بام نکھرے چلے آ رہے ہیں سہاگ اب ستاروں کا ہے لٹنے والا
چلو آخری بار پھر پیار کر لیں،

تبسم سے آنسو ڈھلے آ رہے ہیں نظر میں دھندلکے سے بل کھا رہے ہیں
جدائی کا ہنگام نزدیک تر ہے ستاروں کے مُنھ فق ہوئے جا رہے ہیں
اِدھر آؤ اک بار پھر پیار کر لیں

یہ ذوقِ وفا جانے کیا رنگ لائے محبت خدا جانے کیا گُل کھلائے
یہ وقتِ وداعی، یہ بے چین منظر ہمیں کیا خبر کتنی راتیں جگائے
اِدھر آؤ اک بار پھر پیار کر لیں

مچلنے لگیں نرم شاخوں کی باہیں تکلم پہ مجبور ہیں شاہراہیں
لبوں پر ہیں کچھ اُلجھے اُلجھے سے فقرے دلوں کی زباں بن رہی ہیں نگاہیں
اِدھر آؤ اِک بار پھر پیار کر لیں

کہیں رازداری نہ کہہ دے فسانہ　　نہ ہو جائے ہم تم میں حائل زمانہ
میں اِس رات کی صبح سے ڈر رہا ہوں　　گلے مل کے جانا! گلے مل کے جانا!
اِدھر آؤ اِک بار پھر پیار کرلیں،

نہ دن کو مجھے جب یہاں پاؤگی تم　　تصور کی اُلجھن میں کھو جاؤگی تم
اگر راز پوچھے گی کوئی سہیلی　　نہ بولوگی اور اشک برساؤگی تم
مناسب ہے اِک بار پھر پیار کرلیں

اُکھڑنے کو ہے شب کی ظلمت کا ڈیرا　　برسنے کو ہے آسماں سے سویرا
نقوشِ محبت جو پڑھنا ہیں پڑھ لیں　　کہاں پھر یہ قسمت میں روشن اندھیرا
اِدھر آؤ اِک بار پھر پیار کرلیں

نگاہوں میں بے خوابیاں پل رہی ہیں　　تبسم میں مجبوریاں ڈھل رہی ہیں
ہو ریشے ریشے میں بل کھا رہا ہے　　رگ و پے میں انگڑائیاں چل رہی ہیں
اِدھر آؤ اک بار پھر پیار کرلیں

پسینہ جبیں پر ہے شرما رہی ہو　　سحر کے تصور سے گھبرا رہی ہو،
یہ سانسوں کی تیزی یہ سینے کی دھڑکن　　قدم رک رہے ہیں مگر جا رہی ہو،
نہ جاؤ کہ اک بار پھر پیار کرلیں

یہ آوارہ زلفیں، یہ روئے کتابی　　یہ تپتا بدن، یہ بھنچی اضطرابی
یہ آنکھوں میں بہتے ہوئے سُرخ ڈورے　　یہ بوجھل پپوٹے، تھکی نیم خوابی
مناسب ہے اک بار پھر پیار کرلیں

مری شاعری کی جوانی تمھیں ہو　　جوانی کی رنگیں کہانی تمھیں ہو
جوانی کی رنگیں کہانی تو کیا ہے　　مرا مقصدِ زندگانی تمھیں ہو
اِدھر آؤ اک بار پھر پیار کرلیں

احسان الحق بیتس

ایک گمراہ دوست سے!

چمن میں تجھکو مثلِ آفتاب نو ابھرنا تھا
مگر تو سازِ ہستی کو فقط رنگ و نوا سمجھا
دکھاتا ہی رہا میں تجھ کو آئینہ حقیقت کا
مگر تو، سنگ ریزوں ہی کو اپنا آئینہ سمجھا
بھرا رکھا رہا امرت ترے گلرنگ پیالوں میں
مگر تو، زہر کے جرعوں کو کیفِ جانفزا سمجھا
تجھے تھی جستجو اک قلبِ ایمن زار کی شاید
مگر تو، کرمکِ شب تاب کو ماہ و سہا سمجھا
پہونچنا تھا بہر صورت تجھے بروقت منزل پر
مگر تو شورِ بے ہنگام کو بانگِ درا سمجھا،
پکارا کی حقیقت تجھ کو اکثر گوشۂ دل سے
مگر تو نے نہ اس دل کو حقیقت آشنا سمجھا
خلوص و صدق کی آنکھوں نے برسائے بہت موتی
مگر تو اوس کے قطروں کو درِ بے بہا سمجھا
جفا اک چیز ہے مردود، دنیا بھر کی نظروں میں
مگر تو نے اسے بھی داخلِ کیشِ وفا سمجھا
ضرورت تھی کہ مہرِ علم تیری رہبری کرتا
مگر تو نے جہالت کو چراغِ رہنما سمجھا
تری خاطر تو اُٹھ سکتے تھے بزمِ طور کے پردے
مگر تو خاک کے ذروں کو اپنا مدعا سمجھا
چھری تو پھیر دی تو نے بروٹس ے بن کے سیزر ے پر
مگر تو فطرتِ کیشئیس ے بدبیں کو کیا سمجھا
ارے میں تجھ کو شہزادہ بنا کر تاج پہناتا!
مگر تو اس کہانی ہی کو بے انجام سا سمجھا

مجھے معلوم ہے انساں اصلیت میں حیواں ہے
مگر بیٹے تجھے کیوں ان حدوں سے ماورا سمجھا؟

فضل الدین اثر ایم-اے

Cassius ے Caesar ے Brutus ے

اعتذار

کل وعدہ خلافی پہ تجھے دیکھ کے نادم
آیا مرے شکوؤں کی جبینوں پہ پسینا،

وہ تجھ پہ نظر کرکے مری شکر گزاری
وہ حال مرا دیکھ کے آنسو ترا پینا!

وہ ضبط سے باہر مرے جذباتِ محبت
وہ تنگ مئے کہنہ پہ گنجایشِ مینا

ماتھے پہ بھڑکتے ہوئے بیتابی کے شعلے
چہرے پہ برستا ہوا ساون کا مہینا

ہیجان سے گویائی گرانبار، مگر ہاں
غماز اُدھر حال ادھر دیدۂ بینا،

گردن میں خم - آنکھوں میں تری جرم کا اقرار
دہکے ہوئے رخسار - دھڑکتا ہوا سینا

آنچل میں گرہ دے کے کسا زور سے اسکو
قالین کے ریشوں سے نکالا کبھی کینا

نظروں کو بچانا کہ مبادا مجھے ملجائے
آنکھوں میں جو جذبات کا رہتا ہے خزینا

گیسو میں لگاتار شکن فرقِ حسیں تک
بنتا ہوا زائر کی نظر کے لئے زینا،

وہ دیدۂ میگوں میں اُبھرتا ہوا آنسو،
سونے کی انگوٹھی پہ وہ ہیرے کا نگینا

وعدے پہ اگر تو نہیں آیا تو ہوا کیا؟
میں سنے کوئی دم، نزع کی شدت ہی سہی نا؟

مرنے پہ بھی گر میرے تجھے ہو یہ ندامت
منظور ہے غمگین ابد تک مجھے جینا

رزمی صدیقی (بی۔ا…

غزل:

ہے سہل جو تو عقدِ ثریا سے گزر جا
بے خوف و خطر ملجا و ماویٰ سے گزر جا

اے راہروِ عشق یہ توہینِ وفا ہے
اب آرزو و شوق کی دُنیا سے گزر جا

اب دل کو بنا آئینۂ حُسنِ حقیقی
اور عارض و کاکل کی تمنّا سے گزر جا

اِس بزم گہِ ہوش کے جلوے ہیں سرابی
اس بزم کے ہر ذوقِ تماشا سے گزر جا

تخئیل کے رفرف کو اُڑاتا ہوا دم لے
پرواز وہ کر عرشِ معلّٰی سے گزر جا

یہ وادیِ پُرخار ہے اور راہرِوِ عشق
دامن کو بچاتا ہوا دنیا سے گزر جا

لیلائے تخیل پہ تو اس طرح فدا ہو
رخسار سے اور زلفِ چلیپا سے گزر جا

کافی ہے تجھے اس دلِ پر شوق کی مستی،
ہاں آرزوِ مستیِ صہبا سے گزر جا

لا اپنی نظر میں نہ یہ پستی و بلندی
یوں بیخود و سرشار تو دُنیا سے گزر جا

نبی احمد بریلوی

جگر بریلوی:

رہینِ غم تو رہے رازِ غم سمجھ نہ سکے
مآلِ کشمکشِ زیست ہم سمجھ نہ سکے

اُسے حیات سی نعمت عطا نہ کرنا تھا
طرب طرب کو جو اور غم کو غم سمجھ نہ سکے

جئے تمہارے لئے جان دی تمہارے لئے
ہمارے تم بھی ہوا افسوس ہم سمجھ نہ سکے

نہ جینے میں ہمیں راحت ملی نہ مرنے میں
حیات و مرگ کو جُز نوعِ غم سمجھ نہ سکے

حیات و مرگ تھی مرگ و حیات کی تقریب
ستم رہا کہ تمہارا کرم سمجھ نہ سکے

جنوں جنوں تھا خرد بھی تھی ایک نوعِ جنوں
بہار، لالہ و گل کیا تھی ہم سمجھ نہ سکے

گداگری کا بھرم بے نیازیوں سے رہا
میرے سوال کو اہلِ کرم سمجھ نہ سکے

عطا ہوئی ہمیں ہستی بھی نیستی بھی مگر
مآلِ کارِ وجود و عدم سمجھ نہ سکے

کبھی خوشی میں تھا غم اور کبھی خوشی غم میں
تجھے اس قدر غم و شادی بہم سمجھ نہ سکے

گزارنے کو تو ہم نے گزار دی اک عمر
ہمیں بھی کچھ ہوا حاصل یہ ہم سمجھ نہ سکے

ظہورِ جلوہ بھی تھا اک حجابِ حسن جگر
کچھ اور اس کے سوا خود کو ہم سمجھ نہ سکے

قیصر:

قدم جنونِ محبت میں ڈگمگا نہ سکے
ہماری راہ میں کانٹے بھی سر اُٹھا نہ سکے

کھلی ہیں سیکڑوں راہیں جنوں زدوں کے لئے
بلائے ہوش پرستوں میں بار پا نہ سکے

نرالی وضع ہے تیرے نیازمندوں کی
یہ روٹھ جائیں تو دنیا انھیں منا نہ سکے

بہارِ خلد سکونِ دلِ حزیں سے لئے؟
خطا معاف اگر اعتبار آ نہ سکے

وہی ہیں داد کے خواہاں بھی مجھ سے محشر میں
بگاڑ کر جو مقدر مرا بنا نہ سکے

نقابِ عیشِ غمِ جاوداں کے چہرہ پر!!
خزاں نصیب فریبِ بہار کھا نہ سکے

خجل کھڑے ہیں سرِ حشر رحمتِ حق سے
وہ بدنصیب جو لطفِ گنہ اُٹھا نہ سکے

بہار ہو کے خزاں مسکرا کے رہ جائے
جو اپنے غم کو غمِ جاوداں بنا نہ سکے

نکال اپنی خزاں میں بہار کے پہلو
وہ چشمِ تر ہی نہیں پھول جو کھلا نہ سکے

فریبِ رنگ نہ دے مجھکو کارسازِ بہار
بہار کیا جو کلی دل کی مسکرا نہ سکے

خیال آتے ہی قیصر ٹپک پڑے آنسو
ہم اپنا درد کسی بزم میں سنا نہ سکے

قند پارسی

ہست، ولا یعقل کن از مے بگذر از اہل عقول　　تا ز یاد من غم ہستی ورے گردد ذہول
نقش غم را از دلم شوئید با آب طرب　　زانکہ از فضل و کمال خود ملولیم و ملول
تا نمیگیری صراحی تا نہ بگزاری صراح　　کے رسی بر منزل عشق و مقامات وصول
جز بنور بادہ کشف راز حق باشد محال　　شرح کشاف اینقدر بر من مخواں اے بالفضول
آتش تر زن دریں طومار خشک قیل و قال　　غرق مے کن دفتر قاموس و ہم شرح فصول
در کتاب ہر دو ملت نیست حرف خوشدلی　　گرچہ در وے نو بنو ہستند ابواب و فصول
معنیٔ عیش مخلد در خط ساغر بجوئے　　بس ہمیں علم المعانی بس ہمیں علم الاصول
حالیا من زندہ ام ہر انچہ خواہی زود کن　　تو ز فرصت غافلی و مرگ من باشد عجول
اے سحاب لطف باری بر من خاکی ببار　　اے غمام رحمت حق کن بروے من نزول
کشتۂ بیداد وادت از کہ گیرد داد دل　　چوں بحق خویشتن او خود ظلوم ست و جہول

مدعی وا انجمن آرائی نام و نمود،
شرم بادت اے فلک امید و ہم کنج خمول

(ابوالکمال) اُمید امیٹھوی

چند قابل مطالعہ کتابیں

مضامین رشید:- پروفیسر رشید احمد صدیقی کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے، یہ مضامین کیا ہیں دریائے لطافت سے سینچی ہوئی کشت زعفران، تر و تازہ شاداب و فرحت بخش کتاب کی ظاہری خوشنمائی میں بھی خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ قیمت مجلد [illegible]

میدانِ عمل:- ملک کے مشہور و معروف ادیب منشی پریم چند کا بے نظیر ناول جو انکے تمام پچھلے کارناموں پر بھاری ہے۔ قیمت مجلد [illegible]

بیوہ:- منشی پریم چند آنجہانی نے ایک بیوہ کے حالات دردناک پیرایہ میں لکھے ہیں۔ ضمناً یہ بھی بتایا ہے کہ ایک بیوہ کو کیسی زندگی بسر کرنا چاہئے۔ قیمت مجلد عہ

مینجر نگار لکھنؤ

ملنے کا پتہ: منیجر

نیاز فتحپوری کی دیگر تصانیف

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

ترغیبات جنسی (یا) شہوانیات

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات انکی تاریخ و نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کیساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہو جسمیں بتایا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس کس طرح رائج ہوئی، نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی۔ اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے۔

قیمت تین روپیہ (سے) علاوہ محصول

خریداران نگار سے ایک روپیہ کم۔

مجموعۂ استفسار وجواب سہ جلد

ان تینوں جلدوں میں ۱۹۲۲ء سے لیکر ۱۹۳۶ء تک کے استفسار وجواب شایع کئے گئے ہیں۔ اس مجموعہ کی اہمیت کا اظہار بیکار ہے کیونکہ نگار کو جو خصوصیت اس باب میں حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ان تینوں جلدوں میں سیکڑوں ادبی تاریخی و تنقیدی مسایل شامل ہیں اور اسکی حیثیت ایک مختصر سی سائیکلوپیڈیا کی ہے۔

قیمت فیجلد تین روپیہ (سے) علاوہ محصول

خریداران نگار سے فی جلد ایک روپیہ کم

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے۔ اردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے اور ہندی کلام کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں۔

قیمت علاوہ محصول بارہ آنہ (۱۲/)

خریداران نگار سے تین آنہ (۳/) کم

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے تین علمی مضامین شامل ہیں:۔

۱۔ چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ۔

۲۔ مادئین کا مذہب۔

۳۔ حرکت کے کرشمے۔

نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔

قیمت ایک روپیہ (عہ)

علاوہ محصول

خریداران نگار سے چار آنہ (۴/) کم

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ، حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اس کے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں، یہ فسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔

قیمت دس آنے (۱۰/)

علاوہ محصول

خریداران نگار سے دو آنہ (۲/) کم

فراست الید

مولفہ نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل سیرت عروج و زوال، موت و حیات، صحت و بیماری، شہرت و نیکنامی وغیرہ پر صحیح پیشین گوئی کر سکتا ہے۔

قیمت ایک روپیہ (عہ)

علاوہ محصول

خریداران نگار سے چار آنہ (۴/) کم

مذاکرات نیاز

یعنے حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایک بار اسکو شروع کر دینا، آخیر تک پڑھ لینا ہے۔ اس کتاب کی بہت کم جلدیں باقی رہ گئی ہیں۔

قیمت بارہ آنہ (۱۲/)

علاوہ محصول

خریداران نگار سے تین آنہ (۳/) کم

گہوارۂ تمدن

یہ وہ معرکۃ الآرا کتاب ہے جس میں تاریخ و اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے تمدن کی ترقی میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا اور دنیا کی تہذیب و شائستگی اس کی کس قدر ممنون ہے اردو میں اس موضوع پر اس سے قبل کوئی کتاب نہیں لکھی گئی جسکو اس کتاب پر ریاست بھوپال سے ایک ہزار روپیہ انعام ملا تھا۔

قیمت دو روپیہ (عہ)

علاوہ محصول